ایسے کردار جو محبت میں بھی توحید کے قائل تھے۔

میرا عشق فرشتوں جیسا

محمد فیاض ماہی

داستانِ عشق کو زندگی بخشنے کے لیے زندگی سے بغاوت کرنے والے کا قصہ

میرا عشق فرشتوں جیسا

محمد فیاض ماہی

علی میاں پبلی کیشنز
20۔عزیز مارکیٹ، اُردو بازار لاہور پاکستان۔فون: 37247414

انتساب:

اُن لمحوں کے نام جب میری نگاہوں نے
خانہ کعبہ اور روضۂ رسول ﷺ کو پہلی بار بوسے دیئے تھے
وہ لمحے آج بھی میری آنکھوں کو نم کر دیتے ہیں

محمد فیاض ماہی

رب العلمین کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت علم بھی ہے، جو اس پاک ذات نے مجھے بخشی ہے۔ اس کی عطا کردہ اس نعمت سے استفادہ کرنے کے لئے میں نے اپنے ناتواں قلم اور کاغذ کا سہارا لے کر معاشرے کے بہت سے پہلوؤں پر بہت کچھ تحریر کیا اور میری ان بے ردھم تحاریر کو آپ جیسے ادب شناس قارئین نے پذیرائی بخشی...... اور میرے قلم کی حوصلہ افزائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج میرے اس ناول کا چوتھا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں کی زینت بننے میں فخر محسوس کر رہا ہے۔ یہ سب آپ کی پُر خلوص محبت اور کتاب دوستی کی زندہ مثال ہے، اس پر میں اپنے رب کا کروڑ ہا بار شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے مجھے اس دنیا میں عزت بخشی اور آپ لوگوں میں پذیرائی۔ آپ سب کا بے حد مشکور ہوں۔

پیشِ لفظ

بے شک رب العالمین کی کرم نوازی ہے کہ اب اس ناول کا تیسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں کی زینت بن رہا ہے۔کم عرصہ میں آپ نے اس ناول کو جس محبت سے نوازا ہے میں اس پر آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ اور اللہ رب العالمین کا بے شمار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہ عزت عطا فرمائی۔شکر اللہ الحمد للہ...... یا اللہ تیرا شکر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے علم ایک بہت بڑی نعمت ہے اور بے شمار نعمتوں کو نوازنے کے ساتھ ساتھ غفور و رحیم پروردگار نے مجھے علم کی نعمت سے بھی مالا مال فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں آج اپنے نویں ناول کا پیش لفظ تحریر کرتے ہوئے رب ذوالجلال کا شکر گزار رہوں۔

آپ کے زیرِ نظر ناول میرے محترم برادر جناب عبدالغفار صاحب کی محبتوں کو خراجِ عقیدت ہے کیونکہ میری بے ردھم تحاریر کو ان کے علم اور تجربہ کی کسوٹی پر اس طرح پرکھا جاتا ہے کہ ناول کے پہلے لفظ سے لے کر ٹائٹل اور دیگر امور میں وہ خاص دلچسپی لیتے ہوئے اس کو شاہکار کتاب بنانے میں خاصی محنت کرتے ہیں۔ میں ادارہ ابدا کے روح رواں برادر عبدالغفار صاحب کی ان محبتوں کا مشکور ہوں۔ گھنگرو اور کشکول، گیلے پتھر، کانچ کا مسیحا، کاغذ کی کشتی، تاوانِ عشق، عین شین قاف، موم کا کھلونا اور ٹھہرے پانی، کے بعد ''میرا عشق فرشتوں جیسا'' تک اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت ہی باشعور قارئین کی محبتوں سے نوازا ہے اور یقیناً یہ کتاب دوستی کی زندہ مثال ہے۔

اس ناول کو تحریر کرتے ہوئے میں کافی کرب سے گزرا ہوں کیونکہ جیسا اس کا موضوع تھا مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں کبھی بھی اس کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا پاؤں گا۔گزشتہ برس سخت بیماری سے جنگ کے دوران بھی یہ ناول میرے حواس پر چھایا رہا اور اس کو مکمل کرنے کی دعائیں دن رات میرا وِرد بنی رہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس سے عشق تو ہر مسلمان کی گھٹی میں شامل ہوتا ہے لیکن یہ ایسے عاشق کی کہانی ہے جسے یہ تجسس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا گھر کیسا ہے؟ وہ کس گھر میں رہتا ہے؟ وہ اپنے گھر جن کو مدعو کرتا ہے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں؟ اور اللہ کے گھر کو دیکھنے کے لئے کسی بھی امتحان سے گزرنے کی التجائیں اور دعائیں اس تحریر کا خاصہ ہیں اور اس بار عاشقِ خدا کسی مرد کی ذات نہیں بلکہ ایک طالبہ علم ہے جس پر اللہ کے گھر کا ذکر سنتے ہی رقت اور کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ کے گھر تک پہنچی یا نہیں یہ تو ایک تجسس ہے۔ اگر وہ پہنچی بھی ہے تو کن امتحانوں سے گزر کر وہاں تک پہنچی ہے اور عشقِ خدا نے اس کی ذات سے کیا کیا تاوان وصول کیا ہے یہ بھی راز ہے اور جیسے جیسے آپ اس ناول کے اوراق کو محبتوں سے لپیٹتے جائیں گے وہ راز آپ پر آشکار ہوتے جائیں گے۔

یہ تو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس سے عشق کا ایک ہلکا سا عکس تھا تفصیل تو زیرِ مطالعہ صفحات میں موجود ہے لیکن دنیاوی عشق کی ایک ایسی داستان جو کہ آپ کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دے گی وہ بھی ان صفحات میں موجود ہے۔

ایک غیر مسلم کی ایسی کہانی ہے جس نے سنگتراشی میں مہارت حاصل کی تو ایک جیسے ہی کئی مجسمے تراش دیئے۔ زندگی بھر جس لڑکی کو کبھی بھی نہ دیکھا تھا وہ اس کے عشق کا محور و مرکز تھی اور سبھی مجسمے اسی لڑکی کے تھے اور وہ اپنے مذہب کے مطابق اس کو سجدہ کرتا تھا اور محبتوں سے ان مجسموں کو سنوارتا تھا۔

دو الگ الگ ملکوں، الگ الگ مذاہب اور علیحدہ علیحدہ ثقافتوں کو ایک وقت میں ایک ہی جگہ پر جمع کیا تو وہ جگہ دنیا کی بدنام ترین ''منڈی'' تھی لیکن اس عاشق کی پوجا اور عقیدہ اتنا پختہ تھا کہ عشق کو خود چل کر اس کے دروازے پر آنا پڑا پھر بھی اس نے اس منڈی سے عشق کو کوڑیوں کے مول خرید کر اپنے دل کے نہال خانوں میں عبادت کا درجہ دیا اور اتنی پوجا کی کہ عشق بھی عاشق ہو گیا۔

اس ناول میں ایک ایسا منظر بھی ہے کہ استاد اور شاگرد کے مقدس رشتے کو عشق نے اپنا پیرہن اوڑھا دیا لیکن ایک برہنہ بدن نے اسے نوچ کر خود اوڑھنے کی کوشش کی تو عشق میدان میں کود پڑا اور اپنی پاکیزگی اور عظمت کی گواہی کے لئے قرآن کریم سے مدد مانگی اور قرآن کریم نے ایک انوکھے انداز میں عشق کے تقدس اور حرمت کی گواہی دی کہ خود عشق بھی قرآن کی عظمت پر قربان ہو گیا۔

اس کہانی کے تمام کرداروں نے میرے جذبات کے ساتھ خوب کھیلا ہے اور میں ان کے وار سے بچنے کے لئے اپنی کم علمی کا سہارا لے کر الفاظ سے ان کی تشنگی بجھانے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ فیصلہ ایک بار پھر آپ کے علم اور تجربہ کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے میرے ناتواں اور حقیر قلم نے اس طرح سننا ہے کہ تنقید اور محبتیں اس طرح نچھاور ہوں کہ میں سیکھتا بھی رہوں اور میرا قلم چلتا بھی رہے۔ الفاظ سے کھیلتے کھیلتے اور نت نئے رشتوں میں کرداروں کو جوڑنے کا فن تو شاید مجھے نہیں آتا لیکن حقیقی زندگی میں میں رشتے بناتا نہیں ہوں اور اگر بنا لوں تو پھر مجھے ان رشتوں کے تقدس اور بھرم کو قائم رکھنا بھی آتا ہے لیکن اس سال اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک ایسے مخلص اور بے لوث رشتے سے نوازا ہے کہ وہ رشتوں کے بھرم کو قائم رکھنے میں مجھ سے بھی بازی لے گئی ہیں۔ میں ان کا بے حد احترام کرتا ہوں اور عزت بھی اس طرح کرتا ہوں کہ خون کے رشتہ میں میری بہنیں ان کے بعد آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جس ہستی سے ملایا ہے وہ محترمہ خدیجہ منیر احمد (ڈپٹی ڈائریکٹر فیصل آباد آرٹس کونسل) ہیں۔ میرے الفاظ ان کے سامنے ہیچ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ بہت سی اچھی کتب کی قاری بھی ہیں اور علم و ادب کی قدردان بھی ہیں۔ میں اپنے حلقہ احباب میں سے شکیل شیخ صاحب کا دلی ممنون ہوں جن کی بدولت آرٹ کی دنیا میں مجھے چند لوگ مصنف کے علاوہ بھی جاننے لگے ہیں اور جناب امجد اسلام کا بھی دلی مشکور ہوں کہ وہ اپنی محبتیں مجھ پر نچھاور کرتے ہیں۔

آپ کی محبتوں کا منتظر و بے قرار رہوں گا۔ کیونکہ آپ کے اعلیٰ ذوق کے مطابق لکھنے کے لئے آپ کی پُرخلوص آراء میرے روکھے پھیکے اور خشک قلم کے لیے روشنائی کا کام کرتی ہیں۔ فیس بک پر، موبائل پر آپ کے پیغامات مجھ میں مزید لکھنے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔

منتظر و مخلص

محمد فیاض ماہی

دولت بی بی نے پُرسکون انداز میں تہجد کی اذان کو سنا اور حسبِ معمول وضو وغیرہ سے فارغ ہو کر ''طیبہ'' کے کمرے کی جانب نگاہ دوڑائی تو ان کے لبوں پر پیاری سی مسکان پھیل گئی کیونکہ طیبہ کے کمرے کی جلتی ہوئی روشنی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ بھی ہر روز کی طرح جاگ رہی ہے اور تہجد و فجر کی نماز کا اہتمام کر رہی ہے۔ دولت بی بی کو اپنی اس بڑی پوتی سے دلی لگاؤ تھا۔ اس کی بڑی اور معقول وجہ بھی یہ تھی کہ طیبہ کبھی بھی بے پردہ باہر نہ نکلی تھی۔ اس نے کبھی بھی کوئی بھی نماز نہ چھوڑی تھی۔ وہ حافظ قرآن تھی اور تلاوت کلام مجید اس کے معمول میں شامل تھا اور محبوب عادت بھی تھی۔ جبکہ گھر کے باقی افراد جن میں ڈاکٹر ارباب احمد جو کہ دولت بی بی کا بیٹا اور اس گھر کا سربراہ بھی تھا وہ نماز میں سستی کر جاتا تھا۔

ان کی فرمانبردار بہو شمسہ ارباب بھی نماز اور روزے کی پابند تھی۔ وہ کبھی کبھار ڈاکٹر ارباب احمد کو نماز کی تلقین کرتی تو ان کا کہنا یہی ہوتا تھا کہ مریضوں کی دیکھ بھال ان کی خدمت اور اچھے طریقے سے پُرخلوص علاج بھی عبادت کے زمرے میں ہی آتا ہے۔ شمسہ بیگم ان کی مدلل گفتگو سے خاموش ہو جاتی تھیں کیونکہ ان کو یہ تو بخوبی علم ہی تھا کہ ان کا شوہر محنتی اور اپنے کام سے انتہائی مخلص ہے۔ اگر رات کے کسی بھی پہر ہسپتال میں کوئی ایمرجنسی ہو تو وہ پہلی کال پر ہی ہسپتال کی جانب بھاگ جاتے تھے۔ کیونکہ پورے ہسپتال میں ڈاکٹر ارباب احمد ہی واحد نیورو سرجن تھے جو اپنے کام میں ماہر اور فرض شناس انسان تھے اور یہ خصوصیات بھی عبادت سے کم نہ تھیں۔ مگر نماز کی جو اہمیت اور خاصیت تھی وہ اس سے بھی انکاری نہ تھے۔

ان کا بیٹا عدیم احمد ارباب جو کہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا اس کا کورس اور سٹڈی کافی مشکل تھی وہ اپنی تعلیم پر توجہ دیتا ہوا کامیابی کی منازل طے کرتا جا رہا تھا اور وہ اس سال بیرونِ ملک جا کر تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر شمسہ ارباب اپنے اکلوتے فرزند کو اپنی آنکھوں سے دور کرنے پر رضامند نہ تھیں۔ یہ کیس ان دونوں ماں بیٹے کی کورٹ میں چلتا ہوا ڈاکٹر صاحب کی عدالت میں پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے کوئی بھی فیصلہ سنانے کی بجائے اپنے ملک میں عدیم احمد کی تعلیم مکمل ہونے تک فیصلہ محفوظ کر رکھا تھا اور عدیم احمد کو پورا یقین تھا کہ فیصلہ اس کے حق میں ہی ہوگا کیونکہ ڈاکٹر ارباب خود اس بات کے حق میں تھے کہ ان کے سبھی بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ان کی طرح معاشرے کے باشعور اور اہم ترین شہری بن کر باعزت زندگی گزاریں۔

ڈاکٹر ارباب کے گھر میں خوشیوں اور زندگی کا احساس زندہ رکھنے والی چھوٹی بیٹی ریبا جو کہ شعبہ فائن آرٹس کی

طالبہ ہے اپنی چلبلی شرارتوں اور شوخ باتوں سے گھر بھر میں چہکتی، اُچھلتی، کودتی اور سب کا ناک میں دم کیے رکھتی تھی۔ وہ سب گھر والوں کی لاڈلی تھی اور دادی دولت بی بی کی آنکھ کا تارہ بھی تھی۔ اس گھر کا ساتواں فرد احمد فراز تھا جو کہ ڈاکٹر ارباب احمد کا بھتیجا ہے۔ وہ بچپن میں ہی یتیم ہو گیا تھا اور اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ بچپن سے اب تک دادی کے ساتھ اس گھر میں مہربان چچا اور پیار کرنے والی چچی شمسہ ارباب کے زیر سایہ رہ رہا تھا۔ وہ اس ملک کا بہترین صحافی تھا اور ایک مشہور و معروف ٹی وی چینل سے وابستہ تھا ہفتہ میں دو بار اس کا پروگرام ٹی وی سے نشر ہوتا تھا۔ وہ اپنے شو میں کسی نہ کسی مشہور شخصیت کو بلا کر اس کا انٹرویو کرتا تھا وہ روٹین سے ہٹ کر تیز و تند سوالات کرنے میں ماہر تھا اور فی البدیہہ جملوں سے سامنے والے کو زچ کیے بغیر ہی اصل بات اگلوانے کا ماہر جانا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ٹی وی چینل اسے اچھی خاصی تنخواہ دیتا تھا اور کئی دوسرے چینلز والے اسے اپنے ادارہ میں کام دینے کے لیے بے چین و بے قرار رہتے تھے اور ساتھ ساتھ اچھی سے اچھی آفرز بھی دیتے رہتے تھے لیکن احمد فراز اپنی بات اور اصول کا پکا اور مستقل مزاج کا سمجھدار نوجوان تھا۔ وہ جس چینل سے معاہدہ کر چکا تھا ان کے لیے ہی کام کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ وہ کبھی بھی ارباب احمد یا شمسہ ارباب کو شکایت کا موقع نہ دیتا تھا۔ مگر اس کے دل میں ایک کسک سی اُٹھتی تھی کہ اس نے اپنی ماں کو نہ دیکھا تھا۔ اس سوچ کو لے کر وہ کبھی کبھار اُداس ہوتا تو باپ کی قبر پر جا کر دل کھول کر رو لیتا اور غم ہلکا ہونے پر وہ خود کو ہشاش بشاش محسوس کرنے لگتا تھا۔

دولت بی بی جائے نماز پر خدا کے حضور ہاتھ اُٹھائے دعا میں مصروف تھی کہ انہوں نے دیکھا آج خلاف توقع ارباب احمد بھی جاگ رہے تھے اور وہ نماز کے لیے وضو کر کے جائے نماز پر کھڑے تھے۔ یہ خوشگوار حیرت دولت بی بی کو اچھی لگی۔ وہ ارباب احمد سے ضرور پوچھیں گی۔ وہ منہ پر ہاتھ پھیر کر جائے نماز سے اُٹھیں اور طیبہ کے کمرے کی جانب چلی گئیں۔ انہوں نے قرآن کریم کی تلاوت میں مگن طیبہ کے چہرے پر پھونک ماری تو اس نے مسکرا کر دادی کی طرف دیکھا اور تلاوت ختم کر کے قرآن کریم کو بند کر کے آنکھوں سے بوسے دیئے اور الماری میں رکھ دیا وہ دادی کی طرف مڑی جو آرام وہ کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔

''اللہ کے عطا کردہ تحفوں اور نعمتوں میں سے ایک سب سے اعلیٰ نعمت انسان کے چہرے کا حُسن بھی ہے۔'' دادی بولیں تو طیبہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور سر ان کی گود میں رکھتے ہوئے بولی۔

''دادی! اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کتنا پیار کرتا ہے؟'' اس سوال کو وہ کئی دنوں سے اپنے ذہن میں لیے پھر رہی تھی۔ دولت بی بی نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''دنیا کا کوئی پیمانہ، کوئی ترازو یا پھر کوئی بھی میٹر اس بات کو نہیں ماپ اور تول سکتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کتنا پیار اور کتنی محبت کرتا ہے۔''

''دادی! یہ کیسے پتہ چلتا ہے کہ ہم اللہ کے محبوب بندوں میں شامل ہو گئے ہیں؟'' وہ آہستگی سے بولی تھی۔ کھڑکی کے پار طلوع آفتاب کا اعلان اس طرح ہو رہا تھا کہ اندھیرا آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا جبکہ باہر درختوں کی شکلیں اور ہیولے واضح ہونے لگے تھے۔ پُرنور اور پُرسکون فضا انتہائی باادب انداز میں رب تعالیٰ کی مدح سرا تھی جبکہ پرندے چہچہا کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کرنے میں مگن تھے۔

''اللہ تعالیٰ تو اپنی تمام مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ مگر جو اس کے محبوب بندے ہیں ان پر مہربانی فرماتا ہے ان کو اپنے حضور سجدہ کرنے کی توفیق بھی عطا کرتا ہے۔'' دادی اس کو مطمئن کرنے والے انداز میں بتا رہی تھیں۔ وہ شاید مطمئن نہ ہو سکی تھی اسی لیے پھر سوال کر دیا۔

''تو پھر وہ اپنے محبوب بندوں کو تکالیف اور دُکھ میں مبتلا کیوں کرتا ہے؟ جبکہ وہ تو رحمٰن و رحیم ہے۔'' سوال خاصا گہرا بھی تھا اور انفرادی بھی تھا۔ دادی چونکہ پڑھی لکھی نہ تھی لیکن وہ اللہ کی عبادت اور خصوصی خلوص سے اللہ کو راضی کرنے کی جو جستجو کرتی تھیں وہ اللہ کو کافی محبوب تھی اور اس کے عطا کردہ علم کی بدولت وہ جواب دینے کی کوشش کرنے لگیں۔

''اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنی محبت اور خلوص سے بنایا ہے وہ محبت اور خلوص عشق کا درجہ پا گیا۔ اور عشق بھی ایسا کہ عبادت میں اس نے اپنے محبوبؐ پر درود شریف لازم قرار دے دیا اور ان کو کلمہ، نماز، اذان میں اتنی اہمیت دی کہ ان کی ذاتِ مقدس کے بغیر نہ کلمہ مکمل ہوتا ہے۔ نہ اذان اور نہ ہی نماز مکمل ہوتی ہے۔ مگر ذرا غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بھی آزمائش اور تکالیف جیسے عناصر نازل فرمائے۔''

''مگر کیوں دادی جان؟'' وہ آج کس موڈ میں تھی اس بات کا اندازہ دولت بی بی لگانے سے قاصر تھی۔ ''میں نے تو پڑھا ہے، سنا ہے کہ ہمارا ایمان تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے محبوب ﷺ کی اطاعت کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ پھر ان پر بھی تکالیف، مصائب، آزمائشیں اور پریشانیاں کیوں...... دادی جان!''

''اللہ کے محبوب تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ ان پر جو بھی مصائب یا آزمائشیں نازل ہوئیں۔ وہ سب ان کی امت یعنی ہم لوگوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ہمیں اللہ کے محبوب ﷺ کی سنتوں پر عمل کرتے ہوئے اللہ کی طرف سے ہر آزمائش کو یہی سوچ کر سہنا اور پورا اُترنا ہوگا کہ ہم اس کے محبوب ﷺ کی امت ہیں اور جس طرح ہمارے آقا ﷺ نے اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہر مصائب کو سہا اور صبر کیا ہے۔ ہمیں بھی اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں اور اس کے محبوب بندے ہیں۔''

دولت بی بی نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو سورج اپنی کرنیں بکھیرنے کے لیے بے تاب و بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ کرسی سے اُٹھتی ہوئیں طیبہ کے چہرے پر پھونک مارتی ہوئی بولیں۔

''یہ عشق کے معاملے ہیں۔ ان میں مت اُلجھا کرو۔ کیونکہ یہ وہ گنجھلیں ہیں جن کو کھولتے ہوئے آدمی خود بھی ان میں پھنس جاتا ہے اور گنجھلوں کا دوسرا سرا آج تک کسی کو نہیں ملا۔''

طیبہ کو یہ بات سمجھ آئی تھی یا نہیں مگر وہ اُلجھ ضرور گئی تھی دادی کے کمرے سے باہر جانے کے بعد کھڑکی سے باہر لان میں دیکھنے لگی جہاں احمد فراز اور ڈاکٹر ارباب احمد جاگنگ اور ورزش میں مصروف تھے۔ وہ آج احمد فراز کو اتنی صبح صبح دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ دیر تک سونے کا عادی تھا۔

یہ پہلا موقع نہ تھا کہ ناشتے کی میز پر پوری فیملی جمع تھی۔ طیبہ اسکارف اوڑھے ہوئے تھی جبکہ ریبا بغیر دوپٹہ کے تھی۔ دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ طیبہ کو اللہ تعالیٰ نے صرف صورت ہی نہیں بلکہ اعلیٰ سیرت سے بھی نوازا ہے جبکہ ریبا کو مذہب سے اتنا ہی لگاؤ تھا کہ وہ فرائض بھی بمشکل ادا کرتی تھی۔ اس بات پر دولت بی بی کئی بار اسے ڈانٹ ڈپٹ

بھی کر چکی تھیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی۔ جبکہ شمسہ نے اچھی طرح دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔
''کیوں بھئی خیریت ہے آج پھر اتنی صبح ناشتہ کر رہے ہو؟'' ارباب احمد نے فریش اور خوشگوار موڈ والے احمد فراز سے پوچھ لیا تو وہ مسکرانے لگا مگر اس کے بولنے سے پہلے ہی عدیم نے لقمہ دینا ضروری سمجھا۔
''پاپا! میرا خیال ہے کہ فراز رات کو نہیں بلکہ صبح ہی گھر آیا ہے۔'' اس نے استفہامیہ انداز میں احمد فراز کی طرف دیکھا تو وہ چمچ سے کھیرا اپنے منہ میں ڈالتا ہوا بولا۔
''بالکل درست فرمایا ہے تم نے۔''
''اتنی لیٹ کیوں؟'' طیبہ نے پوچھا۔
''بس......ایک اہم ترین شخصیت کا انٹرویو تھا۔ اس کی ریکارڈنگ کر رہے تھے۔'' سادہ سا جواب تھا۔
''اہم ترین......کون؟'' ارباب احمد بولے۔
''انکل! ایک حکومتی کارکن نے اپنے گروپ سے ٹکر لینے کی ٹھان رکھی ہے۔ وہ باقاعدہ گواہوں اور ثبوتوں کے ساتھ چینل پر آیا ہوا تھا۔ بس آپ دیکھنا آج کل میں حکومت کا دھڑن تختہ ہونے ہی والا ہے۔'' احمد فراز جواب دے کر پھر ناشتے میں مصروف ہو گیا۔
''مگر حکومتی دھڑن تختہ ہونے پر تمہیں کیا ملے گا فراز بھائی!'' ریبا کی چونچ ابھی تک نجانے کیوں بند تھی۔
''ہاں بھئی......یہ تو بہت اہم نکتہ ہے۔'' ارباب احمد نے بیٹی کی تعریف کی تو وہ اور بھی ہوشیار ہو گئی۔
''خواہ مخواہ ہی راتوں کو جاگتے رہتے ہو۔ اپنی نیندیں خراب کرتے ہو۔ اپنے شو میں سنسنی پھیلاتے ہو۔'' ریبا شاید کچھ خائف تھی احمد فراز کی اس جاب سے۔ تبھی تو وہ غبار نکالنے لگی۔
''تم ابھی چھوٹی سی بچی ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ شہرت کیا ہوتی اور عزت کیا ہوتی ہے۔'' احمد فراز اس بار شمسہ کی طرف متوجہ ہوا اور پھر بولا۔ ''آنٹی! آپ نے بُرا کیا جو اس کا فیڈر گم کر دیا۔'' اس بات پر زبردست قہقہہ لگا تو ریبا کھسیانی ہو کر رہ گئی۔
''کھانا اور ناشتہ خاموشی سے کیا کرو۔'' دولت بی بی کی ڈانٹ پر سبھی خاموش ہو گئے اور ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ ڈاکٹر ارباب احمد کے موبائل پر گھنٹی بجنے لگی تو انہوں نے موبائل پکڑ کر نمبر دیکھا اور ملازم کو آواز دی۔ پہلی ہی آواز پر نوجوان ملازم ''رانجھن'' سر پر پہنچ گیا۔
''جی صاحب!'' اس کا انداز اور لہجہ فرمانبرداری سے بھرپور تھا۔
''رانجھن! میرے کمرے میں بیڈ پر ایک لفافہ پڑا ہے وہ لے کر آؤ۔'' رانجھن تائیدی انداز میں سر ہلاتا ہوا واپس مڑا تو ارباب احمد کی آواز نے اس کا پیچھا کیا۔ ''احتیاط سے لانا اس میں کچھ ایکسرے ہیں۔''
''یہ آپ کو کہاں سے مل گیا تھا؟'' شمسہ ارباب رانجھن کے متعلق بولیں۔
''اس بیچارے کا ہمارے سوا کون ہے۔ بس ایک بہن ہے جس کی خاطر وہ ملازمت کرتا ہے۔'' ارباب احمد بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''کیوں......کوئی شکایت ہے آپ کو اس سے؟''
''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ ایسے فرمانبردار ملازم کہاں ملتے ہیں۔'' شمسہ ارباب کا

لہجہ سادگی سے بھرپور تھا۔
''اور ایماندار بھی۔'' طیبہ بولی۔ ارباب احمد اُٹھ کر باہر نکل گئے تو باقی لوگ بھی آہستہ آہستہ اُٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے جبکہ طیبہ کالج کے لیے تیار ہونے لگی ریا کی آج چھٹی تھی وہ گھر والوں کے کان کھانے کے لیے گھر میں ہی موجود تھی۔
''طیبہ! طیبہ!'' شمسہ ارباب ای کے کمرے کی طرف آرہی تھیں وہ اندر داخل ہوئیں تو طیبہ اسکارف اور نقاب سے اپنے چہرے کو ڈھانپ چکی تھی۔ ''جی امی!''
''بیٹا! آج احمد فراز تمہیں چھوڑ آئے گا۔ میں گاڑی لے کر جا رہی ہوں۔''
''نو پرابلم امی جان!'' وہ سعادت مندی سے بولی تو شمسہ نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اللہ نظر بد سے بچائے۔'' وہ باہر چلی گئیں تو طیبہ کے موبائل پر بیل ہونے لگی۔ وہ میسج کی ٹون تھی۔ فراز گاڑی میں اس کا منتظر تھا۔ وہ جلدی جلدی اپنے کمرے سے نکلی کچھ کتابیں وغیرہ اُٹھائیں اور دادی کو سلام کرتی ہوئی باہر کی جانب لپکی جہاں گاڑی میں احمد فراز اس کا منتظر تھا۔
''اب آ بھی چکو یار!'' اس کا فقرہ بیزاری سے بھرپور تھا۔
''آئی ایم سوری! میری وجہ سے تمہیں ڈسٹربنس ہوئی۔'' وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتی ہوئی بولی تو وہ منہ بسورتا ہوا گاڑی گیئر میں ڈال کر گیٹ کی جانب بڑھاتا ہوا بولا۔
''تمہاری وجہ سے ڈسٹربنس نہیں ہوتی۔ بس یہ جو تم حرکتیں کرتی ہو نا۔ اس وجہ سے میں بہت تنگ آ گیا ہوں۔'' چوکیدار کے گیٹ کھولنے پر گاڑی اب کالونی سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔
''حرکتیں؟'' وہ تنک کر بولی۔ ''کیسی حرکتیں...... ذرا کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''
''یہی کہ ہم فرسٹ کزن ہیں لیکن یوں لگتا ہے کہ میں ایک حقیر سا ڈرائیور ہوں اور تم میری مالکن ہو۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔
''تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں لڑکوں سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھتی اور پھر ایک لڑکے کے پہلو میں بیٹھنا...... اللہ معاف فرمائے۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی تو وہ ہنستا ہوا بولا۔
''تو پھر ایک لڑکے کے ساتھ کیوں جا رہی ہو کالج؟''
''تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔ میرے کزن ہو۔ تایا جی کے بیٹے ہو۔'' وہ شرارت سے بولی۔
''صرف......؟'' اس ایک لفظ میں کتنی حسرتیں اور کتنی خواہشیں تھیں یہ بات احمد فراز اچھی طرح جانتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ طیبہ بھی اس سے متفق تھی۔
احمد فراز نے آج تک کبھی بھی اپنی خواہش اور چاہت کا اظہار طیبہ سے نہ کیا تھا۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا اور شدت سے چاہتا تھا لیکن وہ طیبہ پر کبھی بھی یہ ظاہر نہ کر سکا کہ وہ اس کے دل میں اس طرح رچ بس گئی ہے جس طرح اس کی شریانوں میں خون گردش کر رہا ہے۔
کالج آنے پر اس نے طیبہ کو گیٹ پر اُتارا تو وہ اُترنے سے پہلے حکم صادر فرمانے والے انداز میں بولی۔

''دو بجے آ جانا یاد سے۔''
''میں جناب کا ملازم نہیں ہوں۔ بس فرسٹ کزن ہی ہوں۔'' وہ منہ بناتا ہوا بولا مگر تب تک وہ جا چکی تھی۔ وہ کافی دیر تک اس کو دیکھتا رہا تب تک...... جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔
رات بھر جاگنے کی وجہ سے وہ کافی تھکن محسوس کر رہا تھا اس نے گاڑی گھر کی جانب دوڑا دی۔ وہ لمبی تان کر سونا چاہتا تھا کیونکہ رات کے شو کے لیے اسے فریش دماغ کے ساتھ ساتھ تازہ سوالوں کی تیاری بھی کرنا ہوتی ہے۔

O......❖......O

نیا مسودہ دیکھ کر پبلشر صاحب مسکراتے ہوئے فواز احمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔
''کمال ہے فواز احمد صاحب!'' انہوں نے مسودہ پکڑ کر اس کے صفحات دیکھنا شروع کیے تو فواز احمد مسکراتا ہوا بولا۔ ''کمال کس بات کا بھائی صاحب؟''
''بھئی...... یہ کمال ہی تو ہے کہ آپ نے اس ماہ کی دس تاریخ تک ناول مکمل کر کے لانے کا کہا تھا۔ مگر ابھی تو صرف دو تاریخ ہے۔'' پبلشر صاحب کافی خوش نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے کاؤنٹر کا دراز کھول کر مسودہ اس میں رکھا اور ملازم سے کھانا لانے کا کہا۔
''بس...... ! آپ کی دعائیں چاہئیں۔ اللہ کا خاص کرم ہو گیا۔ کام پہلے ہی مکمل ہو گیا تھا اس لیے لے آیا۔''
فواز احمد کے لہجے میں عاجزی اور انکساری ہمیشہ سے موجود ہوتی تھی۔
فواز احمد ایک چھوٹے سے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ اچھی تعلیم کے باوجود بھی اچھی ملازمت نہ ملی تو اس نے کتب لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جو کہ اس کا شوق، عشق اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کا امتحان بھی تھا۔ وہ ابھی تک تو اس امتحان میں بخوبی کامیابی حاصل کرتا آ رہا تھا۔ اس کی کتابوں کی اچھی ریڈر شپ بن گئی تھی۔ موبائل پر اس کے پرستاروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ کمپیوٹر پر خود کمپوزنگ کرتا تھا۔ اس کا ای میل اکاؤنٹ اور فیس بک پر بھی اس کے کافی چاہنے والے تھے۔ وہ اسی بات سے خوش تھا۔ اور چاہنے والوں کی محبت اس کے لیے عزت اور بڑے اعزاز سے کم نہ تھی۔ انٹرنیٹ اور موبائل بھی اس کی کافی حد تک اس سلسلہ میں مدد کر رہے تھے کہ وہ اچھا لکھتا ہے یا کسی جگہ پر اس کی تحریر میں کوئی جھول اور لچک رہ گئی ہے تو اس کو آگاہی ہوتی رہتی تھی۔
وہ قارئین کی پسند کے عین مطابق لکھنے کی کوشش کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے چاہنے والوں میں لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی اور بہت سے لڑکے تو اس کو تنگ کرنے کے لیے لڑکیاں بن کر ایس ایم ایس بھی کرتے رہتے تھے مگر وہ چھچھورا نہ تھا ہر کسی کا مناسب اور ضابطے کے مطابق جواب دیتا تھا اور پھر اس کو تنگ کرنے والے خود ہی معذرت کر لیتے تھے۔ اس کے کئی پرستار تو اس سے ملنے کے لیے گھر بھی آ جاتے تھے جن میں طلباء کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ وہ اپنی حیثیت کے مطابق ان کی خدمت کرتا اور انتہائی خوش اسلوبی سے ان سے ملتا تھا۔ مگر ایک کسک جو اس کے دل اور ذہن میں تھی وہ یہی تھی کہ اس کی تحریر کو ایک ٹی وی سیریل مل جائے، کوئی اچھا پروڈیوسر اس کے لکھے ہوئے کو قلمبند کر لے تاکہ اس کی جیب میں اچھی خاصی رقم بھی آ جائے اور وہ مزید نامور بھی ہو جائے۔ وہ ٹی وی پر چلنے والے ڈراموں کے معیار سے بھی خائف تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ ان سے اچھا اور صاف ستھرا لکھ

سکتا ہے مگر ابھی تک اس پر قسمت کی یاوری نہ ہو سکی تھی۔

وہ اپنے پبلشر سے اگلے ناول کی بات فائنل کر کے واپسی کے لیے نکلا۔ راستے میں اس نے ایک ہوٹل پر بیٹھ کر چائے کا کپ پیا اور دماغ کو راحت پہنچائی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ شام ہونے سے پہلے ہی لاہور جیسے شہر کو چھوڑ دے کیونکہ اس کا معمول بھی یہی تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ داتا سرکار علی ہجویریؒ کے دربار پر سلام کرتا اور واپس اپنے شہر کی جانب آ جاتا تو اس کو سکون آ جاتا تھا کہ وہ اپنے شہر پہنچ گیا ہے اب پُرسکون نیند بھی لے گا اور آسانی سے اپنا اگلا ناول بھی شروع کر سکے گا۔

وہ جس گاڑی کی سیٹ پر بیٹھا تھا وہ اڈے سے نکل رہی تھی وہ جیسے ہی سوار ہوا کنڈیکٹر نے ڈرائیور کو آواز لگائی ''جان دے استاد جی'' اور دروازہ بند کر دیا۔ وہ سیٹ ڈرائیور کے پیچھے والی دو سیٹوں میں سے ایک تھی جبکہ اس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ وہ یہ معمہ نہ سمجھ سکا کہ گاڑی کی یہی دو سیٹیں کیوں خالی تھیں اور ابھی تک ایک سواری رہتی تھی اور گاڑی اڈے سے باہر نکل آئی تھی۔''

''استاد جی بریک دا آسرا کرنا ایہہ سواری دی بکنگ ہوئی اے۔'' کنڈیکٹر نے ایک سواری دیکھ کر ڈرائیور سے کہا کیونکہ کسی سواری نے سڑک کنارے سے گاڑی کو ہاتھ کا اشارہ کیا تھا۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''آؤ باجی جی! چھیتی کرو۔'' اس کے فقرے کے ختم ہوتے ہی ایک نوجوان لڑکی جس نے اسکارف سے اپنا سر ڈھانپا ہوا تھا سوار ہوئی تو گاڑی دوبارہ چل پڑی۔

''میری سیٹ کون سی ہے؟'' لڑکی نے پوری گاڑی میں نگاہ دوڑاتے ہوئے کنڈیکٹر سے سوال کیا تو وہ فواز احمد کی جانب اشارہ کرتا ہوا بولا۔ ''باؤ جی! نال ہو جاؤ۔ یہ ایک سیٹ باجی کی ہے۔'' فواز احمد ایک طرف ہو گیا تو لڑکی گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھی لیکن ایک زوردار بریک لگنے کی وجہ سے وہ فواز احمد کے اوپر گر گئی تو سب مسافر ہنسنے لگے مگر اس کے ساتھ ہی کنڈیکٹر کی آواز بھی سنائی دی۔ ''اوئے انا ہو گیا ایں سڑک تیرے پیو دی اے۔'' یہ آواز اس نے کھڑکی سے منہ نکال کر گاڑی کے آگے آ جانے والی گدھا گاڑی والے کو دی تھی۔ جس کی وجہ سے اتنی زبردست بریک لگی تھی۔

لڑکی نے خود کو مزید تماشہ بنانے کی بجائے فواز احمد کے ساتھ والی سیٹ پر ہی بیٹھنے کو ترجیح دی۔ وہ اپنا آپ سمیٹ کر بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا جس میں اس کی ضروریات کی اشیاء ہوں گی۔ مگر فواز احمد کے نتھنوں میں مہنگے پرفیوم کی خوشبو سرایت کر گئی تھی۔ جو اس لڑکی نے لگائی ہوئی تھی۔ یہ فواز احمد کا پہلا سفر نہ تھا مگر ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کے برابر میں بیٹھ کر چار گھنٹوں کا سفر اسے قیامت لگ رہا تھا اور شاید یہی حال اس لڑکی کا بھی تھا۔ فواز احمد خاصا نروس ہو رہا تھا جبکہ گاڑی اب موٹروے کی جانب بڑھ چکی تھی اور سفر کا باقاعدہ آغاز بھی ہو چکا تھا۔ لڑکی نے اپنے موبائل سے کسی کو فون کرنا شروع کر دیا۔

''ہاں...... میں گاڑی میں بیٹھ گئی ہوں۔'' پھر اس نے دوسری طرف سے کچھ سنا اور بولی۔ ''میں وہاں پہنچنے سے چند منٹ پہلے آپ کو کال کر دوں گی۔ اوکے بائے۔'' وہ جتنی خوبصورت تھی اس کی آواز بھی اتنی ہی پیاری تھی اب دونوں ہی کچھ ریلیکس محسوس کر رہے تھے کیونکہ موٹروے اس دور کی جدید سڑک تھی جس پر کوئی بھی جمپ یا جھٹکے

مسافروں کو محسوس نہ ہوتے تھے اور نہ ہی کوئی سُست رفتار ٹریفک کسی گاڑی کا راستہ روکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لمبے سے لمبا سفر بھی اب پُرسکون اور آرام دہ ہو گیا تھا۔

کنڈیکٹر نے اُٹھ کر پیچھے کی جانب طائرانہ نگاہ دوڑائی اور اپنے کان میں اڑسی ہوئی پنسل نکال کر کاپی پر کچھ لکھا اور بولا۔ ''سارے مسافر سن لو۔ کسی اجنبی سے کوئی بھی شے لے کر نہ کھانا نقصان کے ہم ذمہ دار نہ ہوں گے۔''

وہ اپنا فرض ادا کر کے ڈرائیور کے پہلو میں خالی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا جو کہ اس کی تھی۔ اب وہ اپنی باتوں سے ڈرائیور کو چوکس اور چوکنا رکھنے کا کام بھی کر رہا تھا۔ فواز احمد نے دیکھا کہ لڑکی اپنے ہینڈ بیگ سے کچھ نکال رہی ہے تو دوسرے ہی لمحہ وہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گیا کیونکہ لڑکی نے بیگ سے ایک ناول نکالا تھا جو فواز احمد کا ہی تحریر کیا ہوا تھا۔ لڑکی نے ناول نکال کر بے خیالی میں فواز احمد کی جھولی میں رکھ دیا اور پھر بیگ سے ایک پی نٹ کا پیکٹ نکالا اس کو کھول کر چند دانے اپنے منہ میں ڈالے اور ناول کی طرف دیکھا جو اب تک فواز احمد کھول کر دیکھ رہا تھا۔

''ایکسکیوزمی! اس میں تصویریں نہیں ہیں۔'' یہ تو فواز احمد پر کھلا طنز بھی تھا اور الفاظ کا پہلا حملہ بھی مگر وہ اپنی عادت سے مجبور تھا مسکراتا ہوا کتاب لڑکی کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ''پھر تو یہ میرے کام کی کتاب نہیں ہے۔''

''آپ کو کیا معلوم کہ اس میں کیا ہے؟'' لڑکی نے کتاب اس کے ہاتھوں سے لی اور فواز احمد کے نام پر پیار سے اپنی انگلی کی پور کو پھیرنے لگی۔ فواز احمد کو وہ پورا اپنے چہرے پر پھرتی ہوئی محسوس ہوئی تو وہ خوشی سے سرشار ہو گیا۔ یہ لڑکی بھی اس کی پرستار تھی۔ مگر اس طرح کہ وہ فواز احمد کے نام کو اپنی نرم و نازک انگلی کی پور سے صاف کرنے والے انداز میں پیار کر رہی تھی۔ یہ تو اچھا ہی تھا کہ اس کتاب پر اس کی تصویر نہ تھی ورنہ شاید وہ اس کی تصویر کو چوم لیتی یا اس پر بھی اپنے ہاتھ کو پھیرنے لگتی۔ لوگ اس کو اس طرح سے چاہتے ہیں اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتا ہوا اسکرین کے پار سڑک پر دیکھنے لگا تھا۔

سڑک کے گرد لگے ہوئے درخت ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے یوں لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو چھونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اطراف میں پھیلا ہوا سبزہ ہمیشہ ہی فواز احمد کے سفر کے مزے کو دوبالا کرتا تھا مگر آج تو اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی اس کی خوبصورت اور ینگ پرستار اس کو یہ سفر کبھی نہ ختم ہونے کی دعا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''یو ناؤ؟'' (You Know) وہ بات کو آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔ ''میں نے ان کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔'' یہ بتانے کی فواز احمد کو کوئی ضرورت تو نہ تھی لیکن شاید وہ بھی سفر کاٹنے کے لیے گفتگو کر رہی تھی یا پھر وہ چاہتی تھی کہ کوئی تو ایسا ہو جو اس کے ساتھ فواز احمد کی باتیں کرے۔

''جی ہاں...... میں نے بھی پڑھا ہے۔ اچھا لکھتے ہیں۔'' فواز احمد کا یہ فقرہ اس کے اندازے کی درستگی کر رہا تھا کیونکہ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور بولی۔ ''کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' فواز احمد کی نظروں میں شاید اسے خفگی نظر آئی وہ اپنے فقرے کی اصلاح کرتی ہوئی بولی۔ ''میرا مطلب تھا کہ آپ نے واقعی میں فواز احمد کو پڑھا ہے؟''

''جی! میں نے بھی ان کی تمام بکس پڑھی ہیں۔ بس...... اب تو ٹائم ہی نہیں ملتا۔ پہلے تو کبھی کبھار ان سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔'' یہ آخری فقرہ تو کرنٹ بن کر لڑکی کو لگا وہ چونکتی ہوئی فواز احمد کی طرف دیکھنے لگی مگر آنکھوں

کے راستے سیدھی دل میں اُترتی گئی۔ ایسی ہی کچھ ہلچل شاید اس کے اندر بھی مچی تھی جبھی تو وہ نظریں جھکاتی ہوئی بولی۔ ''آپ نے دیکھا ہے انہیں۔''

''وہ میرا دوست ہے۔'' مختصراً جواب تھا۔

''آپ جانتے ہیں انہیں؟'' اس کے سوال میں تجسس تو تھا مگر الفاظ میں تشنگی بھی تھی۔

''جی جانتا ہوں۔'' فواز احمد کی نظریں اس کے چہرے کا طواف کرتی ہوئی ثواب کمانے لگی تھیں۔ ''بلکہ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ اور پُر تجسس لہجے میں پوچھنے لگی۔

''کیسے ہیں وہ؟''

''اب تو ٹھیک ہے پہلے کچھ بخار تھا۔'' فواز احمد کی اس بات پر وہ آنکھیں نکال کر رہ گئی۔ ''میرا مطلب ہے کہ اچھا ہے۔ ہینڈسم ہے۔ بالکل میرے جیسا۔'' آخری الفاظ پر لڑکی کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

''آپ کمپیوٹر کے ذریعے کیوں نہیں دیکھ لیتیں اس کو؟''

''میں نے ٹرائی کیا تھا مگر انہوں نے اپنی تصویر کی جگہ اس ناول کی ٹائٹل فوٹو لگائی ہوئی ہے۔ اسی لیے تو میں نے یہ خریدا ہے۔'' فواز احمد کو یاد آ گیا کہ اس نے فیس بک اکاؤنٹ پر اپنے اسی ناول کی تصویر لگائی ہے۔

''آپ ان سے ملنا چاہتی ہیں؟''

''آپ کیا سمجھ رہے ہیں کہ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں جو ایک اجنبی کے کہنے پر فواز احمد سے ملنے کی حامی بھر لوں گی۔''

وہ ہتھے سے ہی اُکھڑ گئی تو کنڈیکٹر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ بھی موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے مسکرانے لگی گویا کہ اس نے کنڈیکٹر کو مطمئن کر کے دوبارہ ڈرائیور کے ساتھ باتیں کرنے میں محو کر دیا تھا۔

''آپ کی مرضی ہے۔'' فواز احمد نے کندھے اُچکاتے ہوئے اپنی نظریں ایک بار پھر باہر سڑک پر مرکوز کر دیں۔ وہ ناول پڑھنے میں محو ہو گئی تھی لیکن کن اکھیوں سے کبھی کبھار فواز احمد کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ فواز احمد کو پورا یقین تھا کہ وہ پھر کچھ نہ کچھ اس سے اسی کے بارے میں پوچھے گی۔

''آئی ایم سوری۔'' وہ کتاب بند کر کے بولی۔

''کس لیے؟'' فواز احمد ذرا موڈ دکھاتا ہوا بولا۔

''مجھے ایسے نہیں بولنا چاہیے تھا۔'' وہ اپنی غلطی پر شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

''اِٹس او کے...... نیور مائنڈ۔'' اتنی دیر میں گاڑی ایک قیام وطعام والی جگہ پر رُک گئی۔

''پاء جی ایتھے گڈی آدھا گھنٹہ رُکے گی۔ کھانا شانا کھا لئو۔'' کنڈیکٹر اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو سواریوں نے گاڑی سے اُترنا شروع کر دیا۔ فواز احمد بھی اُتر گیا۔ وہ بہترین ہوٹل میں پہنچا اور کھانے کی بجائے اس نے صرف ایک کپ چائے پینے کو ترجیح دی۔ اس نے اپنی پینٹ کی جیب کو تھپتھپا کر نوٹوں کی موجودگی کا احساس کیا اور ایک خالی میز کے گرد رکھی گئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

وہ لڑکی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ یہ تو ایک لڑکی تھی روزانہ کئی لڑکیاں اور لڑکے اس کو فون کالز کرتے تھے

اور ایس ایم ایس کے ذریعے اس کی کتابوں کی تعریفیں کرتے رہتے تھے۔ وہ سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا۔ تنقید کو بھی سنتا اور آئندہ بہتر لکھنے کا وعدہ کر کے تنقید نگار کو خاموش کروا دیتا تھا۔ لیکن آج وہ پہلی بار ایک ایسی پرستار سے مل رہا تھا جو اس کی کتابیں پڑھنے کی وجہ سے ہی اس کی دیوانی تھی۔ فواز احمد سوچنے لگا کہ کاش یہ سفر طویل سے طویل تر ہی ہو جائے۔ وہ لڑکی اس کے پہلو میں ہی بیٹھی رہے۔

''اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔'' اندر سے آواز آئی تھی۔ ''مگر میں نام پوچھنے کی پہل کیسے کر سکتا ہوں؟'' اس نے خود ہی جواب دیا۔ ویٹر اس سے چائے کا آرڈر لے کر جا چکا تھا۔ اتنی دیر میں فواز احمد نے دیکھا کہ وہ بھی ریستوران میں داخل ہوئی تھی اور اس کی نظریں فواز احمد کو ہی ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ جلد ہی مسکان ہونٹوں پر سجاتی ہوئی اس کی جانب بڑھی اور خالی کرسی دیکھ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''کچھ کھائیں گے آپ؟'' وہ بولی تو فواز احمد مسکراتا ہونے کہنے لگا۔

اس کے بدلے میں مجھے فواز احمد کا حدود اربع بتانا ہوگا...... ہے نا؟'' وہ اس کی بات سن کر ہنسنے لگی۔ اب وہ فواز احمد کے بالکل سامنے تھی۔ سیب جیسے گلابی گال اور کسی جھیل جیسی گہری آنکھیں جن میں کاجل ایسا تھا کہ گھنگور گھٹائیں بھی سیاہ نہ ہوں گی۔ سرخ ہونٹ جو لپ اسٹک کے بغیر ہی یاقوتی رنگ لیے ہوئے تھے۔

فواز احمد کو خود پر رشک آنے لگا تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی اس کی فین تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں...... بس آپ...... میری ایک سفارش کر دیں ان سے؟'' وہ جھجکتی ہوئی بولی۔

''سفارش؟'' فواز احمد حیرت سے پوچھنے لگا۔ ''کیسی سفارش؟''

''یہی کہ وہ اپنی نیکسٹ بک پر اپنی فوٹو ضرور پرنٹ کروائیں۔'' وہ پُر جوش انداز میں بولی۔ ''مجھے بہت اشتیاق ہے کہ میں ان کو دیکھوں۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ کیسا فنکار ہے جو لفظوں سے کھیلتا ہے اور لفظ بھی ایسے کہ ہمیں...... میرا مطلب ہے کہ مجھ جیسے پڑھنے والوں کو گھائل کر جاتے ہیں۔'' اتنی دیر میں چائے آگئی تھی۔ ویٹر جانے لگا تو فواز احمد نے اسے روک لیا۔ ''میڈم کے لیے کچھ لاؤ۔'' وہ لڑکی کی طرف دیکھنے لگا تو وہ بولی۔ ''ایک چکن برگر اور کولڈ ڈرنک پلیز۔''

ویٹر چلا گیا تو وہ بولی۔ ''میرا نام میڈم نہیں ہے۔ روشنی ہے۔''

''اچھا نام ہے۔'' فواز احمد چائے بنا کر سپ لیتا ہوا بولا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ اس کا نام نہ پوچھ لے۔ اگر پوچھ بھی لے گی تو غلط بتا دوں گا۔ اس نے کون سا شناختی کارڈ چیک کرنا ہے۔ مگر اس کو تو فواز احمد کی زندگی کے بارے میں پوچھنے اور جاننے کی فکر لگی ہوئی تھی اس کی نظروں میں استفسار دیکھ کر فواز احمد خود ہی بولا۔

''وہ میرے گھر کے بالکل سامنے رہتا ہے۔ ینگ ہے۔ سمارٹ ہے۔ اکیلا ہے۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ بس ہم نے تو جب بھی دیکھا ہے اس کو کتابوں میں گھرے ہی دیکھا ہے۔ آپ انہیں کال کر لیا کریں؟'' فواز احمد نے ابھی تک کال یا ایس ایم ایس نہ کرنے کی بھی وجہ جاننا چاہی۔

''وہ ایکچوئیلی......'' وہ کچھ نروس لگنے لگی تھی۔ ''میں ڈر جاتی ہوں کہیں وہ بُرا نہ منا جائیں۔ اور پھر میرے پاس تو وہ الفاظ بھی نہیں ہیں کہ میں ان کی تحریروں کی تعریف کر سکوں۔'' وہ تو دیوانی لگنے لگی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ اچھا اور نفیس آدمی ہے۔'' ویٹر برگر دے کر گیا تو فواز احمد نے زبردستی اس کو چائے اور برگر کا بل تھما دیا۔ وہ اُٹھ کر گاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ ساتھ ساتھ کولڈ ڈرنک بھی پی رہی تھی۔ بس عجیب ہی لڑکی تھی۔ گاڑی میں سبھی مسافر آ گئے تو گاڑی دوبارہ منزل کی جانب رواں دواں ہو گئی۔

''آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا؟'' فواز احمد سمجھ گیا کہ وہ بل کی ادائیگی کی بات کر رہی ہے۔

''شرمندہ نہ کریں۔'' وہ شاید کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھی مگر اس بار فواز احمد نے سوال کر دیا۔

''آپ اسلام آباد میں رہتی ہیں۔''

''نہیں...... میرا تعلق ایبٹ آباد سے ہے۔'' وہ مختصر جواب دیتی ہوئی دوبارہ کتاب کھول کر پڑھنے لگی۔ شاید وہ اس سے زیادہ فواز احمد کو اپنے بارے میں نہ بتانا چاہتی تھی۔ فواز احمد بھی سمجھ گیا اس نے باقی سفر خاموشی سے ہی طے کرنے میں عافیت جانی۔ وہ سڑک کے دائیں بائیں سبزے کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی روشنی کی گردن ڈھلکتی ہوئی فواز احمد کے کندھے سے لگ گئی۔ وہ کیسا احساس تھا اس بات کو وہ الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی پرستار جو دیوانوں کی طرح اس کی جھلک دیکھنے کو بے قرار تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ وہ اس وقت جس کندھے پر پُرسکون نیند کے مزے لینے کے لیے سر رکھے سو رہی ہے وہ کندھا اس مصنف کا ہے جسے دیکھنے کے لیے وہ بے قرار ہے تو شاید وہ کبھی بھی نیند سے بیدار ہونے کو ترجیح نہ دے بلکہ ساری زندگی اسی طرح سوئی رہے۔

''پندرہ بیس منٹ تک اسی اڈے پہنچن والے آں۔'' کنڈیکٹر کی عجیب سی آواز نے اسے جگا دیا۔ وہ گھبرا کر اُٹھی اور شرمندگی سے فواز احمد کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے بال جو کہ اس کے چہرے پر سیاہ ناگن کی طرح چاند پر قابض ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ انگلی سے سمیٹتے ہوئے اسکارف میں کیے اور اپنا بیگ درست کرنے لگی۔

گاڑی اڈہ میں پہنچنے والی تھی کہ اس نے موبائل پر کسی کو گاڑی لانے کا کہا۔ فواز احمد سمجھ گیا کہ وہ کافی امیر ہو گی جو اس نے اپنے لیے گاڑی منگوائی ہے۔ پتہ نہیں اس خیال کے آتے ہی وہ نجانے کیوں بجھ سا گیا تھا۔ بہاروں کے تمام رنگ پھیکے لگنے لگے تھے۔ گاڑی اپنی جگہ پر پہنچ کر رُک گئی تو مسافر اُترنے لگے۔ وہ بھی اُٹھی تو فواز احمد بولا۔

''میری کسی بات سے آپ کو دُکھ ہوا ہو تو آئی ایم سوری!'' وہ غور سے فواز احمد کی طرف دیکھنے لگی بس یہی وہ لمحہ تھا جو دونوں ہی دلوں کو گھائل کر گیا۔ وہ نظریں چراتی ہوئی بولی ''کوئی بات نہیں...... سفر تو اسی کو کہتے ہیں۔'' وہ فواز احمد سے پہلے نیچے اُتری اور فواز احمد وہ آخری مسافر تھا جو گاڑی سے اُترا تھا۔

وہ ایک رکشے والے کو اشارہ کرتا ہوا اس کی جانب بڑھنے لگا تو ایک شاندار اور قیمتی گاڑی وہاں آ کر رُکی۔ فواز احمد نے دیکھا کہ روشنی اس گاڑی کی جانب بڑھ رہی ہے۔ یقیناً یہ گاڑی اسی کے لیے آئی تھی۔ روشنی گاڑی کے اگلی طرف کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہونے لگی تو اس کی نظر فواز احمد پر پڑ گئی جو رکشے میں سوار ہونے والا تھا۔

''سنیں...... مسٹر......'' فواز احمد اس کی سمت دیکھتا ہوا رُک گیا۔ وہ پاس آئی اور بولی۔

''مانا کہ آپ کافی ذہین ہیں مگر اپنا نام ہی بتاتے جائیں۔ میں اگر فواز احمد سے بات کروں گی تو آپ کا کیا حوالہ دوں گی؟'' وہی ہوا تھا جس کا ڈر پورا راستہ لگا رہا تھا۔ فواز احمد شش و پنج میں مبتلا ہو گیا تھا کہ اس کو اپنا صحیح نام

بتائے یا کوئی بھی نام بتا کر چلا جائے۔

''کیا ہوا؟ آپ کا کوئی نام نہیں ہے؟'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی تو فواز احمد مسکراتا ہوا بولا۔

''مس روشنی! میں ہی فواز احمد ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر رکشہ میں بیٹھا اور رکشہ اُڑن چھو گیا مگر روشنی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا وہ ایک جاندار مجسمے میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

''میں ہی فواز احمد ہوں۔'' اس کی سماعتوں میں یہ فقرہ گونج رہا تھا اور دل کی دھڑکنیں سینے کے قفس کو توڑنے کے لیے ہزار کلومیٹر کی رفتار سے دھڑک رہی تھیں۔ اس کے گلابی گال اور گلابی ہو گئے تھے۔ اس کا یہ حال تھا کہ وہ دریا کے کنارے پر بیٹھی رہی مگر اپنی پیاس نہ بجھا سکی۔ وہ پیاسی ہی تھی بلکہ اس کی تشنگی اور بھی بڑھ گئی تھی اب تو اس کا حلق بھی خشک ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر گر جاتی گاڑی کے تیز ہارن نے اسے احساس دلایا کہ وہ کس جگہ کھڑی ہے۔ وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی۔

وہ مردہ قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھی اور اس طرف دیکھنے لگی جدھر فواز احمد کا رکشہ گیا تھا۔ مگر اُدھر تو اب لاتعداد رکشے تھے۔ اسے اپنی کم بینی پر غصہ آنے لگا تھا۔ وہ اس کی باتوں سے بھی نہ سمجھ سکی تھی کہ وہ خوابوں میں جس کی شبیہہ کو اپنے من مندر کے دیوتا کے طور پر پوجتی رہی ہے وہ اتنی آسانی سے اس کے سامنے آئے گا کہ وہ اسے ابھی ٹھیک سے دیکھ بھی نہ پائے گی کہ آنکھ کھل جائے گی۔

○......❖......○

یہ اس ماہ کا دوسرا دل دہلا دینے والا واقعہ تھا کہ کسی کالج سے لڑکی اغوا ہو گئی تھی۔ انتظامیہ کے کان پر جوں تک نہ رینگ رہی تھی۔ لیکن اس بار شاید یوں لگتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا کیونکہ پورے صوبے میں عوام سڑکوں پر نکل آئے تھے اور توڑ پھوڑ شروع ہو گئی تھی۔ جن کی لڑکی اغوا ہوئی تھی وہ ماں باپ تو زندہ درگور ہو کر رہ گئے تھے کیونکہ لڑکیوں کے اغوا کے سلسلہ میں جو بھیانک انکشاف ہوا تھا وہ لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔

بات دراصل یہ تھی کہ کوئی گروہ کالج سے حسین اور خوبصورت نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے بازارِ حُسن کی زینت بناتا تھا۔ اب تو گورنمنٹ نے بازارِ حُسن میں سختی کی تھی مگر پھر بھی کام کوٹھوں سے ''کوٹھیوں'' میں منتقل ہو رہا تھا یہی وجہ تھی کہ اس سلسلہ میں ابھی تک کوئی بھی کارروائی ایسی نہ ہو سکی تھی کہ جس کو احسن کارروائی کہا جاتا۔ کیونکہ ''خریدار'' کافی لمبے ہاتھ رکھتے تھے۔ حکومتی ایوانوں تک ان کی پہنچ اس بات کی غمازی کرتی تھی کہ ان کے لیے یا ان کے خلاف کوئی بھی قانون پاس نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر کام خصوصی شفقت اور اعلیٰ پائے کی زیرِ نگرانی بخیر و بخوبی انجام پا رہا تھا۔

میڈیا چیخ چیخ کر اس ظلم و بربریت کے گھناؤنے کھیل کو ہمیشہ ہمیشہ بند کرنے کے لیے زور دے رہا تھا یا یوں کہہ لیں کہ اپنی ڈیوٹی عبادت سمجھ کر کر رہا تھا مگر متعلقہ محکمہ آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال رہا تھا۔ والدین نے تو اپنی بچیوں کو تعلیمی اداروں میں بھیجنا بھی کم کر دیا تھا تعلیمی اداروں میں روز بروز کم ہوتی ہوئی حاضری اور طالبات کی تعداد میں کمی محکمہ کے لیے لمحہ فکریہ تھی۔ حکومتی کارندے حرکت میں آ چکے تھے اور بہت جلد اس گروہ کو گرفتار کرنے کے بلند و بانگ دعوے کیے جا رہے تھے۔

''میں ان کی کسی بھی بات سے اتفاق نہیں کرتا۔'' ارباب احمد نے چائے کا کپ میز سے اُٹھایا اور ایک گھونٹ بھرنے کے بعد اپنی خوبصورت شریک حیات شمسہ ارباب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر کیوں؟'' وہ بھی اپنا کپ پکڑ چکی تھی۔

''جب حکمران یہ دعوے کریں کہ وہ کریں گے، ہوں گے، یہ ہو گا، وہ ہو گا۔ تو بس سمجھ لو کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔'' ڈاکٹر ارباب احمد خاصے نالاں لگ رہے تھے وہ اس وقت ٹی وی دیکھ رہے تھے اور ایک اہم حکومتی رکن سکرین پر اغوا کاروں کو کڑی سے کڑی سزا دینے کی پیشین گوئیاں کر رہا تھا۔ حالانکہ ابھی تک کوئی بھی گرفتاری عمل میں نہ آئی تھی۔

''مما! آپی یونیورسٹی سے آ گئی ہیں؟'' ریبا کا سوالیہ انداز دونوں ہی میاں بیوی کے کان کھڑے کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ چونک کر سامنے کلاک کی طرف دیکھنے لگے اور یہ بات تشویش ناک تھی کہ ٹائم اوور ہو رہا تھا اور طیبہ نے کبھی بھی اتنی لاپروائی نہ برتی تھی وہ گھر میں فون ضرور کرتی تھی اگر دیر ہو جاتی تو وہ ضرور بتا دیتی کسی دوست کے گھر جاتی تب بھی وہ کال ضرور کرتی تھی لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ کسی دوست کے گھر گئی ہو کیونکہ اس نے بہت کم سہیلیاں بنائی تھیں ان کے ساتھ بھی اس کا تعلق صرف یونیورسٹی تک ہی محدود تھا اور آج جو شہر کی پوزیشن تھی وہ خاصی گھمبیر تھی۔ اب تک تو طیبہ کو کوئی نہ کوئی رابطہ کرنا ہی چاہیے تھا۔ ڈاکٹر ارباب احمد کی پیشانی پر تفکر آمیز لکیریں نمایاں ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے چائے کا کپ ایک طرف رکھا اور موبائل نکال کر عدیم احمد کو کال کی پہلی ہی بیل پر عدیم نے کال ریسیو کی وہ بھی ارباب احمد کی بات سن کر پریشان ہو گیا اور گھر والوں کو مطمئن رہنے کی تلقین کی۔

''پلیز کچھ کریں مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔'' شمسہ روہانسی ہو رہی تھیں ان کو تسلی دینے کے لیے ریبا ان کے پاس آ گئی تھی اور شمسہ کو کندھے سے پکڑ کر دلاسہ دینے والے انداز میں دبا رہی تھی۔

ارباب احمد اپنے موبائل سے مختلف جگہوں پر کالز کر رہے تھے۔ وہ جوان بیٹی کا اس طرح دیر سے بھی گھر نہ آنے پر کافی پریشان ہو گئے تھے۔ ان کی نظریں بار بار ٹی وی سکرین پر جاتی اور وہ پھر شمسہ کو دیکھتے۔ اتنی دیر میں طیبہ کی آواز آئی۔ ''السلام علیکم!'' سب کی جان میں جان آئی۔ شمسہ بھاگنے والے انداز میں اسے جا کر ملنے لگی اور ارباب احمد کا بھی پریشان چہرہ دیکھ کر خود طیبہ بھی حیران ہو گئی۔

''کیا ہوا امی! ابو! کیا بات ہے؟ آپ لوگ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں...... وہ...... تمہیں آج خلافِ معمول کافی دیر ہو گئی ہے۔ اسی وجہ سے پریشان تھے۔'' ارباب احمد اب خاصے مطمئن دکھائی دیئے۔

''کیا بات تھی؟ کہاں رہ گئی تھی تم...... تمہیں پتہ ہے تم تو میری جان ہو۔'' شمسہ ارباب کی آنکھیں نم ہو گئیں تو طیبہ نے ان کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ''آئی ایم سوری امی! دراصل میرا سیل بھی آف ہو گیا اور شہر میں ہنگاموں کی وجہ سے کافی راستے بدل بدل کر آنا پڑا۔'' وہ اپنی غلطی مان رہی تھی۔

''چلو اب کھانا کھا لو۔'' شمسہ ارباب اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئیں تو ارباب احمد نے ٹھنڈی اور پُرسکون سانس خارج کی اور موبائل نکال کر عدیم احمد کو اطلاع کر دی کہ طیبہ گھر آ گئی ہے۔ وہ پریشان نہ ہو۔

''پاپا! کیا بیٹیاں اتنی اہم ہیں کہ تھوڑی سی دیر بھی قیامت لگنے لگی ہے؟'' ریبا اب باپ کو مطمئن دیکھ کر سوال

کرنے لگی تو ارباب احمد چائے پیتے ہوئے بولے۔

''جو شخص بیٹیوں کا باپ ہوتا ہے وہ اعتماد اور بھروسے کا محتاج ہوتا ہے۔ دیر اور جلد بازی اعتماد کی قاتل ہوتی ہے۔'' ارباب احمد بیٹی کو مطمئن کرتے ہوئے بولے۔

''تو پھر چور تو بیٹی ہی ہوئی نا؟'' فلسفانہ سوال تھا مگر چالاک اور شوخی ریبا کو جواب دینا ضروری تھا۔

''بیٹی تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ بس ماں باپ اس معاشرے سے ڈرتے رہتے ہیں کہ چوروں اور لٹیروں کا کوئی گروہ ان سے اللہ کی رحمت چھین کر یا چرا کر انہیں بدقسمت لوگوں میں شریک نہ کر دے۔''

''آپ کو فلسفی ہونا چاہیے تھا۔'' ریبا باپ کی بات سمجھ گئی تھی۔ شوخی سے بولی تو ارباب احمد مسکرانے لگے۔

''باپ ایک رشتہ ہی نہیں بلکہ اہم ترین ذمہ داری بھی ہے۔''

''ہمیں آپ پر فخر ہے پاپا!'' وہ ارباب احمد کے گلے میں پیچھے سے بانہیں ڈالتی ہوئی بولی تو ارباب احمد نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور تم اس فخر کا سرمایہ ہو بچے!'' ارباب احمد کا پیار بھی والہانہ تھا۔

○......❖......○

انیل شرما نے تنقیدی نظروں سے اس حسین اور خوبصورت مجسمے کو دیکھا جو اس کے ہاتھوں کی کاریگری کا لازوال شاہکار تھا۔ اس نے وہ مجسمہ اُٹھایا اور اس کو دوسرے بنے ہوئے مجسموں کے ساتھ رکھ دیا۔ یہ عجب اتفاق تھا کہ وہ سب مجسمے بھی اسی ایک صورت کے تھے جو آخری مجسمہ بنایا تھا۔ وہ ایک حسین اور خوبصورت لڑکی کا مجسمہ تھا جس کی آنکھوں میں پاکیزگی اور تقدس صاف نظر آ رہا تھا۔ اب تک وہ گیارہویں مجسمے کو تیار کر چکا تھا اور پھر اصل کام کرنا نہ بھولا تھا۔

اس نے مجسمے کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اپنے وجود کو اس طرح کر لیا کہ کوئی مسلمان رب تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی اُلٹ تھا۔ نہ سجدہ کرنے والا مسلمان تھا اور نہ ہی اس کی عبادت کا مرکز کعبہ یا خدا تھا۔ بلکہ اس کا اپنا تراشا ہوا ایک بت تھا جو کہ حسین اور نوجوان لڑکی کا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ تم اس کائنات میں ہو۔ اور ایک نہ ایک دن یہاں ضرور آؤ گی۔'' وہ سجدے سے اُٹھا اور بولا۔

''وہ کبھی نہیں آئے گی۔'' یہ پری تھی اس کی کزن جو اس کی عبادت میں خلل ڈالنے آ گئی تھی۔ انیل شرما نے ناگواری کا اظہار کرنے کی بجائے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''میرا یقین اتنا پختہ ہے کہ اس پر بداعتمادی یا وسوسوں کا اوزار ہلکی سی لکیر بھی نہیں ڈال سکتا۔''

''خوابوں اور خیالوں میں آنے والوں کو پوجا نہیں جاتا انیل۔'' وہ اس کے اور قریب آ چکی تھی۔ ''یہ حقیقت سے اتنے ہی دور ہوتے ہیں جتنا کہ تم سے اور مجھ سے چاند دور ہے۔''

''چاند کی مثال بھی خوب ہے۔ خود اس میں تو داغ ہے...... مگر ذرا دیکھو...... وہ چاندنی کا دیوانہ ہے اور خود چاندنی...... اس کی دیوانی ہے...... ایسا کیوں ہے پری؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ''شاید اس لیے کہ دیوانگی، محبت اور پیار ہے۔ زندہ انسان کے لیے...... بس عشق کرتے ہیں۔''

''مگر عشق تو انسان کی میراث ہے..... زندہ انسان کے لیے۔'' پری ایک دل جلے کے سامنے کھڑی تھی۔

''نہ..... نہ نہ نہ..... پری! یہ مت کہو..... اگر ایسی بات ہوتی تو ہندو..... بھگوان کو سجدہ نہ کرتا۔ مسلمان..... اَن دیکھے خدا کی عبادت نہ کرتا۔ کوئل اپنی کُو کُو سے، پپیہا اپنی پی پی سے، پھول کانٹوں سے، شبنم پھولوں سے، صبح کا اُجالا بادِ صبا سے اور رات کی تاریکی اپنی سیاہی سے عشق نہ کرتی۔'' وہ پُر جوش انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''پری جی! اگر عشق صرف انسانوں کی میراث ہوتا تو پرندے انسان سے پہلے بیدار ہو کر بھگوان کی پوجا نہ کرتے۔ ندی کا کنارہ دوسرے کنارے سے ملنے کے لیے ہزاروں میل ساتھ ساتھ نہ چلتا۔ ساحل کی گیلی ریت سے ملنے کے لیے ایک لہر ہزاروں لہروں سے اُلجھتی ہوئی تھکن سے چُور چُور ہو کر بھی ساحل تک نہ پہنچتی اور کتنی مثالیں دوں پری جی! عشق تو لامحدود لفظ ہے۔ اس کی تشریح میں مت اُلجھو۔''

''مگر میں تمہاری کسی بھی بات سے مطمئن نہیں ہوں انیل۔'' وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی اس مجسمے کی طرف بڑھ گئی جو ابھی ابھی تیار کیا گیا تھا اور انیل نے اس کو سجدہ کیا تھا۔ ''تم اپنے آپ کو عاشق کہتے ہو۔ مگر صد افسوس کہ تم اس بات سے بالکل انجان ہو کہ عشق ایک بے جان بت کی بجائے ایک جاندار اور خوبصورت جسم میں ڈھل کر تمہارے سامنے ہے۔'' وہ جاندار قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔

''عشق اور عاشق اندھا ہوتا ہے..... وہ دیکھتا کچھ بھی نہیں۔ اگر دیکھ کر ہی عشق کرنا ہے تو پھر تم بھی اس سے عشق کرو۔ جو حسین ہو۔'' پری چپ نہ رہ سکی۔

''انیل! تم بھگوان کی بجائے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے اس ایک مجسمے کو سجدہ کیوں کرتے ہو؟''

''میرا یہی بھگوان ہے۔''

''کفر مت بولو انیل۔''

''اگر ایک بت کو سجدہ کرنا ہی ہندو دھرم کی روایت ہے تو پھر یہ بت ہی کیوں نہیں؟'' وہ لڑکی کے مجسمے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''یہ بھگوان نہیں ہے۔ یہ رام، شنکر، گن پتی، ہنومان یا کشن نہیں ہے۔ اسے تم نے تراشا ہے۔ تمہارے خیالوں اور خوابوں کی اختراع ہے۔ اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ مگر عبادت تو سچائی مانگتی ہے۔ جھوٹ نہیں..... اور انیل شرما! یہ جھوٹ ہے..... کفر ہے..... تم دوشی قرار دیئے جاؤ گے۔''

''کافر نہ کہہ سکو گے مجھے سجدہ صنم کو کرنے سے
میری چاہت پیغمبروں جیسی ہے، میرا عشق فرشتوں جیسا ہے''

وہ مسکراتا ہوا کہنے لگا تھا مگر پری کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں وہ اس کو اپنی ڈھب پر لانے میں آج پھر ناکام ہو گئی تھی۔ وہ گزشتہ پانچ برسوں سے انیل کی یک طرفہ محبت میں گرفتار تھی مگر انیل شرما نے کبھی بھی اسے آنکھ بھر کر نہ دیکھا تھا۔ وہ انیل شرما کی ماتا رادھا دیوی کی بھتیجی تھی اور ان کے ساتھ ہی چوہان محل میں رہتی تھی۔ وہ کالج کی طالبہ تھی اور ایک نظر میں ہی انیل شرما کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔

انیل شرما اس کو حیران و پریشان کھڑا چھوڑ کر اپنے اوزار سمیٹنے لگا تھا۔ وہ جس اوزار کو بھی اُٹھاتا تھا اس کو خوشبو لگا

لگا کر لکڑی کی پیٹی میں رکھتا جاتا تھا۔ آخر اس نے ان اوزاروں سے اپنا ''عشق'' تراشا تھا جسے وہ آج تک حقیقت میں نہ دیکھ سکا تھا بس تخیل ہی میں سمایا تھا۔

○.....❖.....○
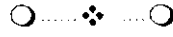
مراد خان نے اخبار پڑھنا شروع کیا تھا کہ ملازم نے چائے کا کپ ان کے سامنے میز پر رکھ دیا اور خود ایک طرف باادب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ہر روز صبح کا معمول تھا کہ مراد خان سیر سے واپس آ کر تازہ اخبار کا مطالعہ کرتے اور چائے کا کپ نوش فرماتے تھے اور اس اخبار کی خاص بات یہ تھی کہ یہ ان کا اپنا اخبار تھا یعنی اس کا چیف ایڈیٹر ان کا اکلوتا بیٹا صہیب احمد تھا جو احسن طریقے سے اخبار کو چلا رہا تھا اور سچائی اور حقیقت پر مبنی خبروں کی بدولت اخبار کی سرکولیشن بڑھتی جا رہی تھی اب یہ اخبار مختلف شہروں سے بیک وقت شائع ہونے کا اعزاز رکھتا تھا جو کہ ایک اعزاز کی بات تھی۔

مراد خان اس خوبصورت جنِ نظیر وادی کا ایک وڈیرہ تھا جو کہ بیوی صباء، بیوہ بہن زبیدہ آپا اور طالبہ بیٹی روشنی کے ساتھ عظیم الشان محل نما عمارت میں رہتا تھا جو کہ ایک پہاڑ نما جگہ پر تعمیر تھی اور موجودہ دور کی ایک یادگار تعمیرات میں اس کا شمار ہوتا تھا تقریباً ایک مربع کے اس محل میں ضروریاتِ زندگی کی ہر سہولت اور ہر چیز مہیا کی گئی تھی ملازموں کی فوج ہر لحہ ہمہ وقت کسی بھی حکم کو بجا لانے کے لیے تیار رہتی تھی۔ وسیع ترین لان میں بچھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے اس وڈیرے کی شان کا یہ عالم تھا کہ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ پورچ میں کتنی گاڑیاں اس وقت کھڑی ہیں اور کون سی گاڑی گھر سے باہر ہے۔

''صہیب آ گیا ہے؟'' انہوں نے اخبار سے نظریں ہٹاتے ہوئے چائے کا کپ پکڑا اور ملازم سے پوچھا۔

''جی سرکار! صاحب رات کو ہی آ گئے تھے۔'' ملازم کا سعادت مندی سے بھرا لہجہ اس بات کی غمازی بھی کرتا تھا کہ مراد خان بدتمیز لوگوں کو اپنے اردگرد پھٹکنے بھی نہ دیتا تھا۔ لیکن ان کی ایک ہی کمزوری تھی وہ تھی ان کی لاڈلی بیٹی روشنی جو کہ علاقے کی یونیورسٹی میں طالبہ تھی وہ اپنی بات منوانے کے گُر جانتی تھی اور مراد خان کی تو اس میں جان اٹکی رہتی تھی۔ آج تک کوئی بھی ایسی بات نہ تھی جو روشنی نے کی ہو اور مراد خان نے پوری نہ کی ہو۔ وہ یہ خیالات رکھتے تھے کہ بیٹی پرایا دھن ہے دوسرے گھر جا کر یہ سسرال والوں کے منہ کی طرف دیکھتی رہے گی اسی وجہ سے انہوں نے روشنی کے جہیز کے لیے ہر وہ چیز تیار کروا کے رکھی ہوئی تھی جو اس کی زندگی میں اہم ترین ضرورت کے طور پر استعمال ہو سکتی ہو۔

دن چڑھنے کے بعد اس علاقہ کے لوگ اپنے اپنے مسائل لے کر مراد خان کے پاس آتے تھے اور ان کے مسائل حل کرنے کے لیے وہ اپنے ذرائع اور اثر و رسوخ استعمال کرتے تھے۔ وہ دو گھنٹے تک کھلی کچہری لگا کر غریبوں کے مسائل سنتے اور ان کا حل بھی کرواتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علاقے میں ان کا نام انتہائی عزت اور احترام سے لیا جاتا تھا۔ مگر اتنی دولت، جاگیر، عزت و احترام کے ہوتے ہوئے بھی ان کو ایک پریشانی اور ایک کسک تھی جو ہر روز اندر ہی اندر ان کو گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی وہ اس کسک اور پریشانی کا ازالہ کرنے کے لیے غریبوں میں گھل مل جاتے اور ان کے مسائل اپنے کسی گناہِ کبیرہ کا کفارہ سمجھ کر حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ ان کی اس دلی

کیفیت سے صرف ان کی بیوہ بہن زبیدہ آپا ہی آگاہ تھیں جو کہ ٹانگوں سے معذور تھیں مگر اپنے بھائی کی خیر خواہ تھیں مگر مراد خان ان کو اپنی پریشانی اور گناہ کی وجہ سمجھتے تھے۔ ان دونوں بہن بھائیوں کا پیار مثالی تھا مگر جو گناہ مراد خان سے سرزد ہوا تھا اس کی ذمہ دار زبیدہ آپا ہی تھیں یہی وجہ تھی کہ مراد خان کوشش کرتے تھے کہ ان کا سامنا صبح صبح زبیدہ آپا سے نہ ہو جائے۔ مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ وہ بھی وہیں چیئر پر بیٹھیں ایک ملازمہ کی مدد سے ادھر ہی آنکلیں۔ مراد خان نے آدھی چائے ہی پی تھی کہ آپا کو دیکھ کر آدھی چائے کپ میں ہی رہنے دی اور اُٹھ کر جانے لگے تو آپا کی گونجدار آواز نے ان کے قدم جکڑ لیے۔

''مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔'' مراد خان رُک گئے تو آپا کا اشارہ پا کر دونوں ملازم وہاں سے چلے گئے۔

''سمندر کے نمکین پانی سے پیاس نہیں بجھائی جاتی مراد خان!'' آپا کا یہی مسئلہ تھا کہ ان کی بات پہیلیوں میں ہوتی تھی مراد خان نہ سمجھتے ہوئے واپس کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے دبنگ لہجے میں بولے۔

''سمندر میں سفر کرنے کے لیے میں نے پیاس بجھانے کا انتظام کر رکھا ہے۔'' وہ کن اکھیوں سے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے پھر بولے۔ ''آپ کہیے کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''صہیب احمد کی شادی کا کیا سوچا ہے تم نے؟''

''اس کی شادی کا وہ خود ہی سوچے گا۔ بلکہ آج کی نوجوان نسل نے سوچا ہی ہوتا ہے۔ آپ اس کی فکر کرنا چھوڑ دیں۔'' وہ روکھے انداز میں بولے۔

''کیسے چھوڑ دوں۔ میں اس کی پھوپھی ہوں۔ اس کا گھر بستا دیکھ کر مجھے خوشی ہوگی۔''

''خوشی......'' مراد خان اس ایک لفظ کو طنزیہ انداز میں ادا کر کے بہن کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ''کیا یہ خوشی بھی ویسی ہوگی۔ جیسی آج سے پچیس تیس سال قبل ہوئی تھی؟''

''مراد خان!'' آپا کی آواز میں رعب و دبدبہ اور لہجہ دبنگ تھا۔ ''مجھے طعنے اور معنے سننے کی عادت نہیں ہے وہ قصوروار تھی۔''

''اگر وہ قصوروار تھی تو پھر آج تک اس کی بددعائیں میرا پیچھا کیوں کر رہی ہیں۔ اس کی سسکیاں اس کی آہیں ایک آرا بن کر میرے دل کو اندر ہی اندر سے کیوں چیرنے آجاتی ہیں؟ اتنی خیرات اور صدقات کے بعد بھی مجھے سکون اور چین کی نیند کیوں نہیں آتی؟ اس بات کا جواب ہے آپ کے پاس تو مجھے بتائیں؟'' مراد خان جیسا دراز قد اور بارعب آدمی روہانسا ہو رہا تھا۔

''سپاں دے پتر مِت نئیں ہوندے۔ بھانویں چلیاں دودھ پلائیے۔'' زبیدہ آپا اپنی بات پر اڑی ہوئی تھیں۔ مراد خان ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے اور آپا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔

''میں نے پڑھا ہے کہ جس نے کسی جانور کو اذیت دی ہو وہ سکون سے نہیں رہ سکتا۔ مگر ہم نے تو ایک انسان پر ظلم و تشدد کی انتہا کر دی تھی۔''

''ہم نے......'' آپا کے لہجے میں کرختگی آ گئی۔ ''ہم نے؟''

''ہاں...... ہاں آپا ہم نے۔ میں نے...... آپ نے اور ابا جی نے۔'' مراد خان کے لہجے کا دُکھ ان کے اندر کی

داستان بیان کرنے لگا تھا۔

''اباجی کا نام مت لو۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔''

''وہ اس دنیا سے کیسے گئے تھے؟ یاد ہے آپ کو... گلیوں بازاروں میں ننگے پاؤں دوڑتے رہتے تھے۔ بچے ان کو پتھر مارتے تو وہ ان بچوں سے پتہ ہے کیا کہتے تھے؟ یاد ہے آپا۔'' مراد خان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ان کی قمیص کو تر کر گئے۔ ''وہ کہا کرتے تھے۔ یہ سزا کم ہے..... مجھے آگ میں جلا دو..... مجھے آگ میں جلا دو..... ڈر لگ رہا ہے مجھے اپنی آخرت سے..... میرے ساتھ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔''

''اس نے گناہ کیا تھا۔'' آپا اپنی بات پر زور دیتی ہوئی بولیں۔

''تو پھر آپ سچی ہوئی ناں؟''

''ہاں..... میں اس وقت بھی سچ کہتی تھی اور آج بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔''

''تو پھر..... تو پھر آپا! اس کی بددعا سے آپ معذور کیوں ہو گئیں؟'' ایک بہت بڑا بم تھا جو مراد خان نے اپنی بڑی بہن کے سر پر پھوڑ دیا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ الفاظ کا ایٹم بم زبیدہ آپا کے وجود کو پہلے چیتھڑوں میں اور پھر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر گیا تھا۔

O.....❖.....O

فواز احمد اور احمد فراز ایک کیفے میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ دونوں کلاس فیلو تھے اور کبھی کبھار اس طرح سرِ راہ مل جاتے یا کافی پینے بیٹھ جاتے تھے۔ احمد فراز کو علم تھا کہ فواز احمد اس ملک کا اچھا مصنف ہے لیکن اس کے شایانِ شان اس سے کام نہ لیا جا رہا تھا۔ وہ اس ملک کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی تک کسی بھی پروڈیوسر ڈائریکٹر یا پھر حکومتی عہدیدار کی اس کے عظیم فن پر نظر نہ پڑی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ کئی کتب لکھنے کے باوجود بھی گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔

''میں تو تمہیں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ تمہارا ایک انٹرویو اپنے چینل پر نشر کروا دیتا ہوں'' احمد فراز نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو وہ ہنسنے لگا اور بولا۔

''اس سے کیا ہوگا؟''

''بیٹا! دنوں میں مشہور ہو جائے گا دنوں میں۔'' وہ چٹکی بجاتا ہوا کہنے لگا تو فواز احمد کی ہنسی چھوٹ گئی

''مجھے نہیں ہونا مشہور..... خود کو ننگا کر کے۔''

''بس یہی تو ایک خامی ہے تم میں..... بات کو سمجھتے نہیں ہو۔'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولا۔

''میری خودداری اگر خامی ہے تو مجھے اس خامی سے پیار ہے بیٹا!'' ترکی بہ ترکی جواب تھا۔

''اچھا ایک بات بتاؤ۔'' احمد فراز اس کے قریب ہوتا ہوا کہنے لگا۔ ''کوئی چکر وکر..... کسی فین سے..... کوئی لو شو.....'' فواز احمد اس کے انداز پر مسکراتا ہوا بولا۔

''جتنے بڑے تم اینکر ہو..... تمہاری سوچ اتنی ہی چھوٹی ہے۔'' فواز احمد کی نظروں میں استفسار دیکھ کر وہ پھر بولا۔ ''تم بھی تو ہزاروں پرستار رکھتے ہو۔''

''بھئی یہ تو کنفرم ہے کہ میں اپنی کسی پرستار سے شادی نہیں کروں گا۔'' احمد فراز دونوں ہاتھ اُٹھاتا ہوا بولا۔
''اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ نظروں میں ضرور کوئی اور ہے؟'' فواز احمد کا انداز بھی شرارتی تھا۔
ایسا پہلی بار نہ ہوا تھا کہ احمد فراز کسی پبلک پیس پر ہو تو اس کے پرستار اس سے آٹوگراف نہ لیں۔ اب بھی ایک نوجوان نے احمد فراز کو دیکھ کر اس کے سامنے ایک چھوٹی سی بک کر دی جس پر پہلے سے ہی کئی شخصیات کے آٹوگراف موجود تھے۔ احمد فراز نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اسی سے پنسل لے کر کاپی پر کچھ لکھنے لگا۔
''کتنا اچھا احساس ہوتا ہے یہ؟'' فواز احمد نے لڑکے کے جانے کے بعد کہا تو احمد فراز مسکرانے لگا۔
''ایسا تبھی ہوتا ہے جب لوگ آپ کو پہچاننے لگیں اور جاننے لگیں کہ یہ شخص اچھا کام کرتا ہے۔''
''اچھا کام......'' وہ حیرت سے بولا تو احمد فراز اس کو لے کر کیفے سے باہر آ گیا۔ بل وہ پہلے ہی ادا کر چکے تھے۔ ''اچھے کام سے مطلب...... یہ کہ اس کا کام پسند کیا جاتا ہے۔''
''اچھا......'' فواز احمد نے لفظ اچھا کو تھوڑا سا لمبا کیا۔ ''میں سمجھا کہ اذان دینا۔ نمازیں پڑھنا وغیرہ۔'' احمد فراز مصنوعی غصے سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
''تم......رائٹر نہیں لگتے۔''
''یہ کیوں کہہ رہے ہو؟''
''میرے بھائی! نمازیں، اذانیں اور نیکی کے کاموں سے تو ویسے ہی لوگ باغی ہو رہے ہیں۔ میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ جو بھی اپنے کام سے مخلص ہے اور ایمانداری سے اپنا کام کر رہا ہے۔ بس معاشرے میں اس کی پہچان ہے۔''
وہ دونوں چلتے چلتے پارکنگ میں احمد فراز کی گاڑی کے پاس پہنچ گئے تو فواز احمد بولا۔
''تو پھر ٹھیک ہے۔ پھر کبھی ملاقات ہو گی۔''
''میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' احمد فراز نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول دیا تھا۔
''نہیں یار! مجھے ابھی کافی کام کرنے ہیں۔ تم کہاں خجل ہوتے رہو گے۔''
''اوکے...... بیسٹ آف لک۔'' احمد فراز نے گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''اپنا خیال رکھنا اور انٹرویو والی بات پر غور ضرور کرنا۔'' اس کی بات سن کر فواز احمد مسکراتا ہوا وہاں سے چل دیا اور احمد فراز بھی گاڑی لے کر دوسری جانب نکل گیا۔ فواز احمد نے محسوس کیا کہ موبائل پر بیل ہو رہی ہے۔ کیونکہ ایک تو وہ سڑک پر کھڑا تھا دوسرا اس نے اپنے موبائل کو وائبریٹ موڈ پر کیا ہوا تھا کیونکہ دونوں ہی دوستوں میں طے تھا کہ وہ کافی یا چائے پینے کے دوران کوئی بھی کال نہیں سنیں گے۔ اگر گھر سے نہ آ گئی ہو تو وہ سنیں گے۔
فواز احمد کو تو گھر سے کال کرنے والا کوئی نہ تھا اور احمد فراز کو ڈاکٹر ارباب کی فیملی ڈسٹرب نہ کرتی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے اپنے پرستاروں سے بچنے اور کافی سے لطف اندوز ہونے کے لیے موبائل یا تو آف کر لیتے تھے یا پھر سائیلنٹ موڈ پر کر لیتے تھے۔ فواز احمد نے نمبر دیکھا تو نیا نمبر تھا۔ اس سے پہلے بھی اس کو کئی چاہنے والوں کے فون آتے رہتے تھے اس نے وہ سب نمبر محفوظ کر رکھے تھے اور جب اس کی کتاب مارکیٹ میں آنے لگتی تو وہ سب کو پیغام کے ذریعے آگاہ کر دیتا تھا۔ اس طرح اس کی کتاب کی اچھی خاصی سیل بھی ہو جاتی تھی اور اس کو قارئین کی رائے کا

بھی پتہ چل جاتا تھا۔
''السلام علیکم!'' اس نے کال ریسیو کی۔
''وعلیکم السلام جناب!'' دوسری طرف ایک مردانہ آواز سنائی دی وہ حیران نہ ہوا تھا کیونکہ ایسی فون کالز وہ اکثر سنتا رہتا تھا۔''فواز احمد بات کر رہے ہیں؟''
''جی.....فواز احمد ہی بول رہا ہوں۔''
''میں زعیم احمد ہوں جناب! اور ایک پبلشنگ ادارہ چلا رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے ادارے کا نام بتایا گیا تو فواز اور حیران رہ گیا کیونکہ وہ تو ایک نامور ادارہ تھا اور اس کے ایڈیٹر کے نام سے بخوبی واقف تھا۔'' کیا آپ کچھ وقت ہمیں بھی دے سکتے ہیں؟'' یہ فواز احمد کی خوش قسمتی تھی وہ فوراً بولا۔
''آپ حکم کریں جناب!''
''بس...... درخواست یہی ہے فواز صاحب! اگر ہمارے ساتھ بھی تعاون کریں تو ہمیں بھی مہربان پائیں گے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا تو وہ ہنسنے لگا۔
''ایسی کوئی بات نہیں زعیم صاحب! شرمندہ نہ کریں۔ میں تو حاضر ہوں۔ آپ حکم کریں۔'' فواز احمد سعادت مندی سے بولا تو زعیم احمد نے اس سے اس کا اگلا ناول پرنٹنگ کے لیے مانگ لیا اور فواز احمد نے ان کو اپنا اگلا ناول دینے کی حامی بھر لی کیونکہ زعیم احمد کا پبلشنگ ادارہ خاصا معتبر نام اور مقام رکھتا تھا اور پھر اس ادارہ کی زیر ادارت کتب شائع ہونے پر اس کو خاصا اچھا معاوضہ بھی مل سکتا تھا۔
اس کو تو آج احمد فراز کے ساتھ چائے پینا راس آ گیا تھا۔

O......❖......O

طیبہ نے قرآنِ کریم کو آنکھوں سے لگایا اور بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ وہ حسبِ معمول تلاوت کلام مجید سے دل و دماغ کو معطر کر چکی تھی۔ اس کی پُرسکون آنکھوں میں چمک اور روشنی تھی وہ کئی کئی گھنٹوں تک قرآن کریم کا مطالعہ کرتی رہتی تھی اس کو بہت سی معلومات جمع کرنے کا جو شوق تھا وہ اس کو قرآن کریم سے پورا کر رہی تھی۔ وہ اپنی کلاس فیلوز سے اگر کسی بھی معاملے پر بحث کرتی تو اس کی دلیلیں باقاعدہ قرآن کریم سے ہی ہوتی تھیں اور وہ ان کو اپنے مدلل جوابات سے خاموش کروا دیتی تھی۔
مگر اس کے اکثر کلاس فیلو اس کی باتوں سے اکثر متنفر ہی نظر آتے تھے وہ کسی کو بھی زیادہ منہ نہ لگاتی تھی کیونکہ وہ ایک پاک باز اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی جس کے من میں قرآن کریم اور اللہ واحد کی محبت بس رہی تھی اور وہ اس محبت سے لطف اندوز بھی ہو رہی تھی اور اپنے ذہن کو پُرسکون بھی محسوس کرتی تھی۔ اس کی دادی دولت بی بی اس کی بہترین تربیت کر رہی تھیں کیونکہ وہ ریبا کی نسبت ان کی بات بھی مانتی تھی اور ان کی عزت بھی کرتی تھی۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا کہ ڈاکٹر ارباب احمد اکیلے ہی لان میں ٹہل رہے ہیں۔ وہ بھی لان میں چلی آئی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ احمد فراز کے ساتھ ورزش نہ کر سکے کیونکہ وہ اپنے بدن کو اچھی طرح ڈھانپ کر رکھتی تھی۔ مگر جب اکٹھے کھانا کھانا پڑتا تو وہ کوشش کرتی کہ وہ اس سائیڈ پر کرسی پر بیٹھے جو احمد فراز کی سائیڈ ہوتا کہ وہ اس کو گردن موڑ کر نہ دیکھ سکے۔

اس کے ساتھ یونیورسٹی جانا اگر بہ امر مجبوری بھی ہوتا تو وہ کوشش کرتی کہ پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھے تا کہ اس کے پہلو میں مگر وہ سمجھدار بھی تھی۔ نوجوان بھی اور خوبصورت بھی تھی وہ احمد فراز کی آنکھوں کا مطلب سمجھتی تھی وہ اس کی باتوں اور اشاروں کو جانتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ احمد فراز کبھی بھی خود سے کوئی ایسی بات نہ کہے گا جو طیبہ سننا چاہتی ہو یا پھر طیبہ پسند کرتی ہو، کیونکہ احمد فراز کی نظروں میں پاکیزگی اور محبت ایمان کی طرح اس کو نظر آتی تھی۔ وہ اپنی کلاس فیلوز کے قصے سن سن کر حیران رہ جاتی تھی اور شکر کرتی تھی کہ کوئی اجنبی اس سے فلمی ہیروز کی طرح آج تک نہ ٹکرایا تھا اور نہ ہی وہ اتنی ''اوچھی'' تھی کہ نظروں کو اِدھر اُدھر گھماتی پھرتی۔

''السلام علیکم ابو!'' اس نے لان میں قدم رکھتے ہی ارباب احمد کو سلام کیا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرا پڑے۔

''وعلیکم السلام! جیتی رہو۔ اچھا ہوا تم آ گئی۔'' وہ اپنا سانس درست کرنے کے لیے رُک گئے تھے۔

''آپ مجھے بلا لیتے۔'' وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

''وہ جو آپ کی امی ہیں نا۔'' ڈاکٹر ارباب احمد لمبی سانس اوپر کھینچتے ہوئے بولنے لگے۔ ''وہ کہہ رہی تھیں آپ چلیں۔ میں آ رہی ہوں۔ بس...... سوگئی ہوں گی پھر۔'' ارباب احمد کا انداز بے بسی لیے ہوئے تھا طیبہ مسکرانے لگی۔

''اوہ...... تو آپ امی کو مس کر رہے تھے۔''

''نہیں یار! میں تو ایک ساتھی کو مس کر رہا تھا۔ تم آ گئی...... بس کافی ہے۔'' وہ آگے آگے اور پھر طیبہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ''یہ احمد فراز بھی اُلوؤں کی طرح رات کو جاگتا رہتا ہے اور دن کو سویا رہتا ہے۔'' وہ پھر بولے تو طیبہ ہنسنے لگی۔ ''ابو! اس کی جاب ہی ایسی ہے۔ وہ کیا کرے؟''

''لیکن صبح کی سیر تو ضروری ہے نا؟'' انہوں نے تصدیق کے لیے طیبہ کی طرف دیکھے بغیر اپنی بات پر زور دیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔ ''یہ تو ہے لیکن اپنی صحت کے لیے نیند بھی تو ضروری ہے نا؟'' طیبہ کا انداز بھی ارباب احمد جیسا ہی تھا۔ تبھی وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

ارباب احمد کرسی پر بیٹھ چکے تھے جبکہ طیبہ ننگے پاؤں سے نرم نرم گھاس کو روندتی ہوئی شبنم کے قطروں کو اس بات کی اجازت دے رہی تھی کہ وہ اس کی تلیوں کو بوسے دے لیں وہ اس کام میں سکون محسوس کر رہی تھی۔ وہ چکر لگاتی ہوئی ارباب احمد کے پاس پہنچی تو وہ بولے۔

''کیسا جا رہا ہے تعلیمی سلسلہ؟''

''بس ٹھیک ہے ابو......''

''کیوں...... بوریت محسوس کر رہی ہو اس شہر میں؟'' ارباب احمد اس کا انداز محسوس کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''نہیں بلکہ انجوائے کر رہی ہوں ابو! لیکن میں چاہتی ہوں کہ...... کچھ پڑھوں۔ کچھ لکھوں کچھ ایسا سیکھوں جو اب تک کسی نے نہ سیکھا ہو۔'' وہ پُر جوش انداز میں بولی تو ارباب احمد ہنستے ہوئے بولے۔

''تو پھر ایسا کرو تم امریکہ چلی جاؤ۔ مزید سٹڈی کے لیے۔''

''ابو......'' وہ حیرانگی سے بولی تو ارباب احمد زور سے ہنسنے لگے۔ ''کافروں کے ملک میں آپ جانے کو کہہ رہے ہیں؟'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی تھی۔ ''توبہ یا اللہ! میں مر جانے کو ترجیح دوں گی بہ نسبت اس کے کہ میں

کافروں کے ملک میں جاؤں اور وہ بھی سٹڈی کے لیے۔ توبہ......'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی ہنس رہی تھی۔

''تو پھر سعودی عرب چلی جاؤ۔'' ارباب احمد نے دیکھا کہ طیبہ کے چہرے سے ہنسی یک دم غائب ہوگئی تھی۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں ارباب احمد کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگیں تو ارباب احمد کو فکر ہوئی وہ اس کو بازو سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولے۔

''طیبہ! بیٹا کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ کرسی سے اُٹھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''بالکل ٹھیک ہوں...... پھر...... بولو...... کیا ہوا؟''

''کیا میں اس قابل ہوں ابو؟'' وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔ ''میں...... اور سعودی عرب...... پاک زمین...... حجاز مقدس...... مقدس سر زمین۔ معطر و با ادب ہوائیں...... پُرنور فضائیں...... پُرنور اندھیرے اور مطہر و معطر سویرے...... ابو......'' وہ ارباب احمد کے سینے سے لگ کر رونے لگی تو وہ حیرانگی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

O......❖......O

امیت چوہان کی پوری فیملی اس پوجا میں شامل تھی۔ یہ پوجا اس کی بیوی کے تندرست ہونے کی منت پر کی جا رہی تھی۔ اپنی آن بان شان دکھانے کے لیے امیت چوہان نے اپنے سب ملنے جلنے والوں کو مدعو کیا ہوا تھا۔ اور سبھی اس کی طرح کروڑوں اور اربوں کے مالک تھے۔ بھگوان کے سامنے ہاتھ جوڑے امیت چوہان اپنی بیوی رادھا دیوی کے صحت یاب ہونے پر تشکر آمیز نگاہوں سے بھگوان کی مورتی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی، انیل شرما، بیٹی سمن اور رادھا کی بھتیجی پری بھی کھڑی تھی۔ ان کے پیچھے باقی سب مہمان وہ راگ الاپ رہے تھے جو کہ پنڈت کے منہ سے جاری تھا وہ اس کی تقلید کر رہے تھے۔ پھر ایک موقع ایسا آیا کہ پنڈت بھگوان کی مورت کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا اس کی تقلید میں سبھی کروڑ ارب پتی اور ان کی فیملیاں بھی سجدہ ریز ہو گئیں۔ مگر ایک چونکا دینے والا واقعہ یہ ہوا کہ انیل شرما ان سب کو دیکھ رہا تھا وہ اکڑوں کھڑا تھا اس کے ہاتھ بھگوان کے سامنے جڑے ہوئے تھے ماتھے پر لگا ہوا تلک بھی اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ خالص ہندو ہے اور بھگوان پر یقین رکھتا ہے لیکن اس نے سب کی طرح بھگوان کو سجدہ نہ کر کے امیت چوہان کے ساتھ ساتھ سب مہمانوں کو بھی حیران کر دیا تھا۔

امیت چوہان اس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''کیا بات ہے؟ یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' امیت چوہان کا لہجہ گو کہ دھیما تھا مگر اس کی آواز دور دور تک مہمانوں کی سماعتوں میں گھس گئی تھیں۔ سبھی ان دونوں کی طرف متوجہ تھے۔

''پتا جی! آپ کو تو معلوم ہی ہے۔'' انیل شرما سعادت مندی سے بولا تھا۔

''بعد میں بات کریں گے۔ ابھی اپنی شکل گم کرو یہاں سے۔'' امیت چوہان غصے کو قابو کرتا ہوا بولا تو انیل شرما وہاں سے سر جھکاتا ہوا مہمانوں کے درمیان سے ہو کر واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں اس نے ان دیکھی ایک خوبصورت لڑکی کے مجسمے تراش تراش کر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور ایک مجسمے کے سامنے کھڑا ہو کر اس کو مسکرا کر دیکھنے لگا۔

''اگر ایک پتھر کی مورتی کو ہی پوجنا ہے تو پھر اس مورت کو کیوں نہیں؟'' وہ اپنے آپ سے سوال کر کے اس مجسمے کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔ وہ کئی لمحوں تک پُرسکون انداز میں سجدہ ریز رہا اور پھر اس نے سجدے سے سر اُٹھایا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔

اس نے میز سے شراب کی بوتل اُٹھائی اور گلاس بھر کر گھونٹ گھونٹ اس کو پینے لگا۔ وہ مجسمے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ شراب کے تیسرے گلاس نے اپنا کام دکھایا تو وہ مجسمے سے لپٹ گیا اور کہنے لگا۔

''میرا اعتماد...... میرا بھروسہ اور میرا یقین...... میرے عشق کی انتہا کو آزما رہے ہیں۔'' اب اس کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ ''تم ضرور آؤ گی۔ بھگوان اپنا درشن ضرور کرواتے ہیں۔ وہ...... وہ سالی پری...... جھوٹ بولتی ہے۔ جھوٹ بولتی ہے کہ تم...... تم...... نہیں...... نہیں...... تم نہیں...... آپ...... ہاں آپ تو...... ہو ہی نہیں۔'' وہ مجسمے کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ گلاس خالی ہو چکا تھا مگر اپنا کام کر گیا تھا۔ وہ مجسمے کے قدموں کو چومتا ہوا کہنے لگا۔

''اگر ہو ہی نہیں...... تو پھر یہ سب ایک جیسے کیوں ہیں؟'' وہ باقی مجسموں کی طرف انگلی کرتا ہوا بولا۔ ''جھوٹ بولتی ہے پری...... چڑیل...... میرا یقین میرے عشق کی ابتداء ہے اور میرا عشق تمہاری پوجا کی انتہا ہو گا۔'' وہ سجدے میں گر گیا اور لڑکھڑاتے الفاظ ادا کرنے لگا۔

مانا کہ خاک نشیں ہوں مگر اتنا یقیں ہے مجھے
ردائے عشق اوڑھ لوں تو یہ گھر بہشتوں جیسا ہے
کافر نہ کہہ سکو گے مجھے سجدہ صنم کو کرنے سے
میری چاہت پیغمبروں جیسی ہے، میرا عشق فرشتوں جیسا ہے

وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر خوبصورت لڑکی کے مجسمے کے قدموں میں گرا ہوا تھا جس کے چہرے پر ایک اسکارف بھی بنا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس لڑکی نے اسکارف سے اپنا حُسن چھپانے کی کوشش کی ہو۔

○......❖......○
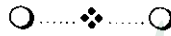
''آپ فکر نہ کریں۔ اس نے ایسے ہی کہہ دیا ہو گا؟'' شمسہ ارباب اور ڈاکٹر ارباب احمد اس وقت گھر سے باہر تھے۔ وہ سمندر کے کنارے کنارے گیلی ریت کو اپنے پاؤں تلے دفن کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے چلتے جا رہے تھے۔

''شمسہ! میں اس کی عجیب سی کنڈیشن دیکھ کر شاکڈ ہو گیا تھا۔'' ارباب احمد طیبہ کی بابت بات کر رہے تھے۔

''وہ اس طرح کانپ رہی تھی گویا سخت سردی لگ رہی ہو؟''

''ڈاکٹر صاحب! میرا تو خیال ہے کہ ہر مسلمان کی یہی کیفیت ہونی چاہیے۔'' شمسہ شوہر کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''حجاز مقدس کا تذکرہ ہو تو بدن پر کپکپی طاری ہونا تو فطری بات ہے نا؟''

ڈاکٹر ارباب احمد دور تک دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ ''ہر مسلمان کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔'' شمسہ مختصر جواب سن کر ارباب احمد کی طرف دیکھ کر بولی۔

''مطلب...... میں سمجھی نہیں؟'' وہ واقعی شوہر کی بات نہ سمجھ پائی تھی کیونکہ وہ دیکھ رہی تھی کہ ارباب احمد کی

پیشانی پر پریشانی کی لکیریں نمایاں تھیں۔
''اس کی سٹڈی کا ٹائم کتنا ہے؟'' شمسہ کی آنکھوں میں استفسار دیکھ کر ارباب احمد نے اپنا سوال تبدیل کر کے دہرایا۔ ''وہ کب تک اپنی سٹڈی مکمل کر لے گی۔''
''ابھی تو اس کی کلاسیں سٹارٹ ہوئی ہیں۔ کم از کم چھ سات ماہ تو مزید لگیں گے۔'' شمسہ نے اپنی معلومات ارباب احمد تک پہنچائیں تو وہ آہستگی سے بڑبڑائے۔ ''یہ تو بہت لمبا وقت ہے۔'' شمسہ حیران تھی کہ ارباب احمد اس کو اتنی دور صرف طیبہ کی کیفیت بتانے کے لیے ہی لائے تھے یا کوئی اور مقصد تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی تھی۔
''ہوسکتا ہے کہ اس کی کیفیت بس یونہی ہوگئی ہو؟'' ارباب احمد خود ہی گویا ہوئے تو شمسہ فوراً بول پڑیں۔
''یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔''
''ایسی کیفیت تب ہوتی ہے جب کوئی نام، کسی کا ذکر، تذکرہ یا پھر خبر سنتے ہی اندرونی نظام میں ہلچل مچ جائے خاص طور پر دل و دماغ کی تاریں آپس میں جڑ جائیں۔''
''میں سمجھی نہیں۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ طیبہ کا دماغ ہل گیا ہے؟''
''نہیں...... اس کو عشق ہوگیا ہے۔'' ڈاکٹر ارباب احمد رُک کر بیگم کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اپنی بات کا اثر بیگم شمسہ ارباب کے چہرے پر دیکھ رہے تھے جہاں بے یقینی کی کیفیت تھی۔ وہ حیرانگی سے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''عشق'' وہ تھوک نگلتی ہوئی بولیں تو ارباب احمد ان کو لے کر ریت پر ہی بیٹھ گئے اور دور سمندر کی لہروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔
''ہر پانچ وقت کا نمازی مسلمان ضرور ہے۔ مگر عاشق نہیں۔ کیونکہ عشق اللہ تعالٰی کی خاص عطا ہے جو ہر بندے کو نہیں ملتی۔ اس کی تقسیم انتہائی منصفانہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی تقسیم میں ڈنڈی نہیں مارتا۔ بڑا بے نیاز ہے۔'' بیگم ڈاکٹر ارباب احمد اپنے شوہر کا یہ نیا روپ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ ارباب احمد اپنا سانس درست کرتے ہوئے پھر کہنے لگے۔
''اگر ایسا ہوگیا شمسہ بیگم تو پریشانی بڑھ جائے گی۔''
''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب!'' شمسہ ارباب واقعی پریشان لگ رہی تھی۔ ''یہ عشق نمازیں اللہ کی عطا...... پلیز ارباب میرے صبر کا امتحان نہ لیں۔ جو کچھ بھی ہے مجھے کھل کر بتائیں۔''
''شمسہ بیگم! میں نے حجاز مقدس کا ذکر مذاق میں ہی کیا تھا مگر یکدم اس کے چہرے کی رنگت زرد ہوگئی۔ وہ کانپنے لگی۔ وہ روتی ہوئی میرے سینے سے لگی تو اس کی دھڑکنیں اتنی تیز تھیں۔ گویا ٹرین یا جہاز کی رفتار ہو۔'' ارباب احمد بھی خاصے پریشان تھے۔
''ہوسکتا ہے آپ کا وہم ہو یا پھر کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہو۔'' شمسہ بیگم ارباب احمد کی بات ماننے پر تیار نہ تھیں۔
''اللہ کرے کہ وہم ہی ہو۔'' ارباب احمد ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولے اور حیران شمسہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر ایک بار پھر گیلی ریت پر چلنے لگے۔ وہ کوئی اور بات نہ کرنا چاہتے تھے یا پھر یہ سوچ رہے تھے کہ وہ اپنا وہم یا غلط فہمی دور کرنے کے لیے مختلف طریقوں سے طیبہ کی کیفیت کو چیک کریں گے۔

O......❖......O

فواز احمد نے موبائل کی طرف دیکھا سکرین پر ایک نمبر جگمگا رہا تھا۔ آنے والی کال کو سننا ضروری تھا لیکن وہ نئے ناول میں اتنا محو تھا کہ اس نے نظر انداز کر کے دوبارہ ناول لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن رات کے ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے اور کال کرنے والا دوبارہ کال کرر ہا تھا۔ چار و نا چار فواز احمد کو کال ریسیو کرنا پڑی۔

''السلام علیکم!'' اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا تو دوسری طرف سے ایک خوبصورت نسوانی آواز نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ ''وعلیکم السلام! کیا آپ فواز احمد بول رہے ہیں؟'' سوالیہ انداز بتا رہا تھا کہ پہلی بار ہی کال کی گئی ہے۔ مگر فواز احمد کو اکثر ہی کالز اور میسج وغیرہ آتے رہتے تھے۔ یہ کوئی حیرانگی کی بات نہ تھی۔ وہ سانس اندر کی جانب کھینچتا ہوا بولا۔

''جی بول رہا ہوں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' دوسری طرف سے خوبصورت اور مہذب انداز اختیار کیا گیا تھا۔

''آپ نے یہ نمبر کہاں سے لیا؟'' فواز احمد نے گھڑی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''آپ کے پبلشر سے۔'' مختصر سے جواب نے فواز احمد کو ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''پھر بھی آپ یقین نہیں کر رہیں میڈم!''

''میں میڈم نہیں ہوں سر!'' وہ شاید ناراض ہو گئی تھی۔

''تو پھر...... آپ کو کیا کہوں؟ میڈم! میرا وقت کافی قیمتی ہے۔'' وہ بوریت محسوس کرنے لگا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ کا وقت کافی قیمتی ہے۔ ڈسٹرب کرنے کی معذرت چاہتی ہوں۔ بس ایک سوال پوچھنا تھا۔'' وہ شاید سمجھ گئی کہ فواز احمد کو اس وقت کال کرنا اچھا نہ لگا ہو۔

''جی پوچھیں۔''

''کیا عشق حقیقی کے لیے عشق مجازی ضروری ہے سر!'' کافی گہرا سوال تھا مگر فواز احمد سمجھ گیا کہ اس نے یہ سوال اس کی ایک کتاب سے ہی نکالا ہے۔ جواب دینا ضروری تھا۔

''جی ہاں...... عشق حقیقی تک پہنچنے کے لیے عشق مجازی ضروری ہے۔''

''مگر کیوں سر؟'' وہ دماغ کھپا رہی تھی یا اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتی تھی۔

''اگر آپ کوئی عمارت بنانا چاہیں تو اس کے لیے زمین یعنی جگہ کی ضرورت ہو گی۔ پھر اس کی بنیادیں، دیواریں، چھت اور پھر دیواریں پھر چھت اور اس طرح اوپر سے اوپر تک آپ تعمیر کر سکتے ہیں۔ مگر سب سے اوپر والی چھت پر جانے کے لیے آپ کو ایک راستہ بھی بنانا پڑتا ہے۔ جو کہ سیڑھیوں کی صورت میں ہوتا ہے اور سیڑھی اس عمارت کی زمین سے ہی شروع ہوتی ہے۔''

فواز احمد نے اپنے تئیں اس لڑکی کو مطمئن کرنا شروع کیا تھا۔ اس نے پھر سے ایک اور سوال کر دیا۔

''زمین کو آپ کس کیٹگری میں فٹ کریں گے سر؟''

''عشق ایک ایسی چھت ہے جس کا کوئی بھی پایا نہیں ہے۔ وہ آسمان کی طرح ہم پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ مگر ہم اس کو ایک چادر کی طرح تب تک نہیں اوڑھ سکتے جب تک ہم اپنا وجود اس چادر کے برابر نہیں کر لیتے۔ یعنی سب

سے پہلے پیار، محبت اور پھر عشق۔ یہ سب عشق مجازی کی سیڑھیاں ہیں مگر سب سے اوپر والی چھت پر پہنچنے کے لیے ہمیں عشق کو ہر قسم کی ہوس، حرص، لالچ اور حسد سے پاک رکھنا ہو گا۔ تاکہ عشق عبادت کا درجہ پا سکے اور جب عشق عبادت لگنے لگے تو سمجھو تم سب سے اوپر والی چھت پر پہنچنے کی حقدار بن گئے ہو۔ مگر نگاہوں کو باوضو کر کے دل و دماغ کو معطر کر کے روح کو مطہر و پاک کر کے تب اوپر کی جانب دیکھنا ورنہ سب کچھ رائیگاں تو ہو گا ہی، اس کے ساتھ ساتھ تم عرش سے فرش تک اس طرح گرو گے کہ گلیوں کے خس و خاشاک بھی تم سے برتر ہوں گے اور یاد رکھو۔ عشق کے دھتکارے ہوئے کو کسی بھی دَر پر پناہ نہیں ملتی اور کوئی بھی اس کا پُرسان حال نہیں ہوتا۔''

فواز احمد کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ دوسری طرف سے ٹھنڈی آہ بھرنے کی آواز سنائی دی تو وہ پھر بولی۔ ''سر! کیا آپ مجھے لکھنا سکھا سکتے ہیں؟''

''میری فیس بہت ہے۔'' فواز احمد مسکراتا ہوا کہنے لگا۔

''کیا میری جان سے بھی زیادہ فیس ہو گی آپ کی؟'' دوسری طرف سے عجیب سا جواب سن کر وہ حیرانگی سے بولا۔ ''میں سمجھا نہیں؟ ویسے بھی میں نے مذاق کیا تھا۔ ایسی باتیں سیکھنے سے نہیں آتیں بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے میڈم!''

''آپ صرف یہ بتائیں کیا آپ مجھے کتاب لکھنا سکھا سکتے ہیں سر! مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے سر! پلیز.....'' وہ تو دماغ خراب کر رہی تھی اب اس سے جان چھڑانا ضروری تھا۔ مگر وہ پھر بولی۔ ''میں آپ کو ایک لاکھ روپیہ فی مہینہ دوں گی سر!'' فواز احمد نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔

''میڈم! اتنا معاوضہ تو مجھے میرے پبلشر بھی نہیں دیتے جنہیں میں اپنی مرضی سے لکھ کر دیتا ہوں۔''

''ان کو آپ کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے سر! آپ تو وہ ہیرا ہیں جس کو ایک جوہری کی تلاش ہے۔'' وہ محبت سے بولی تو فواز احمد پھر ہنسنے لگا۔

''تو آپ جوہری ہیں؟''

''نہیں..... میں آپ کی پرستار ہوں سر! مجھ میں اتنی جرأت نہیں کہ آپ کی قیمت لگا سکوں۔''

''آئی ایم سوری میڈم! یہ کام سیکھنے سے نہیں آتا۔ یہ قدرتی امر ہوتا ہے اور اللہ کی عطا ہوتی ہے۔'' فواز احمد نے جان چھڑانے والے لہجے میں کہا تو وہ مسکراتی ہوئی بولی۔

''آپ یہ نمبر محفوظ کر لیں سر! اور میری پیشکش پر ضرور غور کریں۔ کیونکہ مجھے.....آپ کی ضرورت ہے۔'' رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ مگر آخری فقرہ کیا تھا فواز احمد موبائل کی طرف دیکھ رہا تھا جس میں سے یہ فقرہ نکلا تھا۔ ''مجھے آپ کی ضرورت ہے۔'' کچھ دیر بعد اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور ''ٹائم پاس'' سمجھ کر دوبارہ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

ایک گھنٹہ تک لکھنے کے بعد اس نے ٹی وی آن کیا تو اس پر احمد فراز کا شو چل رہا تھا جو کہ رات کے اس پہر میں دوبارہ ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ وہ احمد فراز کے انداز پر قربان ہو رہا تھا۔ وہ ایک سینئر سیاستدان کو بہت ٹف ٹائم دے رہا تھا۔ فواز احمد اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا تھا۔ اسے اس بات پر فخر تھا کہ احمد فراز اس کا بہترین دوست ہے۔

موبائل پر پیغام کی ٹون دیکھ کہ وہ جواب دیکھنے لگا۔ یہ بھی اس کا کوئی پرستار تھا جو اس کی کتاب پڑھ رہا تھا وہ

اس کی تعریفیں کر رہا تھا اور فواز احمد عاجزی سے اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس نے پہلی کال والا نمبر بھی محفوظ کر لیا تھا۔ وہ خوشامد پسند نہ تھا اور نہ ہی خوابوں کی دنیا کا گرویدہ تھا۔ اس نے ایک پرستار لڑکی کے طور پر وہ نمبر محفوظ کر لیا تھا۔ لیکن پندرہ دن گزر جانے کے بعد بھی وہ روشنی کے ساتھ کیا جانے والا سفر نہ بھولا تھا۔

روشنی اس کی وہ ہمسفر تھی جو اجنبی مانوس کی طرح اس کے دل و دماغ میں رچ بس گئی تھی۔ وہ اس کی باتیں یاد کر کے حظ اُٹھایا کرتا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ کبھی روشنی بھی اس کو کال کرے۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ اضطراب یہ بے چینی کیوں تھی اور ابھی ابھی جو ایک لاکھ روپے ماہانہ کی آفر ہوئی تھی وہ بھی پُرکشش تھی مگر یہ کام سکھانے سے تو نہیں آتا تھا یہ تو اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ چیزیں ہیں جو تحفہ کی صورت میں اس نے اپنے بندوں میں بانٹی ہوئی تھیں۔ ''اگر روشنی کہے کہ مجھے لکھنا سکھا دو؟'' وہ خود ہی بڑبڑایا تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ گھڑی نے ایک بجنے کا الارم بجایا وہ چونک گیا اور مسکرانے لگا۔ ''بھلا روشنی کیوں ایسا کہے گی۔ وہ تو شاندار گاڑی میں بیٹھ کر گئی تھی۔ وہ تو کافی امیر تھی۔'' یہ اس کی سوچیں تھیں جو کبھی منتشر ہوتیں اور کبھی یکجا ہو کر روشنی پر ہی آ کر ٹھہر جاتی تھیں۔

وہ سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔ کبھی کروٹ بدل کر کمرے کی دیوار کو گھورنے لگتا اور کبھی سیدھا لیٹ کر چھت کو گھورنے لگتا۔ موبائل کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو اس نے دیکھا وہی لڑکی کا نمبر تھا جو اس نے کچھ دیر پہلے محفوظ کیا تھا۔ کال ریسیو کی ''ہیلو۔''

''تو پھر کیا سوچا آپ نے سر!'' دوسری طرف سے لڑکی کی مترنم آواز سنائی دی۔ اس کا سوال اپنی جگہ پر ہی ٹکا ہوا تھا۔ فواز احمد نے سوچا کہ نیند تو آتی نہیں۔ چلو اس سے بات کر کے ہی ٹائم گزارتے ہیں۔

''یہ کام سیکھنے سے نہیں آتا میڈم!'' وہ بولا تو دوسری طرف سے کھنکتی ہوئی ہنسی یوں لگی تھی کہ کوئی جھرنا کافی بلندی سے نیچے گر رہا ہو۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آپ نے میرا نمبر محفوظ کر لیا ہے؟''

''جی کر تو لیا ہے لیکن نام کوئی نہیں لکھا۔ کیونکہ آپ نے نام بتایا ہی نہیں۔'' فواز احمد بیڈ پر لیٹا تھا اور اب وہ خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ اسے پہلے نیند نہ آ رہی تھی اور اسی وجہ سے وہ بے چینی اور بے قراری محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ اجنبی لڑکی سے باتیں کر کے خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگا تھا۔

''نام بھی بتا دوں گی پہلے آپ میری باتوں کا جواب دیں۔'' وہ بھی کافی کایاں لگتی تھی۔

''دیکھیں رات کے اس پہر آپ مجھے تنگ کر رہی ہیں۔ لیکن میرا اور آپ کا یہی رشتہ ہے کہ آپ جیسے لوگ میری تحاریر کو اپنی محبتوں سے نوازتے ہیں اور مجھ جیسے اچھا لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''تو پھر یہ رشتہ تو محبتوں کا رشتہ ہوا نا؟'' اس کے بے باک جواب پر فواز احمد بھی لاجواب ہو جاتا اگر وہ لفظوں کا کھلاڑی نہ ہوتا۔ وہ جب قلم اور کاغذ لے کر بیٹھتا تو الفاظ اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کیا کرتے تھے اور وہ ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا تھا۔ اب بھی اس کی بات کا جواب دینا تو ضروری تھا۔

''بے شک یہ محبتوں کا رشتہ ہے۔ مگر میڈم! یہ تو سوچیے یہ کافی نازک رشتہ ہوتا ہے۔''

''آپ حامی تو بھریں سر جی! نبھانا میرا کام ہے۔'' وہ ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

''اوکے...... پوچھیے کیا پوچھنا ہے آپ کو؟'' فواز احمد نے گویا خود کو سرینڈر کر دیا تھا۔

''آپ کیسے لکھتے ہیں؟'' پہلا سوال ہی دلچسپی سے بھرا ہوا تھا۔ ایک لمحہ تو فواز احمد نے سوچا کہ اسے کہہ دوں۔ ''کاغذ اور قلم لے کر لکھتا ہوں۔'' لیکن اس کی پرسنالٹی اور جو منصب تھا وہ اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا کہ وہ رات کے اس پہر اپنی ایک پرستار سے اس طرح کی بات کرے۔

''بس یہ مجھ پر اللہ کا کرم ہے۔ جب میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو الفاظ مجھ سے اور میں ان سے کھیلتا ہوں۔''

''سر! میں نے آپ کی سبھی کتب پڑھی ہیں۔ آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ کیا میں بھی ایسا لکھ سکتی ہوں؟''

''دیکھیں میڈم! آپ یقیناً مجھ سے بھی اچھا لکھ سکتی ہیں۔ بس ارادہ اور تھوڑا سا علم ہونا چاہیے۔'' فواز احمد اسے مطمئن کر رہا تھا۔

''کیا آپ شادی شدہ ہیں؟'' یہ سوال اس انداز میں پوچھا گیا تھا کہ ان الفاظ میں تجسس نمایاں تھا۔

''جی نہیں۔''

''گڈ......'' اس طرف سے کہا گیا تو فواز احمد حیرانگی سے بول پڑا۔

''جی؟''

''میرا مطلب ہے کہ اگر آپ مجھے ناول لکھنا سکھا دیں اور آپ کو میرے شہر آنا پڑے تو پیچھے کوئی پرابلم تو نہیں ہوگی؟'' وہ بات کو سنبھال گئی تھی یا پھر بدل گئی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' فواز احمد نے سوچا کہ اب اس نے بھی چند سوال پوچھ ہی لیے جائیں۔ ''آپ ناول کیوں لکھنا چاہتی ہیں؟'' اس نے جواب دینے کی بجائے فواز احمد سے ہی اُلٹا سوال کر دیا۔

''آپ کیوں لکھتے ہیں؟''

''اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم عطا کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ دوسروں تک بھی پہنچے اور دوسرے لوگ بھی اس سے استفادہ کریں۔'' فواز احمد کے جواب سے وہ مطمئن ہوگئی تھی تبھی تو وہ بولی۔

''میں نے آپ کی کتب سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ سر! اب میں بھی چاہتی ہوں کہ کچھ نہ کچھ لکھوں۔''

''آپ نے مجھے ہی کیوں چنا اس کام کے لیے۔'' فواز احمد شک سے بھرے لہجے میں بولا۔ ''مجھ سے بہتر اور سینئر لکھنے والے بھی ہیں۔ آپ ان سے کوئی رہنمائی لے لیں۔''

''ان سب کو میں نے دیکھا ہے۔'' وہ بولی۔ ''ان میں سے کوئی تو شادی شدہ ہے۔ اپنی فیملی کو چھوڑ کر نہیں آ سکتا۔ اگر کوئی آ سکتا ہے تو وہ بوڑھا ہے۔ مجھے بوڑھے ٹیچرز پسند ضرور ہیں مگر ان سے سیکھنا پسند نہیں۔'' اس کی صاف گوئی پر فواز احمد حیران تھا۔

''لیکن آپ نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں ہے۔ نہ ہی میری کوئی تصویر دیکھی ہے آپ نے؟'' فواز احمد کا جواب دلچسپ بھی تھا اور بھرپور بھی تھا۔

''آپ پہلے وعدہ کریں کہ مجھے ناول سکھانے کے لیے آئیں گے نا؟'' اس کے لہجے میں لجاجت اور منت تھی۔

''میں آپ کو آپ کے قیمتی وقت کا معاوضہ تو نہیں دے سکتی مگر آپ کی عزت افزائی کرنے کی بھرپور کوشش کروں گی۔''

''اگر میں وعدہ کروں کہ میں آپ کو لکھنا سکھا سکتا ہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' فواز احمد اب جان چھڑا کر پُرسکون نیند سونا چاہتا تھا۔

''آپ کو میرے گھر آنا ہوگا سر!'' وہ پُر جوش انداز میں بولی تھی۔ ''آپ کو گاڑی لے آئے گی آپ کو اتنا عرصہ ادھر ہی رہنا ہوگا میرے گھر میں۔ آپ کی خدمت میں اچھا خاصا معاوضہ بھی پیش ہوگا۔ آپ کا تمام خرچہ اور ہر ضرورت میری ذمہ داری ہوگی۔ پلیز سر! آپ آئیں گے نا؟''

''اچھا اب آپ بتائیں کہ آپ نے مجھے کہاں دیکھا؟'' فواز احمد اس سے یہ بات پوچھ کر جان چھڑانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ ان تمام ضروریات کا عادی نہ تھا اور نہ ہی اس کو ان کی طلب تھی۔

''آپ وعدہ کریں پہلے کہ مجھے سکھانے کے لیے ضرور آئیں گے۔''

''وعدہ کرتا ہوں کہ ضرور آؤں گا۔'' فواز احمد اب اُکتا گیا تھا۔

''میں روشنی ہوں سر! آپ کے ساتھ ایک مختصر سفر کرنے کا اعزاز ہے میرے پاس۔''

دوسری طرف سے روشنی تھی۔ وہی روشنی جس کی باتیں دہرا دہرا کر وہ حظ اُٹھایا کرتا تھا۔ وہ چونک کر بیڈ سے نیچے اُتر آیا۔ وہ بار بار موبائل کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کہ اسے بالکل بھی یقین نہ آ رہا ہو کہ انگریز کی یہ ایجاد سچی ہے یا کہ بالکل جھوٹی ہے۔ دوسری طرف سے اس کے شوق اور تجسس کی آگ کو ہوا دے کر کال منقطع ہوگئی تھی۔ وہ خود بھی روشنی کو کال کرسکتا تھا مگر یہ معیوب لگتا تھا۔ وہ ہونق بن کر کھڑا تھا۔

وہ چند گھنٹے پہلے سوچ رہا تھا کہ اگر روشنی اس سے ناول لکھنے کا کہے گی تو وہ حامی بھر لے گا اور اسے سکھائے گا۔ کاش کہ روشنی اسے کال کرے۔ یہ اس کی خواہش تھی۔ مگر روشنی اسے کال کرکے کافی دیر باتیں کرتی رہی تھی وہ اسے پہچان نہ پایا تھا۔ یقیناً وہ کافی شرارتی اور چالاک تھی۔

مگر ان خوبیوں کے علاوہ اس کی دل کو بھا جانے والی ادائیں۔ اس کی خوبصورتی۔ اس کا حسین چہرہ اور پیارے لہجے کی شیرینی سے بھری باتیں۔ فواز احمد کا دل تو گھائل ہو چکا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹ کر وہ لمحات یاد کرنے لگا جب روشنی اس کے کندھے پر سر رکھے پُرسکون نیند کے مزے لے رہی تھی۔

''میں آؤں گا روشنی...... تمہیں سکھانے کے لیے نہیں...... صرف ایک جذبے کے تحت...... محبت کے لیے۔''

○......❖......○

''وہ کیا ڈرامہ تھا؟'' امیت چوہان انیل شرما کی اس دن والی حرکت پر سخت نالاں تھا اور وہ اپنا غصہ نکالنے کے لیے آج انیل شرما کے کمرے میں آیا تھا۔ ''کیسا ڈرامہ پتا جی!'' انیل شرما گو کہ جانتا تھا مگر پھر بھی انجان بنتا ہوا بولا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کس دن کی کون سی بات کر رہے ہیں۔'' امیت چوہان سخت غصے میں تھا۔

''پتھروں کو مت پوجو یہی رو رہا ہے کوئی
کہ اسی زعم میں خدا ہو رہا ہے کوئی''

انیل شرما نے ایک زبردست چوٹ کی تھی جو امیت چوہان کے غصے کی چنگاری کو مزید بھڑکاتی ہوئی آگ دکھا گئی تھی۔

''انیل شرما! یہ مت بھولو کہ بھگوان کو باتوں سے بہکایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی اس کی پوجا سے نظریں چرائی جا سکتی ہیں۔'' وہ کمرے میں دیکھتا ہوا آگے بڑھا اور لڑکی کے مجسمے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ جس نے چہرے پر اسکارف اوڑھ رکھا تھا اور مجسمہ خود میں حُسن کا نایاب شاہکار نظر آ رہا تھا۔

''اوہ......'' وہ واپس انیل شرما کی طرف مڑا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تو تم نے اپنی پرستش کے لیے اپنے ہی خدا تراش رکھے ہیں اور آج کل ان کی پوجا پرستش ہو رہی ہے۔''

انیل شرما مسکراتا ہوا دھیمے انداز میں جواب دینے لگا۔

''یہ میرے خدا نہیں ہیں۔ بلکہ سب مجسمے ایک ہی پری پیکر کے ہیں پتا جی! ان سب کی شکل وصورت اور جسامت میں رتی برابر بھی فرق نہیں ہے۔'' امیت چوہان غصے میں لال پیلا ہونے کی بجائے مجسموں کو غور اور حیرت سے دیکھنے لگا۔ واقعی سبھی مجسمے ایک ہی چہرہ لیے ہوئے تھے اور ان میں سے کسی میں بھی رتی برابر فرق نظر نہ آ رہا تھا۔ یہ کاریگر کی مہارت، محنت اور محبت کا انمول ثبوت تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا بولا۔

''دیوی اور بھگوان کی مورتیاں بنانا اچھی بات ہے اگر تم جیسا کاریگر یہ کام کرے تو اور بھی اچھی بات ہے۔'' وہ انیل شرما کی جانب دیکھتا ہوا پھر کہنے لگا۔ ''تم اتنی محبت سے ان مجسموں کو تراش کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

''سجدہ اگر پتھر کو ہی کرنا ہے تو پھر اس پتھر کو کیوں نہ کروں جسے میں نے خوابوں میں دیکھا ہے۔ دل کے مندر میں دیوی بنا کر اس کی پوجا کی ہے۔ راتوں کو جاگ جاگ کر اس کے خدوخال کو محبت بھرے بوسے دیئے ہیں۔ آنکھوں نے دنیا سے بغاوت کر کے دل کی بات مان کر اسے سجدے کیے ہیں۔ بس پتا جی! یہی میرا بھگوان ہے۔''

''انیل شرما!'' امیت چوہان غصے سے لال پیلا ہوتا ہوا حلق کے بل دھاڑا۔ ''یہ سب کتابی اور فلمی باتیں ہیں اور میں ہندوستان کا امیر ترین باشعور شہری ہوں ان ڈھکوسلوں کو نہیں مانتا۔''

''یہ ایک دن ضرور آئے گی پتا جی! آپ بھی دیکھیں گے۔ سب دیکھیں گے۔ پھر پورا ہندوستان دیکھے گا کہ انیل شرما کی محبت عشق بنی اور عشق نے عبادت کا درجہ پالیا۔'' وہ باغی انداز میں بولا۔

''اگر تم میرے بیٹے نہ ہوتے تو آج اور ابھی میں مینٹل ہاسپٹل بھجوا دیتا۔'' امیت چوہان کا غصہ عروج پر جا چکا تھا۔ مگر انیل شرما ہنسنے لگا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں ابھی بھی نارمل ہوں؟''

''شٹ اپ!'' امیت چوہان غصے سے پھنکارتا ہوا اس کے کمرے سے نکل گیا لیکن انیل شرما کے زوردار اور جاندار قہقہے نے اس کا تعاقب ضرور کیا تھا۔

وہ چلتا ہوا اس مجسمے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے مجسمے کی آنکھوں پر اپنی انگلی پھیر کر اس کو صاف کیا پھر ہونٹوں پر انگلی پھیرنے لگا۔ اس نے اسکارف پر اپنا ہاتھ پھیرا اور اسے جھاڑنے والے انداز میں صاف کرنے لگا۔

''یہ لوگ شعور نہیں رکھتے۔'' وہ اس مجسمے سے باتیں کرنے لگا۔ ''انہیں معلوم نہیں کہ عشق کیا ہے؟ یہ تو بس یہی سمجھتے ہیں کہ بھگوان کو بنایا اسے رنگ پھیرا۔ اس کو مندر میں یا طاق میں رکھا اور پوجا شروع کر دی۔ چچ...... چچ......

کتنا دکھاوہ ہے ان کی پوجا میں۔ مگر تم تو جانتی ہو کہ میں ایسا نہیں کرتا۔ میں نے تمہیں تراشا ہے۔ سوچا ہے۔ چاہا ہے۔ پوجا ہے۔ پیار سے۔ محبت سے۔ خلوص سے اور عشق سے۔ دل کی انتہا گہرائیوں سے۔ آنکھوں کو آنسوؤں کے وضو سے پاک کیا ہے۔ ہوس، حرص سے پاک ہو کر تمہاری پوجا کی ہے اور میری پوجا کا ایمان ہے کہ بھگوان ایک نہ ایک دن ضرور ملتا ہے۔ تم بھی ضرور ملو گی مجھے۔ ضرور...... ضرور...... کیونکہ یہ میرے عشق کی سچائی ہے اور سچ اپنا آپ ضرور دکھاتا ہے۔'' اس کی محویت نہ ٹوٹتی اگر پری کے ہاتھوں کا شور تالیوں کی صورت میں نہ گونجتا۔ وہ مخمور انداز میں واپس گھوما تو پری کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکان رینگتی دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگا۔

''تمہیں تو ایک اچھا پالیٹیشن ہونا چاہیے تھا انیل شرما۔'' پری اس کے پاس آ گئی۔

''کیوں؟ تمہیں اچھا نہیں لگتا کہ میں شریف آدمی ہوں؟'' وہ پری سے باتیں کر کے مجسمے کے متعلق اس کی وہ باتیں سننا چاہتا تھا جو وہ دل میں کدورت کے طور پر رکھتی تھی۔

''شریف آدمی!'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''کیا یہی شرافت ہے کہ تم مجسموں سے دل بہلاؤ۔ ان پر ہاتھ اور لفظوں کے ایسے نشتر چلاؤ کہ مجسمہ بھی شرم سے پانی پانی ہو جائے۔''

وہ یہ الفاظ سن کر زوردار قہقہہ لگاتا ہوا پری کو دیکھنے لگا اور بولا۔

''یہ میرا بھگوان ہے۔ میں اس کو سجدہ کرتا ہوں۔ اس کی پوجا کرتا ہوں۔ دل و جان سے عشق کرتا ہوں۔ اس فعل میں تمہیں میری محبت کی خوشبو اور عبادت کی جھلک نظر آئے گی۔''

''ان پتھروں سے خود کو بہلانے کی بجائے زندہ انسانوں سے پیار کرو انیل جو تمہاری ذہنی اور دلی تسکین کا بھی باعث ہوگا۔'' اس نے الفاظ کے پیرہن میں اپنا آپ انیل شرما کو سونپنے کا عندیہ دیا تو وہ ہنسنے لگا۔

''میں عاشق ہوں جان من!'' انیل شرما نے اس کے بالوں کی لٹ کو انگلی سے ہٹایا اور اس کے چہرے پر پھونک مارتا ہوا بولا۔ ''ہوس کا پجاری نہیں ہوں۔ جب میرا ایمان لرزنے لگا۔ جب میرا اعتماد میرے اپنے ہی عشق سے اٹھ گیا تب تم میرے پاس آنا پری! مجھے دلاسہ دینے کے لیے۔ مجھے بہلانے کے لیے۔ میرے دل اور روح کی تسکین کے لیے۔ ابھی نہیں پری! ابھی نہیں۔''

وہ یہ الفاظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور پری اس کی انگلی کا لمس اپنے بالوں کی لٹوں پر محسوس کر کے حظ اُٹھاتی ہوئی بولی۔ ''میں بھی دیکھتی ہوں انیل شرما! کہ تم ایک پتھر کی پوجا کس طرح کرتے ہو اور پتھر بھی وہ کہ جسے تم نے خود تراشا ہے۔ جس کا کوئی نام و نشان یا وجود نہیں ہے۔''

○......❖......○

''بھائی! آپ بابا جان سے کہیں نا۔'' روشنی نے صہیب احمد کی منت کی تو وہ ہنسنے لگا اور چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے بہن کی طرف دیکھا۔ ''تم خود کیوں نہیں کہہ لیتیں؟''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' وہ خوفزدہ ہوتی ہوئی بولی۔

''کس سے بابا جان سے؟'' صہیب احمد حیرانگی سے بولا۔ ''آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا روشنی صاحبہ!''

''بھائی! بابا جان سے نہیں ان کی ناراضگی سے ڈر لگتا ہے۔ کیا وہ یہ برداشت کریں گے کہ کوئی اجنبی ان کی فیملی

کا حصہ بن کر ان کے ساتھ ہی رہے۔'' صہیب احمد اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''تم کون سا کام کرنا چاہتی ہو؟ ذرا مجھے کھل کر بتاؤ۔'' وہ چائے پی چکا تھا۔

''میں ناول لکھنا سیکھنا چاہتی ہوں۔بس......'' وہ خوشی سے بولی۔

''بس......''

''ہاں بھائی! آپ بات کریں نا بابا جان سے۔'' وہ لجاجت سے بولی تھی۔

''وہ تو تمہاری شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں اور تم بچوں کی طرح کتابیں لکھنا سیکھنا چاہتی ہو۔'' صہیب احمد کا انداز اس کو چڑانے والا تھا۔

''بھائی! مجھے پتہ ہے کہ آپ مجھے تنگ کر رہے ہیں۔اگر میں اپنی ضد پر آ گئی نا۔تو پھر سارا گھر بھی میری منتیں کرتا پھرے گا اور مجھے منا نہیں سکے گا۔'' وہ ضدی اور خودسر تھی مگر سب کی لاڈلی بھی تھی۔یہی وجہ تھی کہ اس کی ہر بات مانی جاتی تھی اور ہر فریاد سنی جاتی تھی اور اس پر فوری عمل درآمد بھی ہو جاتا تھا۔

''ویسے یہ بیوقوفانہ خیال تمہارے دل میں کیسے آیا کہ ناول لکھنا چاہیے۔'' صہیب ابھی تک سنجیدہ نہ تھا۔

''بھائی! یہ بیوقوفانہ خیال نہیں ہے۔ بلکہ ہم ناولوں سے، اچھی کتب سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔یعنی کہ آج معاشرے میں سر اُٹھا کر بات کر سکتے ہیں۔''

''گڈ...... بابا آ رہے ہیں میں بات کرتا ہوں۔'' صہیب احمد نے دیکھا کہ مراد خان اپنے جاہ و جلال کے ساتھ ان کی طرف ہی چلے آ رہے تھے۔وہ دونوں احتراماً اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''السلام علیکم بابا جان!'' وہ مراد خان کے پاس پہنچنے پر یک زبان بولے۔

''وعلیکم السلام! کیسے ہو بھئی تم دونوں؟'' وہ خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہے تھے۔وہ تینوں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو مراد خان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔''کیا خیال ہے تمہاری شادی نہ کر دی جائے؟'' آخری فقرہ انہوں نے صہیب احمد سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔وہ ہنسنے لگا جبکہ روشنی نے ''ہُرّے'' کا نعرہ لگایا۔وہ کھسیانا ہوا مراد خان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''بابا جان! کیا بات ہے؟ آپ کو میری آزادی اچھی نہیں لگتی۔''

مراد خان ہنستے ہوئے بولے۔''یار بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری ماں کے پاس تو ٹائم ہی نہیں ہے کہ وہ ایسی باتیں تم سے کرے۔وہ اپنی این جی اوز اور پتہ نہیں کن کن بکھیڑوں میں مصروف رہتی ہے۔''

''لیکن بابا جان! اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ مجھے قید کر دیں۔'' خوشگوار اور پُرسکون ماحول میں بااخلاق گفتگو کرنے والے باپ، بیٹا اور بیٹی تھے۔

''تم سمجھ نہیں رہے ہو صہیب! میں چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی کی عمر نہ نکل جائے۔تمہاری ماں کی الابلا کی مصروفیات ہیں۔اور پھر تم مجھے کوستے رہو کہ بابا جان آپ نے بھی میرے دل کا حال نہ جانا؟'' تینوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔یہ مراد خان کی اچھی عادت تھی وہ بچوں کو دوستوں کی طرح ہی رکھتے تھے اور پھر یہ دو بچے ہی تو ان کی کائنات تھے۔ان کی عظیم تر جاگیر و جائیداد کے اکیلے وارث تھے۔

''بابا! میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔'' روشنی اُٹھ کر ہمیشہ کی طرح مراد خان کے پیچھے آ کر اس کی گردن میں بازو ڈالتی ہوئی بولی تو مراد خان مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر بولے۔

''یقیناً کوئی مشکل ترین بات ہوگی؟'' صہیب احمد نے روشنی کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ بات شروع کرے۔ صہیب احمد نے نفی میں سر ہلایا تو مراد خان دونوں کی حرکات سے محظوظ ہوتے ہوئے بولے۔ ''میں جاؤں یا...... بات کرنی ہے؟''

''نہیں...... نہیں بابا جان!'' روشنی فوراً بولی۔ ''بابا جان میں کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' مراد خان نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر دوبارہ گھمانے والے انداز میں اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''اچھے کام کے لیے میری اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ بسم اللہ کرو۔''

''لیکن مجھے لکھنا نہیں آتا۔'' روشنی کی معصومیت سے کہی گئی بات پر مراد خان قہقہہ لگاتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولے۔ ''گاؤں بسا نہیں اور اُچکے آ بھی گئے۔'' صہیب احمد تو ہنسنے لگا مگر روشنی حیرت سے بولی۔

''یہ کیا مثال ہے بابا جان!''

''لکھنا نہیں آتا تو کیسے لکھو گی؟'' وہ پیار سے بولے۔

''میں لکھنا سیکھنا چاہتی ہوں بابا جان!'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ انسان کو ہر دم کچھ نہ کچھ سیکھتے رہنا چاہیے۔''

''بابا جان! اس ملک کا ایک مصنف ہے روشنی اس کی کتابیں پڑھتی ہے اور اسی کو اپنا استاد بنانا چاہتی ہے۔'' صہیب احمد نے اس کی وکالت کی تو وہ خوش ہوگئی۔

''لیکن کیسے ممکن ہے۔ کیا وہ ہمارے شہر میں ہی رہتا ہے؟'' مراد خان کچھ سنجیدگی سے بولے۔

''نہیں بابا جان! وہ اسلام آباد میں رہتا ہے اور روشنی کا خیال ہے کہ وہ اس کو اِدھر آ کر سکھا سکتا ہے۔'' صہیب احمد پھر بہن کی وکالت کرتا ہوا بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ یہاں ہی رہے گا؟'' مراد خان اب خاصے سنجیدہ ہوگئے تھے۔

''ہاں بابا جان دو تین ماہ کی تو بات ہے۔'' روشنی چہکتی ہوئی بولی۔

''ہم اسے علیحدہ کمرہ دے دیں گے بابا جان!'' صہیب احمد نے کہا۔

''کیا یہ مناسب رہے گا تمہاری نظر میں۔'' مراد خان شاکی لگ رہے تھے۔

''بابا جان! یہ روشنی کا شوق بھی ہے اور اس کا دل بھی لگا رہے گا۔'' صہیب احمد نے مراد خان کو قائل کرنے والے لہجے میں کہا تو مراد خان نے اُٹھ کر روشنی کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور کہا۔

''میرا اعتماد اور عزت کا بھرم ہی میری زندگی ہے بچے!'' روشنی نے کرب سے مراد خان کی طرف دیکھا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس میرے وقار کو قائم رکھنا۔ اس خاندان کی عزت تم دونوں بچے ہی ہو۔'' مراد خان چلے گئے تو صہیب احمد روشنی سے بولا۔

''بابا جان کا لہجہ کافی دُکھ بھرا تھا۔''

''ایسا کیوں ہے بھائی؟'' روشنی جہاں اجازت ملنے پر خوش تھی وہاں اس نے بھی محسوس کیا تھا کہ خوشگوار یت کس طرح اُداسی میں بدل گئی تھی۔

''میں معلوم کرلوں گا۔ اب مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ تم بلالو اس کو۔'' صہیب احمد جلدی میں تھا۔

''کس کو بھائی؟'' روشنی اس کی بات نہ سمجھ سکی تھی۔

''وہی جو تمہارا ٹیچر ہے۔ ملازم سے کہہ کر اس کے لیے کمرہ صاف کروا دو اور اچھی طرح سب کو ہدایت کر دو۔ کیونکہ وہ تمہارا ٹیچر ہے قابل احترام ہے اور اس گھر کے فرد کی حیثیت سے ہی رہے گا۔ سمجھ گئی ہو یا ابھی تک نہیں؟''

صہیب احمد نے روشنی کو مزید چڑانے کے لیے دماغ پر انگلی رکھ کر کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''تھینک یو بھائی۔''

''تم میری جان ہو۔ بس یہی ذہن میں رکھنا۔'' صہیب احمد مسکراتا ہوا چلا گیا۔ روشنی کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اب مسئلہ فواز احمد کو اس بات پر راضی کرنا تھا کہ وہ روشنی کو ناول لکھنا سکھانے کے لیے اس کے گھر پر آئے۔

''کیا صرف لکھنا ہی سیکھنا چاہتی ہو یا اس سے آگے بھی کچھ اور ہے؟'' وہ اس آواز کو سن کر چونک گئی اس نے گھبرا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا مگر کسی کو بھی نہ پا کر شرارتی دل کو ڈانٹنے والے انداز میں جھڑکتی ہوئی بولی۔ ''شٹ اَپ!'' پھر خود ہی مسکراتی ہوئی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

○.....❖.....○

احمد فراز اپنے کمرے کی کھڑکی سے پردے کی اوٹ میں ہو کر طیبہ کو دیکھ رہا تھا جو کہ لان میں ایک کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی ان کے سامنے والی کرسی پر دولت بی بی ہاتھ میں تسبیح پکڑے اللہ اللہ کر رہی تھیں۔ طیبہ احمد فراز کی فرسٹ کزن تھی وہ اپنے والدین کی وفات کے بعد ارباب احمد کے گھر میں ہی پلا بڑھا تھا۔ ارباب احمد رشتہ میں اس کا سگا چچا تھا لیکن آج تک اپنے بچوں اور احمد فراز میں انہوں نے فرق نہ سمجھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج احمد فراز جس مقام پر تھا وہ ارباب احمد کی خصوصی محبت اور شفقت کا مرہون منت تھا۔ لیکن بچپن سے آج تک وہ عدیم اور طیبہ کے ساتھ کھیل کود کر بڑا ہوا تھا مگر طیبہ اس کے دل میں کب گھر کر گئی تھی اس بات کا احمد فراز کو پتہ ہی نہ چلا تھا۔

وہ طیبہ کی معصومیت اور خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس کی سادگی پر بھی مر مٹا تھا۔ وہ دوسری لڑکیوں سے یکسر مختلف تھی۔ وہ میک اَپ کے بغیر ہی کسی جنتی حور سے کم نہ لگتی تھی۔ اس کے چہرے پر سیاہ رنگ کے کپڑے کا اسکارف اس کے حُسن اور خوبصورتی میں مزید اضافہ کر دیتا تھا۔ وہ نہ ہی زیادہ باتونی تھی اور نہ ہی کم گو تھی۔ وہ طیبہ سے محبت کرنے لگا تھا مگر آج تک اس کو اتنی جرأت نہ ہو سکی تھی کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کر سکتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ابھی تو طیبہ اپنی سٹڈی میں مصروف تھی دوسرے وہ کبھی بھی یہ نہ جان سکا تھا کہ طیبہ بھی اس کے لیے پیار بھرے جذبات رکھتی ہے اور پھر وہ اپنی محبت کا اظہار کر کے اس کی نظروں میں گرنا نہ چاہتا تھا کیونکہ طیبہ کے انکار کی صورت میں وہ اس گھر میں رہ نہ سکتا تھا۔

یہ بات اس کی اپنی تھی حالانکہ ارباب احمد اس کو کہیں بھی نہ جانے دیتے۔ باوجود اس کے کہ احمد فراز اچھی خاصی تنخواہ لے رہا تھا اس کا مستقبل بھی روشن تھا۔ ارباب احمد اس کو کبھی بھی نہ جانے دیتے اور نہ ہی احمد فراز چاہتا تھا کہ وہ اس گھر سے جائے کیونکہ وہ طیبہ کے دیدار سے اپنے پیار کو تسکین دے لیتا تھا اور دل کو سکون ہو جاتا تھا۔ وہ اس

انتظار میں تھا کہ شمسہ چچی یا خود ارباب احمد اس سے طیبہ کے متعلق بات کریں۔ مگر ابھی تو فی الحال یہ دور دور تک نظر نہ آ رہا تھا کیونکہ طیبہ ابھی پڑھ رہی تھی۔ اس سے پہلے عدیم اور ریا کی تعلیم کا بھی مسئلہ تھا۔ احمد فراز اسی انتظار میں تھا لیکن یہ انتظار ابھی تو لمبا ہی ہوتا جا رہا تھا۔

پڑھا لکھا، باشعور اور ہوشیار چالاک صحافی احمد فراز جو کہ اپنی دلیلوں سے بڑے بڑے سیاستدانوں کی بولتی بند کروا دیتا تھا۔ بڑے نامور فلم سٹارز کی باتوں میں سے بات نکال کر ان کے سکینڈلز کی باتوں کو ٹی وی سکرینوں پر انہی کے منہ سے نکلوانے کا فن جاننے والا احمد فراز بے بس تھا۔

عشق، محبت اور پیار کی دلیلوں کے سامنے خود کو مجبور اور بے بس محسوس کرتا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ محبت کے کیا تقاضے ہوتے ہیں۔ پیار کس طرح کیا جاتا ہے۔ عشق کیا ہوتا ہے۔ عشق کی کیا ضروریات ہوتی ہیں۔ محبت کا اظہار کن الفاظ میں کس طرح کیا جاتا ہے۔ وہ ان سب باتوں کو ایک ہی پلڑے میں رکھ کر دوسرے پلڑے میں ڈاکٹر ارباب احمد کے ان احسانات کو رکھ لیتا تھا جو انہوں نے اس پر اس طرح کیے تھے کہ آج وہ اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ سٹیٹس، اچھا رہن سہن کھانا پینا اور پہننا سب کچھ ارباب احمد کی محبت کا مرہون منت سمجھ کر اپنے پیار کو خاموشی کی سولی پر لٹکا رہا تھا۔ اور خود دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر طیبہ کا دیدار اس طرح کیا کرتا تھا کہ جیسے انوکھا لاڈلا زمین پر بیٹھ کر چاند کی طرف دیکھ کر اس کو کھیلنے کے لیے مانگتا ہے۔

اس نے رب کریم سے التجائیں اور دعائیں کی تھیں کہ طیبہ کو اس کی شریکِ زندگی بنا دے۔ مگر وہ کاتب تقدیر کے قلم سے نکلے ہوئے مقدر کو تبدیل نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی اپنی طرف سے اس لوح پر کچھ لکھنے کی جسارت کر سکتا تھا۔ جو سات آسمانوں پر محفوظ ہو چکی تھی۔

O.....❖.....O

پورے ملک کی انتظامیہ میں تھرتھلی مچ گئی تھی کیونکہ بات ہی ایسی تھی عدالت کے اعلیٰ ترین جج کی بیٹی کو نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا تھا۔ انتظامیہ کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں۔ سب کے موبائلز آن تھے اور کان اغوا کاروں کی طرف سے کی جانے والی ڈیمانڈ پر لگے ہوئے تھے مگر ابھی تک کوئی ایسی کال نہ آئی تھی کہ جس سے اغوا کاروں کا مقصد معلوم ہوتا کہ وہ لڑکی کو تاوان کے لیے یا پھر کسی اور مقصد کے لیے اغوا کر کے لے گئے ہیں۔

وہ لڑکی بھی طیبہ کے ساتھ ہی پڑھتی تھی بلکہ اس کی کلاس فیلو تھی آج اتفاق سے طیبہ یونیورسٹی نہ جا سکی تھی اور جیسے ہی چھٹی ٹائم پر لڑکیاں گھروں کو جانے کے لیے گاڑیوں یا اپنی اپنی ذاتی سواریوں پر سوار ہونے لگیں تو چند نامعلوم اسلحہ بردار اسلحے کے زور پر جج صاحب کی بیٹی کو اس کی گاڑی سمیت اغوا کر کے لے گئے۔ چند ہی گھنٹوں بعد اس کی ذاتی گاڑی تو شہر سے باہر جانے والی مین سڑک سے مل گئی۔ مگر ابھی تک لڑکی کا نام ونشان تک نہ ملا تھا۔ یہی بات اس ملک کی انتظامیہ کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔

آج سے پہلے بھی اس یونیورسٹی کی تین طالبات کو گم کر دیا گیا تھا مگر وہ بھی آج تک زندہ یا مردہ نہ مل سکی تھیں۔ ان کا بھی کوئی سراغ لگانے میں عوام کے محافظ بُری طرح ناکام رہے تھے۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد ان لڑکیوں کے والدین رو دھو کر خاموش ہو گئے تھے مگر ان کی سسکیاں اور آہیں عرشِ الٰہی کو ضرور ہلاتی تھیں۔ کیونکہ حکومتی ایوانوں

میں بجنے والے ''ٹل'' یا تو ناکارہ ہو گئے تھے یا پھر نفسا نفسی کے سوداگروں کے شور میں اپنی اہمیت کھو چکے تھے لیکن آج کا معاملہ خاصا مختلف تھا جس جج کی بچی کو اغوا کیا گیا تھا ان کی عدالت میں موجودہ حکومت کے خلاف کرپشن کے کافی کیسز زیر سماعت تھے۔اس لیے میڈیا اخبارات و دیگر ذرائع حکومت کو ہی آڑے ہاتھوں لے رہے تھے اور حکومتی وزراء نے میڈیا کے تیز و تند سوالات سے بچنے کے لیے اپنے موبائلز ہی بند کر دیئے تھے۔

طلباء و طالبات یونیورسٹیوں سے نکل کر سڑکوں پر آ چکے تھے۔ ہر طرف ٹریفک جام ہو چکی تھی۔توڑ پھوڑ میں وہ بھی شامل ہو گئے تھے جو حکومت سے کافی اُکتائے ہوئے تھے اور بہانہ ہی ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ یہ اچھا خاصا بہانہ آ گیا تھا کہ حکومت مخالف نعرے بازی اور سرکاری املاک کی توڑ پھوڑ میں وہ کافی لطف محسوس کر رہے تھے۔میڈیا اور پریس کے صحافیوں کی دوڑیں لگی ہوئی تھیں۔جبکہ پولیس والے اپنے مورچے چھوڑ کر کسی بڑے کے بڑے حکم کا انتظار کر رہے تھے بلکہ آدھے پولیس والوں نے تو ڈر اور خوف سے یونیفارم اُتار پھینکا تھا اور سفید کپڑے پہن لیے تھے کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ دو تین شہروں میں پولیس والوں کی درگت بن رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' طیبہ نے احمد فراز سے پوچھا جو کہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ طیبہ کب ادھر آ نکلی تھی اور کافی دیر سے سکرین پر ہنگاموں کے فوٹیج دیکھ دیکھ کر پریشان اور خوفزدہ ہو رہی تھی جب اغواکنندگان کی فوٹوز دکھائی گئیں تو وہ آج کے کیس کو دیکھ کر روہانسی انداز میں چیخ پڑی تو احمد فراز نے گردن گھما کر اس کو دیکھا اور پریشان لہجے میں پوچھا۔

''تم آج یونیورسٹی نہیں گئیں؟''

''نہیں...... بس میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔'' طیبہ اس کے ساتھ والے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ کافی پریشان لگ رہی تھی اور خوفزدہ بھی تھی احمد فراز اس کی سچویشن سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ اغوا ہونے والی اس کی کلاس فیلو بھی تھی اور اس کی دوست بھی تھی اور وہ ایک اچھے اعلیٰ سٹینٹس کے مالک کی بیٹی بھی تھی۔ احمد فراز ٹھنڈی سانس خارج کرتا ہوا بولا۔

''تم پریشان نہ ہو۔ پولیس اپنا کام کر رہی ہے۔''

''پولیس؟'' طیبہ زور سے چلائی۔''میری رائے میں تو پولیس ہی ملوث ہے اس کام میں۔'' وہ خاصی خوفزدہ لگ رہی تھی۔''آج تک کوئی بھی اغوا کار پکڑا نہیں گیا فراز!''

احمد فراز کو اس کے منہ سے اپنا نام اس طرح سننا بہت اچھا لگا مگر یہ موقع نہ تھا کہ وہ کوئی اظہار کرتا۔ وہ اس کو دلاسہ دینے والے انداز میں بولا۔''تم ریلیکس ہو جاؤ۔ ابھی کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا جس سے جج صاحب کی بیٹی مل جائے گی۔'' مگر اس کا یہ دلاسہ بھی ناکام ہوتا دکھائی دیا جب وہ رونے والے انداز میں بولی۔

''اب معجزے نہیں ہوتے فراز! اب پیغمبر نہیں آئیں گے۔''

''اب وہ قومیں بھی تو نہیں ہیں نا؟'' احمد فراز بولا۔

طیبہ احمد فراز کی طرف دُکھ سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''خدانخواستہ کل کو اگر ایسا ہی کچھ میرے ساتھ ہو جائے تو معجزے کا انتظار کرتے رہنا۔'' احمد فراز تڑپ کر اُٹھا

اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔ ''خدا نہ کرے تمہارے ساتھ ایسا کچھ ہو۔'' اس کے فقرے کی تڑپ۔ الفاظ کی ادائیگی اور بے ساختہ پن نے طیبہ کو خوف کی حالت سے باہر نکال کر حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ احمد فراز کا ہاتھ ابھی تک اس کے منہ پر تھا اس نے احمد فراز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا تو اس کو اپنی بے ساختگی اور بیوقوفی کا شدت سے احساس ہوا اس نے طیبہ سے نظریں چراتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا لیا تو طیبہ روہانسی انداز میں اندر کی جانب بھاگ گئی۔ وہ سامنے سے آتی ہوئی ریبا سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

''اسے کیا ہوا فراز بھائی؟'' ریبا کی حیرت قدرتی تھی وہ احمد فراز کے پاس پہنچ چکی تھی۔

''کچھ نہیں......وہ دیکھو۔'' اس نے ریبا کی نظریں ٹی وی سکرین کی جانب کرواتے ہوئے کہا۔ ''آج جو لڑکی اغوا ہوئی ہے طیبہ کی کلاس فیلو تھی۔ وہ یہ مناظر دیکھ کر خوفزدہ ہو گئی ہے۔''

ریبا شاید ابھی ابھی جاگی تھی وہ سکرین پر چلنے والی خبروں اور تجزیوں کے ساتھ ساتھ شہر بھر کی بلکہ ملک بھر کی دگرگوں حالت پر افسردہ ہو گئی تھی۔ احمد فراز اس کو چھوڑ کر چلا جاتا لیکن موجودہ حالات کو ٹی وی سکرین پر دیکھنا اس کے لیے ضروری تھا۔ کیونکہ اس نے رات کے لیے اپنے شو کی تیاری بھی کرنا تھی۔ اس لیے وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہیں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔

○......❖......○

''آیئے آیئے زہے نصیب......آج کیسے رونق بخشنے کا فیصلہ کر لیا سرکار!'' نائیکہ انیل شرما کو آتے دیکھ کر بولی۔

انیل شرما نے نائیکہ کی آنکھوں میں کاروباری چمک دیکھی اور مسکراتا ہوا بولا۔ ''بدنام گلی کوچوں سے تو ہمارا بچپن کا یارانہ ہے نائیکہ جی! ادھر نہ سہی اُدھر سہی۔'' انیل شرما آگے بڑھتا ہوا قیمتی قالین کو اپنے پاؤں تلے روندھ کر سامنے لگے ہوئے تخت پر بیٹھ گیا۔

''کیا خدمت کروں حضور کی؟'' لہجہ کاروباری تھا مگر الفاظ میں چاپلوسی صاف ظاہر کرتی تھی کہ نائیکہ انیل شرما کے اعلیٰ خاندانی سٹیٹس سے بخوبی واقف ہے۔

''تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہم بدن کے خریدار نہیں ہیں۔ صرف کلا کے پرستار ہیں۔'' انیل شرما نے واضح کر دیا تھا کہ وہ جسمانی تعلق کا خواہاں نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف ناچ گانے کا ہی رسیا ہے۔ نائیکہ بھی بڑی کائیاں تھی۔

''جو حکم حضور! ایک زبردست مال آیا ہے۔ کیا خوب ناچتی ہے۔ اس کے انگ انگ سے کلا ٹپکتی ہے یوں لگتا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ کوٹھے کی ہر چیز ناچ رہی ہو۔'' تعریفوں کے پل باندھ باندھ کر نائیکہ ناچنے والی طوائف کا ریٹ بڑھا رہی تھی اور ابھی تک انیل شرما نے طوائف کو دیکھا بھی نہ تھا۔

نائیکہ اُٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔ آس پاس کے کوٹھوں سے طبلوں اور دیگر سازوں کے ساتھ ساتھ گانوں کی آوازیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ اس وقت ''دھندہ'' عروج پر ہے۔ کچھ ہی دیر میں سازندوں نے اپنے اپنے سازوسامان کو سیٹ کر لیا تو آنے والی کا حُسن دیکھ کر واقعی انیل شرما کے ہوش قابو میں نہ رہے تھے۔ وہ انتہائی خوبصورت تھی اور بمشکل ہی اس کی عمر بیس اکیس سال ہو گی۔ دیکھنے میں وہ کوئی کالج کی طالبہ لگتی تھی۔ اس کے حُسن کا جائزہ لیتے لیتے انیل شرما کی نظریں اس کی آنکھوں پر گئیں تو وہ حیران رہ گیا کیونکہ وہاں پر اُداسی اور غم کی سوگواریت

چھائی ہوئی تھی۔

طوائف نے ناچنا شروع کیا تو واقعی رقص کو عضاء کی شاعری قرار دینے والوں کو داد دینا پڑی کیونکہ طوائف کی پتلی اور لچکتی کمر گلوکارہ کے منہ سے الفاظ نکلنے کے ساتھ ساتھ ہی بل کھاتی تھی اس کے پاؤں میں پڑی ہوئی پائل چھن چھن کر رہی تھی۔ انیل شرما اس کے حُسن میں کھو جاتا مگر اس کے تخیل میں یک دم اپنا ''بھگوان'' آ گیا جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے تراشا تھا۔ اس کی پوجا کیا کرتا تھا۔ جس کو اپنی حقیقی دنیا میں دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے اسے اپنے انتظار اور پرستش پر بھروسہ تھا۔ وہ اس کو غور سے دیکھنے لگا اگر یہ طوائف اپنے حُسن سے مزید دس گنا بھی خوبصورت اور حسین ہوتی تب بھی وہ اس کے خیالوں میں اس کے دل پر حکومت کرنے والی دیوی سے کمتر ہی تھی۔

انیل شرما نے طوائف کے رقص کی تعریف کی اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس پر نچھاور کرتا ہوا بولا۔

''جب دل پریشان ہو تو آنکھیں اُداس ہو جاتی ہیں اور مجبوری رقص بن کر پورے بدن کو طوائف بن کر ناچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔'' اس نے اپنے سامنے کھڑی نوجوان طوائف کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی انگلی سے اس کے ماتھے پر آ جانے والی بالوں کی لٹ کو ہٹاتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ ماحول تمہارے لیے اور تم اس ماحول کے لیے اجنبی ہو۔ مگر...... خریدار کو اس بات اور تمہاری مجبوری سے کوئی غرض نہیں ہے۔'' وہ یہ کہہ کر طوائف کو حیران و پریشان چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔

یہ اس کی روٹین میں شامل تھا کہ وہ شراب سے اپنا دل بہلایا کرتا تھا اور ہر ہفتے میں ایک دن وہ بازارِ حُسن کا چکر ضرور لگایا کرتا تھا۔ دولت کی پرواہ نہ تھی باپ کا امپورٹ ایکسپورٹ کا وسیع تر بزنس تھا جس کا کوئی حساب ہی نہ تھا۔ اس نے آج تک کسی بھی طوائف کے ساتھ جسمانی تعلق روا نہ رکھا تھا۔ وہ اعلیٰ سٹیٹس کی اعلیٰ ترین شخصیت ہونے کے ناطے اس کام کو انتہائی چھوٹا اور غلط سمجھتا تھا یہ اس کی اعلیٰ ذہنیت کی اعلیٰ کارکردگی بھی تھی۔ اس نے کبھی بھی ایک ہی طوائف کے کوٹھے پر ناچ گانا نہ سنا تھا بس کبھی ایک کے پاس اور پھر اگلے ہفتہ کبھی دوسری طوائف کے کوٹھے پر چلا جاتا تھا۔ مگر جس کوٹھے پر ایک بار چلا جاتا اس کوٹھے کی نائیکہ اور طوائفوں کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ انیل شرما جب بھی آئے دوبارہ انہی کے پاس ہی آئے کیونکہ سبھی اس کے امیر کبیر ہونے کو جان گئی تھیں اور ان کی ''آمدنی'' بھی اچھی خاصی ہو جاتی تھی۔

آج جس طوائف کو وہ دیکھ کر آ رہا تھا اس نے اسے خاصا متاثر کیا تھا کیونکہ وہ کسی طور پر بھی طوائف نہ لگ رہی تھی یوں لگتا تھا کہ اس کو زبردستی اس کام میں بلکہ اس آگ میں جھونکا گیا ہے۔ اس ''مارکیٹ'' کا یہی تو سب سے بڑا المیہ تھا کہ یہاں پر آنے والی نئی نئی لڑکیوں کو کسی نہ کسی کا قریبی رشتہ دار فروخت کر جاتا تھا یا پھر ان کو دوسرے ملکوں کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کے تعلیمی اداروں سے بھی اغوا کروایا جاتا تھا۔ طوائفیں ان کے گُن دیکھ کر ان کی بولی لگاتی تھیں اور اپنے کام میں ''نئی ورائٹی'' بڑھانے کے لیے اچھے داموں پر خرید لیتی تھیں۔

آج اس کے سامنے ناچنے والی بھی کسی مجبوری کے گھنگرو اپنے پاؤں میں باندھ کر اپنے رقص کو اس طرح اس کے سامنے پیش کر رہی تھی کہ اعضاء کی شاعری کا توازن متوازن نہ لگ رہا تھا یوں لگتا تھا کہ اس کا پاؤں زمین پر نہیں اسی کے دل پر پڑ گیا ہو اور فقرے کا وزن خراب ہو گیا ہو۔ اس کی کیا مجبوری تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا کہ وہ اس

بازار کی زینت بن گئی تھی۔ اسے کون بیچ گیا تھا۔ کتنے میں بیچ گیا تھا اور وہ بیچنے والے کی کیا لگتی تھی۔ انیل شرما کو اس کہانی سے کوئی سروکار نہ تھا کیونکہ وہ جس طوائف کو بھی کھنگالتا اس کی کہانی انتہائی دردناک ہی ہوتی۔ وہ اپنے ذہن کو فریش کرنے کے لیے یہاں آتا تھا وہ کسی بھی طوائف کی رُوداد سن کر مزید دُکھی ہونے کے لیے نہ آتا تھا کیونکہ وہ پہلے ہی مجسمہ حُسن کا گرفتار تھا اور اس کی آمد کا منتظر تھا۔

○.....❖.....○

فواز احمد نے اپنے بہترین کپڑے بیگ میں رکھے تھے۔ ضروری سامان کے ساتھ ساتھ اس نے لکھنے لکھانے کا سامان بھی رکھ لیا تھا۔ وہ روشنی کی دعوت پر اس کو ناول لکھنا سکھانے کے لیے ایبٹ آباد جا رہا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے ایک چھوٹی سی میٹنگ احمد فراز کے ساتھ بھی کر لی تھی وہ بھی کہہ رہا تھا کہ تمہاری تو لاٹری نکل آئی ہے کیونکہ یہ کام تو سکھانے سے نہیں آتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کسی کے لکھے ہوئے کو آپ اپنے علم اور تجربہ کی بنا پر سنوار سکتے ہیں۔ اس کی جھول اور نوک پلک سنوار کر اس تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے قابل بنا سکتے ہیں۔

لیکن فواز احمد ہی جانتا تھا کہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر جا رہا ہے۔ اس کو روشنی کا وہ لمس نہ بھولا تھا جب وہ سفر کے دوران سر اس کے کندھے پر رکھ کر سو گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ کر بڑبڑا رہی تھی۔ وہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی اسی کی کتاب پڑھ رہی تھی۔ وہ فواز احمد کی تحریر سے اتنا پیار کرتی تھی کہ وہ کتاب کھولنے سے پہلے فواز احمد کے نام پر اپنی نرم و نازک انگلی پھیرتی تھی۔ وہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھی۔

فواز احمد بھی پیار بھرے تیر سے گھائل ہو گیا تھا۔ وہ زخمی زخمی سینہ اور چھلنی دل لے کر راتوں کو جاگتا رہا تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا بلکہ دعائیں کیا کرتا تھا کہ روشنی اس کو کال کرے تو وہ اس سے ڈھیروں باتیں کیا کرے گا۔ ایسا ہی ہوا تھا کہ روشنی کا ایک فون ایسا آیا کہ اس کو ڈھیروں باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا اور بہترین جواز بھی مل گیا تھا۔ مگر وہ ایک استاد کی حیثیت سے جا رہا تھا۔ کیا استاد اور شاگردوں کے درمیان محبت کا رشتہ ٹھیک اور مناسب بات ہے؟ لیکن محبت تو اندھی ہوتی ہے وہ تو ایسا رشتہ ہے جو ہر رشتے پر حاوی ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فواز احمد کبھی بھی اپنے جذبات کا اظہار روشنی سے نہیں کرے گا۔ وہ اپنے امیج کو اس طرح برقرار رکھے گا۔ بس وہ روشنی کو اپنے سامنے ہی دیکھنا چاہتا ہے اس کے دل کو سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک ملنا ہی اس کا مقصد تھا۔

اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ روشنی کون ہے۔ ایبٹ آباد کس جگہ رہتی ہے۔ اس کے والدین بہن بھائی کس طرح فواز احمد کو ڈیل کریں گے۔ وہ کیسے برداشت کریں گے کہ ایک نوجوان لڑکا ان کی جوان خوبصورت حسین لڑکی کو پڑھانے کے لیے آئے اور ان کے ہی گھر میں رہے۔ حالانکہ روشنی نے اسے بتا دیا تھا کہ اس نے اپنے گھر میں فواز احمد کے لیے ایک الگ کمرہ صاف کروا دیا ہے۔ صاف کروانے کے ذکر پر فواز احمد کے ذہن میں اپنے گھر جیسا ہی کوئی کمرہ تھا جس میں فالتو کاٹھ کباڑ پڑا ہوگا اسے صاف کروا کے فواز احمد کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہوگا۔ وہ دیکھ چکا تھا اور پڑھ بھی چکا تھا کہ ایبٹ آباد کافی خوبصورت علاقہ ہے۔ سرسبز و شاداب علاقہ پورے ملک میں اپنی الگ ہی پہچان رکھتا تھا۔ اس علاقے میں سیب اور آلو کی فصل سال کے مخصوص مہینوں کی خاص پیداوار تھی۔

فواز احمد نے ایبٹ آباد بس اسٹینڈ میں اتر کر اِدھر اُدھر اس طرح دیکھا جیسے کوئی ''پینڈو ودوبئ'' آ گیا ہو۔ کیونکہ

اسے اب معلوم نہ تھا کہ کدھر جانا ہے کیونکہ اس کے پاس صرف اور صرف روشنی کا نمبر تھا گھر اور گھر والوں کا بھی علم نہ تھا۔ لیکن روشنی نے اس کی ایک پریشانی حل کر دی تھی کہ وہ جب ایبٹ آباد پہنچ جائے تو روشنی کو کال کر دے اس کا ڈرائیور اسے پک کر لے گا۔ فواز احمد کو ڈرائیور کے پک کرنے والی بات پر تھوڑا سا اچنبھا ہوا کیونکہ اس بات سے تو لگتا تھا کہ روشنی کسی امیر باپ کی بیٹی ہے۔ ہاں بھئی امیر باپ کی بیٹی ہے تو وہ ایک لاکھ روپے ماہانہ پر ٹیوٹر افورڈ کر رہی ہے۔ فواز احمد کو وہ گاڑی بھی یاد آ گئی جو اس کو لینے آئی تھی۔ جب روشنی لاہور سے اس کے ساتھ سفر کرتی ہوئی اسلام آباد پہنچی تھی۔ وہ گاڑی تو کافی قیمتی تھی۔ بہت سی الجھنیں تھیں جو اس کے ذہن میں تھیں وہ روشنی سے مل کر ہر اُلجھن کو سلجھانے کی کوشش کرے گا۔ اس نے روشنی کا نمبر پریس کیا تو پہلی ہی بیل پر کال ریسیو ہونے پر فواز احمد سمجھ گیا کہ روشنی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہے۔

''فواز احمد بول رہا ہوں۔'' اس نے روشنی کے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔ ''میں ایبٹ آباد پہنچ گیا ہوں میڈم۔''

''او مائی گاڈ سر! آپ کہاں ہیں؟'' روشنی ناقابل یقین انداز والے موڈ میں بولی تھی۔

''بس اسٹینڈ پر ہوں۔''

''ابھی...... ابھی سر! ڈرائیور آپ کو لینے آرہا ہے۔ پلیز سر! آئی ایم سوری...... مجھے اندازہ نہ تھا کہ آپ آئیں گے۔ ابھی ڈرائیور آ جاتا ہے۔'' روشنی کو یقین نہ آ رہا تھا وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کس طرح اور کن الفاظ میں کرے۔

''میں اسٹینڈ کے بالکل سامنے کتابوں کے سٹال پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا ہوں۔'' فواز احمد کا لہجہ متانت اور سنجیدگی سے بھرپور تھا۔

''جی سر! میں ابھی بھیجتی ہوں ڈرائیور کو۔'' کال منقطع ہوگئی۔ فواز احمد چلتا ہوا اسٹینڈ سے باہر نکل آیا۔ اس نے دور سے ہی بکسٹال پر لٹکے ہوئے اخبارات دیکھ لیے تھے اس لیے اس نے روشنی کو وہی پتہ بتایا تھا فواز احمد جا کر سٹال پر کھڑا ہوا تو اسے خوشگوار حیرت کا اظہار ہوا۔ کیونکہ بکسٹال والے نے اس کے نئے ناول کا اشتہار لگا کر نیچے لکھا ہوا تھا کہ ''یہاں دستیاب ہے۔''

فواز احمد وہاں کھڑا ہو کر تازہ اخبار دیکھنے لگا تھا۔ وہ کبھی ماہانہ ڈائجسٹ دیکھنے لگتا تھا اس کی نظر اپنی کتاب پر گئی تو اس نے سٹال والے سے قیمت پوچھ لی۔ سن کر وہ سوچنے لگا کہ پبلشرز اس کے نام سے کتنا روپیہ کما رہے تھے جبکہ اس کو صرف پیٹ بھرنے کے لیے چند ہزار ہی ملتے تھے۔

''آپ فواز احمد ہیں؟'' ایک باوردی ڈرائیور نے اس کے پاس آ کر پوچھا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''جی ہاں...... میں ہی فواز احمد ہوں۔'' فواز احمد سوچ رہا تھا کہ روشنی نے اس کا حلیہ بتا کر ڈرائیور کو بھیجا ہوگا اور پھر وہ اس وقت اکیلا ہی بکسٹال پر کھڑا تھا اس لیے بآسانی پہچانا گیا تھا۔ اس کے اعتراف پر ڈرائیور نے اس کا بیگ پکڑا اور ''آئیے سر'' کہتا ہوا آگے آگے چل دیا۔ وہ سڑک پر کھڑی شاندار قیمتی گاڑی کے پاس پہنچ کر رُکا تو فواز احمد کو یاد آ گیا یہی وہ گاڑی تھی جس میں روشنی بیٹھنے لگی تھی آج وہی گاڑی فواز احمد کو لینے آئی تھی۔ ڈرائیور نے ادب سے اگلی

سیٹ کا دروازہ کھولا اور فواز احمد کے اندر بیٹھ جانے تک با ادب کھڑا رہا۔ اس کی عزت شروع ہوگئی تھی۔ وہ ایک استاد کی حیثیت سے آیا تھا مگر محبت کا پروفیسر بن گیا تھا۔ گاڑی اپنی منزل کی جانب چل پڑی تو خوبصورت علاقے کی خوبصورتی اور بھی نکھرنے لگی کیونکہ وہ روشنی کی گاڑی میں بیٹھا اس کے گھر جا رہا تھا۔ اسے ان راستوں سے روشنی کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی ہر طرف سبزہ اور ہریالی اس کی آنکھوں کو بھا رہی تھی اردگرد بکھرے کھیت کھلیان سبزیوں اور فروٹ سے لدے ہوئے تھے۔

ایک موڑ مڑتے ہی گاڑی بہت بڑے محل کے گیٹ پر کھڑی تھی فواز احمد کی حیرت دو چند ہوگئی تھی۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ روشنی اتنے بڑے محل میں رہ رہی ہوگی۔ گیٹ کھولا گیا تو گاڑی اندر داخل ہوئی تو فواز احمد کے لیے حیرت واستعجاب کے سمندر میں غوطے لگانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ کم از کم ایک مربع پر پھیلا ہوا لان اور پھر درخت اس ترتیب سے لگائے گئے تھے کہ خوبصورتی کا احساس دل و دماغ کو سکون بخشنے کے لیے کافی تھا۔ گاڑی چلتی ہوئی عمارت کے پاس پہنچی تو پورچ میں پہلے بھی دو گاڑیاں کھڑی تھیں جو کہ قیمتی اور خوبصورت تھیں۔ فواز احمد سوچ میں پڑ گیا تھا کہ اتنے امیر لوگ بھی اس کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اتنی دولت اور شان و شوکت کے ہوتے ہوئے بھی آج کے دور میں مصنف سے محبت اور اس کی تحاریر کو پذیرائی بخشتے تھے۔

وہ گاڑی سے اُترا اور ڈرائیور نے ایک ملازم کو آواز دے کر اسے سمجھایا کہ فواز احمد کو ایک کمرے میں چھوڑ آئے کیونکہ یہ روشنی میڈم کے مہمان ہیں۔ فواز احمد کا بیگ اس ملازم نے اُٹھایا اور ''آئیں صاحب جی'' کہتا ہوا آگے آگے چل پڑا اور فواز احمد اس کی تقلید کرتا ہوا جب محل میں داخل ہوا تو اسے احساس ہوا کہ وہ جنت میں آ گیا ہے۔ غریبوں کی زندگی جی کر اسے یہی لگ رہا تھا کہ ہر انسان اسی کی طرح جیتا ہوگا بس فرق ہوگا تو صرف اتنا کہ وہ کچے مکان میں رہتا تھا اور امیر لوگ سنگِ مرمر سے تعمیر کسی کوٹھی میں رہتے ہوں گے۔ مگر یہ تو محل تھا جو اس نے فلموں میں دیکھا اور اپنی کہانیوں میں لکھا تھا۔

قیمتی اور دیوہیکل فانوس چھت سے لٹکا ہوا فواز احمد کو بتا رہا تھا کہ روشنی نے ایک لاکھ روپیہ ماہانہ کی آفر اسے یونہی نہیں کر دی تھی اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ روشنی کے والد کا کیا کاروبار ہے اور اس کے گھر کے کتنے افراد ہیں۔ بھائی کتنے ہیں اور کیا کام کرتے ہیں۔ وہ ملازم کی معیت میں چلتا ہوا ایک راہداری پار کر کے ایک کمرے میں پہنچا تھا۔ ملازم اس کا سامان رکھ کر چلا گیا تھا مگر فواز احمد ہونق بن کر کمرے میں کھڑا تھا اس کے پاؤں کے نیچے قیمتی قالین تھا۔ دروازے اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے پردے بھی نفاست اور قرینے سے لگائے گئے تھے۔

ایک خوبصورت اور بڑے بیڈ پر اعلیٰ قسم کے کپڑے کا سیٹ بچھایا گیا تھا۔ ایک سونگ الماری جو کہ دیوار میں ہی بنی ہوئی تھی اسے کمرے کی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا جو کہ اس کی سمجھ کے مطابق اٹیچ باتھ ہوگا۔ اس نے کمرے کے جائزے سے فارغ ہو کر خود کو پُرسکون انداز میں بیڈ پر گرا لیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ملک میں نہیں بلکہ کسی یورپی ملک کے فائیو سٹار ہوٹل کے کمرے میں موجود ہے۔ اس نے جوتے اُتارے اور واش روم میں داخل ہوا تو خوشبوؤں کے ایک ہلے نے اس کا استقبال کیا جو کہ رنگ برنگ اور امپورٹڈ باڈی سپرے اور دیگر شیونگ کے سامان سے اُمڈ رہا تھا۔ اتنا بڑا واش روم دیکھ کر اس کی تو سٹی گم ہوگئی کیونکہ وہ

اتنے سائز کے ایک کمرے میں اُٹھتا بیٹھتا اور سوتا تھا۔

اس نے منہ ہاتھ دھویا اور خود کو پُرسکون پایا ایک نرم تولیے سے منہ صاف کرتا ہوا باہر نکلا تو اس کے بیڈ پر ایک ٹرے میں پانی کا گلاس اور گرم گرم بھاپ اُڑاتی چائے کا مگ موجود تھا کوئی ملازم اس کی واش روم میں موجودگی کے وقت میں رکھ گیا تھا۔ اس نے پانی پیا اور گرم گرم چائے کا مگ ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ بہترین اور مزیدار چائے سے لطف اندوز ہوتا ہوا کمرے میں ایک کھڑکی کی جانب بڑھا اور دبیز پردے ہٹاتا ہوا باہر کے خوبصورت منظر کو دیکھنے لگا جو کہ اسی محل کا ہی حصہ تھا وہ ایک بڑے سوئمنگ پول کا منظر تھا جس میں ہلکے نیلے رنگ کا پانی ہوا کے دوش پر آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ تھوڑی دور نظریں دوڑانے پر اس کو وہ تمام لان نظر آنے لگا جس کو وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا جب وہ گاڑی میں سوار اس محل میں داخل ہوا تھا۔ یہ یقیناً روشنی کے باپ کا کمال تھا کہ اس نے ہر چیز کو اپنی پرفیکٹ جگہ پر لگوانے کے لیے اپنا رُعب اور دبدبہ استعمال کیا ہوگا اور یہ گھر تقریباً ایک کلومیٹر مربع میٹر پر محیط ہوگا۔ یہ فواز احمد کی اپنی ذاتی سوچ تھی کہ اس گھر کی ملکیت تقریباً بیس سے تیس کروڑ تک تو ہوگی یا پھر اس سے بھی زیادہ۔ اس کا اندازہ وہ نہ لگا سکتا تھا۔ اس نے ایک عورت کو دیکھا جو وہیل چیئر پر بیٹھی چائے پی رہی تھی وہ معذور عورت کون تھی اور اس کے اس طرح چائے پینے کے سٹائل سے تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ روشنی کی کوئی عزیزہ ہی ہے کیونکہ فواز احمد کو اپنی دور کی نظر پر مان تھا اس نے معذور عورت کے قیمتی اور صاف ستھرے کپڑوں سے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ بھی گھر والوں میں سے ہی ہے۔ اپنی بات کی تصدیق وہ کسی بھی ملازم سے کر سکتا تھا۔

دروازے پر دستک سن کر اس نے شیشے میں اپنے بال دیکھے اور گلا کھنکار کر بولا۔ ''دروازہ کھلا ہے۔'' اس کا خیال تھا کہ روشنی آئی ہوگی۔ مگر اندر داخل ہونے والا ایک بھرپور مردانہ وجاہت سے بھرپور شخص تھا جس کے چہرے سے متانت، وقار اور جلال جھلک رہا تھا۔ اس کے بے داغ سوٹ نے اس کی شخصیت کو اور بھی نکھار دیا تھا۔

''السلام علیکم جی!'' فواز احمد آنے والے کی رُعب دار شخصیت سے خاصا متاثر ہو گیا تھا اس لیے اس نے بغیر تعارف کے ہی سلام کرنے میں پہل کی تو وارد جو کہ مراد خان تھے نے باوقار انداز میں جواب دیا۔

''وعلیکم السلام!'' مراد خان نے تنقیدی نظروں سے فواز احمد کا جائزہ لیا اور پھر بولے۔ ''فواز احمد؟''

''جی...... میں ہی فواز احمد ہوں۔'' فواز احمد کا لہجہ باادب تھا۔

''آنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی برخوردار!'' مراد خان کا لہجہ اپنائیت سے بھرپور لگا تو فواز احمد کو حوصلہ ہو گیا۔

''جی نہیں...... اگر کوئی دقت ہوتی بھی تو یہاں آ کر جو سکون ملا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔'' مراد خان نے غور سے فواز احمد کی طرف دیکھا اور کمرے میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے اور فواز احمد کو بھی اشارہ کیا کہ وہ بھی بیٹھ جائے۔ فواز احمد کو اس کے اشارے کو سمجھتے ہی عمل بھی کرنا پڑا تھا۔

''انسان برسوں میں جوان ہوتا ہے۔ مگر تم تو مجھے بوڑھے لگ رہے ہو؟'' فواز احمد کو سمجھ نہ آئی کہ وہ مراد خان کی بات کا کیا مطلب لے۔ اس نے اس کی تعریف کی تھی یا اس کی پرسنالٹی سے جیلس ہو کر اس پر تنقید کی تھی۔ مگر وہ الفاظ کا کھلاڑی تھا اور مراد خان کی بات کا جواب بھی اسی انداز میں دینا تھا کہ جیت الفاظ کی ہی ہوتی۔

''میں اپنے وقت کو بہترین صرف کرتا ہوں۔ اسی لیے بوڑھا ہو گیا ہوں۔'' مراد خان اس کے بہترین جواب

سے عش عش کرنے لگے تھے اس سے پہلے کہ مراد خان کچھ بولتے فواز احمد پھر بولنے کی جرأت کر گیا۔
''مجھے معلوم ہے کہ تجربہ کار ہو گیا ہوں اور تجربہ کار ہی بوڑھا ہوتا ہے جسمانی طور پر وہ جوان ہی رہتا ہے۔''
''میں نے تو یہی سیکھا ہے کہ وہ انسان تعریف کا مستحق ہے جو علم کی طاقت کے ساتھ ساتھ شہرت غضب کو بھی زائل کرنے کی طاقت اور حوصلہ رکھتا ہو۔'' مراد خان شاید اس کا امتحان لینے آئے تھے۔ وہ ان کی بات سن کر ہولے سے مسکرایا اور بولا۔
''جس طرح محبت انسانیت کا دوسرا نام ہے بالکل اسی طرح علم بھی برداشت اور صبر کا نام ہے اور جناب مجھ میں برداشت کی اتنی قوت ہے جو مجھے طاقت دیتی ہے کہ میں کسی بھی میدان میں الفاظ کے ہاتھوں شکست نہیں کھا سکتا۔'' بھرپور جواب تھا مراد خان مسکراتے ہوئے اُٹھ کر کھڑے ہوئے تو فواز احمد بھی کھڑا ہو گیا۔
''مفلس ومحتاج کا ایماندار رہنا بہت مشکل ہے۔'' فواز احمد کی ذات پر طنز تھا یا اس بات کی وارننگ تھی کہ تم نوجوان ہو اور اس گھر میں تمہاری بننے والی شاگرد بھی خوبصورت اور نوجوان ہے۔ تمہاری نگاہوں کی پاکیزگی اور نفس کی ایمانداری ہی تمہاری حیثیت کی شناخت بتائے گی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔
''دولت مندی سے زیادہ کوئی بھی چیز ایمان کو متزلزل نہیں کرتی۔ میرے پاس دنیاوی دولت نہیں ہے بلکہ علم اور ایمان کی دولت ہے جس نے مجھے خوش حال بنایا ہوا ہے اور جس کے پاس علم کی دولت ہو وہ کبھی بے ایمان نہیں ہوتا جناب۔''
''میرا نام مراد خان ہے۔'' مراد خان نے فواز احمد کا باادب اور الفاظ سے بھرپور لہجہ سنا تو اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور میں روشنی کا باپ ہوں۔'' فواز احمد نے مراد خان کا ہاتھ تھام لیا تھا اور مراد خان کے آخری فقرے پر وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا رہے تھے اور فواز احمد کا ہاتھ بھی ہلا رہے تھے۔
''مجھے خوشی ہوئی تم سے مل کر...... اور امید بھی کرتا ہوں کہ جس کام کے لیے تم آئے ہو اسے ایمانداری سے سر انجام دو گے۔''
''ان شاء اللہ۔'' مراد خان باہر جانے لگے اور پھر واپس مڑتے ہوئے بولے۔
''فواز احمد! اس گھر کی ہر اینٹ اور ہر ذرہ مہمانوں کی قدر کرتا ہے۔ اگر تمہیں اپنی عزت افزائی اور قدر میں کوئی کمی نظر آئے یا محسوس ہو تو بلا جھجک کہہ دینا۔''
''جی ضرور۔'' فواز احمد پر ان کی رُعب دار شخصیت اور الفاظ کی دھاک بیٹھ گئی تھی اور پھر وہ اس عظیم الشان پراپرٹی کے مالک اور روشنی کے والد تھے فواز احمد کا مختصر جواب اور باادب لہجہ مراد خان کو بھی خاصا متاثر کر گیا تھا وہ کمرے سے باہر نکلے تو فواز احمد نے ایک طویل پُرسکون سانس خارج کی اور خود کو بیڈ پر گرا لیا۔
وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس گھر میں روشنی کے استاد کی حیثیت سے آیا ہے اس کا اچھا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ بہترین کمرہ اور بہترین ماحول مہیا کیا گیا ہے مگر ابھی تک روشنی اس سے ملنے کیوں نہیں آئی؟ یہ سوال اس کے دل کے نہاں خانوں سے اُبھرا تھا۔ وہ اتنی بے چینی سے روشنی کا منتظر کیوں تھا یہ بات یہ عمل اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ دروازے پر دستک سن کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ''کم ان'' کہتا ہوا دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلا تو وہ

بے اختیار اُٹھ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ روشنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی اس نے ٹراؤزر اور شرٹ پہن رکھی تھی اور گلے میں دوپٹہ تھا بغیر میک اَپ کے ہی وہ کوئی پری لگ رہی تھی۔ وہ اپنے ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح کھڑی تھی اور اس مانوس اجنبی کی طرف دیکھے جا رہی تھی جو اس کی نیندیں چرا گیا تھا دل کا قرار اور سکون برباد کر گیا تھا وہ اس کے سامنے یوں کھڑا تھا جیسے کوئی چور کٹہرے میں ہو۔ مگر فرق اتنا تھا کہ دونوں ہی اس وقت دل کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے تھے اور دونوں ہی ایک دوجے کے لیے چور تھے مگر جج کون تھا اس بات کا فیصلہ نہ ہو پایا تھا۔

فواز احمد نے پلکیں جھپکیں تو کھلی آنکھوں سے روشنی دل میں اُتر گئی۔ دونوں کی دھڑکنیں ایک دوسرے کو پکار رہی تھیں۔ فواز احمد یہاں پر استاد بن کر آیا تھا مگر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا تھا جبکہ روشنی سیکھنے کے لیے فواز احمد کو یہاں تک لائی تھی وہ کچھ بھی نہ سیکھ پائی تھی کہ سب کچھ ہار بیٹھی۔ کیونکہ ابھی تک کلاس ہی شروع نہ ہوئی تھی مگر امتحان شروع ہو گیا تھا۔ اب فیل اور پاس کا نتیجہ آنے میں کتنا وقت درکار تھا اس بات کا اندازہ استاد اور شاگرد کو نہ تھا۔

''السلام علیکم!'' روشنی کی گنگناتی آواز سنائی دی تو فواز احمد تخیلیاتی دنیا سے باہر آ گیا۔

''وعلیکم السلام! کیسی ہیں آپ؟'' وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا۔

''تھینک یو سو مچ سر فار کمنگ'' (Thank You So Much Sir For Coming) روشنی کے ہونٹوں سے گلاب جھڑے تو فواز احمد مسکرانے لگا اور بولا۔

''سیکھنے کی لگن اور پُرخلوص جستجو یقیناً کوئی طاقتور چیزیں ہیں۔''

''نہیں سر! یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ آپ میرے کہنے پر تشریف لائے۔'' روشنی کی گول گول آنکھیں فواز احمد کو اپنے دل میں گھر کرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ یقیناً خوبصورت اور سمارٹ تو تھی ہی لیکن انتہائی پُرکشش بھی تھی۔

''مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ جیسے لوگ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔'' فواز احمد بولا تو وہ استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگی تو فواز احمد کو اپنی بات واضح کرنا پڑی۔ ''میرا مطلب تھا کہ میری تحریروں سے آپ اتنا پیار کرتے ہیں کہ میرے لیے یقیناً یہ ناقابلِ بیان ہے۔'' وہ ہولے سے مسکرائی اور بولی۔

''آپ ہیں ہی اتنے اچھے کہ آپ سے پیار کیا جائے۔'' اب حیران ہونے کی باری فواز احمد کی تھی۔

''جی......'' وہ حیرت سے بولا۔

''آپ بہت اچھا لکھتے ہیں سر! میں تو کیا میری اور دوست بھی آپ کی فین ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے بات کو بدل گئی۔ ''آپ کو کوئی دقت تو نہیں ہوئی سر!''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنے بڑے گھر میں رہتی ہیں؟'' فواز احمد دل کی بات کو ہونٹوں پر لے آیا تھا۔

''یہ سب تو تقدیر کی تقسیم ہے سر! میں اس گھر میں پیدا ہوئی۔ یہ گھر میری پیدائش سے پہلے کا ہے۔'' روشنی

کا جواب بہت اچھا تھا۔ ''میں آپ کے لیے کھانا بھجواتی ہوں سر!'' وہ واپس جانے لگی تو فواز احمد نے اس کو پکارا۔

''روشنی.....'' وہ واپس پلٹی اور فواز احمد کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے نگاہیں جھکاتی ہوئی بولی۔

''جی سر!''

''میری وجہ سے کوئی خاص تکلف نہ کیجیے گا پلیز۔''

''ایسی کوئی بات نہیں سر! آپ بھی پلیز خود کو غیر نہ سمجھئے گا۔ بلکہ آپ اس فیملی کا حصہ ہیں۔'' وہ آخری فقرہ اس انداز میں کر گئی تھی کہ فواز احمد کے لیے سوال چھوڑ گئی تھی۔ اس فیملی کا حصہ؟ وہ ان چار الفاظ پر غور کرنے لگا۔ ''کتنی دیر تک.....؟'' وہ خود ہی بڑبڑایا اس نے اپنے بیگ میں سے اپنا لیپ ٹاپ نکال کر میز پر رکھا اور باقی سامان بھی طریقے سے رکھنے لگا۔ اس نے الماری کھولی تو اس میں نئی پینٹ شرٹس پریس کر کے ہینگرز میں لٹکائی گئی تھیں۔ فواز احمد حیران رہ گیا پھر خود ہی سر کو جھٹکتا ہوا مسکرانے لگا۔

''یہ یقیناً روشنی کے بھائی کا کمرہ ہوگا جو مجھے دیا گیا ہے۔ اس نے دوسرے خانے میں اپنے کپڑے نکال کر رکھے اور الماری بند کی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی اسے ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے محل میں کسی ملازم کو کیسے بلائے گا اس کی نظر ایک کونے میں رکھے ہوئے فریزر پر پڑ گئی وہ حیران بھی ہوا اور مسکرانے بھی لگا کہ بھوک لگی تو اندر کی آنکھ نے کیا کچھ ڈھونڈ لیا حالانکہ فریزر سامنے ہی پڑا ہوا تھا جسے وہ دیکھ نہ پایا تھا۔

○.....❖.....○

احمد فراز ابھی ابھی چینل سے واپس لوٹا تھا تو اس کو دولت بی بی کا حکم سننا پڑا اور وہ حکم طیبہ کے متعلق تھا کہ فراز اس کو یونیورسٹی چھوڑ آئے کیونکہ ارباب احمد کسی سیمینار کے سلسلہ میں ملک سے باہر تھے اور گاڑی عدیم کے استعمال میں تھی جبکہ دوسری گاڑی خراب تھی۔ حکم نامہ تو فراز کے حق میں تھا لیکن وہ تھکا ہوا تھا رات بھر جاگ کر اس نے ایک شو کی ریکارڈنگ کروائی تھی۔ وہ راستے میں ہی سوچ رہا تھا کہ جاتے ہی سو جائے گا لیکن ابھی تک مہارانی تیار ہو کر باہر نہ آئی تھی۔ احمد فراز کو طیبہ پر غصہ بھی آ رہا تھا اور وہ انکار بھی نہ کر سکتا تھا۔

طیبہ اندر سے آتی ہوئی دکھائی دی تو وہ یہ بھول گیا کہ وہ کہاں کھڑا ہے کیونکہ آج طیبہ نے سیاہ رنگ کی بجائے سفید رنگ کا اسکارف اوڑھ رکھا تھا یوں لگ رہا تھا کہ دودھ کو کسی سفید ململ سے ڈھانپنے کی کوشش کی گئی ہو۔ کیونکہ طیبہ کا اپنا رنگ دودھ جیسا سفید تھا اور پھر اس پر سفید اسکارف قیامت ڈھا رہا تھا۔

''ہیلو! کہاں کھو گئے ہو کزن!'' طیبہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی لہرائی تو وہ کھسیانا ہو کر مسکرانے لگا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ طیبہ اس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گئی تو احمد فراز کو ایک پیاری سی خوشبو کا جھونکا اپنے نتھنوں سے ٹکرانے کا احساس ہوا تو وہ آنکھیں بند کر کے لمبا سانس کھینچنے لگا۔

''اگر نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ۔ میں اکیلی ہی چلی جاتی ہوں۔'' طیبہ کا لہجہ شرارتی تھا۔ احمد فراز نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور بولا۔ ''اکیلی جانے کا شوق ہے؟ پتہ ہے یہ شہر انسانوں کا نہیں بھیڑیوں کا جنگل ہے۔'' اس نے گاڑی گھر سے نکال کر مین سڑک پر دوڑا دی تھی۔

''میں بھی کوئی کم نہیں ہوں۔ جنگلی بلی ہوں۔ سمجھے۔'' وہ ہاتھوں کے اشارے سے احمد فراز کو ڈراتی ہوئی بولی۔ تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''تمہیں کیا پتہ کہ تم کیا ہو؟'' وہ آہستگی سے بولا تھا اور طیبہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

''انکل کب آ رہے ہیں؟'' احمد فراز نے بات آگے بڑھائی تو وہ ونڈ سکرین سے پار سڑک پر دیکھتی ہوئی بولی۔

''کل آ جائیں گے۔ میں بھی ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن وہ مانے ہی نہیں۔'' اس کے الفاظ میں پچھتاوا تھا۔

''تم کیوں جانا چاہتی تھیں ان کے ساتھ؟'' گاڑی ایک سڑک پر مڑ گئی۔

''میں انڈیا دیکھنا چاہتی ہوں۔ سنا ہے خوبصورت کنٹری ہے۔'' وہ اس کی بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تو طیبہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سوری...... سوری کہتا ہوا اپنی ہنسی روکنے لگا۔

''اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟'' احمد فراز کو معلوم تھا کہ وہ مصنوعی غصے سے بولی ہے۔

''انڈیا...... خوبصورت کنٹری...... مجھے ہنسی تو اس بات پر آ رہی ہے کہ جانا ہے تو کسی یورپین کنٹری کی سیر کو جاؤ جو واقعی خوبصورت ہوتے ہیں۔ انڈیا تو ہمارے ملک جیسا ہی ہے۔''

''اللہ معاف کرے یورپ کے کنٹری سے۔'' وہ دونوں ہاتھ کانوں کو لگاتی ہوئی بولی تو احمد فراز پھر ہنسنے لگا۔

''جہالت اور بیہودگی میں وہ نمبرون ہیں۔''

''یہ تمہیں کیسے پتہ ہے؟'' گاڑی یونیورسٹی کے گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔

''میں نے پڑھا ہے اور سنا ہے۔'' وہ گاڑی سے اُترنے لگی تو احمد فراز بولا۔

''اگر میں آفر کروں کہ میرے ساتھ انڈیا چلو تو......؟'' وہ احمد فراز کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ گومگو کی حالت میں تھی اور کچھ لمحات یونہی گزر گئے تو وہ بولی۔

''نہیں...... کیونکہ انڈیا بھی ہمارے جیسے ملک کا نام ہے۔'' وہ گاڑی سے اُتر گئی تو خوشبو بھی احمد فراز کا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھا طیبہ کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ طیبہ نے اس کی آفر پر غور کرنے کا کہنے کی بجائے انکار کر دیا تھا اس کا مطلب ہے کہ وہ اس کے ساتھ کہیں بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ فراز بجھ سا گیا تھا لیکن یہ آغاز تھا کہ اس نے اپنے جذبات طیبہ تک پہنچانے شروع کیے تھے۔ شاید موقع ٹھیک نہ تھا یا پھر الفاظ مناسب نہ تھے۔ اس نے خود کو تسلی دی اور گاڑی واپس گھر کی جانب دوڑا دی۔

''ہائے طیبہ!'' وہ جیسے ہی کلاس میں داخل ہونے لگی تو اس کی واحد دوست حاویہ نے اس کو پکارا تو وہ رُک گئی اور مسکراتی ہوئی اس سے ملی حاویہ بھی اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے کی نورچشمی تھی وہ بھی ایک شاندار گاڑی میں آتی تھی بس طیبہ کو پوری یونیورسٹی میں وہی اچھی لگی تھی کیونکہ طیبہ کی طرح اس کا بھی کوئی لڑکا دوست نہ تھا۔ وہ پوری یونیورسٹی میں مردم بےزار کے نام سے مشہور تھیں۔ لڑکے اکثر ان پر فقرے کستے تھے لیکن ان کی کسی بھی بات کا کبھی بھی ان دونوں نے جواب نہ دیا تھا بلکہ ان کی حرکات اور بدکلامی کو نظر انداز کر کے گزر جاتی تھیں۔

''ادھر آؤ میرے ساتھ۔'' حاویہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کینٹین کی جانب چل پڑی تو طیبہ بول پڑی۔

''کینٹین پر کیا کریں گے؟ ابھی تو ناشتہ کر کے آ رہے ہیں یار؟''

''تم کر کے آئی ہونا۔ میں نے نہیں کیا ناشتہ۔'' وہ اسے کھینچنے والے انداز میں کینٹین پر لے گئی۔ ''ایک اور بات بھی تمہیں بتانی ہے۔'' وہ کرسیوں پر بیٹھ گئیں تو لڑکے کو آرڈر دے دیا گیا۔

''اپنے لیے منگوانا...... میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔'' طیبہ نے کہا تو حاویہ مسکراتی ہوئی بولی۔

''چائے تو پیو گی نا؟''

''ہاں تھوڑی سی۔'' اس نے اپنا بیگ میز پر رکھا اور کہنے لگی۔ ''ہاں بتاؤ کیا بات کرنی ہے تم نے؟''

''پاپا اور مما کل آ رہے ہیں۔'' حاویہ نے کہا تو طیبہ کے چہرے کی رنگت زرد ہونے لگی۔ وہ مریل سی آواز میں بولی۔ ''کل؟'' حاویہ اس کی کیفیت کو سمجھتی ہوئی بولی۔

''ہاں کل یار! تم ان سے ملنے ضرور آنا۔''

''میں ان سے مل سکتی ہوں؟'' طیبہ کا سوالیہ انداز حاویہ کو حیران کر گیا۔
''آف کورس یار! کیوں نہیں مل سکتی وہ میرے ممی پاپا ہیں۔'' حاویہ اس کو سمجھانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔
''حاویہ! میں ان سے ملنا چاہتی ہوں ابھی.....'' طیبہ کی حالت عجیب ہونے لگی تو حاویہ نے اس کے ہاتھ پکڑے اور حیرت سے بولی۔''پاگل! میں نے کہا ہے وہ کل آرہے ہیں۔تم ان سے ابھی کیسے مل سکتی ہو؟'' طیبہ لمبی سانس لے کر رہ گئی۔اس کی آنکھیں نمکین پانی سے بھر گئی تھیں۔

لڑکے نے چائے وغیرہ ان کے سامنے رکھی تو حاویہ نے طیبہ کو ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔
''پاگل مت بنو۔اس طرح تو تم تماشہ بن جاؤ گی۔آنکھیں صاف کرو۔'' حاویہ نے اس کو ٹشو پکڑایا تو طیبہ اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔''میں جانتی ہوں کہ تم ان سے کیوں ملنا چاہتی ہو اور کیا پوچھنا چاہتی ہو۔ ری لیکس یار! چند گھنٹوں کی تو بات ہے۔'' حاویہ چائے پیتے ہوئے بسکٹ بھی کھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھی۔''دل کھول کر ما سے باتیں کر لینا۔''
''وہ مجھے بتائیں گی نا؟'' طیبہ کا انداز سہا اور سوالیہ تھا۔
''ضرور بتائیں گی۔ویسے کیا پوچھو گی تم ان سے؟'' حاویہ اس کا موڈ خوشگوار کر رہی تھی۔
''میری کیا مجال کہ وہاں کے بارے میں پوچھ سکوں......حاویہ؟'' طیبہ اس کے ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگی۔
''کیا میں وہاں جا سکتی ہوں؟''
''کیوں نہیں یار! تم پوچھ کیوں رہی ہو؟ تمہارا اپنا گھر ہے۔'' حاویہ اس کے رویے پر حیران ہو رہی تھی۔ وہ حاویہ کی بات سن کر نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔''تم سمجھ نہیں پا رہی ہو کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں؟''
''کیا؟ جو بھی بات ہے پلیز کھل کر کہو نا۔'' حاویہ کو وہ اس وقت نفسیاتی مریضہ لگ رہی تھی۔
''کیا میں اللہ کے گھر جا سکتی ہوں؟'' طیبہ بہت کرب سے گزر کر ان الفاظ کو ادا کر سکی تھی ان کی آنکھوں میں جھلمل کرنے والے آنسو چھلک پڑے تھے۔حاویہ کو اس کی یہ کیفیت حیران کن لگی۔وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ طیبہ اتنی جذباتی ہے۔

وہ تو اس کو یہ بتا رہی تھی کہ اس کے ممی پاپا! عمرہ کی ادائیگی سے واپس آرہے ہیں تم ان سے مل لینا۔لیکن وہ یہ نہ جانتی تھی کہ طیبہ دل میں عشق کا ایک طوفان چھپائے بیٹھی ہے وہ اللہ کی ذات سے اتنا عشق کرتی تھی کہ اس کے گھر جانے کے لیے اپنی ذات کو کسی بھی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے تیار تھی۔
''اللہ کے گھر تو سبھی جا سکتے ہیں طیبہ! اس کی رحمت کے دروازے تو ہر ایک پر کھلے ہیں۔تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟'' حاویہ نے بل ادا کیا اور طیبہ کا ہاتھ تھام کر اس کو گراؤنڈ میں لے گئی۔
''میں بہت گناہگار ہوں حاویہ! بہت گناہگار ہوں۔'' وہ پھر رونے لگی تو حاویہ نے اپنی انگلی کی پور سے اس کی آنکھیں صاف کیں اور بولی۔''اپنے آپ کو تماشہ مت بناؤ۔پلیز......ہم پھر بات کریں گے۔''
وہ اپنی آنکھیں صاف کرتی ہوئی اثبات میں سر ہلا کر حاویہ کے ساتھ کلاس روم کی جانب چل پڑی۔طیبہ خود حیران تھی کہ اس پر ایسی کیفیت کیوں طاری ہو جاتی تھی۔حالانکہ اس نے صرف ایک بار خواب میں ہی اللہ کے گھر کی

زیارت کی تھی اور وہ کئی راتوں کو بیت اللہ کی ہیبت سے سو نہ سکی تھی اس بات کا صرف دولت بی بی کو علم تھا کیونکہ وہ جب بھی تہجد کی نماز کے لیے طیبہ کو جگانا چاہتی تھیں طیبہ ان کو اپنے بستر پر جاگتی ہی ملی تھی۔اس کی نیندیں اور سکون سب کچھ بیقراری میں بدل گیا تھا۔اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اُڑ کر وہاں پہنچ جاتی۔

○……❖……○

شادی والے گھر میں خوب ہلا گلا ہو رہا تھا آج لڑکے کی مہندی تھی اور لڑکی والے مہندی لگانے آئے ہوئے تھے۔یہ ریبا کی کلاس فیلو امبرین کے بھائی کی رسم حنا کا موقع تھا ریبا اس فنکشن میں پیش پیش تھی وہ ضد کر کے اس فنکشن میں شرکت کے لیے آئی تھی امبرین اس کی بیسٹ فرینڈ تھی جبکہ دلہا ساحر تھا جو امبرین کا بھائی تھا وہ بھی ریبا کو امبرین کی طرح ہی سمجھتا تھا ساحر کا تعلق چونکہ صحافت سے تھا اس لیے اس کی شادی میں صہیب احمد کی شرکت بھی لازمی تھی کیونکہ ساحر،صہیب کے اخبار کا ایک اہم ترین صحافی تھا لیکن ساحر جانتا تھا کہ صہیب احمد خاصا مصروف اور ریزرو رہنے والا بندہ ہے وہ مہندی پر تو شاید نہ آئے اگر بارات پر بھی آیا تو چند منٹوں کے لیے ہی آئے گا۔لیکن وہ خاصا حیران رہ گیا جب صہیب احمد کو اس پنڈال میں آتے ہوئے دیکھا۔

ساحر حیرانگی سے منہ کھولے صہیب احمد کو دیکھ کر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن ابھی صہیب احمد اس تک نہ پہنچا تھا کہ کسی مہمان کے ہاتھوں سے کولڈ ڈرنک اُچھل کر اس کے قیمتی کوٹ پر گر گئی۔ساحر اس سچویشن کو دیکھ کر خاصا گھبرا گیا تھا مگر صہیب احمد جتنا بڑا آدمی تھا اس کا دل بھی اتنا ہی اچھا تھا اس نے مسکرا کر مہمان کی طرف دیکھا اور بولا۔''آئی ایم سوری! مجھے پتہ نہیں چلا۔'' وہ ٹشو سے کوٹ کو صاف کرتا ہوا ساحر کی جانب بڑھا تو ساحر خاصا شرمندہ اور نروس ہو رہا تھا۔''سر آپ؟'' وہ صہیب احمد سے ملتے ہی سوالیہ انداز میں بولا تو وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ مہندی کے موقع پر مجھے بھی انوائٹ کیا ہے آپ نے؟''صہیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آیئے سر پلیز!'' ساحر ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتا ہوا بولا تو صہیب احمد نے اپنے کوٹ کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔''میرا خیال ہے کہ مجھے اس داغ کو دھو لینا چاہیے۔''

''جی……کیوں نہیں سر! میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' ساحر اس کے ساتھ جانے لگا تو صہیب احمد نے سختی سے منع کر دیا۔''کیوں پٹو گے انکل سے۔تمہاری رسم حنا ہے اور تم ہی غائب ہو گے تو مہندی کس کو لگائیں گے۔'' صہیب احمد ارد گرد دیکھتے ہوئے بولا۔''یہ گھر اتنا بڑا تو نہیں ہے میں واش روم ڈھونڈ لوں گا۔پلیز……تم زحمت مت کرو۔'' پھر بھی ساحر نے اسے اشارے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کن کن جگہوں سے گزر کر جائے۔

صہیب احمد مسکان ہونٹوں پر سجائے ہوئے آگے کی جانب بڑھ گیا مگر لڑکیوں میں اس کی پرسنالٹی پر کانا پھوسی شروع ہو گئی تھی۔

صہیب احمد گراؤنڈ سے نکل کر عمارت میں داخل ہوا تو دائیں یا بائیں کا فیصلہ کرتا ہوا دائیں طرف چل پڑا۔ اچھی خاصی عمارت تھی جس میں ساحر احمد کے والد نے بہترین کنسٹرکشن کروا رکھی تھی وہ ایک کمرے کے سامنے سے گزرا تو اس کی نگاہ کمرے کے اندر پڑ گئی جہاں ایک لڑکی آئینے کے سامنے بن سنور رہی تھی۔وہ آگے بڑھ جاتا مگر خوبصورت ریبا کو دیکھ کر وہیں کا وہیں کھڑا رہا اور بڑی محویت سے اس کو دیکھنے لگا۔اتنی خوبصورتی اس نے شاید پہلے

نہ کبھی دیکھی تھی۔ ریبا اپنے کام میں مگن تھی وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ کوئی اس کو بہت محبت اور محویت سے دیکھ رہا ہے۔ وہ بالوں کو سنوارتی کبھی دوپٹہ اوڑھ کر آئینے میں دیکھنے لگتی اور کبھی جوتی کو دیکھتی۔

صہیب احمد اس کی خوبصورتی اور سادگی پر فریفتہ ہو گیا تھا وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ کس کام سے آیا ہے اس کا قیمتی کوٹ خراب ہو رہا تھا اس پر کولڈ ڈرنک کا داغ اپنا گھر بناتا جا رہا تھا۔ اس کو یہ بھی پرواہ نہ تھی کہ وہ کسی غیر کے گھر میں کھڑا ہے یا پھر اس کا سٹیٹس کیا ہے۔ یہ تو برا ہوا اس کے موبائل کا جس کی گھنٹی بے وقت کی راگنی کی طرح بجنے لگی تو وہ چونک پڑا اور اس کے ساتھ ساتھ ریبا بھی چونک کر اس کو دیکھنے لگی۔

وہ ہونٹوں پر زبردستی کی مسکان سجاتا ہوا کھسیانے انداز میں بولا۔ ''واش روم۔'' ریبا اس کی حالت سے محظوظ ہوتی ہوئی اس کے پاس آئی اور بولی۔ ''کیا آپ واش روم میں جا کر کال اٹینڈ کرتے ہیں؟'' ایک بڑا ہی زبردست جواب تھا جو کہ موقع پر صہیب احمد کو یہ بتا گیا کہ لڑکی ذہین بھی ہے اور چالاک بھی ہے۔

اس نے موبائل جیب سے نکال کر اس کو آف کر دیا اور ریبا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔

''موقع کی مناسبت سے کہی گئی بات فی البدیہہ فقرے اور خوبصورت لوگ میرے دل کے انتہائی قریب ہیں۔''

''اور کسی کو چھپ چھپ کر دیکھنا۔ بدتہذیبی کی علامت ہے۔'' ریبا دروازے سے گزر کر جانے لگی تو صہیب احمد مسکرایا۔

''میں اچھی بات غور سے سنتا ہوں اور حُسن پرست اتنا ہوں کہ خوبصورت تصویر بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔''

''میں اجنبیوں سے زیادہ فری ہونے کی قائل نہیں ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی مگر جاتے جاتے اپنا پراندہ گھما کر صہیب احمد کے منہ پر مار گئی۔ وہ اس لمحے کو اپنی آنکھوں میں قید کرنے کے لیے پُرسکون انداز میں سانس لینے لگا۔ وہ کوٹ صاف کیے بغیر ہی وہاں سے واپس چلا آیا۔

وہ ساحر سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے؟ اگر یہ ساحر کی بہن ہوئی تو؟ وہ خود ہی سوچ کر خاموش ہو گیا۔ وہ دل کی اس چورنی کو یونہی نہیں جانے دے گا۔ وہ اس کے ''گھر'' تک پہنچے گا۔ وہ چند ہی لمحوں میں اس کا چین چرا کر یونہی نہیں جا سکتی تھی۔

وہ پنڈال میں آ کر کھڑا ہو گیا تو اس کی آنکھیں رنگین کپڑوں میں ملبوس اجنبی لڑکی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ نگاہوں کو گھماتا ہوا ساحر کو دیکھنے لگا تو وہ آفت کی پرکالہ ساحر کے ہاتھوں پر مہندی لگا رہی تھی۔ صہیب احمد نے موقع غنیمت جانا اور سٹیج پر پہنچ گیا۔ ساحر نے اپنے والد اور والدہ سے اس کا تعارف کروایا اور امبرین سے بھی ملوایا تو اس نے پُرسکون سانس خارج کی کہ وہ جان لیوا اداؤں والی ساحر کی بہن نہ تھی۔

لڑکیاں ڈھولک پر گیت گانے لگیں تو ریبا بھی اپنا حصہ ڈالنے کے لیے گانے لگی تو صہیب احمد نے موقع غنیمت جان کر ساحر کے کان میں پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟'' ساحر کو اچنبھا ہوا تو صہیب احمد جھینپنے والے انداز میں اپنی صفائی بیان کرتا ہوا بولا۔ ''دراصل یہ مجھے اندر ملی تھی میں سمجھا کہ تمہاری بہن ہے۔ کیونکہ اس کا تعارف نہیں ہوا نا؟'' ساحر

اخبار کی دنیا کا آدمی تھا سمجھ گیا اور ہونٹوں پر شرارتی مسکان سجاتا ہوا بولا۔

''سر! یہ ڈاکٹر ارباب احمد کی چھوٹی صاحبزادی ریبا ہیں۔ امبرین کی خاص دوست ہیں اور آپ کو سپیشلی بتا دوں یہ مشہور ٹی وی اینکر احمد فراز کی فسٹ کزن ہیں۔''

''احمد فراز کی کزن؟''صہیب احمد کا انداز ایسا تھا کہ اس کی لاٹری نکل آئی ہو۔''کیا تم نے اس کو انوائٹ نہیں کیا؟''

''کیا ہے سر! لیکن مہندی پر صرف مخصوص لوگوں کو ہی بلایا ہے۔ باقی دوستوں کو کل بارات پر بلایا ہے۔ وہ بھی کل ہی آئے گا۔'' ساحر کا جواب سن کر صہیب احمد بڑبڑایا۔

''مقدروں والا ہے احمد فراز۔''

''جی......مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟'' ساحر کی توجہ چونکہ مہمانوں کی طرف تھی وہ صہیب کی بڑبڑاہٹ نہ سن پایا تھا۔

''ارے نہیں بس میں تو یونہی.....''صہیب احمد محویت سے ریبا کو دیکھنے لگا تو چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ریبا کی نظر بھی اس پر پڑ گئی۔ پہلے تو وہ آنکھ چرا گئی لیکن پھر اس نے امبرین سے صہیب احمد کے بارے میں دریافت کیا تو صہیب احمد کو واضح طور پر پتہ چل گیا تھا کہ اس کی بات ہو رہی ہے کیونکہ امبرین نے انگلی سے اس کی طرف ہی اشارہ کر کے ریبا کو بتانا شروع کر دیا تھا۔

صہیب احمد کو بار بار آفس سے فون آ رہے تھے۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ لیٹ نائٹ کی میٹنگ کو اٹینڈ کرے مگر کام بھی ضروری تھا اور یہاں ریبا نے اس کے دل کی دنیا لوٹ لی تھی۔ وہ اس چور کو اپنی آنکھوں سے اوجھل بھی نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔

وہ ساحر کے پاس سے اُٹھا اور اجازت طلب کی۔ کل پھر آنے کا وعدہ کر کے وہ وہاں سے نکلنے لگا تو بے اختیار ریبا کی آنکھوں نے اسے دل میں بسانے کی ٹھان لی اور انداز استفہامیہ تھا مگر صہیب احمد کو جلدی تھی وہ وہاں سے نکل آیا اور گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا اس نے سگار سلگایا اور دھوئیں کے مرغولے اس کو پھر ساحر کے گھر کے اس کمرے میں لے گئے جہاں ریبا اپنے آپ کو آئینہ میں دیکھ رہی تھی۔ جب اس کا پراندہ صہیب احمد کے منہ کو چھو کر گزرا تو وہ چونک گیا اور خود کو گاڑی میں پا کر خود ہی مسکرانے لگا۔

گھر آ کر بھی صہیب احمد کی نیندیں اُڑ چکی تھیں۔ ریبا کی خوبصورت مسکان اور گہری گہری آنکھوں نے اس کو دیوانہ کر دیا تھا۔ اسے اس بات کی بھی تسلی تھی کہ ریبا احمد فراز کی کزن ہے احمد فراز ایک مشہور ٹی وی اینکر تھا اور آج کل ایک مشہور ٹی وی چینل پر اس کا طوطی بول رہا تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ احمد فراز اور صہیب احمد ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھے تھے اور کلاس فیلوز بھی تھے اور انہی کا تیسرا کلاس فیلو ملک کا گمنام مصنف فواز احمد بھی تھا۔ تینوں ایک ہی کلاس میں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھ لکھ کر الگ الگ پہچان اور اپنے اپنے نصیب کے مطابق بھرپور زندگی گزار رہے تھے۔

موبائل پر بیل سن کر وہ چونکا تو وال کلاک پر نظر پڑ گئی گھڑی کی سوئیاں رات کے دو بجا رہی تھیں اس وقت کال

دیکھ کر وہ حیران بھی تھا لیکن پریشان نہ تھا کیونکہ آفس یا کسی بھی مشہور شخصیت کا فون اس کو کسی بھی وقت آ سکتا تھا کیونکہ وہ ایک باخبر اخبار کا چیف ایڈیٹر تھا اور اخبار بھی وہ تھا جس نے دنوں میں ہی اپنی دھاک بٹھادی تھی اور پڑھنے والے اس کے سحر میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اس کامیابی کا کریڈٹ لینے کے لیے صہیب احمد نے دن رات خوب محنت کی تھی اور صحافت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ سچائی اور صرف سچائی کو ہی ترجیح دی تھی یہی وجہ تھی کہ آج اس کا نام دنیا بھر کے اخبارات کے چیف ایڈیٹرز کی فہرست میں اچھے مقام کے ساتھ درج تھا۔ کال ریسیو کی تو آفس سے فون تھا کوئی خبر ابھی ابھی آئی تھی اس کی تصدیق کے بعد اس کو پرنٹ کرنے کے لیے ایڈیٹر نے رائے مانگی تھی۔

اب جیسے تیسے کر کے اس نے اگلا دن گزارا اور رات کو ساحر کی بارات کے لیے تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھا تو موبائل پر ٹون دیکھ کر ہنسنے لگا کیونکہ ساحر کا ہی فون تھا اس نے کال ریسیو کی اور بتایا کہ وہ آ رہا ہے۔ عملے کو اتنی ہی بہت خوشی ہوتی ہے کہ مالک ان کی خوشیوں میں شریک ہو جائیں۔ صہیب احمد کو ساحر کی شادی سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی اگر وہ کل کی رات ریبا کے حُسن کا دیوانہ نہ ہو جاتا۔ وہ تو خود اُڑ کر تقریب میں پہنچنے کو بے تاب تھا۔

سہرا بندی ہونے والی تھی ساحر دلہا کے روپ میں سٹیج پر ایک صوفے کی کرسی پر براجمان تھا وہ کریم رنگ کی شیروانی اور کلاہ پہن کر شہزادہ لگ رہا تھا۔ وہ صہیب احمد کو دیکھ کر احتراماً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تو صہیب احمد نے مسکراتے ہوئے اس کو مبارک دی اور سلامی بھی پیش کر دی۔ وہ اس کے ساتھ ہی سٹیج پر بیٹھ گیا تو احمد فراز بھی مسکراتا ہوا ان کی طرف بڑھا لیکن صہیب احمد کی نظریں احمد فراز کے ساتھ آنے والی ریبا پر گڑھی ہوئی تھیں۔ وہ آج یوں لگ رہی تھی گویا کوئی پری اپنے دیس سے خصوصی طور پر زمین پر آئی ہو۔

''بڑی بڑی ہستیاں آج تو نظر آ رہی ہیں؟'' احمد فراز ساحر سے ملا تو صہیب احمد کو بھی جیسے ہوش آ گیا وہ بھی احمد فراز سے گرم جوشی سے گلے ملا۔ ''تم تو خود ہی عید کا چاند ہو گئے ہو۔'' صہیب احمد کا منہ ریبا کی طرف تھا جبکہ وہ احمد فراز سے گلے ملتا ہوا بات ریبا سے کر رہا تھا جس نے اپنی انگلی سے بالوں کی لٹ ماتھے پر سے ہٹائی تو اس ادا پر صہیب احمد قربان ہو کر رہ گیا۔ اس نے مخمور انداز میں آنکھیں بند کیں تو احمد فراز کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

''تمہیں کیا کوئی چاند ہو یا سورج ہو تم مگن رہو اپنے کام میں۔'' دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ریبا نے آگے بڑھ کر ساحر کو سلام کیا تو صہیب احمد کو شرارت سوجھی۔

''فراز! تم بہت کمینے ہو۔ شادی بھی کر لی اور بتایا تک نہیں۔'' احمد فراز اس کا اشارہ سمجھ کر ہنسنے لگا اور بولا۔

''مجھے پتہ ہے کہ تم ریبا کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو۔ بچو دس سال کا عرصہ تمہارے ساتھ گزارا ہے تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔'' حالانکہ ساحر حیران ہو رہا تھا کہ وہ رات کو ہی ریبا کے متعلق صہیب احمد کو بتا چکا ہے۔

''یہ ریبا ارباب ہیں۔ میری کزن ہیں لیکن چھوٹی، خاص بہن کی طرح ہیں۔'' ریبا کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں لیکن اس کی اداؤں کے تیر صہیب احمد کے دل کو گھائل کر رہے تھے۔

''ریبا ارباب؟'' صہیب احمد خاص ادا سے بولا تو احمد فراز نے ریبا کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''ریبا! یہ صہیب احمد ہیں۔ ایک نیوز پیپر کے مالک اور میرے بہترین کلاس فیلو۔'' ریبا نے ہونٹوں پر مسکان سجا کر صہیب احمد کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے اندر کی دنیا اتھل پتھل کر دی تھی وہ منہ کھولے اور آنکھیں جھپکے بغیر

ریبا کو دیکھنے میں محو تھا کہ امبرین نے آ کر ان سے سلام لی اور ریبا کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے لے گئی۔ سہرابندی شروع ہوگئی تھی۔ پنڈال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اور ساحر کے والدین بھی خاصے ہنس مکھ اور ملنسار تھے یہی وجہ تھی کہ مہمانوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔

بارات پاس ہی میرج ہال میں پہنچی تو لڑکی والوں نے بہترین اور پُر تپاک استقبال سے ان سب کے دل موہ لیے تھے۔ اچھا اور لذیذ کھانا سب باراتیوں کو یاد رہ گیا تھا۔ ساحر دلہن بیاہ کر گھر لے گیا تھا لیکن اس شادی سے ساحر کا فائدہ ہوا تو صہیب احمد کا نقصان ہو گیا تھا۔ اس کا دل چوری ہو گیا تھا۔ وہ ایک سمجھدار باشعور اور پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ اس کے کندھوں پر ایک بہت ہی حساس اور نازک ذمہ داری تھی جس کو وہ بخوبی نبھا بھی رہا تھا لیکن ریبا اس کی زندگی میں اس طرح داخل ہوگئی تھی کہ وہ اپنا آپ بھول رہا تھا۔

اس رات بھی صہیب احمد نے سگار پی پی کر گزاری اگلے دن کا اخبار دیکھ کر اس نے ایک طرف رکھ دیا تھا ویسے بھی اب دوپہر کے دو بج رہے تھے اور اخبار تو تازہ ہی اچھا لگتا تھا۔ وہ آفس چلا گیا تو کافی کام نبٹانے والے تھے جو اس نے سرانجام دیئے اور دو ایک میٹنگز بھی اٹینڈ کیں اور واپس چلا آیا۔ مغرب کی اذان ہو رہی تھی کہ اس کو خیال آیا کہ گھر والوں کی خیریت ہی دریافت کر لے کیونکہ وہ اسلام آباد میں اکیلا رہتا تھا دو تین ملازموں کے ساتھ رہنا اس کی مجبوری تھی کیونکہ مراد خان اپنا محل چھوڑ کر اس کے پاس نہیں آنا چاہیے تھے جبکہ اس کی جوان ماں صباء بیگم اپنی این جی اوز اور دیگر سرگرمیوں کی وجہ سے کبھی کبھار اس کے ہاں چلی آتی تھی۔ اس نے روشنی کے نمبر پر کال کی تو اس کی چہکتی آواز سنائی دی۔ ''السلام علیکم بھائی!''

''جیتی رہو۔ سدا خوش رہو۔ کیسی ہو؟'' صہیب احمد کا موڈ خاصا خوشگوار تھا اور دوسری طرف بھی اس کی ماں جائی روشنی تھی جو بھائی کی رگ رگ سے شناسائی رکھتی تھی اسی لیے تو وہ پھدکتی ہوئی بولی۔

''خیریت ہے بھائی! کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ آج تو اسلام آباد کا موسم خاصا خوشگوار لگ رہا ہے۔'' صہیب احمد ہنسنے لگا اور بولا۔ ''خزانہ تو ابھی دیکھا ہے۔ بس اس کی تلاش ختم ہوگئی ہے صرف ہاتھ لگنا ہی باقی ہے۔''

''واقعی بھائی؟'' روشنی پُر جوش اور حیرت بھرے خوشگوار انداز میں چلائی تھی۔ اس کی آواز اتنی زوردار تھی کہ صہیب احمد کو موبائل ایک سیکنڈ کے لیے کان سے دور کرنا پڑا۔ ''سچ بتاؤ بھائی وہ کیسی ہیں؟''

''کون کیسی ہیں؟'' صہیب احمد اس کو چڑانے والے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

''میری بھابی جان اور کون؟'' روشنی خوامخواہ ہی بات نہ کر رہی تھی بلکہ اس کو پورا یقین تھا کہ اس کے بھائی کو ضرور کوئی لڑکی پسند آ گئی ہے۔

''کم آن! تم بھی حد کر دیتی ہو۔ یہ قارون کے خزانے والی بات میں بھابی کا ذکر کہاں سے آ گیا ہے؟'' وہ روشنی کو چڑا رہا تھا یا پھر ریبا کے متعلق سوچنے کے لیے بات کو طول دے رہا تھا اس کو خود بھی ابھی سمجھ نہ آ رہی تھی۔

''بھائی!'' دوسری طرف سے روشنی کی شوخی سے بھرپور آواز اُبھر رہی تھی۔ ''میں جانتی ہوں کہ آپ کے لیے یہ خزانہ وزانہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر سب کچھ ہے تو وہ بھابی کی تلاش ہے بس۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''اس لیے کہ بابا اور بواء جس تواتر سے آپ کی شادی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور آپ ان کو بڑی ہوشیاری سے گھمار ہے ہیں۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ آج آپ کا موڈ بتا رہا ہے کہ اب بھابی کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔'' روشنی نے اپنی آخری بات پر اس قدر زور دیا گویا اس کی کہی ہوئی بات کی تائید ابھی کہ ابھی صہیب احمد کر دے گا۔

''اچھا یہ بتاؤ بابا کیسے ہیں؟ مما......'' صہیب احمد اس کی بات پلٹنا چاہتا تھا۔

''وہ سب ٹھیک ہیں۔ آپ کیسے ہو؟'' صہیب احمد کچھ کچھ کامیاب ہو گیا تھا۔

''وہ تمہارا ٹیچر آ گیا یا ابھی پہنچا ہی نہیں۔'' روشنی کچھ توقف کے لیے خاموش ہو گئی تو صہیب احمد کو دوبارہ ''ہیلو'' کہنا پڑا۔

''وہ آ گئے ہیں بھائی!''

''تو پھر تمہارا لہجہ اتنا اُداس کیوں ہے؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے نا کیونکہ وہ تمہاری خواہش تھی۔''

''خوش ہوں بھائی! اتنی خوش کہ اب موبائل پر کیسے بتاؤں؟'' روشنی ایک بار پھر روشن ہو گئی تھی۔

''اچھا بابا کو سلام کہنا۔'' صہیب احمد بات ختم کر کے ساحر کے ولیمہ پر جانے کے لیے تیار ہونا چاہتا تھا۔

''بھائی! کچھ تو بتاؤ نا پلیز۔'' روشنی پھر پٹڑی سے اُتر رہی تھی یا پھر چڑھ رہی تھی۔

''ابھی دیکھا ہی ہے بس اس سے آگے کچھ نہیں۔''

''بھائی...... بھائی...... آپ کو کیسی لگی؟'' روشنی تجسس بھرے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں کیوں بتاؤں؟ بائے......'' صہیب احمد نے کال منقطع کر دی اور ہنسنے لگا کیونکہ وہ تصور ہی تصور میں دیکھ رہا تھا کہ روشنی اس ادھوری بات پر اس کو کھا جانے والے انداز میں گھور رہی ہے اور بے بسی سے موبائل کو پٹخنے کے درپہ ہے۔

اس نے ساحر کو کال کر کے دعوت کا ایگزیٹ ٹائم پوچھا اور کچھ ٹائم ہونے کی بنا پر وہ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا تو ریبا اُچھل کود کرتی ہوئی سکرین پر دکھائی دینے لگی۔ اس نے لیپ ٹاپ کی سکرین کو چھو کر دیکھا تو خود ہی اپنی بے وقوفی پر ہنسنے لگا۔

تقریباً آدھا گھنٹہ یونہی گزار کر اس نے تیار ہونا شروع کر دیا تازہ شیو کر کے غسل کیا اور بہترین سوٹ زیب تن کر کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر خود کو تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ نوجوان تھا۔ اس نے گاڑی نکالی اور بینکوئٹ ہال پہنچ گیا۔ تقریباً سبھی مہمان آ چکے تھے۔ آج بھی ساحر اور اس کے ہنس مکھ والدین نے اس کا پُر تپاک مسکراہٹ سے استقبال کیا تھا۔ اس نے نئی نویلی دلہن کو نقدی کی صورت میں سلامی دی اور سٹیج سے اُتر کر ایک میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں ریبا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ بے چین و بے قرار دل کی بے ترتیب دھڑکنیں خود کو قرار اور ترتیب دینے کے لیے اپنے مسیحا کا منتظر تھیں۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کے بالکل سامنے سے ریبا مونگیا اور کالے رنگ کی دیدہ زیب ساڑھی میں ملبوس بڑے باوقار انداز میں چلتی ہوئی آ رہی تھی۔ آج وہ اکیلی تھی اس کے ساتھ احمد فراز نظر نہ آ رہا تھا۔ صہیب

احمد نے دیکھا کہ ریبا نے مسکرا کر ساحر کو سلام کیا اور دلہن کے گلے ملی اور پھولوں کا خوبصورت تحفہ ان کو پیش کیا اور سٹیج پر سے اُتر آئی۔

وہ اِدھر اُدھر امبرین کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ انجانے میں چلتی ہوئی صہیب احمد کی میز تک پہنچ گئی تھی وہ اس کی تکریم میں کھڑا ہو گیا تھا۔

''آپ کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں؟''صہیب احمد سے رہا نہ گیا تو وہ بول پڑا اس کے اس طرح بولنے سے ریبا چونک گئی اور مسکان ہونٹوں پر سجاتی ہوئی بولی۔

''میں امبرین کو دیکھ رہی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ بہترین جگہ ہے آپ یہاں بیٹھ کر بھی امبرین کو دیکھ سکتی ہیں۔''صہیب احمد نے ایک خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا تو ریبا ہچکچاتی ہوئی بیٹھ گئی تو صہیب احمد بھی بیٹھ گیا۔''احمد فراز نظر نہیں آ رہا۔''

صہیب احمد نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا تو ریبا اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی اس کے دل کی گہرائیوں تک اُترتی گئی۔ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''فراز بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں کہ آپ کم بولتی ہوں گی؟''صہیب احمد کو مختصر جواب سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ لیکن اسے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا کیونکہ اسے لگا کہ اس کی بات ریبا کو بُری لگی ہے۔

''سٹڈی کیسی جا رہی ہے؟''صہیب احمد ریبا کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔''پھر مختصراً جواب پا کر صہیب احمد نے خاموش ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ اتنی دیر میں امبرین نے ریبا کی کمر پر چٹکی کاٹی تو وہ ''اوئی'' کی آواز نکال کر اس کی جانب غصے سے دیکھنے لگی۔ امبرین نے صہیب کو سلام کیا اور ریبا سے مخاطب ہو کر بولی۔''نیا نو دن پرانا سو دن۔''

''بکواس بند کرو۔ یہ مثال تو بالکل ہی فضول ہے۔''ریبا مصنوعی غصے سے بولی۔

کھانا تیار تھا اس لیے ریبا اور امبرین وہاں سے چلی گئیں۔ صہیب احمد نے بھی تھوڑا سا کھانا کھایا اور ایک کولڈ ڈرنک کو گھونٹ گھونٹ پینے لگا تو ساحر اس کے پاس آیا۔

''سر کوئی چیز کی ضرورت ہو تو پلیز تکلف نہ کیجیے گا۔''

''ارے نہیں......نہیں تم زحمت نہ کرو۔ میں لے لوں گا۔''

''سر ایک زحمت ہے آپ کے لیے۔''ساحر خاصا نروس لگ رہا تھا۔

''کہو کہو کیا بات ہے؟''صہیب احمد اس کی جانب متوجہ تھا۔

''سر! وہ آج احمد فراز آ نہیں سکا۔ تو......ریبا اکیلی ہے......اگر آپ اسے جاتے ہوئے ڈراپ کر دیں تو......''

یہ تو صہیب احمد کے دل کی بات تھی جو ساحر شرمندگی سے کہہ رہا تھا۔

''نو پرابلم......مجھے تو کوئی اعتراض یا زحمت نہیں ہو گی۔ تم پلیز مس ریبا سے پوچھ لو۔''

''جی سر! میں ابھی آپ کو بتاتا ہوں۔''ساحر وہاں سے چلا گیا تو صہیب احمد کے دل میں خوشیوں کے

شادیانے بجنے لگے تھے۔لیکن پھر وہ یکدم ہی بجھ سا گیا۔"اگر ریبا نہ مانی تو؟" یہ خیال آتے ہی وہ ہال میں ریبا کو ڈھونڈنے کے لیے نظریں دوڑانے لگا۔تو دور کھڑی ریبا، امبرین اور ساحر اس کو کھڑے نظر آ گئے۔ غالباً ساحر نے اس سے بات کر لی تھی اب پتہ نہیں اس کا جواب کیا تھا۔صہیب احمد کی جان پر بن رہی تھی۔ وہ خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اب ساحر اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔صہیب احمد کے دل کی دھڑکنیں خاصی تیز ہو گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے سر! آپ جاتے ہوئے ریبا کو اس کے گھر ڈراپ کر جائیں۔" ساحر نے یہ نوید سنا کر صہیب احمد کی نسوں میں پارہ بھر دیا تھا۔وہ دل کی خوشی بیان کرنے سے قاصر تھا وہ خود پر بمشکل قابو پاتا ہوا بولا۔

"اوکے! آپ ریبا کو بھیج دیں میں بس نکلنے ہی والا ہوں۔" ساحر وہاں سے جا کر پھر ریبا اور امبرین کے پاس گیا اور صہیب احمد کا پیغام دیا۔وہ خود مہمانوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ریبا نے امبرین سے اجازت لی اور صہیب احمد کے پاس آ گئی۔وہ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"چلیں مس ریبا!" صہیب احمد کے مخاطب کرنے پر وہ اس کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا کر رہ گئی۔

صہیب احمد آگے آگے چل پڑا۔گاڑی نکال کر وہ لایا تو اس نے ریبا کے لیے اگلی طرف کا دروازہ کھول دیا لیکن ریبا نے پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھنے کی جلدی کی تو صہیب احمد نے کندھے اچکاتے ہوئے دروازہ بند کیا اور گاڑی گیئر میں ڈالتا ہوا مین روڈ پر لے آیا۔

"چوک سے دائیں طرف لے لیں۔" پچھلی سیٹ سے ریبا کی موہنی اور کوئل جیسی آواز پر صہیب احمد نے اثبات میں سر ہلا کر حکم کی تعمیل کرتے ہوئے گاڑی دائیں طرف موڑ لی۔

"آپ نے شیکسپیئر کو پڑھا ہے؟" صہیب احمد نے بات کا آغاز کیا اور بیک مرر سے پچھلی سیٹ پر دیکھا لیکن اس کی بات کا جواب نہ ملا تو وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے پھر بولا۔"وہ کہتا ہے کہ عورت کو محبت کے پانی سے سیراب کیا گیا ہے۔" اس بات پر بھی کوئی ردِ عمل ظاہر نہ ہوا تو وہ شرمندہ ہونے کی بجائے پھر بولا۔"آپ کی احتیاط مجھے اچھی لگی۔"

"احتیاط؟" اس بار ریبا کی آواز میں سوالیہ لہجہ بھی شامل تھا۔

"ہاں احتیاط......اجنبیوں سے بالکل فری ہو کر بات کرنا اور پہلی ہی ملاقات میں فری ہو جانا۔ یہ بے احتیاطی ہی تو ہے۔" صہیب احمد چاہتا تھا کہ گفتگو کا آغاز ہو جائے تاکہ گھر پہنچنے تک وہ ریبا کی صحبت سے جتنا بھی زیادہ ہو سکے لطف اندوز ہو جائے۔

"احتیاط اچھی بات ہے کیونکہ انسان کم بولے تو اچھا لگتا ہے اور بات بھی اچھی ہوتی ہے۔اور میں ویسے بھی اجنبیوں سے کم ہی بات چیت کرتی ہوں۔اور آپ پر اعتماد کرتے ہوئے ہی تو میں نے اتنی رات گئے آپ کے ساتھ گھر جانے کی حامی بھر لی ہے۔ مجھے خود پر اعتماد ہے۔چوک سے بائیں طرف ٹرن لے لیں۔" ریبا کی زبان چل نکلی تو صہیب احمد کے چودہ طبق روشن ہوتے ہوتے رہ گئے تھے کیونکہ چوک سے بائیں اور مڑتے ہی ان کا گھر آ گیا تھا گاڑی رُک گئی تو ریبا اُترنے سے پہلے آہستگی سے بولی۔

"میں باتونی نہیں ہوں۔"

''جی...... مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔'' صہیب احمد مسکراتے ہوئے بولا تو ریبا گاڑی سے اتر گئی صہیب احمد نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گیٹ پر بیل بجانے سے پہلے واپس مڑی اور پاس آتی ہوئی ''تھینک یو'' کہہ کر پھر واپس چلی گئی اتنی دیر میں گیٹ کھل گیا لیکن گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولنے والی ایک باوقار عورت تھی جن کی آنکھوں سے نیند کا خمار جھلک رہا تھا لیکن ان کے ہونٹوں پر ایک چوکیدار کی طرح فرض شناسانہ مسکان کی بجائے ممتا بھرا خلوص ڈھلک رہا تھا۔

صہیب احمد نے انہیں سر کے ہلکے سے اشارے سے سلام کیا تو وہ مسکراتی ہوئی ریبا کے ساتھ اندر کی جانب چلی گئیں اور پھر گیٹ بند ہو گیا۔ صہیب احمد کو وہ عورت ریبا کی ماں لگی تھی کیونکہ بیل بجانے سے پہلے ہی گیٹ کا کھل جانا اس بات کی علامت تھی کہ وہ عورت ریبا کے انتظار میں جاگ رہی تھیں اور کسی کھڑکی یا دریچے سے اس بات کی منتظر تھیں کہ ریبا فوراً آجائے اور جیسے ہی صہیب احمد کی گاڑی گیٹ پر رکی تو انہوں نے جلدی سے گیٹ کھول دیا اور ریبا کو مطمئن دیکھ کر ان کے چہرے پر بھی اطمینان کی جھلک نمایاں تھی۔

صہیب احمد کو اس عورت کے چہرے پر چھائے ہوئے وقار اور متانت نے خاصا متاثر کیا تھا۔ اس نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور گھر کی جانب بھگا دی اب وہ آرام کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ کافی تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔

○......❖......○

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے خیالات باغیانہ ہو رہے ہیں۔'' امیت چوہان بیٹے کے سامنے کھڑا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ انیل شرما اپنے بنائے ہوئے مجسمے کے سامنے کھڑا برش سے اس کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف تھا۔

''میرے کن خیالات سے آپ نے اندازہ لگایا کہ میں باغی ہو رہا ہوں۔ دھرم سے آپ کی فرمانبرداری سے، گھریلو حالات سے یا پھر کاروبار سے...... پتا جی!'' انیل شرما باپ کی جانب مڑتے ہوئے سوال کا جواب دینے لگا تو امیت چوہان چلتے ہوئے ایک شاندار کرسی پر بیٹھ گیا۔

''دھرم سے بغاوت کی بُو۔'' امیت نے کہا تو انیل شرما مسکرانے لگا۔

''دھرم کے معاملے پر میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا پتا جی! کیونکہ بحث گفتگو کی موت کا سبب بنتی ہے۔''

''اور دھرم سے دوری انسان کی عبرت ناک موت کا سبب بن جاتی ہے۔'' امیت چوہان کا دھیما مگر دھمکی آمیز لہجہ سن کر انیل شرما پھر مسکرایا اور بولا۔

''کیا آپ چاہیں گے کہ آپ کا اکلوتا بیٹا مر جائے؟'' یہ انوکھا اور اچھوتا سوال سن کر امیت چوہان یکدم کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے کہ اسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اس کے کچھ بھی بولنے سے پہلے انیل شرما پھر بولا۔ ''میں مذہب کا باغی نہیں بنوں گا پتا جی! اس بات کی فکر نہ کریں آپ۔''

''جس طرح مفلسی انسان کو کفر کے قریب لے جاتی ہے بالکل اسی طرح دھرم میں اپنی مرضی اور پسند کے خدا بنانے والے بھی دھرم کے وفادار نہیں رہتے اور ان کی سزا ایسی ہے کہ مجھے خوف آتا ہے۔'' امیت چوہان انیل شرما کو

سمجھانے والے انداز میں بول رہا تھا لیکن وہ یہ بھی غور کر رہا تھا کہ جوان اور اکلوتے بیٹے پر اس کی باتیں کچھ خاص اثر نہیں کر پا رہیں اور فی الحال تو اس کا سمجھانا بے سود ہی جا رہا تھا۔

''پتا جی! آپ جس مجسمے کو تراش کر اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں اس کو بھگوان کہتے ہیں۔ اچھی بات ہے اور کہنا بھی چاہیے کیونکہ ہمارے دھرم کے مطابق سب کچھ اسی بھگوان سے ہی ملتا ہے۔'' انیل شرما باپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''دولت، روپیہ پیسہ، جاگیر، سٹیٹس، صحت خوشی اور غم وغیرہ وغیرہ۔ لیکن پتا جی! میں یہ سب کچھ آپ کے بنائے ہوئے بھگوان سے ہی حاصل کرنے کے بعد صرف ایک خوشی ایک خواہش ایک آرزو اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بھگوان سے کرتا ہوں اور آپ لوگ اس پر بھی تنقید کرتے ہیں۔''

''تنقید تمہارے مانگنے پر نہیں ہے تنقید تمہارے تراشے ہوئے بھگوان پر ہے برخوردار۔''

''پتھر کو کوئی بھی صورت دے لیں اس کو سجدہ کرنے سے وہ بھگوان ہی بنتا ہے۔'' انیل شرما بولا۔

''سب کچھ پا لینے کے بعد کس چیز کی کمی ہے جو تم اس لڑکی کے مجسمے سے پانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''آپ نہیں سمجھیں گے پتا جی!''

''مجھے سمجھاؤ نا؟'' امیت چوہان اپنے الفاظ پر زور دیتا ہوا بولا۔

''مجھے زندگی چاہیے پتا جی!'' بڑا ہی انوکھا جواب اور خواہش اس سے بھی زیادہ انوکھی تھی۔

''تم زندہ ہو۔ کبھی شراب کے نشے اور اس مجسمے کے حُسن کے سحر سے باہر نکلو تو تمہیں معلوم ہو کہ زندگی کیا ہے اور کتنی خوبصورت چیز ہے۔'' امیت چوہان انیل شرما کو مطمئن کر رہا تھا۔

''میں اس مجسمے کی عبادت نہیں کرتا ہوں۔ بلکہ یہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں اس کی پوجا کروں۔ اس کو سجدے کروں۔ اس کو سجاؤں، سنواروں اس کی ایک ایک چیز سے محبت کروں۔ پلکوں سے چوموں کہ ہونٹ اس کے وجود کو زخمی نہ کر دیں۔''

''یہ زندگی نہیں یہ تو موت کی وہ علامات ہیں جو مرنے والے کے وجود میں سرایت کر جاتی ہیں اور پھر اس کی زندگی کے آخری وقت مخبوط الحواسی کی شکل میں اس کی زبان سے الفاظ بن کر نکلنا شروع ہو جاتی ہیں۔'' امیت چوہان کو معلوم تھا کہ اس کا بیٹا پڑھا لکھا اور باشعور ہے اسی لیے تمہید باندھنا اس کی مجبوری تھی لیکن وہ خود پر قابو رکھنے پر مجبور تھا کیونکہ انیل شرما ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ آپ نہیں سمجھیں گے پتا جی! کہ زندگی کیا ہے؟''

''اپنی عقل کو کامل سمجھنے والا جہالت اور حماقت میں ہوتا ہے۔ اس بات کا علم تو ہو گا تمہیں؟'' امیت چوہان زچ ہونے لگا تھا۔ کیونکہ انیل شرما کے ہونٹوں پر اب بھی مسکان پھیلی ہوئی تھی۔

''میں نے سنا ہے کہ بادشاہوں کے دوستوں پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنا راز اپنے پاس رکھنے والا ہی بہترین شخص ہوتا ہے۔'' انیل شرما باپ کو سمجھانا چاہتا تھا لیکن فی الحال تو بحث طول پکڑتی نظر آ رہی تھی۔

''تمہیں کیا چاہیے۔ میں سب دینے کو تیار ہوں۔'' یوں لگ رہا تھا کہ امیت چوہان تھک گیا ہو۔

''مجھے سب نہیں چاہیے...... صرف...... صرف عشق چاہیے عشق۔'' انیل شرما کھو سا گیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں زندگی نہیں چاہیے۔'' اس بار امیت چوہان کے ہونٹوں پر مسکان تھی فرق صرف اتنا تھا کہ مسکان طنزیہ تھی۔

''عشق ہی تو زندگی ہے پتا جی!''

''درد اور تکالیف سے بھری عمر گزارنے کو تم زندگی کہتے ہو؟''

''جو مزہ اس درد اور تکلیف دہ زندگی گزارنے میں ہے وہ عیش وعشرت کی عمر گزارنے میں نہیں ہے۔''

''بدن پر ایک زخم لگ جائے تو رات بھر نیند حرام ہو جاتی ہے صاحبزادے! اور عشق تو آلام اور زخموں کی آماجگاہ کا نام ہے۔'' امیت چوہان بیٹے کی انوکھی خواہش پر حیران تھا۔

''کچھ زخم ایسے ہو جاتے ہیں جنہیں چھیڑنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ عشق بھی ایک راحت بھری تکلیف اور پُرسکون زخم کا نام ہے پتا جی!''

''کچھ زخم ناسور بن جاتے ہیں تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔''

''بس میں وہی زندگی چاہتا ہوں۔ عشق سے بھرپور زندگی۔ جس میں ہر زخم ناسور ہو۔ جس میں ہر زخم خود ہی مرہم بھی ہو۔ ایسی زندگی جس میں نیند خواب کو ترسنے لگے اور سکون سکون حاصل کرنے کے لیے دربدر بھٹکتا پھرے اور......''

''بس انیل شرما بس۔'' امیت چوہان کی برداشت جواب دے چکی تھی اس نے انیل کی بات کو کاٹتے ہوئے درشت لہجے میں کہا تو وہ باپ کی طرف معصومیت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''زخموں کا سودا تو میں کر رہا ہوں پتا جی! آپ کا لہجہ کیوں گھائل ہو رہا ہے؟''

''تم امیت چوہان کے بیٹے ہو۔ وہ امیت چوہان جس کے پیسے پر اس ملک کے کئی بینک چلتے ہیں۔ کئی خیراتی اداروں میں بہت سارا دھن ہم ہر ماہ بھیجتے ہیں۔ اور میں نہیں چاہوں گا کہ امیت چوہان کے اکلوتے بیٹے کے پاگل ہونے کی خبر باہر جائے اور وہ بھی کسی ایسے ادارے میں باقی زندگی گزارے جو ہمارے ٹکڑوں پر پل رہا ہو۔'' امیت چوہان کا تلخ لہجہ اور سخت الفاظ انیل شرما کی سماعتوں میں زہر گھول گئے تھے وہ چلتا ہوا مجسمے کے سامنے آیا اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

''اگر تم نہیں ہو تو پھر یہاں کیوں ہو؟'' اس نے اپنے دل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''اک بار آ کر ان دنیادار لوگوں کو بتا دو کہ تم موجود ہو۔ میرا یقین میرا ایمان میرا عشق سچا ہے۔ میرے سچے عشق کی پاکیزہ گواہ بن کر تمہیں آنا ہی پڑے گا اور جب تک تم آنہیں جاتی میں تمہیں یونہی پوجتا رہوں گا۔ تمہاری اسی طرح پرستش کرتا رہوں گا۔ تمہیں گیت بنا کر یونہی گنگناتا رہوں گا۔ میرے ہونٹوں سے الفاظ نکلیں گے تو صرف تمہارے لیے۔ صرف تمہارا ہی نام پکاریں گے۔ صرف تمہارا ہی نام پکاریں گے اور آج سے تمہارا نام ''گیت'' ہے۔ تمہیں میرے علاوہ کوئی اور کبھی بھی نہیں گنگنائے گا۔ بس میں ہی تمہیں گنگناؤں گا گیت...... تمہیں آنا پڑے گا۔ میرے عشق کی خاطر۔ میری چاہت اور اعتماد کی ٹوٹتی ہوئی سانسوں کو زندگی دینے کے لیے تمہیں ایک بار آنا ہی پڑے گا۔ سنو گیت! میں نے تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔ میری چاہت سچی اور خلوص بے لوث ہے۔ میرا جذبہ اور احساسات تمہاری دید کے مرہونِ

منت ہیں۔ چلی آؤ گیت اک بار چلی آؤ۔'' اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے تھے۔ وہ اس مجسمے کے قدموں میں سر رکھ کر رونے لگا اور کہنے لگا۔

خزاں کے پھول ہی مجھ کو گلے لگائیں تو کیا کروں
کہ بن گئی ہیں رقیب بہار کی ہوائیں تو کیا کروں
عقیدت ہے مجھ کو آج بھی تیری پرستش سے
یہ دنیا والے اسے فسانہ بنائیں تو کیا کروں؟

O......❖......O

''تم ابھی بچی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ کا عشق کیا ہوتا ہے؟'' دولت بی بی نے سامنے بیٹھی ہوئی طیبہ کو دیکھا اور بولیں۔

''لیکن دادی! یہ کیسے پتہ چلتا ہے کہ انسان کو دنیاوی نہیں بلکہ اللہ کا عشق ہو گیا ہے۔'' وہ اپنے پاؤں نرم نرم گھاس پر رکھتی ہوئی بولی۔ وہ اس وقت گھر کے لان میں تھیں اور نماز فجر سے فراغت کے بعد اپنے پسندیدہ موضوع پر بات کر رہی تھیں۔

''یہ اللہ کی عطا ہوتی ہے وہ جب نوازنے پر آتا ہے تو بندہ اس کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ غیب کے خزانوں سے وہ اپنے بندے کی مدد کرتا ہے اور جو اللہ والا ہوتا ہے نا اس کو اپنے آس پاس کی خبر نہیں ہوتی۔''

''وہ کیوں دادی!'' وہ تجسس سے بولی۔

''کیونکہ اللہ والا اللہ کا بندہ ہوتا ہے پھر اس کا ناطہ دنیا سے ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اللہ کی یاد میں مگن رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا رونا ہنسنا سونا جاگنا اوڑھنا بچھونا بھی اللہ کی رضا سے ہوتا ہے۔ اسے خود کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔''

''دادی آپ نے اللہ کو دیکھا ہے؟'' دولت بی بی کو وہ ایک دم دس گیارہ سال کی وہ بچی لگی جسے اللہ کا نام سن کر اللہ کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے انہوں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور آسمان کی طرف نظریں اُٹھا کر کہنے لگیں۔

''میں تو وہ بدنصیب ہوں جو اللہ کا گھر تک نہ دیکھ سکی۔ اللہ کو دیکھنا تو بہت بڑی بات ہے۔'' دولت بی بی کی آواز نم ہو گئی۔

''آپ کیوں نہیں گئیں اللہ کے گھر؟ پاپا کے پاس پیسہ بھی ہے اور آپ ان سے کہہ کر جا بھی سکتی ہیں۔'' طیّبہ بھی گیلی آواز میں بولی۔

''تم تو پاگل ہو۔'' دولت بی بی کی آواز بھرا گئی اور بالآخر وہ اپنے لہجے پر قابو نہ رکھ سکیں۔ ''وہاں دولت والے تھوڑی جاتے ہیں۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر ان کے گالوں پر بہنے لگے۔ ''وہاں تو وہ جاتا ہے جسے اللہ پسند کرتا ہے۔ جسے وہ پسند کرتا ہے اسے اپنے گھر بلا لیتا ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بھی اللہ کے گھر پہنچتا ہے وہ اللہ کا مہمان ہوتا ہے؟'' وہ بچوں کی طرح باتیں کر رہی تھی حالانکہ اس کی تعلیم کے آخری ایام چل رہے تھے اور ڈاکٹر ارباب احمد اس کی شادی کے لیے فکر مند تھے۔ دولت

بی بی ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔
''اللہ کے مہمان بننا کائنات کا سب سے بڑا اعزاز ہے میری بچی!''
''دادی! آپ اللہ سے کہیں نا کہ مجھے اپنے گھر بلا لے۔ میں اس کے گھر کو دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اب طیبہ کی باری تھی آنسوؤں کو بہنے دینے کی۔ کیونکہ وہ جس محبت سے اللہ کا ذکر کر رہی تھی آنسوؤں نے ادب واحترام کے ساتھ اس کی آنکھوں کو باوضو کرنا شروع کر دیا تھا۔ ''میں اس کا پاک ومقدس گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اس عظمت والے رب کے عظیم گھر کو آنکھوں سے بوسے دینا چاہتی ہوں۔ دادی! آپ اللہ سے کہیں نا۔ وہ میری بات نہیں سنتا دادی! آپ اللہ سے بات کریں نا۔'' طیبہ کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے زاروزار آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے گلابی گال آنسوؤں کے پانی سے دھل دھل کر مزید چمکنے لگے تھے یوں لگ رہا تھا گویا کسی نے کشمیری سیب کو شبنم کے پانی سے دھوڈالا ہو۔
''وہ ضرور سنتا ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے۔ بس ہم ہی نکمے ہیں جو اپنی بات کہنے کا قرینہ نہیں جانتے۔ میری بچی! اپنی فریاد اس پروردگار کی بارگاہ میں پیش کرتی رہو۔ وہ بڑا بے نیاز ہے۔ بس دعا کرنا وہ ہمیں کسی آزمائش کسی امتحان میں نہ ڈالے۔ ہم بہت لاچار اور بے بس ہیں۔ اس کے کسی امتحان کے قابل نہیں ہیں۔ بس وہ اپنا رحم فرماتا رہے۔''
''میں ہر امتحان دے لوں گی دادی! ہر امتحان دینے کی سکت ہے مجھ میں۔'' وہ یکدم بولی تو نجانے کیوں دولت بی بی کا دل لرز گیا۔ وہ اسے اپنی گود میں چھپاتی ہوئی بولیں۔ ''ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ اس کے امتحان بڑے کڑے ہوتے ہیں بس اس کی مدد اور رحمت ہی درکار ہے ہمیں۔ اس کے کسی امتحان کے قابل نہیں ہیں ہم۔''
''دادی! اگر وہ اپنے گھر کی زیارت کے لیے مجھے کسی آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہے تو میں تیار ہوں۔ میں کہوں گی اللہ میاں جی! مجھے ہر امتحان میں آپ پورا پاؤ گے۔ بس ایک بار اپنا گھر دکھا دو۔'' وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔
دولت بی بی نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ وہ جب سے اپنی کلاس فیلو کے والدین سے مل کر آئی ہے جو عمرہ سے واپس آئے تھے۔ اس دن سے اس کی یہی کیفیت تھی۔ دولت بی بی نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ طیبہ کی اس کیفیت کا ارباب سے ضرور تذکرہ کرے گی۔ کیونکہ جوان بیٹی کی بات تھی۔ کل کو اس کا رشتہ بھی کرنا تھا۔ وہ اس بات کو لے کر کافی پریشان تھیں۔ جبکہ ریبا یا عدیم بھی تو ارباب احمد اور شمسہ کے ہی بچے تھے انہوں نے کبھی بھی ایسی باتیں نہ کی تھیں بلکہ اسلامی اور مذہبی موضوع پر بات ہی نہ کی تھی۔
اگلی صبح ارباب احمد کی ملاقات اپنی ماں سے ہو ہی گئی تھی وہ دولت بی بی کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ کیونکہ جو کیفیت دولت بی بی نے انہیں بتائی تھی وہ خود بھی ایک بار دیکھ چکے تھے اور ان کا فکر مند ہونا فطری امر تھا۔ ''اسے عمرہ پر لے جاؤ ایک بار'' دولت بی بی نے کہا تو ڈاکٹر ارباب احمد ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ ''اماں! ابھی اس کے ایگزام ہونے والے ہیں اسے چاہیے کہ پوری توجہ سے اپنے ایگزام دے پھر کوئی بات کریں گے۔''
''میں تو کہتی ہوں کہ اس کی شادی کرنے سے پہلے ایک بار اللہ کے گھر کی زیارت کروا دو۔'' دولت بی بی کو معلوم تھا کہ طیبہ کے آنسوؤں میں بھی کتنی تشنگی تھی اور اس کا کرب بھرا لہجہ کتنا شدت مند تھا۔

''اماں! وہ اکیلی کیسے جا سکتی ہے۔ میں بہت مصروف ہوں۔ آپ یا شمسہ بھی اگر اس کے ساتھ جائیں تو اکیلی عورتیں......'' وہ تذبذب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ''کیا کروں اماں جی!''

''میں اسے دلاسہ دیتی ہوں کہ وہ اپنے ایگزام پر پوری توجہ دے۔ اس کے بعد ہم پوری فیملی عمرہ کرنے کے لیے جارہے ہیں۔'' دولت بی بی نے تجویز دی تو ارباب احمد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''آپ کسی طرح تین چار ماہ کا وقت نکالیں۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ کوئی شیڈول ایسا بن جائے کہ ہم پوری فیملی ہی چلے جائیں۔'' وہ وہاں سے جانے لگے تو دولت بی بی نے پوچھا۔

''شمسہ کو طیبہ کی اس کیفیت کا معلوم ہے کیا؟'' ڈاکٹر ارباب احمد نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہاں سے چلے گئے۔ جبکہ دولت بی بی آسمان کی جانب ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنے لگیں۔

○......❖......○

فواز احمد کو تیسرا دن تھا اور آج اس نے روشنی کو ناول لکھنا سکھانا شروع کیا تھا۔ سب گھر والوں کی مشترکہ رائے سے ایک کمرے کو ان کے کلاس روم کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس کمرے میں بہترین صوفے لگا دیئے گئے تھے اور ایک وائٹ بورڈ بھی دیوار پر لٹکا دیا گیا تھا۔

فواز احمد کلاس روم میں وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا وہ ایک ایک چیز کا تنقیدی جائزہ لے رہا تھا۔ ہر ایک چیز اپنی جگہ پرفٹ اور پرفیکٹ تھی۔ یہ گھر والوں کے رہن سہن اور رکھ رکھاؤ کی دلیل تھی کہ ہر چیز میں ایک قرینہ جھلکتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ناول لکھنا یا شاعری سکھانا بالکل ایسے ہی تھا جیسے کسی مردہ سانپ کو دوبارہ زندہ کرنا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ یہ چیزیں سکھانے سے نہیں آتیں بلکہ اللہ کی عطا ہوتی ہے اور ان کی آمد کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔

لیکن وہ دل کے چور کو کیسے سمجھاتا کہ وہ بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں تک آ گیا تھا۔ اس نے ایک ہی سفر جو کہ چند گھنٹوں پر محیط تھا روشنی کے ساتھ کیا تھا اور اس سفر میں روشنی کا اس کے کندھے پر سر رکھ کر سو جانا اور اس کی تحریروں سے محبت کرنا ہی اس کو محبت میں مبتلا کر گیا تھا۔ وہ دن رات روشنی کے خواب دیکھنے لگا تھا وہ خود کبھی بھی روشنی کو کال نہ کر سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس روشنی کا کوئی رابطہ نمبر نہ تھا لیکن اس کو اپنے دوسرے پرستاروں کی طرح روشنی کی کال کا انتظار ضرور رہنے لگا تھا اور پھر ایک دن تقدیر اس پر مہربان ہو گئی اور روشنی کی کال آ گئی۔ پھر تو اس کی دھڑکنیں اپنی اوقات بھول گئی تھیں۔

لیکن یہاں آنے کے بعد فواز احمد کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ اسے اپنی اوقات میں رہنا ہو گا کیونکہ اس نے ان تین دنوں میں جتنا بھی گھر دیکھا تھا اس کے مطابق وہ آدھا گھر ہی گھوم پھر کر دیکھ سکا تھا اور وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ مراد خان کے دو ہی بچے ہیں۔ روشنی سے وہ مل چکا تھا اور صہیب احمد کو اس نے ابھی نہ دیکھا تھا اور دونوں ہی بچے اس شاندار جاگیر اور نا معلوم اور کتنی دولت کے وارث و مالک ہیں۔ یہی بات اس کو اس کی اوقات یاد دلانے کے لیے کافی تھی۔

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ ماہ تک یہاں سے چلا جائے گا اور واپس جا کر اپنی غربت کی دنیا میں کھو جائے گا اور روشنی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جائے گا۔ وہ اپنے اس فیصلے پر کتنا عمل درآمد کرنے والا تھا اس کا فیصلہ

آنے والے ایک ڈیڑھ ماہ میں ہونے والا تھا۔ ابھی تو فی الحال آج آغاز کا دن تھا اور کلاس روم کے دروازے پر دستک سن کر اس نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو روشنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موجود تھی۔

''مے آئی کم ان سر؟'' وہ اندر آنے کی اجازت مانگ رہی تھی لیکن فواز احمد اس کے سراپا میں کھویا ہوا تھا۔ وہ روشنی کو سر تا پا اس طرح دیکھ رہا تھا کہ کوئی حور جنت سے بغاوت کر کے زمین والوں کے دلوں کا سکون برباد کرنے اُتر آئی ہو۔

وہ سفید فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہنے پاؤں میں گولڈن چپل پہنے ہاتھ میں ایک نوٹ بک پکڑے منہ میں پنسل دبائے دروازے کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ سرخ یاقوتی ہونٹوں پر کوئی بھی لپ گلوز کی ضرورت نہ تھی سیب کی طرح سرخ گال ایسے دہک رہے تھے جیسے آگ میں کوئلے دہک رہے ہوں۔

''میں اندر آ سکتی ہوں سر!'' روشنی کی زوردار مگر اخلاقی آواز نے فواز احمد کا محویت بھرا انداز ختم کیا تو وہ کھسیانا سا ہو کر ہونٹوں پر مسکان سجا کر بولا۔

''پلیز...... یہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔'' روشنی اس کے ہاتھ کا اشارہ پاتی ہوئی اندر بڑھ گئی اور ایک بار پھر فواز احمد کے اشارہ کرنے پر صوفے پر بیٹھ گئی جب فواز احمد اپنی کرسی پر بیٹھا تو روشنی بولی۔

''سر! ایک بات کہنا چاہوں گی۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو؟'' اس کا انداز اجازت طلب کرنے جیسا تھا۔

''کہیے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' فواز احمد اس کی پہلے دن کی بات سننا چاہتا تھا کہ روشنی کا انداز اجازت طلب کرنے جیسا کیوں ہے؟

''میں شاگرد ہوں اور آپ استاد ہیں۔'' وہ بولی تو فواز احمد مسکراتا ہوا بولا۔

''لیکن ابھی تو کلاس سٹارٹ بھی نہیں ہوئی۔''

''آپ مجھے ''تم'' کہیں گے یا پھر روشنی کہیں گے۔''

''لیکن میں روشنی......'' روشنی نے اس کی بات کاٹ دی اور کہنے لگی۔

''پلیز سر! میں کچھ سیکھنا چاہتی ہوں اور میں نہیں چاہتی کہ آپ اس بات کو محسوس کرتے رہیں کہ آپ ایک بچی کو ٹیوشن دینے آئے ہیں اور وہ بچی بہت امیر باپ کی بیٹی ہے آپ اس کے باپ کی دولت اور جاگیر کے رُعب میں اس بچی کو بھی آپ آپ کہہ کر پکارتے رہیں۔''

فواز احمد ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا بولا۔ ''آپ ناول لکھنا کیوں سیکھنا چاہتی ہیں؟'' یہ پہلا سوال تھا جو ایک استاد نے اپنی اکلوتی شاگرد سے کیا تھا۔ نامعلوم طریقے سے ہی کلاس کا آغاز ہو چکا تھا۔

''میں نے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں اور اکثر یہ بھی پڑھا ہے کہ لکھنے والے نے اس میں سچ بیانی بیان کی ہے میں بھی چاہتی ہوں کہ اس قابل ہو جاؤں کہ کوئی مجھے اپنی داستان سنائے تو میں اس کو اپنے الفاظ میں لکھ کر صفحہ قرطاس پر بکھیر دوں۔'' روشنی نے پہلے سوال کا جواب استاد کو مطمئن کرنے والے انداز میں دیا تو وہ ہنسنے لگا اور بولا۔

''آپ کے اس عظیم الشان محل میں تو کوئی پرندہ بھی پَر مارنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ پھر آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ لوگ آپ کو اپنی داستانیں سنائیں گے آپ ان کے پاس نیچے زمین پر بیٹھ کر ان کے دکھ سکھ کی اس طرح شریک

بنیں گی کہ وہ اپنا سب کچھ ہی اُگل دیں؟''

''آئی ایم سوری ٹو سے (I Am Sorry To Say) ہم بھی انسان ہیں۔ آپ صبح ہی دیکھنا اس علاقہ کے لوگ بابا جان کے پاس اپنے مسائل لے کر آتے ہیں۔ اور بابا جان ان کے مسائل حل بھی کرتے ہیں۔'' وہ فواز احمد کی آنکھوں میں بے خیالی میں ہی دیکھ گئی تھی لیکن نظریں جھکانا شاید بھول گئی تھی یہی وجہ تھی کہ دھڑکنیں بے قابو ہو گئی تھیں۔

''دیکھ لیں گے؟'' فواز احمد کا جواب سن کر وہ نظریں جھکاتی ہوئی آہستگی سے بولی۔

''کیا دیکھ لیں گے سر!''

''میرا خیال ہے کہ سٹارٹ کیا جائے؟'' فواز احمد واپس جانے کے ارادے کو متزلزل ہوتے دیکھ کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوتا ہوا بولا تو روشنی بھی ''جی سر!'' کہتی ہوئی نوٹ بک کھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

O......❖......O
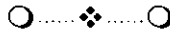
گھر کے سبھی افراد کھانے کی میز پر جمع تھے اور اتفاق سے صہیب احمد بھی گھر آیا ہوا تھا اور صباء بیگم کو بھی آج کچھ فرصت مل گئی تھی کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف تھی۔ زبیدہ آپا اور مراد خان بھی اپنی اپنی پسند کی ڈشز سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''کیسا جا رہا ہے ناول لکھنے کا عمل؟'' صہیب احمد نے روشنی سے پوچھا تو زبیدہ آپا اس کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑیں۔ ''کھانا تو خاموشی سے کھا لیا کرو۔ لکھنے پڑھنے کی باتیں کرنے کے لیے پوری رات باقی ہے۔''

''کیا کریں بوا جی! بہن بھائی کو کبھی کبھی تو موقع ملتا ہے اس طرح اکٹھے بیٹھنے کا۔''

''صہیب! آپا ٹھیک کہتی ہیں۔ یہ کھانے کی میز ہے باتیں پھر کر لینا۔ پہلے اچھی طرح کھانا تو کھا لو۔'' صباء بیگم نے بھی زبیدہ آپا کی بات کی تائید کی تھی۔ اس کے بعد کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ باری باری سب اُٹھ کر چلے گئے لیکن جب مراد خان اُٹھنے لگے تو زبیدہ آپا کی آواز پر ان کو رُکنا پڑا۔

''یہ گھر میں کیا نیا کھیل چل رہا ہے؟''

''میں سمجھا نہیں آپا؟'' مراد خان واقعی نہ سمجھ پائے تھے کہ زبیدہ آپا کا اشارہ کس طرف ہے۔

''یہ لڑکا کون ہے جو روشنی کو پڑھاتا ہے؟'' زبیدہ آپا کا تیکھا اور روکھا انداز ہمیشہ ہی مراد خان کو تکلیف دیتا تھا۔

''وہ روشنی کا استاد ہے۔'' مختصر جواب دے کر مراد خان یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس معاملے پر بحث نہیں کرنا چاہتے لیکن ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ زبیدہ آپا بال کی کھال نکال کر ہی چھوڑیں گی۔

''استاد!'' اس کے ایک لفظ ادا کرنے میں حیرت اور غصہ نمایاں تھا۔ ''اتنا جوان استاد اور جوان بیٹی کو اکیلا ہی کمرے میں پڑھاتا ہے اور ادھر آ کر براجمان بھی ہو گیا ہے۔ مراد خان آنکھیں کھولو۔''

زبیدہ آپا ایک ہی سانس میں اپنا غصہ نکال چکی تو مراد خان نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولے۔

''روشنی میری بیٹی ہے اور مجھے اپنے خون پر اعتماد ہے اور اعتماد ہو تو انسان ہر محاذ پر کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔''

''لیکن یہ کوئی محاذ نہیں ہے مراد خان!'' وہ اپنی بات پر زور دیتی ہوئی بولیں۔ ''یہ گھر کی عزت اور خاندان کی

غیرت کا معاملہ ہے۔''

''کون سا خاندان؟ اور کون سی غیرت؟'' مراد خان یکدم چنگھاڑنے والے انداز میں بولے گو کہ ان کی آواز بڑی بہن کے سامنے دھیمی اور لہجہ با ادب ہی تھا لیکن ان کے الفاظ اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ اپنا غصہ بمشکل قابو کر رہے ہیں۔

''کیوں؟ آج خاندان بھی یاد نہیں رہا تمہیں؟'' زبیدہ آپا کی طنزیہ بات نے مراد خان کے ہونٹوں پر بھی طنزیہ مسکان پھیلا دی وہ آگے ہوتے ہوئے بولے۔

''وہی خاندان! جس میں ایک شریف اور باحیاء بہو کو ایک سسر کے ساتھ ذلیل و رسوا کر کے نکال دیا جاتا ہے؟'' زبیدہ آپا کے چہرے کی بھی رنگت سرخ ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ''وہی خاندان جس نے میرا بسا بسایا گھر اُجاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہی خاندان جس نے مجھے آج تک کرب اور پچھتاوے کی سولی پر لٹکا رکھا ہے؟'' مراد خان کی آنکھوں میں پانی جگمگانے لگا تھا۔

''اگر اس کو چھوڑنے کا اتنا ہی پچھتاوہ ہے تو جاؤ جا کر اس سے معافی مانگو اور لے آؤ اس کو ایک بار پھر اس گھر میں گندگی گھولنے کے لیے۔'' زبیدہ آپا معذور نہ ہوتیں تو شاید اب تک اُٹھ کر جا چکی ہوتیں لیکن اب بات کے جواب میں مراد خان کی بات سننا بھی ان کی مجبوری تھی۔

''اگر میرے بس میں ہوتا تو وقت کی نبض اتنی زور سے دبا دیتا کہ اس کی سانسیں میرے اختیار میں ہو جاتیں اور میں وقت کو اپنی مرضی سے چلاتا ہوا اس کے قدموں میں گر جاتا اور اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا سودا کر لیتا۔''

''سودے بازی میں تو وہ بھی کافی ماہر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی اچھی آفر اسے واپس آنے پر مجبور کر دے۔'' زبیدہ آپا کی زبان زہر اُگلنے لگی تو مراد خان کرب سے بولے۔

''جس طرح میرا گھر ہے اسی طرح اس کا بھی ایک گھر ہوگا بچے ہوں گے؟''

''لیکن جو عیش و آرام اسے یہاں تھا وہ تو اس کے ساتھ نہیں ہوگا۔'' زبیدہ آپا نے کہا تو مراد خان طنز سے مسکرائے اور بولے۔

''جتنا دُکھ اور جتنی تکلیف اس نے اس محل میں برداشت کی ہے اب وہ اتنے ہی آرام اور سکون سے رہ رہی ہو گی۔''

''اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''وہ اس محل کی باسی ہی نہ تھی۔ وہ اگر ہمارے ماحول کی عادی ہو رہی تھی تو صرف اپنے ہونے والے بچے کی خاطر وہ اپنی بیٹی کی خاطر اس محل کی سازشوں کی شکار ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج یہاں نہیں ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ جہاں بھی ہوگی۔ سکون اور آرام سے ہوگی بہ نسبت اس سازشی محل کے۔'' مراد خان جانے لگے تو پھر بولے۔

''اگر میرا اور آپ کا خون کا رشتہ نہ ہوتا تو شاید میں بھی آپ کو زہر لگتا۔'' مراد خان زہر پینے کی کوشش میں چند قطرے اُگل ہی گئے تھے۔ وہ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکلے تو صباء بیگم پردے کے پیچھے سے نکل کر زبیدہ آپا

کے پاس آ گئی اور بولی۔

''یہی بات مجھے تکلیف دیتی ہے کہ مراد آج تک اس کمینی کو نہیں بھولے۔''

''تم فکر نہ کرو۔ اس کے دل و دماغ سے اس کو اس طرح کھرچ دوں گی جس طرح کسی زنگ آلود برتن کو ریگ مار سے کھرچتے ہیں۔''

''آپا! آج تک مراد نے ایک بار بھی مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔'' صباء بیگم اپنے ہونٹ کاٹتی ہوئی بولی تو زبیدہ آپا نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ صہیب اور روشنی اس کی محبت کی نشانیاں ہی تو ہیں۔''

''ایسی محبت کا کیا کرنا آپا جو بستر کی سلوٹ زدہ چادر پر چند بدبودار لمحوں کی محتاج ہو۔'' صباء بیگم کی آواز سے کرب کی جھلک نمایاں تھی۔

''کیا تم یہ معلوم کر سکتی ہو کہ اس وقت وہ کہاں ہو گی اور کس طرح زندگی گزار رہی ہو گی؟'' زبیدہ آپا کے سازشی اور شرارتی ذہن میں کوئی چال کی کھچڑی پک رہی تھی۔

''وہ کون آپا؟''

''مراد کی پہلی بیوی......'' زبیدہ آپا کی آنکھوں میں نفرت کے دیپ جلنے لگے تھے۔

''مجھے اس چڑیل سے کیا لینا دینا آپا! بس میں اپنی زندگی میں مزید زہر نہیں گھولنا چاہتی۔'' صباء بیگم نے فی الحال تو زبیدہ آپا کی جلتی پر پانی پھینک دیا تھا۔ وہ چلی گئی تو زبیدہ آپا خود ہی بڑبڑائیں۔

''مراد خان! تمہاری زندگی سے ابھی تک شمسہ نہیں نکل سکی۔ تم اس جوان لڑکے کو کیا سمجھو گے جو تمہاری عزت کا لٹیرا بن کر آ گیا ہے۔ میں یہ سب نہیں ہونے دوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔''

○......❖......○

''بھائی آپ وعدہ کریں کہ آپ ان کو تنگ نہیں کریں گے۔'' روشنی صہیب احمد کے ساتھ فواز احمد کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی اور صہیب احمد اس کو تنگ کر رہا تھا کہ وہ تمہارے استاد کا امتحان لے گا کیونکہ وہ اس ملک کا مایہ ناز صحافی تھا اور معلومات کا خزانہ اس کے دماغ میں جمع رہتا تھا۔ مگر روشنی اس کی لاڈلی بہن تھی اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ استاد جی کو کچھ نہیں کہے گا بلکہ صرف ملاقات کرے گا اور واپس چلا جائے گا۔

جیسے ہی وہ کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر پہنچے تو فواز احمد صہیب کو دیکھ کر حیران رہ گیا جبکہ یہی حالت صہیب احمد کی بھی ہو رہی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ......تو تم ہو استاد جی! توبہ یا اللہ توبہ! میں سمجھا کہ کوئی سمجھدار بندہ ہو گا مگر یہاں تو اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔'' صہیب احمد نے فواز احمد کو آگے بڑھ کر گلے لگایا تو روشنی کی حیرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ ''اور تم اس گھر کے سپوت ہو؟'' فواز احمد نے صہیب احمد کی طرف دیکھا اور بولا۔

''آف کورس یار! سنا کیسا ہے تُو...... بہت دیر بعد ملاقات ہوئی ہے۔'' صہیب احمد کرسی پر بیٹھا تو حیران و پریشان کھڑی روشنی خاموش نہ رہ سکی۔

''بھائی پلیز......کچھ مجھے بھی تو بتائیں نا؟''

''سکون سے بیٹھ جاؤ ابھی پتہ چل جاتا ہے۔''صہیب احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ روشنی فواز احمد کی طرف غور سے دیکھتی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اسے یہ اطمینان تھا کہ فواز احمد کے چہرے پر سکون تھا۔

''مس روشنی مراد خان!''صہیب احمد کہنے لگا۔''یہ آپ کے استاد محترم یعنی فواز احمد میرے کلاس فیلو ہیں۔ہم تین اچھے دوست تھے جو کلاس فیلو بھی تھے۔اللہ کا شکر ہے کہ تینوں ہی زندہ ہیں ابھی تک۔''

''بھائی! خدا نہ کرے آپ کو کچھ ہو؟''روشنی یکدم بولی۔

''صرف مجھے؟''صہیب احمد ہنستے ہوئے بولا۔

''تینوں کو۔''روشنی کی دھڑکنیں یکدم تیز ہوگئی تھیں کیونکہ فواز احمد نے جن نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا ان میں''کیوں''کا سوال ضرور تھا۔

''یہ کلاس میں بھی شاعری کرتا رہتا تھا اور میں کسی نہ کسی کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا اور تیسرا وہ احمد فراز اکیلا ہی بیٹھا کرسی کا انٹرویو کرنے لگتا تھا۔''ایک زوردار قہقہہ لگا تو روشنی بھی ہنسنے لگی۔

''فواز! یہ بتاؤ کیسی گزر رہی ہے زندگی؟''صہیب احمد کے اس سوال پر فواز احمد کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ایک انجانا خوف تھا جسے صرف فواز احمد ہی محسوس کر سکتا تھا۔وہ آہستگی سے بولا۔

''بس دیکھ لو تمہارے سامنے ہی ہوں۔''

''اچھا......ایسا کرتے ہیں کہ تم کچھ دیر بعد باہر لان میں آ جاؤ۔موسم بھی بہت پیارا ہے اور پھر چائے کا بھی موڈ ہے۔''

صہیب احمد نے فواز احمد سے کہا تو وہ ہونٹوں پر مسکان سجاتا ہوا بولا۔''او کے!''روشنی سمجھ گئی کہ اب صہیب احمد بھی اُٹھ کر چلا جائے گا اس لیے اس کا ایسے بیٹھے رہنا مناسب نہ لگتا تھا وہ ان سے پہلے کمرے سے باہر نکل گئی صہیب احمد جانے لگا تو فواز احمد نے اسے روک لیا وہ واپس مڑا تو فواز احمد کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''کیا ہوا؟''صہیب احمد نے پوچھا تو فواز احمد آنسو پینے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔

''میں تقدیر سے نہیں لڑ سکتا یار!''

''پاگل مت بنو۔روشنی دیکھے گی تو کیا کہے گی؟''صہیب احمد نے اسے حوصلہ دیا۔''کہو کیا بات ہے؟''

''تقدیر مجھے بار بار سائل بنا کر تمہارے دروازے پر کیوں لاتی ہے یار!''فواز احمد کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''تم میرے دوست ہو اور جانتے ہو کہ کلاس فیلو کا رشتہ کتنا بے لوث اور بے غرض ہوتا ہے اور پھر میں نے بھی تو تمہارے گھر کا نمک کھایا ہوا ہے۔مجھے اس طرح شرمندہ نہ کرو۔تم اپنے گھر میں ہو۔''صہیب احمد نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور باہر نکلتا ہوا بولا۔''اب دیر نہ کرنا......فوراً آ جاؤ۔''اور باہر نکل گیا۔

فواز احمد خواب میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ وہ اپنے کلاس فیلو اور محسن صہیب احمد کے گھر میں اس طرح پہنچے گا تقدیر اس کی بے بسی اور اپنی چال پر مسکرا رہی تھی۔وہ صہیب احمد کی بہن سے محبت کرتا تھا جو اس کا محسن تھا۔وہ اب واپس جانا چاہے بھی تو نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہ روشنی کو دل میں بسا چکا تھا۔لیکن ابھی تک روشنی کے دل کا پتہ نہ تھا کہ

اس کے تاثرات اور خیالات کیا ہیں؟
وہ صہیب احمد کے ملنے سے پہلے ہی مراد خان کی جاگیر و جائیداد کے رُعب سے واپس جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اب وہ عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ روشنی کو یوں چھوڑ کر نہ جا سکتا تھا۔ کیونکہ ابھی تو اسے کچھ بھی نہ پڑھایا یا سکھایا تھا اور پھر وہ صہیب احمد کو کیا جواب دے گا اگر وہ ابھی کے ابھی چلا جائے۔ اتنی دیر میں دروازے پر دستک ہوئی تو اسے یاد آیا کہ صہیب اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔ وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہتا تھا کہ کسی سے ٹکرا گیا اس نے درد سے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو ایک نرم و نازک ہاتھ نے اس کے ماتھے پر پیار کا لمس چھوڑا تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دیکھا تو سامنے روشنی کھڑی تھی اسے بھی چوٹ محسوس ہوئی ہو گی لیکن شاید وہ ضبط کر گئی تھی یا پھر چوٹ زوردار نہ تھی۔
''آئی ایم سوری سر! ایکچوئیلی......'' وہ اپنی غلطی سمجھتی ہوئی فواز احمد سے معذرت کر رہی تھی۔
''اٹس اوکے (Its Ok) کوئی بات نہیں۔ مجھے بھی احتیاط کرنا چاہیے تھی۔'' وہ خوش اخلاقی سے بولا تو روشنی نظریں جھکاتی ہوئی بولی۔
''صہیب بھائی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر واپس چلی گئی مگر جاتے ہوئے فواز احمد کے نتھنوں میں ایک خوشگوار خوشبو کا جھونکا محسوس کرنے کے لیے چھوڑ گئی تھی۔

O......❖......O

ہندوستان کی ایک بڑی ہیرا منڈی میں اس وقت بولی لگ رہی تھی بازار کافی گرم تھا نرم و نازک کلیاں جو نجانے کن گلستانوں سے لُوٹ کر یہاں تک پہنچائی گئی تھیں ان کی بولی لگانے والے ایک ایک کلی کو پکڑ کر سٹیج پر لاتے اور حرص و ہوس کے سوداگر ان کی قیمت لگاتے تھے۔ مول طے ہو جانے پر سوداگر کا مال اس کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ کروڑ پتی اور ارب پتی تاجر اپنی ہوس کی تشنگی بجھانے کے لیے اس منڈی میں آتے تھے اور اپنی پسند کا مال لے کر چلے جاتے تھے یا پھر چھوٹے چھوٹے شہروں میں ان نایاب ہیروں کو بہتر منافع لے کر فروخت کر دیتے تھے۔
ان میں سے ننانوے فیصد لڑکیاں مزاحمت کرتی تھیں اور وہ زبردستی سوداگروں کے ساتھ جانے کو تیار نہ ہوتی تھیں اور پھر ان کو بے ہوش کر کے گاڑیوں میں لاد کر پولیس کی ملی بھگت سے دوسرے شہروں میں بھجوا دیا جاتا تھا۔ ان میں سے بہت سی ایسی ہوتی تھیں جو انتہائی غریب گھرانوں میں پیدا ہونے کا جرم کر لیتی تھیں اور جوانی کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے تقدیر سے لڑتی رہتی تھیں جیسے ہی جوانی اپنا رنگ دکھاتی تھی وہ والدین کی مجبوریاں اور لاچاریاں پوری کرنے کے لیے تقدیر سے لڑنے کا فیصلہ کرتی کرتی خوفناک سفر پر روانہ ہو جاتی تھیں۔ ان کے چچا، ماموں، تایا اور دیگر نام نہاد رشتے ان کو دھوکے اور فراڈ سے اس منڈی تک لے آتے تھے پھر ان کی جوانی دیکھ کر اس کا مول لگایا جاتا تھا اور وہ گھر والوں کی تقدیر بدلنے کا ارادہ کرتی کرتی اپنی قسمت کو کوستی ہوئی کسی نہ کسی کوٹھے کی زینت بن جاتیں۔ یا پھر کسی نہ کسی ساہوکار اور دولت والے کی رکھیل بن کر اس کی جسمانی حرص کو پورا کرنے کے لیے اس کام کو ہی اپنا مقدر سمجھ کر صبر شکر کر لیتی تھیں۔ اچھا کھانا اور اچھا لباس ان کو ہر غم بھولنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ بھوک اور افلاس کی قید سے نکل کر جیسے ہی امارت اور دولت کی چکا چوند کا شکار ہوتی تھیں ان کو ماضی فراموش کرنے میں دیر نہ لگتی تھی۔

ان میں سے بعض ایسی بھی تھیں جن کو ''امپورٹڈ'' مال کہا جاتا تھا وہ دوسرے ملکوں سے اسمگل کر کے لائی جاتی تھیں وہ کالجز اور یونیورسٹیز سے اغوا کر کے راتوں رات سرحد پار کروا کے اس منڈی میں پہنچائی جاتی تھیں وہ انتہائی گھبرائی ہوئی ہوتی تھیں۔ ان کی بے بسی ان کے چہروں اور آنکھوں سے جھلکتی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھی۔ ان کا مول اچھا خاصا لگتا تھا کیونکہ ایسی حسین اور خوبصورت کھیپ مہینوں بعد ہی آتی تھی کیونکہ تعلیمی اداروں سے اغوا کی جانے والی لڑکیاں انتہائی خوبصورت اور جوانی سے بھرپور ہوتی تھیں۔ ان کے جسمانی خدوخال ہر ایک کو اپنی جانب متوجہ کرتے تھے اور ان کو فروخت کرنے والے کی چاندی ہی نہیں بلکہ سونا ہو جاتا تھا۔ وہ ایسا مال فروخت کرنے کے لیے اپنے رابطے استعمال کرتا تھا اور پورے ہندوستان کے ''دلالوں'' کو اطلاع دے دیتا تھا اور پھر جب ان ہیروں کی منڈی لگتی تھی اس میں چیدہ چیدہ خریدار ہی ہوتے تھے جو مال خرچ کرنے والے ہوتے تھے اور قدردان جوہری کی آنکھ بھی رکھتے تھے۔ وہ بڑھ چڑھ کر بولی دیتے تھے اور اپنی پسند کا مال ساتھ لے جاتے تھے ان لڑکیوں کو چند دن اپنی عیاشی کے لیے اپنے محلوں میں رکھتے تھے اور پھر جی بھر جانے پر ان کو آگے چھوٹے بازاروں میں بیچ دیتے تھے۔ یہ گھناؤنا اور غلیظ کاروبار اعلیٰ حکام کی ملی بھگت اور پولیس کے تعاون سے ہی فروغ پا رہا تھا۔

یہاں سے لے جانے کے بعد پھر چھوٹی چھوٹی منڈیوں میں اس شاندار مال کی پبلسٹی دلالوں کے چکنے چوپڑے الفاظ اور ان کے حیاء سے عاری انداز میں کی جاتی تھی۔ کسی کو ناچنے والی اور کسی کو گانے والی تو کسی کو جسم فروشی کے دھندے پر لگا دیا جاتا تھا۔ ان کی مجبوریاں، ان کی بے بسی اور لاچاری کو دیکھنے سمجھنے کی بجائے تماش بین تماشہ دیکھتے اپنا کام کرتے اور چلتے بنتے تھے۔ آج تک کسی بھی حکمران یا پھر اعلیٰ عہدیداران کو اتنی توفیق نہ ہو سکی تھی کہ ان منڈیوں کی تجارت بند کروا سکتا کیونکہ ان کا ڈالا ہوا گند بھی انہی بازاروں اور گلیوں میں موجود ہوتا تھا۔ یا پھر وہ اپنی جوانی کے بہترین ایام ان کوٹھوں پر گزار کر طوائفوں کے ہاتھوں بلیک میل ہو کر رہ جاتے تھے اور کوئی بھی بڑا عہدیداران پر ہاتھ ڈال کر خود کو بے نقاب نہ کرا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ مکروہ اور غلیظ دھندہ انتہائی عروج پر تھا اور دن بہ دن اس کام کو مزید عروج ملتا جا رہا تھا۔

اس عروج کو دوام بخشنے کے لیے امیر زادے نوابزادے اور بہت سے ''زادے'' پُرکھوں کی کمائی اُڑانے کے لیے شراب کا سہارا لے کر ان کوٹھوں کا رُخ کرتے تھے۔ گھنگروؤں کی جھنکار، طبلوں کی تھاپ اور ہارمونیم کے شوخ سازوں پر مجرا کا باقاعدہ اہتمام اس بات کی علامت ہے کہ آج کی رات بھی گاہک کافی ہیں اور ناچنے والی طوائف کی کافی ڈیمانڈ ہے۔ کئی بار کام اور ڈیمانڈ مجرے سے بڑھ کر ہو جاتی تو روپیہ بارش کی طرح برسنے پر نائیکہ کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔

باپ کو بیٹی کی پہچان نہ تھی اور بعض اوقات مکافاتِ عمل کا شکار عقل وفہم کے اندھے اپنی ہی بیٹی سے حرص وہوس کا سودا کر کے عظیم سوداگروں میں اپنا نام لکھوا کر فخر محسوس کرتے تھے۔

اس ملک کی سب سے بڑی منڈی میں ایک شاطرانہ ذہن اور کاروباری سوچ کا مالک عیار ترین دلال کافی مستعد اور چابکدستی سے کام کرنے کی وجہ سے ''سپیڈو'' کے نام سے مشہور تھا۔ پورے ملک کی طوائفوں سے اس کی شناسائی تھی اور وہ سب جانتا تھا کہ کون کہاں سے آئی ہے اور کس کی ''پیداوار'' ہے۔ وہ اس مارکیٹ کا ایک دلچسپ و

عجیب وامیر کردار تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کئی زبانوں پر عبور رکھتا ہے۔ وہ دیکھنے کو بظاہر ایک مسخرہ لگتا تھا لیکن اس کو قریب سے جاننے والے جانتے تھے کہ یہ کافی ہوشیار اور معلومات رکھنے والا ایسا روبوٹ ہے جو انسانی روپ میں اس منڈی میں چھوڑا گیا ہے۔

چھوٹے موٹے دلال اس کو استاد جی کہہ کر اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر کام شروع کرتے تھے اور وہ اپنے چیلوں کی بدولت ہر معلومات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا اور وقت آنے پر متعلقہ آدمی یا عورت کو اپنے کام کے لیے استعمال کرتا اور ناجائز فائدہ اُٹھا کر دن بہ دن امیر ہو رہا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ کسی بھی شہر میں کوئی ہیرا ہے تو وہ وقت ضائع کیے بغیر وہاں پہنچ جاتا اور اپنا کام کرنے پر واپس آتا تھا۔ آج بھی اس کی چاندی ہو رہی تھی کیونکہ ''امپورٹڈ'' مال آیا تھا اور ابھی اس کی بولی ہونے والی تھی۔

آہستہ آہستہ بازار گرم ہو رہا تھا رونق عروج پر پہنچ رہی تھی کاروباری حضرات آنا شروع ہو گئے تھے پنڈال بھرنا شروع ہو گیا تھا گاڑیوں کی لمبی قطاریں اس بات کی گواہی دینے لگی تھیں کہ جو سوداگر پچھلی مرتبہ اچھے مال سے محروم رہ گئے تھے وہ آج سب سے پہلے آئے ہیں اور اپنی جیبیں تھپتھپا کر اس بات کا اعادہ بھی کرتے نظر آ رہے تھے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے آج وہ خالی ہاتھ نہ لوٹیں گے بلکہ جتنا روپیہ ساتھ لائے ہیں وہ میلہ لوٹیں گے اور ''خیر'' لے کر ہی گھر کو جائیں گے۔

سٹیج لگ گیا تھا اور ابھی چند منٹوں بعد ہی مال بھی آنے والا تھا۔ سپیڈو نے سوداگروں سے ساز باز شروع کر لی تھی اور بیعانہ کی رقم لے کر اپنی جیب بھرنا شروع کر دی تھی۔ اعلان ہوا اور ایک خوبصورت بیس اکیس سالہ دوشیزہ کو بازو سے پکڑ کر سٹیج پر لایا گیا وہ سہمی ہوئی ہرنی کی مانند اپنے اردگرد پھیلے ہوئے خونخوار بھیڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے آنسو بہہ بہہ کر اس کے گالوں پر جم چکے تھے بکھرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے ہی سنوارنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ ہونٹوں کا سرخ رنگ اُڑ کر اس طرح ہو گیا تھا کہ جیسے خون جم گیا ہو۔ چہرے کی زرد رنگت ہلدی کی مانند ہو رہی تھی۔

''ایک لاکھ'' اچانک بولی شروع ہوئی تو اس نے اپنا بازو طاقتور سوداگر کے ہاتھ سے چھڑانے کی ناکام کوشش کی۔ بولی بڑھنے لگی تو وہ بے بس ہو کر سٹیج پر گر گئی اس کے چہرے پر پانی پھینکا گیا ہوش میں آنے کے بعد اس کی بولی مکمل ہو گئی تو ایک نوجوان امیر زادے نے اسے پکڑا اور اپنے ساتھ لے گیا۔ سپیڈو نے اپنا پیسہ کھرا کیا اور پھر دوسرے مال کی بولی لگنے لگی۔

اس طرح تین چار گھنٹوں تک بازار کافی گرم رہا کیونکہ امپورٹڈ مال تھا ان میں سے تو کچھ نے سکول کالجز اور یونیورسٹیز کی یونیفارم پہن رکھی تھیں اور دیکھنے میں ہی محسوس ہوتا تھا کہ ان لڑکیوں کا تعلق اچھے مہذب اور کھاتے پیتے گھرانوں سے ہے۔ ان کی بے بسی پر کسی کو بھی رحم یا ترس نہ آتا تھا بلکہ سوداگروں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ شراب کا کھلے عام استعمال ہو رہا تھا۔ ہیروئن اور دیگر نشہ آور اشیاء اس طرح فروخت ہو رہی تھیں جیسے کہ کوئی سالانہ میلہ ہو اور اس میں سٹال لگے ہوں۔

اس محدود یا لامحدود وقت میں تقریباً بیس ''ہیروں'' کی بولی لگ چکی تھی اردگرد کھڑی طوائفیں بھی اپنے کو ٹھے

کی رونق بڑھانے کے لیے اچھے سے اچھے مال کی بولی لگا رہی تھیں اور بعض اوقات تو کسی طوائف کی سُوئی کسی رئیس زادے سے اڑ جاتی تو پھر اس مال کی بولی ضد بازی میں کافی اوپر تک چلی جاتی اور بالآخر وہ مال رئیس زادہ ہی لے جاتا تھا کیونکہ طوائف اور دلال کی پلاننگ سے ہی اس مال کا ریٹ بڑھتا تھا۔ شام ڈھلنے سے پہلے ہی یہ بازار ختم ہو جاتا تھا اور بیوپاری اور سوداگر اپنے اپنے مال کے ساتھ واپس لوٹ جاتے تھے۔

○……❖……○

احمد فراز آج یونیورسٹی سے طیبہ کو لینے کے لیے گیا تھا۔ جیسے ہی وہ فری ہوئی باہر آ کر خلافِ توقع اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ خاموش خاموش لگ رہی تھی اس کے سفید اور گلابی چہرے کے گرد سیاہ اسکارف نے اس طرح گھیرا ڈالا ہوا تھا کہ چاند کو سیاہ بادلوں نے چھپانے کے لیے اپنی کوئی سازش تیار کی ہو لیکن انہیں ناکامی ہوئی کیونکہ چاند کی چاندنی کو رُوکنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چاند جیسے چہرے کے گرد سیاہ اسکارف اپنی ناکام کوشش کر رہا تھا لیکن پھر بھی احمد فراز نے اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بھانپ لیا کہ آج طیبہ کا موڈ کچھ خراب ہے اس نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور رش سے نکل کر آنے کے بعد طیبہ کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولا۔

''کیا بات ہے؟ کچھ اُداس لگ رہی ہو؟'' طیبہ نے شاید احمد فراز کی بات نہ سنی تھی اسے دوبارہ اپنی بات الفاظ بدل کر کہنا پڑی۔ ''مانا کہ کم بات کرنا بڑی حکمت ہے لیکن اپنی پریشانی دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا بھی اچھی بات ہے۔'' اس بار طیبہ نے اس کی طرف دیکھا تو آنکھوں میں اُداسی صاف نظر آنے لگی تھی جس طرح کسی تالاب کے صاف پانی میں سنہری مچھلی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی واضح نظر آ جاتی ہے بالکل اسی طرح طیبہ کی آنکھیں بھی اس کے دل کی کیفیت کی غمازی کر رہی تھیں۔

''میں اُداس نہیں ہوں۔ پریشان ہوں۔'' وہ دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تو احمد فراز سمجھ گیا کہ معاملہ گھمبیر ہے۔ وہ گاڑی کی رفتار آہستہ کرتا ہوا بولا۔ ''مجھے اپنی پریشانی نہیں بتاؤ گی۔''

اس نے سامنے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم کیا کر لو گے میری پریشانی جان کر۔''

''تمہیں پتہ ہے کہ دُکھ اور پریشانی بانٹنے سے کم ہو جاتے ہیں۔'' احمد فراز کے پاس بہت اچھا موقع تھا کہ وہ اپنے دل کی بات آج طیبہ سے کہہ سکتا تھا لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ اگر اسے بات مناسب نہ لگی تو وہ ارباب احمد کو بتا دے گی اور آج تک احمد فراز نے ان کی نظروں میں جو بھی امیج بنایا تھا وہ خراب ہونے کا خطرہ تھا اور پھر طیبہ کی ناراضی وہ کسی بھی قیمت پر مول نہ لے سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ احتیاط سے الفاظ کا استعمال کر رہا تھا کیونکہ یہ کوئی ٹاک شو نہ تھا بلکہ اس کے دل کا معاملہ تھا اور دل کے معاملات میں سامنے والے کی بات اور موڈ کی اہمیت ہوتی ہے۔

''فراز!'' وہ اس سے براہِ راست مخاطب ہوئی تو احمد فراز کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہوں۔'' وہ اتنا ہی کہہ پایا اور اپنے جذبات چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

''انسان ہونا کتنا بڑا جرم ہے اس بات کا اندازہ ہے تمہیں؟'' یہ عجیب سی بات تھی اس بات کا احمد فراز کی ذات

سے پتہ نہیں کیا تعلق تھا۔ یہ بات طیبہ نے آج اس سے کیوں پوچھی تھی یا کیوں کہی تھی۔ احمد فراز اس کا تعین کرنے میں ناکام ہی نظر آ رہا تھا لیکن جواب دینا بھی ضروری تھا۔

''انسان ہونا کوئی جرم نہیں ہے بلکہ ہمیں تو فخر ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں انسان بنایا ہے کیونکہ انسانیت نور کا دریا ہے۔ جو ازل کی وادیوں سے نکل کر ابد کی راہوں میں بہتا رہتا ہے۔''

''تو پھر انسان کا لفظ صرف مردوں کے لیے ہی مخصوص کر دینا ہماری تہذیب کا شرمناک جرم نہیں ہے کیا؟'' وہ اس بار بولی تو اس کی آواز روہانسی ہونے لگی تھی۔

''یہ سچ ہے کہ تمام مخلوقات میں سے اپنی خواہشات اور نفس کی غلامی کا محتاج انسان ہی ہے۔ حالانکہ انسان کی زندگی اس شمع کی مانند ہے جو ہوا میں رکھی گئی ہے۔''

''تو پھر نفسانی خواہشات انسان کو خونخوار درندے کے روپ میں کیوں بدل دیتی ہیں جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی زندگی کی لَو تھرتھرا رہی ہے اور وہ کبھی بھی بجھ سکتی ہے؟'' اتنا دُکھ اور کرب اس نے آج سے پہلے طیبہ کی آواز میں محسوس نہ کیا تھا۔ اس نے گاڑی ایک سٹور کے سامنے روک دی۔

''جو بھی بات ہے پلیز کھل کر کہو اور بتاؤ کہ کیا کھانا پسند کرو گی؟'' وہ اس طرح گاڑی رُک جانے پر حیران رہ گئی اور بولی۔ ''گھر چلتے ہیں اور جا کر کھانا کھاتے ہیں امی انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''کھانا بھی کھا لیں گے یار! چلیں کچھ لائٹ سا ہو جائے۔'' اتنی دیر میں اندر سے ایک ویٹر ٹائپ لڑکا آیا تو احمد فراز نے فش برگر لانے کو کہہ دیا۔ لڑکا چلا گیا تو طیبہ نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

''تمہیں کیسے پتہ کہ مجھے فش برگر پسند ہے؟'' یہ فقرہ بتا رہا تھا کہ اس کا موڈ ٹھیک ہو رہا ہے اور وہ جس انداز اور جس کیفیت سے یونیورسٹی سے نکلی تھی اب آہستہ آہستہ دھند کی طرح چھٹ رہی ہے۔

''جنہیں چاہا جائے ان کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔'' احمد فراز نے مسکراتے ہوئے کہا تو طیبہ کا دل دھڑک کر سینے سے ٹکرانے لگا وہ اس کی طرف آنکھیں نکالتی ہوئی دیکھنے لگی تو احمد فراز بے ساختہ و بے اختیار ہو کر ہنسنے لگا۔ طیبہ نے فائل اُٹھا کر اس کے سر پر مارنا شروع کر دی۔

''تم لازمی پٹو گے مجھ سے...... بدمعاشی کرنے لگے ہو میرے ساتھ۔'' وہ مار رہی تھی اور احمد فراز ہاتھ آگے کر کے اپنا بچاؤ کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ قہقہے بھی لگا رہا تھا۔

''قسم سے...... تمہارا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے مذاق کر رہا تھا۔ طیبہ! یار پلیز...... لگتی ہے یار...... مذاق کر رہا تھا۔'' وہ رُک گئی اور اس کی طرف دیکھتی ہوئی پوچھنے لگی۔

''سچ بتاؤ یہ بات کیوں کہی تم نے؟'' وہ ہنستا ہوا بولا۔

''یار! تمہارا موڈ فریش کرنے کے لیے کہی تھی۔ مذاق میں......''

''قسم کھاؤ۔'' وہ پھر آنکھیں نکال کر بولی تو اس بار احمد فراز کی ہنسی تھمتے تھمتے تھم ہو گئی۔ وہ سچی بات کو جھوٹ ثابت کرنے کے لیے قسم نہ کھا سکتا تھا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا تو طیبہ پھر بولی۔

''فراز! تم پھر پٹو گے۔ بتاؤ قسم کھا کر بتاؤ۔''

''میرا اعتبار کرو۔ میں مذاق کر رہا تھا۔'' وہ بات تو کر گیا تھا مگر اب سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

''تو پھر میری قسم کھاؤ۔ کہ تم مذاق ہی کر رہے تھے۔'' اس نے احمد فراز کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا تو احمد فراز کو واضح محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ لرز رہا ہے۔ اتنی دیر میں لڑکا ان کا آرڈر لے کر آ گیا۔ احمد فراز نے شکر کیا اور اس سے برگر لے کر پیسے ادا کر دیئے۔

''تھینکس!'' طیبہ برگر لیتی ہوئی بولی۔

''ویل کم.....'' احمد فراز مزید محتاط ہو گیا تھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ جیسے ہی برگر ختم ہو گا طیبہ پھر اس سے قسم لینے کے درپے ہو جائے گی۔ ساتھ فریش کولڈ ڈرنک نے برگر کا مزہ اور بھی دوبالا کر دیا تھا۔

''اچھا یہ تو بتا دو کہ تمہارا موڈ کیوں آف تھا۔'' احمد فراز طیبہ سے اس کی اُداسی کی وجہ پوچھنا چاہتا تھا۔

''یونیورسٹی ایک ماہ کے لیے احتجاجاً بند ہو رہی ہے۔'' وہ برگر کھاتی ہوئی بولی۔

''کیوں؟''

''جو لڑکیاں اغوا ہو رہی ہیں ان میں سے ایک کے والدین نے اپنی بیٹی نہ ملنے پر خودکشی کر لی ہے اور حکومت کچھ بھی نہیں کر رہی۔ اس لیے احتجاجاً یونیورسٹی بند ہو رہی ہے۔''

''اوہ ویری سیڈ! خیر تم پریشان نہ ہو۔ میں اس پر بھی ایک پروگرام کر رہا ہوں۔ متعلقہ وزیر صاحب کو اپنے شو میں بلا کر ان کی پھٹیاں اکھیڑ دوں گا۔'' وہ اسے دوبارہ ہنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ اب طیبہ کا موڈ پہلے سے کافی بہتر تھا۔

''اینکر ہی رہو۔ پنجابی فلموں کے وحشی نہ بنو۔'' طیبہ نے اس کے لفظ ''پھٹیاں'' اُکھیڑنے کو پکڑ لیا تھا۔ دونوں ہی اس بات پر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے اتنی دیر میں احمد فراز کے موبائل پر بیل ہونے لگی تو وہ نمبر دیکھ کر چونک پڑا کیونکہ شمسہ بیگم کال کر رہی تھیں۔ احمد فراز نے کال ریسیو کرنے کی بجائے موبائل طیبہ کو پکڑا دیا اس نے بات کر کے شمسہ کو تسلی دی کہ وہ راستے میں ہیں اور تھوڑی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔

''چلو فراز! جلدی سے چلتے ہیں۔ امی پریشان ہو رہی ہیں۔'' طیبہ نے برگر ختم کر لیا تھا اس کی بات پر احمد فراز نے بھی اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی گھر کی طرف دوڑا دی۔

احمد فراز جانتا تھا کہ دوسرے بچوں کی نسبت شمسہ چاچی طیبہ سے زیادہ پیار کرتی ہیں اور اس کا خیال بھی زیادہ رکھتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے سختی سے طیبہ کو منع کر رکھا تھا کہ وہ اکیلی کبھی بھی گھر نہ آئے اور نہ ہی بس میں آئے وہ خود گاڑی لے کر چلی جاتیں یا پھر احمد فراز کو کہہ دیتیں کہ طیبہ کو یونیورسٹی سے لے آئے۔

''آج تو بال بال ہی بچے ہو مسٹر فراز!'' احمد فراز نے دل میں سوچا اور خود ہی مسکرا دیا جبکہ طیبہ اس کی طرف دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

O.....❖.....O
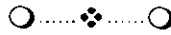
صہیب احمد کبھی کبھی کھانا کھانے کے لیے اس ریسٹورنٹ میں آ جاتا تھا۔ اکثر کھانا وہ گھر میں ہی کھاتا تھا کیونکہ اس کا خانساماں اچھے اور مزیدار کھانے بنانے میں طاق تھا۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے صہیب احمد اس ریسٹورنٹ کا

رُخ کرتا تھا۔ اس نے ویٹر کو آرڈر دیا اور ٹیبل پر بیٹھ کر کولڈ ڈرنک سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس نے دیکھا کہ ریبا اپنی چند دوستوں کے ساتھ ریستوران میں داخل ہو رہی تھی۔ صہیب احمد ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ چلتی ہوئی اس کے ساتھ والے میز پر بیٹھ گئیں۔ ان کے بیٹھنے کی ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ ریبا کی پشت صہیب احمد کی طرف تھی یعنی وہ دیکھ نہ سکتی تھی کہ اس کی پچھلی میز پر کون بیٹھا ہے۔ لیکن صہیب احمد ان سے بہتر پوزیشن پر تھا۔ اس نے وہ کرسی چھوڑ دی اور اس کرسی پر آ کر بیٹھ گیا جس کی پشت اس کرسی سے ملی ہوئی تھی جس پر ریبا براجمان تھی۔

''بولو جی کیا کیا کھاؤ گے؟'' ریبا کی شوخی سے بھرپور آواز اُبھری۔

''دیکھو بھئی ریبا ہمیں تو معلوم نہیں کہ کیا کیا کھانا ہے۔ تم میزبان ہو جو بھی کھلاؤ گی کھا لیں گے۔'' ایک لڑکی شوخی سے بولی تو سبھی ہنسنے لگیں۔

''تو پھر ٹھیک ہے تم بتاتی جانا۔ میں ویٹر کو آرڈر کرتی جاؤں گی۔'' ریبا خاصی شوخ ہو رہی تھی۔ اتنی دیر میں ویٹر صہیب احمد کا کھانا لے کر آ گیا۔ وہ سکون سے کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ تقدیر کی ستم ظریفی تھی کہ وہ ریبا کے ساتھ بیٹھا تھا لیکن اس کے ساتھ کھانا نہ کھا سکتا تھا۔ وہ تھوڑا سا مسکرایا اور آرام سے کھانا کھانے میں مگن ہو گیا لیکن ایک آواز نے اس کے کان کھڑے کر دیئے۔

''اچھا یار یہ تو بتاؤ پھر اس نے کیا کہا اور تم نے کیا کہا؟'' یہ ریبا کی کسی دوست کی آواز تھی۔

''کہنا کیا ہے؟ بس بولا۔'' کیا آپ کم بولتی ہیں؟'' ریبا کی اس بات پر قہقہے بلند ہونے لگے تو اردگرد میزوں پر بیٹھے لوگ ان کی طرف دیکھنے لگے لیکن ان کو کسی کی پرواہ نہ تھی۔ ''بس پھر کیا تھا میں جو اپنی آئی پر آ گئی۔ تو بس توبہ توبہ...... موصوف کے ہاتھ جڑوا دیئے۔'' صہیب احمد کو ایسا لگا کہ یہ اس کی ہی بات ہو رہی ہے۔

''پھر تمہیں ڈر تو لگا ہو گا کہ ایک انجان نوجوان کے ساتھ تم اکیلی اور پھر رات کا سفر؟'' ایک اور سہیلی نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا تو ریبا پھر بولی۔

''نہیں ڈر کیسا؟ وہ کوئی جن بھوت تھوڑی تھا اور نہ ہی مجھے کھا جاتا وہ۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ انجان اجنبی لیکن ایک بات ہے۔ بندہ وہ شریف ہے۔''

''پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی اس سے؟'' کسی اور نے پوچھا تو ریبا ٹھنڈی آہ بھرتی ہوئی بولی۔

''کہاں یار! کمبخت نیندیں چرا کر لے گیا ہے۔'' اس فقرے پر صہیب احمد کا دل اس زور سے دھڑکا کہ اگر وہ اپنے سینے پر ہاتھ نہ رکھتا تو شاید دل سینے سے باہر ہی آ چکا ہوتا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر وہ ریبا کو دیکھ کر بے چین و بے قرار رہتا تھا تو اُدھر بھی کچھ ایسا ہی پرابلم تھا۔ یہ بات صہیب احمد کے حق میں تھی وہ ریبا سے مل کر اپنی بے چینی و بے قراری کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کو اس طرح جواب مل گیا تھا کہ اس کی لاج بھی رہ گئی تھی۔ اس کو تو آج پہلی بار اس ہوٹل کے عملے پر پیار آنے لگا تھا جنہوں نے میز اور کرسیوں کی ترتیب اس طرح رکھی تھی کہ اس پر دل کا معاملہ کھول کر بیان کرنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ اور اسے اپنی بے قراری اور بے چینی کو دور کرنے کا جواز اور جواب بھی مل گیا تھا۔

''آرڈر لے کر اس طرح آنا جس طرح کھوٹا سکہ واپس آتا ہے۔'' ریبا شاید ویٹر سے واقف تھی۔ وہ چلا گیا تو

صہیب احمد بھی کھانے سے لطف ہوتا ہوا ارد گرد نظریں دوڑا کر اس بات کی تسلی کر رہا تھا کہ اس کا کوئی شناسا نہ ادھر نکل آئے ورنہ سارا مزہ ہی کرکرا ہو کر رہ جاتا۔ ابھی تک تو ہر طرف خیر ہی خیر تھی۔

صہیب احمد کے کانوں میں ایک اور دلکش آواز پڑی۔

''تمہیں سالگرہ کی مبارک ہو ریبا! بس اگر یہی پارٹی تم گھر پر رکھتیں تو ہم تمہارے لیے گفٹس بھی لے کر آتے اور کیک بھی کھاتے۔''

''کم آن یار! یہ سب فضول باتیں ہیں۔ میں ان پر یقین نہیں رکھتی۔ انسان جب ایک بار پیدا ہوتا ہے تو پھر اس کی زندگی کے دن بڑھنے کی بجائے کم ہی ہوتے رہتے ہیں۔'' ریبا کے سوچنے کا انداز اچھا تھا۔ صہیب احمد اس کو تو محض لاأبالی اور کھلنڈری لڑکی سمجھتا تھا۔ مگر وہ سمجھدار بھی تھی۔

''اچھا اگر وہ اب کبھی مل جائے تو پھر کیا کرو گی؟'' ایک اور سوال نے شاید ریبا کو مخمصے میں ڈال دیا تھا کیونکہ وہ خاموش ہو گئی تھی اور اس کی دوستوں سے زیادہ صہیب احمد کو اس کے جواب کا انتظار تھا۔ وہ بے چینی سے کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ ''بولو...... بولو ریبا......'' وہ اندر ہی اندر بولا تھا۔

''کرنا کیا ہے؟ دیکھیں گے اس کے تاثرات کیا ہیں؟''

''پھر آنٹی نے کچھ نہیں کہا تم سے اس طرح ایک اجنبی کے ساتھ رات کو آنے سے۔''

''نہیں میری مما ایسی نہیں ہیں وہ کافی برائٹ مائنڈڈ اور اچھی ہیں۔'' ریبا شوخی سے بولی۔ اتنی دیر میں کھانا آنا شروع ہو گیا تھا۔

پھر چند منٹ بعد پلیٹوں اور چمچوں کے کھنکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کھانا بھی کھا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے افیئرز کے بارے میں بھی تبصرہ کر رہی تھیں۔ صہیب احمد کھانا کھا چکا تھا لیکن وہ پُرسکون انداز میں بیٹھا رہا۔

اس کو اس بات کی ہی خاصی خوشی تھی کہ وہ ریبا کے ساتھ بیٹھا ہے چاہے ایک اجنبی کی طرح ہی کیوں نہ ہو۔ صہیب احمد نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر دیا۔ وہ کاغذ لے کر منیجر کے پاس گیا اور چند منٹوں بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاپی تھی جس میں اس کے کھانے اور ریبا کے کھانوں کا بل بھی تھا۔ اس نے وہ بل ادا کر دیا اور پُرسکون انداز میں بیٹھا رہا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ریبا نے بل منگوایا تو ویٹر نے صہیب احمد کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ آپ کا بل ان صاحب نے ادا کر دیا ہے۔ ریبا جیسے ہی واپس مڑی تو صہیب احمد کو دیکھ کر گنگ رہ گئی۔ اس کے چہرے کی ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' صہیب احمد باقاعدہ تالی بجاتا ہوا گانے لگا۔ ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ریبا۔''

ریبا کی دوست صہیب احمد کو دیکھ کر حیرانگی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

''آپ کی تعریف مسٹر؟'' ان میں سے ایک بولی تو ریبا گلا کھنکارتی ہوئی بولی۔

''یہ صہیب احمد ہیں جن کی باتیں ہم کر رہے تھے۔'' وہ صہیب احمد سے نظریں چراتی ہوئی بولی تو وہ مسکراتا ہوا

کہنے لگا۔ ''میں خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میری باتیں آپ کر رہی تھیں۔''

''آپ کو بل نہیں ادا کرنا چاہیے تھا۔'' اب صہیب احمد بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

''کیا مجھے اپنی برتھ ڈے میں شامل ہونے کا موقع نہیں دیں گی آپ؟''

''نہیں ایکچوئیلی...... بات دراصل یہ ہے کہ میں اس دن کو سیلی بریٹ نہیں کرتی۔ بس دوستوں کے ساتھ گپ شپ لگالی اور ہلا گلا کرلیا۔ یہی خوشی ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے لیکن دوسروں کو اپنی خوشیوں میں شریک نہ کرنا بھی تو زیادتی ہے۔'' اتنی دیر میں ویٹر پاس آیا تو صہیب احمد نے ریبا اور باقی لڑکیوں سے پوچھا۔ ''آپ لوگ کچھ اور کھانا پینا پسند کریں تو پلیز بلا تکلف کہہ دیں۔''

''نو تھینکس۔'' وہ یک زبان ہو کر بولیں تو صہیب احمد ہنسنے لگا۔

''ایکسکیوز می! ہمیں اجازت چاہیے۔'' ریبا نے دھیمے لہجے میں کہا تو وہ بزلہ سنجی سے بولا۔

''آف کورس! کبھی ایک کپ چائے پینے کا شرف بخشیں تو عنایت ہوگی۔'' ریبا نظریں جھکاتی ہوئی اپنی دوستوں کے ساتھ وہاں سے نکل گئی۔

صہیب احمد جس دن سے ساحر کی شادی سے واپس آیا تھا وہ تو ریبا کے ہی خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کو یہی معلوم تھا کہ وہ اس کے کلاس فیلو احمد فراز کی کزن ہے۔ وہ گھر بھی گیا تو روشنی کے بارہا اصرار پر بھی وہ کچھ نہ بتا پایا کیونکہ اس کو ریبا کے متعلق کوئی زیادہ معلومات نہ تھیں۔ وہ زیادہ دن گھر پر نہ رُک سکا اس کا خیال تھا کہ وہ اسلام آباد چلا جائے جو ریبا کی رہائش کا شہر ہے۔ کبھی نہ کبھی یا پھر کسی نہ کسی جواز کے تحت ریبا اس سے یا وہ ریبا سے مل پائے گا اور تقدیر نے آج اس کو بہترین موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس کی خواہش پوری ہوگئی تھی۔

اب وہ ریبا کا موبائل نمبر حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ پہلے تو اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ ساحر کی بہن امبرین سے پوچھ لے گا لیکن اس کو ایسا کرنا مناسب نہ لگا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ میز پر پڑا ہوا موبائل بولنے لگا وہ حیران ہو کر اس موبائل کو دیکھنے لگا جس کی سکرین پر ریبا کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اگر یہ نمبر ریبا کا تھا تو پھر یہ موبائل کس کا تھا۔ اس نے نمبر ذہن میں محفوظ کرلیا تھا اور چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ ریبا کی ایک دوست گھبرائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوئی تو صہیب احمد سمجھ گیا کہ موبائل اسی لڑکی کا ہے۔

''وہ ایکچوئیلی...... میرا موبائل ادھر ہی رہ گیا تھا اور ریبا نے کال کر کے کنفرم کیا کہ کسی دوست نے شرارت سے نہ چھپا لیا ہو۔'' وہ موبائل پکڑ کر تیزی سے باہر نکل گئی لیکن صہیب احمد کی بہت بڑی مشکل حل ہوگئی تھی۔ اس کو ریبا کا نمبر حاصل کرنے کے لیے نجانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے۔ لیکن تقدیر فی الحال اس پر مہربان تھی۔ اس نے ریبا کا نمبر اپنے موبائل میں محفوظ کیا اور دفتر کال کر کے اپنی مصروفیت کا شیڈول بنانے لگا۔

○......❖......○

فواز احمد نے کھڑکی کے پردے ہٹائے تو دھوپ چھن چھن کرتی اس کے کمرے میں اُتر آئی وہ باہر کے حسین موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے کھڑکی کھول کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا باہر تا حد نگاہ سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اس خوبصورت

علاقہ میں سیب کے درختوں کی بہتات تھی اور اخروٹ و دیگر خشک میوہ جات بھی اس علاقہ کی سوغات میں شامل تھے۔
دروازے پر دستک سن کر وہ اُٹھا اور دروازہ کھولا تو سامنے ایک ملازم چائے کا مگ ٹرے میں رکھے ہوئے احترام سے کھڑا تھا فواز احمد نے شکریہ کہہ کر وہ مگ لیا تو وہ چلا گیا۔فواز احمد واپس مڑا اور دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا واپس اپنی کرسی پر بیٹھ کر وہ سرد اور دل کو بھا جانے والے موسم کا نظارہ کرنے لگا تھا۔نیلگوں آسمان پر سیاہ بادل اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ان بادلوں کی نیت خراب لگ رہی تھی لیکن ابھی تک تو نیلگوں آسمانوں پر پرندوں کی ٹولیاں پرواز کرتی ہوئی اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں۔اس کی آنکھوں کو یہ منظر بہت بھلا لگ رہا تھا۔
وہ چائے کے ہلکے ہلکے گھونٹ بھرنے لگا تھا۔قدرت کی مہربانی سے وہ آج جس گھر میں پہنچا تھا وہ اس کے کلاس فیلو اور محسن صہیب احمد کا تھا۔صہیب احمد نے اس پر کافی احسانات کیے تھے۔جن میں سب سے بڑا احسان تو یہ تھا کہ فواز احمد کی والدہ کو کینسر تھا وہ اپنی ماں کے علاج کے لیے دوائی تک نہ لا سکتا تھا علاج کرانا تو دور کی بات تھی۔اس موقع پر صہیب احمد نے بہت سا روپیہ خرچ کیا لیکن ماں جی کے دن پورے ہو چکے تھے لہٰذا وہ کافی علاج کے باوجود بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔پھر صہیب احمد نے اس موقع پر بھی فواز احمد کی مدد کی تھی جب اسے فیس ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے کالج سے نکال دیا گیا تھا۔صہیب احمد نے اس کی فیس ادا کر کے اسے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھنے میں مدد کی تھی وہ آج جو کچھ بھی تھا صہیب احمد کا بہت بڑا ہاتھ اس کے مستقبل میں شامل تھا۔اس کی تان اس بات پر آ کر ٹوٹتی تھی کہ اگر وہ روشنی سے محبت کا سلسلہ آگے بڑھائے تو اس کے محسن کی عزت پر حرف آتا تھا اور وہ احسان فراموش اور کم ظرف کہلاتا تھا۔اگر وہ روشنی کو اس طرح بیچ دوراہے پر ہی چھوڑ جاتا ہے تو استاد شاگرد کا تقدس بھرا رشتہ ختم ہو جاتا تھا۔اور پھر ابھی تک تو روشنی کوئی ایسی بات یا اشارہ نہ دیا تھا کہ وہ بھی فواز احمد کی محبت میں گرفتار ہے یا پھر وہ اکیلا ہی یکطرفہ محبت کو پروان چڑھا کر دل میں روگ پال رہا تھا۔کیونکہ روشنی امیر باپ کی بیٹی ہے اور اکلوتی بیٹی ہونے کی بنا پر لاڈلی اور چہیتی بھی ہے۔اور ماں باپ کیسے چاہیں گے کہ ان کی بیٹی کا رشتہ ایک غریب مصنف سے ہو جائے جو صرف الفاظ سے کھیل کر ہی اپنائیت بھرنے کی تگ و دو میں مصروف رہتا ہے۔جس کی زندگی میں کبھی بھی کوئی بڑا جیک نہ لگنے والا تھا اور دور دور تک اس کے امیر ہونے کے چانسز بھی نہ تھے اس نے اپنی کم مائیگی اور روشنی کے سٹیٹس کو سوچا تو آنکھیں بھر آئیں۔اس نے شکوہ بھری آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور خود ہی مسکرا دیا۔
اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا تو اس کو اپنے پیچھے کسی عورت کے گلا کھنکھارنے کی آواز سنائی دی وہ چونک کر مڑا تو سامنے کھڑی صباء بیگم کو دیکھ کر حیران و پریشان ہو گیا۔اس سے پہلے اس نے صباء بیگم کو دیکھا نہ تھا وہ آج پہلی بار اس کمرے میں آئی تھیں۔بنا بازوؤں کے سیاہ رنگ کی قمیص پہنے کھڑی صباء بیگم غور سے فواز احمد کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں جبکہ فواز احمد کے ذہن میں آنے والا پہلا سوال یہی تھا کہ یہ عورت روشنی کی کوئی کزن ہے یا پھر کوئی ایسی مہمان ہے جس کا تعارف کروانا روشنی بھول گئی ہے۔
''میں تو سمجھی تھی کہ روشنی کا ٹیچر کوئی ادھیڑ عمر یا پھر مولوی ٹائپ کوئی بندہ ہو گا۔لیکن تم تو......'' وہ فواز احمد کو سر تا پا دیکھ رہی تھی اور فواز احمد نے دیکھ لیا تھا کہ صباء بیگم کی نظروں میں اس کی پرسنالٹی کے لیے پسندیدگی کے تاثرات تھے۔
''ابھی تو تمہاری اپنی سیکھنے کی عمر ہے مسٹر!'' وہ فواز احمد کو ''تم اور تمہارا'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی جو بات اسے فی الحال

تو نا گوار ہی گزر رہی تھی لیکن وہ مکمل تعارف ہو جانے تک خاموشی سے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ عورت کون ہے؟ اس کو روشنی نے نہ بھیجا ہو۔

''فواز احمد!'' وہ صباء بیگم کے اچانک خاموش ہو جانے پر اپنا نام بتانے کے لیے بولا تھا۔

''گڈ! جیسے کیوٹ خود ہو نام بھی ویسا ہی پیارا ہے۔'' صباء بیگم نے برملا فواز احمد کی تعریف کر کے اس کو مزید حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ ''کیا پڑھاتے ہو روشنی کو؟''

''میں پڑھاتا نہیں ہوں۔ سکھاتا ہوں۔ لکھنا سکھاتا ہوں۔'' وہ ادب کو ملحوظ خاطر رکھتا ہوا بولا۔

''کیا وہ چوتھی یا پانچویں کلاس کی بچی ہے جس کو تم لکھنا سکھاتے ہو؟'' وہ دلفریب ہنسی میں بولی تو فواز احمد کو اس کی ہنسی کی دل ہی دل میں داد دینا پڑی۔ صباء بیگم ایک کرسی پر بیٹھ گئی تو فواز احمد کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن وہ کھڑا ہی رہا اور دلچسپی سے اس محل کے اس دلچسپ اور خوبصورت کردار کو دیکھتا رہا۔

''روشنی کو کب سے جانتے ہو؟'' لہجہ محبت بھرا تھا۔

''جانتا ہی نہیں ہوں۔'' وہ برملا اعتراف تھا جو فواز احمد کی زبان سے نکلا تو صباء بیگم حیرانگی سے دیکھنے لگی۔ وہ پھر بولا۔ ''میں نے روشنی کو یہاں آ کر ہی دیکھا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس سے پہلے نہیں۔'' اس کو عجیب بھی لگ رہا تھا کہ وہ اس حسین عورت کے سوالوں کے جواب کیوں دے رہا ہے لیکن وقت گزارنے کے لیے یہ کھیل فی الحال اچھا اور دلچسپ بھی لگ رہا تھا۔

''آپ کی تعریف؟'' فواز احمد نے پہلا سوال پوچھا تو وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھتی ہوئی پاؤں کو ہلانے لگی اور بولی۔

''تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے میرے بارے میں؟'' اس نے فواز احمد سے اُلٹا سوال کر دیا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''میں گیس نہیں کر پا رہا کہ آپ روشنی کی کزن ہیں یا سسٹر ہیں یا پھر کوئی بہترین دوست۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسی تو فواز احمد کو یوں لگا کہ اس کے الفاظ ''نقرئی قہقہہ'' میں جان پڑ گئی ہو۔

''کیا کرو گے جان کر؟''

''بس یونہی اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہا تھا۔''

''تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟'' وہ اپنا تعارف پھر چھپا گئی تھی۔

''جی نہیں۔''

''مختصر بات کرنا اچھی بات ہے لیکن بعض اوقات یہ حرکت اور ادا بد اخلاقی کے زمرے میں بھی آتی ہے۔''

اسے فواز احمد کا مختصر جواب دینا شاید اچھا نہ لگا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کہ میں بد اخلاق نہیں ہوں۔''

''اوہ......'' وہ کرسی سے اُٹھتی ہوئی فواز احمد کی طرف بڑھی تو حیرت و استعجاب میں مبتلا فواز احمد کی سانسیں اوپر کی اوپر ہی رہ گئیں کیونکہ وہ اس کے کافی پاس آ گئی تھی اور آنکھیں بند کرتی ہوئی سانس اندر کی جانب کھینچتی ہوئی بولی۔ ''یہ کولون ہمیشہ سے ہی میری کمزوری رہا ہے۔ نائس......ویری نائس۔'' وہ واپس جانے لگی تو فواز احمد پھر بولا۔

''خوبصورت اور حسین لوگوں کی تعریف میری کمزوری رہی ہے۔'' وہ مسکراتی ہوئی واپس مڑی اور فواز احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوئی بولی۔

''میں اس کمرے میں آنے سے پہلے بہت کچھ سوچ کر آئی تھی لیکن جو کہنا تھا وہ کہہ نہیں پائی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ تم اچھے ٹیچر ہو۔ کیونکہ میں چند لمحوں اور چند باتوں میں ہی بہت کچھ سیکھ کر جا رہی ہوں۔'' وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی۔ لیکن فواز احمد کے لیے ایک معمہ چھوڑ گئی تھی۔ وہ حیرت سے کندھے اچکاتا ہوا اپنا لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ای میل اکاؤنٹ میں سے کچھ میلز پڑھیں اور کچھ کے جواب دیئے اور تھوڑا بہت اپنا ناول لکھا تو دوپہر کا وقت ہو چکا تھا لیکن وہ حیران رہ گیا جب بارش نے ٹھنڈی ہوا کو اس کی خبر گیری کے لیے اس کمرے میں بھیجا۔ اس نے اُٹھ کر کھڑکی سے باہر کا نظارہ کیا تو سبز لان پر بارش کے قطرے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے اسے بہت اچھے لگے۔

وہ کافی دیر تک سیاہ بادلوں سے برسنے والے پانی کو دیکھتا رہا اسے ایک بار پھر اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا وہ واپس مڑا تو سامنے کھڑی روشنی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور یہی کیفیت روشنی کی بھی تھی وہ شرمندہ ہو گئی اس کا انداز ایسا تھا کہ اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

''وہ...... سر...... میں نے دروازہ ناک کیا تھا۔ بٹ آپ......'' وہ اپنی صفائی بیان کرنے لگی تو فواز احمد کو اس پر بے پناہ پیار آنے لگا۔ وہ اس کو محبت سے دیکھنے لگا تو روشنی نے نظریں جھکا لیں۔

''سر!'' فواز احمد کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ گلا کھنکارتا ہوا بولا۔

''مس روشنی! یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ آپ جب دل چاہے جہاں بھی بآسانی بنا اجازت آ جا سکتی ہیں۔ ایسی بات کر کے مجھے شرمندہ تو نہ کریں۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو روشنی بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''کیا آپ کو ایسا موسم اچھا لگتا ہے۔'' فواز احمد نے بات شروع کی تو وہ آنکھیں اُٹھاتی ہوئی اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔ ''ایسے موسم تو انسان کو محبت سکھاتے ہیں۔'' فواز احمد کی نظروں میں استفسار دیکھ کر وہ شپٹاتی ہوئی کہنے لگی۔ ''میرا مطلب تھا کہ آسمان سے برسنے والی بوندیں زمین پر گر کر فنا ہو جاتی ہیں تو ان کا مقصد ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ زمین پر بسنے والی مخلوقات کو زندگی اور سکون بخشنے کے لیے اپنی قربانی دیتی ہیں اور سر! میں نے سنا ہے کہ قربانی محبت ہی محبت ہے۔''

''مس روشنی! آپ نے کس سے سنا ہے کہ قربانی محبت ہے؟'' فواز احمد اس کی اچھی بات سے بات نکالتا ہوا آگے بڑھنے لگا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

''آپ ہی کی ایک کتاب میں پڑھا تھا سر!''

''لیکن میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔''

''تو پھر آپ نے کیوں لکھ دیا؟''

''مجھے تو یاد نہیں۔''

''لیکن مجھے آپ کا لکھا ہوا ہر وہ لفظ یاد ہے جو محبت کی تشریح میں لکھا ہے۔''

''تو کیا آپ کو کسی سے محبت ہو گئی ہے مس روشنی؟'' اس سوال کے کرتے ہوئے فواز احمد کا دل اتنی زور سے

دھڑکا تھا کہ آواز سماعتوں میں محسوس ہو رہی تھی۔

روشنی اس سوال پر خاصی گھبرا گئی تھی۔ وہ چند لمحے فواز احمد سے نظریں چراتی رہی اور پھر لمبی سانس بھرتی ہوئی کہنے لگی۔ ''میں تو صرف سیکھنے کی حد تک کی بات کر رہی تھی سر!'' فواز احمد جانتا تھا کہ اس کے دل پر اتنی گہری چوٹ لگ گئی ہے کہ وہ اس چوٹ کی آواز کو چھپانے کے لیے اپنی آنکھیں زور سے بھینچ لینا چاہتی تھی وہ اس کی حالت سے خاصا محظوظ ہوتا ہوا بولا۔

''وری گڈ! سیکھنا اچھی بات ہے اور کسی چیز کا علم نہ ہو تو اس کے بارے میں معلومات نہ لینا بُری بات ہے۔'' روشنی نے ہمت کر کے ایک سوال پوچھا۔

''سر! کیا ایسا موسم آپ کی اندرونی کیفیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟''

''جی ہاں...... بالکل ہوتا ہے۔ کیونکہ مجھ جیسا حساس شخص ایسے ہی موسموں کا محتاج ہوتا ہے۔''

''لیکن ایسا موسم تو محبتوں کا موسم ہوتا ہے۔'' وہ پتہ نہیں کیا پوچھنا چاہتی تھی۔

''ہاں بالکل...... لیکن مجھے محبت نہیں ہو سکتی؟'' اس جواب پر وہ بے اختیار پلکیں اُٹھا کر براہِ راست فواز احمد کی آنکھوں کے راستے دل میں اُتر گئی تھی لیکن فواز احمد نے محسوس کیا تھا کہ اس کی نظروں میں اک کرب نمایاں تھا جس کو چھپانے کی روشنی نے ناکام کوشش کی تھی۔

''کس سے...... محبت ہے آپ کو؟ میرا مطلب ہے کہ ایک طالب علم اور شاگرد ہونے کی حیثیت سے تو مجھے پوچھنے کا کوئی حق نہیں ہے بس صرف معلومات کے لیے پوچھ رہی ہوں۔''

''اگر میں کہوں کہ مجھے ''تم'' سے محبت ہے تو......'' دونوں طرف کے دل کے تار چھن چھن کرنے لگے تھے۔

''یہ اچھا فقرہ ہے سر!'' وہ نظریں اُٹھا کر آہستگی سے جھکاتی ہوئی دھیمے لہجے میں بولی۔

''محبت کا اظہار لفظوں سے بھرے فقروں کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تو جذبات اور احساسات کے ساتھ ساتھ آنکھوں کی زبان کا محتاج ہوتا ہے۔'' فواز احمد اپنی بات کہہ گیا اور روشنی کو شاید اپنی بات کا جواب بھی مل گیا تھا لیکن ابھی تک اعتبار نہ آ رہا تھا۔ وہ پھر بولی۔

''جو اس زبان کو سمجھ نہ سکے۔''

''پھر اس کو محبت کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔''

''یہ کب ہو جاتی ہے سر؟''

''صرف ایک لمحے میں...... اس کو اپنا جال بچھانے میں صدیوں کی پلاننگ نہیں کرنا پڑتی۔ صرف ایک لمحہ...... یہ تو بہانے تراشتی ہے کہ کسی کے کندھے پر سر رکھ کر سو جائے۔ یا پھر......'' فواز احمد جان بوجھ کر خاموش ہو گیا تھا وہ اپنی کہی ہوئی بات کا اثر روشنی کے سرخ گالوں پر دیکھ رہا تھا جو شرم و حیاء سے مزید سرخ و سپید ہو گئے تھے۔ ''یا پھر...... کسی آنچل کو مہربان جانتے ہوئے اپنی آنکھوں کا نمکین پانی اس میں جذب کرنے کے لیے اس ایک لمحے کی محتاج ہوتی ہے جو محبت بھرا لمحہ ہو اور محبت کو ہی ترسا ہوا ہو۔''

دل کے مندر میں گھنٹیاں بجنے کی آوازیں روشنی بخوبی سن سکتی تھی اس کی پلکیں اس خیال سے ہی بوجھل ہو رہی

تھیں کہ کسی کے کندھے پر سر رکھ کر سو جانا بھی محبت کی ابتدائی نشانیوں میں سے ایک ہے اور وہ ایک چھوٹے سے سفر کے دوران فواز احمد کے کندھے پر سر رکھ کر چند منٹوں کے لیے سو گئی تھی۔ کیا اس کو اس مانوس اجنبی سے محبت ہو گئی ہے؟ کیا وہ لمحہ اتنا پیاسا تھا کہ وہ محبت کے مشروب سے شرابور ہونے کے لیے فواز احمد کے کندھے کا سہارا پا کر ہی اپنی تشنگی بجھا گیا تھا۔

روشنی اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ چند ساعتیں یونہی گزر گئیں تو خاموشی کو بارش کی تیز آواز نے اپنے پانی میں بھگو کر بولنے پر مجبور کر دیا۔

''سر! آپ کو اس گھر میں کوئی پرابلم تو نہیں؟''

''میں سمجھا نہیں مس روشنی!''

''میرا مطلب تھا کہ ابھی میں نے کچھ بھی نہیں سیکھا اور اگر آپ کو یہاں کوئی پرابلم ہوئی تو میرا خواب ادھورا ہی رہ جائے گا۔'' روشنی کو بھی الفاظ کا پیرہن اوڑھ کر بات کو دوسرے کے کورٹ میں پھینکنے کا فن آتا جا رہا تھا۔ فواز احمد مسکراتا ہوا بولا۔

''مجھے یوں لگتا ہے کہ میں اس عظیم الشان محل میں کچھ سیکھنے آیا ہوں۔ سکھانے نہیں۔''

''میں سمجھی نہیں سر!'' وہ بے خیالی میں پھر آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر پوچھ بیٹھی تھی اور دل تھا کہ اور گھائل ہو گیا تھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اتنے بڑے محل کے مکین اتنے پُر خلوص بھی ہیں۔'' اس کا اشارہ روشنی کی طرف تھا۔ یا صہیب احمد کے احسانات کی طرف یا پھر اس لڑکی نما عورت صباء بیگم کی طرف تھا جو اپنی شیرینی جیسی زبان سے فواز احمد کو اپنا تعارف کیے بغیر ہی پوچھ گئی تھی کہ ''تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟'' کیا وہ بھی چاہتی تھی کہ فواز احمد اس محل سے نہ جائے۔ یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آ سکی تھی کہ وہ عورت کون تھی۔

''خلوص تو دلوں میں ہوتا ہے سر! یہ پتھروں کی عمارتیں تو بے جان اور بے مروت ہوتی ہیں۔'' روشنی نے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ مسکراتا ہوا پوچھنے لگا۔ ''آپ سے پہلے ایک ماڈرن اور خوبصورت پُر وقار عورت یہاں آئی تھیں۔ انہوں نے اپنا تعارف نہیں کروایا لیکن میری ہر ضرورت کا خیال رکھنے کا عندیہ ضرور دیا ہے۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ عورت کون تھیں۔''

روشنی نے ذہن پر زور دیا اور بولی۔ ''پُوا تو چل نہیں سکتیں۔ میری کوئی چھوٹی بڑی بہن یا کزن بھی نہیں ہے۔ وہ مما تھیں۔ صباء بیگم! میری سویٹ مام!'' یہ بات سن کر فواز احمد کے ہاتھوں کے حقیقت میں طوطے اُڑ چکے تھے۔

○......❖......○

''انیل شرما! اتنے بڑے باپ کا بیٹا جو ایک خوبصورت اور جوان لڑکی کے ساتھ ڈیٹ پر آیا ہو اور اُداس سی صورت بنا کر آتی جاتی لہروں کو گن رہا ہو۔ کیا یہ سب کچھ تمہیں عجیب نہیں لگتا انیل؟'' پری اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی تو وہ زبردستی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا اور بولا۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ ڈیٹ پر تم آئی ہوئی ہو میں نہیں۔'' پری اس کی بات سن کر ہنسنے لگی۔

"بعض اوقات مجھے ایسا کیوں لگتا ہے میں تمہیں کھو رہی ہوں۔"

"اس چیز کے کھونے کا ڈر نہیں ہونا چاہیے جو اپنی مٹھی میں قید ہو۔" وہ پاؤں کے انگوٹھے سے ساحل کی گیلی ریت کو کھود رہا تھا۔ "دوسروں کے ہاتھوں کی مٹھیاں بند دیکھ کر یہ نہیں سوچ لینا چاہیے کہ میری مٹھی میں بھی کوئی جگنو قید ہے۔"

پری ایک ٹھنڈی سانس لیتی ہوئی بولی۔ "ہزاروں میل سے سفر کرتی ہوئی پانی کی ایک لہر تمہارے خیال میں ساحل پر کیا لینے آتی ہے؟" پری کا سوال انیل شرما کے لیے انوکھا نہ تھا۔

"ساحل پر آ کر اپنا آپ ختم کرنے کے لیے۔" وہ اسی لہجے میں بولا۔

"نہیں مسٹر انیل شرما! ویسے تو تم عشق کے پروفیسر ہو۔ لیکن تم ابھی تک یہ حقیقت ہی نہیں جان پائے کہ عشق کیا ہے؟" وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تم جانتی ہو عشق کیا ہے؟"

"نہیں......" پری نے نفی میں سر ہلایا تو اسے غصہ آنے لگا۔ "کیونکہ میں نے عشق نہیں کیا۔"

"تو پھر انیل شرما سے کیا چاہتی ہو؟" وہ روکھے انداز میں بولا تو وہ ہنسنے لگی۔

"دل کے مندر میں تمہیں بھگوان بنا کر پوجنا چاہتی ہوں۔ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر تمہاری داسی بن کر تمہاری خدمت کرنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن یہ کیسا انداز ہے کہ پتھر کو پوجو تو کافر اور انسان کی پوجا کرو تو عاشق؟" اس کا اشارہ پری کے ان الفاظ کی طرف تھا جس دن پری نے اسے گیت کے مجسمہ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا کہ اس مجسمے کو پوجنے پر تم دوشی قرار دیئے جاؤ گے۔

"میں تمہارا مجسمہ نہیں بناؤں گی انیل! من مندر میں تمہاری مورتی بنا کر پوری دنیا سے چھپاؤں گی۔ تمہیں بھگوان سمجھ کر اس طرح پوجا کروں گی کہ کوئی بھی اپنے بھگوان کی اس انداز میں پوجا نہ کرتا ہو۔"

"وہ کیسا انداز ہوگا پری؟"

"ان لہروں جیسا انداز ہوگا جنہیں یہ معلوم ہے کہ ساحل کی محبت میں سینکڑوں میلوں کا سفر طے کرنے کے بعد وہ جیسے ہی ساحل سے گلے ملیں گی ان کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن پھر بھی ان کا جوش اور انداز قابل بیان ہوتا ہے۔ وہ اپنی قربانی دے کر ساحل کی خشک اور تپتی ریت کو اس طرح اپنا آپ بخش دیتی ہیں کہ ریت کی ساری تشنگی ختم ہو جاتی ہے اور لہر کا اپنا وجود بھی اس ریت میں ضم ہو جاتا ہے۔"

وہ ہونٹوں پر مسکان سجاتا ہوا بولا۔ "تو پھر میرے انتظار کو کیا نام دو گی تم؟" وہ دونوں اُٹھ کر وہاں سے ریت پر چلنے لگے۔

"بے مقصد اور وقت کا ضیاع۔" وہ مختصراً بولی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"مجھے ایک عظیم لکھاری کی ایک بات اس وقت بہت شدت سے یاد آ رہی ہے اگر تم کہو تو سناؤں؟" وہ اس کی طرف اجازت طلب انداز سے دیکھتا ہوا بولا تو پری ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

''تم اس دل کے راجہ ہو اور بات کہنے کے لیے اجازت طلب کر کے میرا قد چھوٹا نہ کرو۔'' وہ یہ سن کر ہنسنے لگا۔

''ایک لال بیگ نے شمع سے کہا کہ میں تمہارا عاشق ہوں اور پروانہ بننا چاہتا ہوں۔ شمع یہ سن کر خوب ہنسی اور بولی کہ تم پروانے کی طرح مجھ سے عشق نہیں کر سکتے۔ لیکن لال بیگ اپنی بات پر اڑا رہا شمع کو اس کے اصرار پر ماننا پڑا کہ ہاں تم عاشق ہو مگر میری ایک شرط ہے کہ جاؤ اور ایک چکر لگا کر آؤ اور دیکھو کہ شہر میں کس کس جگہ شمعیں جل رہی ہیں۔ لال بیگ کو چونکہ شمع سے عشق کا دعویٰ تھا وہ فوراً حکم کی تعمیل میں اُڑا اور اپنی بساط کے مطابق شہر کا چکر لگا کر واپس شمع کے پاس آ گیا اور بتانے لگا کہ پورے شہر میں تقریباً بیس شمعیں جل رہی ہیں۔ اس کی بات سن کر شمع نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولی۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو کیونکہ عشق کرنا اور پروانہ بننا تمہارے بس کی بات نہیں ہے اگر تم عاشق ہوتے تو ایک شمع سے دوسری شمع تک کبھی نہ پہنچتے بلکہ پروانے کی طرح یہیں قربان ہو جاتے۔''

بات بہت گہری تھی اور انیل شرما جانتا تھا کہ پری کی سمجھ میں آ گئی ہو گی۔ پری نے ایک کرب سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''جس کا تمہیں انتظار ہے اس کی آنے کی امید بھی اتنی شدت سے ہی ہے جتنی شدت سے اس مجسمے کو سجدے کرتے ہو؟''

انیل شرما قہقہہ لگا کر بولا۔ ''اگر مجسمے کو زبان مل جائے تو وہ تمہیں بتائے کہ میں کس کرب اور شدت سے اس کے آنے کا منتظر ہوں۔''

''انتظار مسلسل اگر بے سود ہو تو کتنا دکھ اور کرب محسوس کرو گے...... اس بات کا اندازہ ہے تمہیں؟'' پری دور سمندر میں چلتے ہوئے جہازوں کو دیکھتی ہوئی بولی۔

''عشق اس سمندر کی مانند ہے جس کے دوسرے کنارے کا علم ہی نہیں ہے اور اس کی گہرائی کتنی ہے یہ بھی کوئی نہیں جان سکتا۔'' انیل شرما پری کے ساتھ چلتا ہوا ریت سے نکل کر سڑک پر آ گیا تھا۔ انہوں نے پاؤں دھوئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی گھر کی جانب چل پڑی تو پری بولی۔

''میں آج پھر ایک نظر اس مجسمے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا مجھے اس کی اجازت ہے؟'' وہ گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا ہنسنے لگا اور بولا۔ ''وہ مجسمہ تمہاری سوتن تو نہیں ہے جو اس کو اس انداز میں دیکھو گی۔''

''اگر وہ مجسمہ مجسمہ ہی رہے تو مجھے سوتن کے طور پر بھی قبول ہے۔'' وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی بولی تو انیل شرما اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہیں بھی امید ہے کہ اس مجسمہ میں کبھی جان پڑ سکتی ہے۔''

پری اس کے جواب میں کچھ نہ بولی اور سامنے سڑک پر دیکھتی رہی۔ اور گاڑی گھر کی جانب رواں دواں تھی۔

○......❖......○

طیبہ اپنے کمرے میں بیٹھی احمد فراز کا شو دیکھ رہی تھی براہِ راست شو میں آج جو مہمان تھا وہ اعلیٰ حکومتی عہدیدار تھا اور احمد فراز نے لڑکیوں کے اغوا کا معاملہ اُٹھایا ہوا تھا یقیناً اس شو کے لیے اور اس مہمان سے بات چیت کرنے کے لیے احمد فراز کو کافی محنت کرنا پڑی ہو گی۔ کیونکہ مشکل ترین سوالات کے جواب دیتے وقت اعلیٰ عہدیدار کے ماتھے پر پسینے کے واضح قطرے نظر آنے لگے تھے۔

بریک کے دوران ان والدین کے تاثرات دکھائے گئے جن کی جوان بچیوں کو کالجز اور یونیورسٹیز سے اغوا کر لیا گیا تھا۔ بوڑھی مائیں اور باپ اپنی عزتوں کے اس طرح کھو جانے پر اس نام نہاد معاشرے سے منہ چھپا رہے تھے اور ان کی آنکھیں سمندر بن کر بہہ رہی تھیں۔ پھر طیبہ کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا جب اس کی اغوا ہونے والی کلاس فیلو اور دوست کی تصویر بار بار ٹی وی سکرین پر دکھائی جانے لگی حالانکہ یہ اخلاقی طور پر ممنوعہ فعل تھا لیکن گھر والے چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ان کی بیٹی کی خبر ان تک پہنچ جائے لیکن ابھی تو فی الحال سب کچھ ہی بے سود نظر آ رہا تھا۔

بریک کے بعد احمد فراز کا محتاط رویہ اس بات کی غمازی کرنے لگا تھا کہ احمد فراز کو چینل کی طرف سے یا پھر اس اعلیٰ عہدیدار کی طرف سے سخت سوالوں سے اجتناب کرنے کی وارننگ دی گئی ہے۔

وہ احمد فراز کو غور سے دیکھ رہی تھی کیونکہ آج جو اس نے بات کی تھی وہ طیبہ کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''جسے چاہا جائے ان کی پسند اور ناپسند کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔'' ان الفاظ نے ایک بار پھر طیبہ کو اس حرکت پر مجبور کر دیا کہ وہ نظریں اُٹھا کر احمد فراز کو دیکھے لیکن ٹی وی سکرین پر چلنے والے کمرشلز نے اس کی بے چینی بڑھا دی تھی۔

احمد فراز نے یہ بات کیوں کی تھی وہ اس کے سابقہ رویوں اور حرکات پر غور کرنے لگی۔ وہ اس کا تایا زاد تھا اور ان کے ساتھ ہی کھیل کود کر پلا بڑھا تھا۔ ڈاکٹر ارباب احمد نے اس کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا اور بچپن سے ہی طیبہ کے ساتھ اس کی اٹیچ منٹ اور دلچسپی زیادہ تھی لیکن جیسے ہی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو دونوں کے رویے محتاط بھی ہو گئے تھے اور فاصلے بھی بڑھنے لگے تھے۔ طیبہ بھی احمد فراز کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی لیکن وہ کافی احتیاط پسند بھی تھی اور اپنے مستقبل کا بہترین فیصلہ کرنے کے لیے اس نے اپنی امی شمسہ بیگم اور ابو ڈاکٹر ارباب احمد پر تکیہ کیا ہوا تھا۔

لیکن احمد فراز کے لیے پسندیدگی کے جو جذبات اس کے دل میں تھے اس نے ان کو چپکے چپکے ہی پروان چڑھایا تھا کیونکہ وہ کوئی بھی اوچھی حرکت کر کے اپنے ماں باپ کا سر نیچا نہ کروانا چاہتی تھی اس نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ احمد فراز اس کو چھپ چھپ کر بھی دیکھتا ہے لیکن طیبہ نے کبھی بھی اس طرح کی کوئی حرکت یا اشارہ و کنایہ نہ کیا تھا کہ جس سے احمد فراز کو اس کے ساتھ کھل کر اپنے جذبات یا تاثرات کے اظہار کی جرأت ہوتی۔

لیکن وہ جس سٹیج پر تھی اس کو اس بات کی شدید خواہش تھی کہ کوئی اسے بھی چاہے لیکن پاکیزگی اور تقدس کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی عزت اور قدر کرے اور چاہت ایسی ہو کہ چاہت بھی اس پر ناز کرے۔ اگر اس کے والدین نے احمد فراز کے بارے میں اس سے پوچھا تو وہ خود فوراً جواب نہ دے پائے گی۔ وہ چند دن کا وقت مانگے گی اور پھر ریا سے اپنی پسند کا اظہار کر دے گی۔ وہ یہ سوچ کر خود ہی مسکرانے لگی کہ وہ جتنے دن سوچنے اور اپنی بات کرنے کے لیے وقت لے گی اتنے دن احمد فراز کی جان سولی پر لٹکی رہے گی۔

وہ احمد فراز کی صورت میں ایک بہترین اور مخلص شریک سفر چن چکی تھی لیکن اظہار باقی تھا۔ اگر احمد فراز نے انکار کر دیا تو......؟ اس کے خیالات اور جذبات کی تان اس انکار پر آ کر ٹوٹ گئی تھی۔ وہ یکدم پریشان ہو کر ٹی وی کی جانب دیکھنے لگی تو وہاں پر احمد فراز نہ تھا بلکہ اس کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ طیبہ کو اس بات کی فکر ہو رہی تھی کہ اس نے

جیسے ہی احمد فراز کی جانب سے انکار کا سوچا اُدھر اس کی تصویر سکرین سے غائب ہو گئی۔ لیکن وہ ان توہمات پر یقین نہ رکھتی تھی اس نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور اللہ تعالیٰ سے احمد فراز کو مانگنے لگی۔

اتنی دیر میں ریبا کمرے میں داخل ہوئی تو طیبہ کو ابھی تک جاگتا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''آپی! آپ ابھی تک سوئی نہیں؟''

''نیند نہیں آرہی تھی۔ سوچا کچھ پڑھ لوں۔'' طیبہ نے اس کو ٹالنے کے لیے کہا لیکن وہ ریبا تھی مطمئن نہ ہوئی۔

''کیا ٹی وی چلا کر پڑھا جا سکتا ہے؟'' طیبہ نے ٹی وی کو ریموٹ سے آف کر دیا اور بولی۔

''احمد فراز کا شو چل رہا تھا وہ دیکھنے لگی تھی۔''

''آپی! آپ کو نہیں لگتا کہ آج فراز بھائی نے کچھ زیادہ ہی زچ کیا ہے اپنے مہمان کو۔'' ریبا نے بھی شاید پروگرام دیکھا تھا۔ طیبہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ایکچوئیلی...... یہ انتہائی حساس اور اچھوتا مسئلہ ہے جسے احمد فراز نے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''آپی! میں نے سنا ہے کہ یہ سیاسی لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ کہیں فراز بھائی کو کوئی نقصان ہی نہ پہنچا دیں؟'' ریبا نے تو کہہ دیا لیکن طیبہ چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔ ریبا کو بھی طیبہ کے اس طرح دیکھنے پر حیرت ہوئی لیکن طیبہ سنبھلتی ہوئی بولی۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کیونکہ جیسے ہی پروگرام ختم ہوتا ہے اینکر کو ایکسکیوز کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر چینل کی اپنی بھی ایک پالیسی ہوتی ہے اور سوالنامہ بھی چینل کی طرف سے دیا جاتا ہے۔''

ریبا سر ہلا کر رہ گئی اور اپنی کتابوں میں گم ہونے لگی تو اس کے موبائل پر بیل ہونے لگی۔ موبائل چونکہ طیبہ کے پاس ہی رکھا تھا اور ریبا ذرا پرے تھی وہ چلاتی ہوئی بولی۔

''آپی پلیز کال ریسیو کریں نا۔'' طیبہ نے اس کا موبائل پکڑا ہی تھا کہ وہ پھلانگتی ہوئی آئی اور طیبہ سے بولی۔

''اگر امبرین ہوگی تو کہہ دیں کہ میں سو گئی ہوں۔'' وہ پاس کھڑی ہوگئی تو طیبہ نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو السلام علیکم!'' طیبہ کی آواز کے جواب میں دوسری طرف سے کوئی مردانہ آواز سنائی دی۔

''کیا میں مس ریبا سے بات کر سکتا ہوں؟'' طیبہ کو یہ سن کر اچنبھا ہوا کیونکہ پہلی بار کسی غیر مرد کا فون اس گھر میں آیا تھا اور دوسری سمت سے بولنے والے کو یہ بھی معلوم تھا کہ کال ریسیو کرنے والی ریبا نہیں ہے۔

''جی ضرور...... آپ کون؟'' طیبہ کے اس طرح پوچھنے پر ریبا کے چہرے کی رنگت بھی زرد ہونے لگی تھی۔

''میں صہیب احمد بات کر رہا ہوں۔''

''صہیب احمد کون؟'' اتنا سننا تھا کہ ریبا نے طیبہ کے ہاتھ سے موبائل چھینا اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ جبکہ طیبہ اس کی اس حرکت پر حیران رہ گئی۔ دس منٹ یونہی گزر گئے تھے۔

''یہ صہیب احمد کون ہے؟'' ریبا کے اندر آنے پر طیبہ نے سوال کیا تو ریبا زبردستی ہونٹوں پر مسکان سجاتی اور نظریں چراتی ہوئی بولی۔ ''یہ...... یہ...... یہ تو کوئی رانگ کال تھی آپی!'' طیبہ اس کے سامنے جا کھڑی ہوگئی اور اس کا منہ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہوئی بولی۔

''رانگ کال کرنے والے کو تمہارا نام اور تمہاری آواز کی پہچان کس نے بتائی ریبا؟ بولو...... جواب دو۔''

''آپی! یہ امبرین کا بھائی ہے۔'' وہ تیزی تیزی میں پھر جھوٹ بول گئی مگر طیبہ نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا۔

''تم نے ہی تو بتایا تھا کہ امبرین کا ایک ہی بھائی ہے اور اس کا نام ساحر ہے اور پھر پچھلے دنوں اس کی شادی بھی ہو گئی ہے۔ وہ تم کو نام بدل کر فون کیوں کرنے لگا؟'' طیبہ نے اس کے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور بولی۔

''اوپر دیکھو میری طرف...... میری آنکھوں میں دیکھو اور سچ بتاؤ کہ یہ کون ہے؟''

''آپی! یہ صہیب احمد ہے۔'' ریبا طیبہ کی کافی عزت کرتی تھی اور اس سے دبتی بھی تھی۔

''نام کا مجھے پتہ چل گیا ہے۔ حدود اربع بیان کرو۔ نہیں تو ابھی امی ابو اور عدیم کو بتا دوں گی۔'' طیبہ کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ ریبا اس کو لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور تمام واقعات بیان کرنے لگی۔ طیبہ اس کے لہجے اور الفاظ کی سچائی کو اپنے تجربے سے ماپتی رہی اور ہنکارہ بھرتی ہوئی اس کی تمام بات سن کر بولی۔

''تم کیا چاہتی ہو؟'' ریبا خاموش رہی اور اس کی طرف دیکھتی رہی۔

''کیا تم نے اس سے کبھی موبائل پر بات کی ہے؟ یا باہر......؟'' طیبہ کی بات سن کر ریبا نے نفی میں سر ہلا دیا اور بولی۔ ''فراز بھائی کا کلاس فیلو ہے اور مشہور اخبار کا چیف ایڈیٹر بھی ہے۔''

''چیف ایڈیٹر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے گھر میں نقب زنی شروع کر دے۔'' طیبہ نے ریبا کو ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا اور پوچھا۔ ''فراز کو اس بات کا علم ہے؟''

''میرا نہیں خیال کہ فراز بھائی کو اس بات کا علم ہو گا کہ صہیب احمد ان کے گھر تک پہنچ گیا ہے۔'' ریبا معصومیت سے بولی اس سے پہلے کہ طیبہ مزید کچھ اور کہتی ایمبولینس کے تیز ہوٹر نے ان دونوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔ ''ایمبولینس؟'' طیبہ نے چونکتے ہوئے کہا اور کھڑکی کا پردہ سرکا دیا تو ایک ایمبولینس ان کی کوٹھی میں داخل ہو رہی تھی طیبہ اور ریبا کے لیے یہ بات پریشان کن تھی۔ اتنی دیر میں ایمبولینس کے پاس ڈاکٹر ارباب احمد عدیم اور شمسہ بیگم بھی اندر سے پہنچ گئے تو طیبہ کا دل حلق میں آ کر پھنس گیا۔ کیونکہ اس ایمبولینس میں ان کے گھر کا ایک ہی فرد ہو سکتا تھا اور وہ تھا احمد فراز! کیونکہ دولت بی بی تو اتنی رات کو گھر سے باہر نہیں جاتی تھیں ریبا تو طیبہ کو چھوڑ کر فوراً نیچے کی جانب بھاگ گئی مگر طیبہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پاؤں من من کے ہو گئے ہیں اور وہ وہیں گڑھ کر رہ گئی ہے۔

ایمبولینس کے پچھلے دروازے سے ایک سٹریچر نکالا گیا جس پر احمد فراز پٹیوں میں جکڑا ہوا لیٹا تھا۔ اس کے بازو اور ٹانگ پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں اور وہ ہوش میں تھا اس کے ہونٹوں پر کربناک مسکان تھی۔ طیبہ اس کو اس حالت میں دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔

وہ جیسے تیسے کر کے نیچے ڈرائنگ روم میں پہنچی تو احمد فراز کو صوفے پر لٹا دیا گیا تھا اور ایمبولینس واپس جا چکی تھی اس کے چہرے پر تکلیف اور دُکھ کی لکیریں نمایاں تھیں۔ سب لوگ اس کے اردگرد جمع تھے اور ڈاکٹر ارباب احمد اس سے پوچھ رہے تھے۔

''کیسے ہوا یہ سب کچھ؟''

''بس کچھ نہیں انکل! ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ تھا۔ بچ گیا ہوں۔'' اس نے آخری الفاظ طیبہ کی جانب دیکھتے

ہوئے کہے تو اس کو حیرت ہوئی کہ طیبہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے جن کو چھپانے کی وہ ناکام کوشش کر رہی تھی۔
احمد فراز کو حیرت بھی ہوئی اور ایک انجانا سا احساس بھی جاگا کہ طیبہ کی آنکھوں میں آنسو اس کو اس حالت میں دیکھ کر آئے ہیں۔ وہ دھیرے سے مسکرایا اور پھر بولا۔ ''بس کسی کی دعاؤں نے بچا لیا ہے۔''

''اللہ نے مہربانی کر دی ہے۔ کیا ہوا تھا؟'' شمسہ بیگم بھی اس کے لیے خاصی پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔

''کچھ نہیں چچی! آفس میں بیٹھے تھے کہ چند شر پسندوں نے آفس پر حملہ کر دیا انہوں نے پاس ہاکیاں اور ڈنڈے پکڑے ہوئے تھے۔ ان سے ہاتھا پائی ہونے لگی بس پھر کیا تھا ان کے سامنے جو بھی آیا وہ اندھا دھند اپنا کام کرتے رہے۔'' احمد فراز تکلیف سے کراہ کر رہ گیا تو شمسہ نے طیبہ سے کہا۔

''جاؤ فوراً دودھ بوائل کر کے لاؤ۔ جلدی۔'' طیبہ کو جیسے ہوش آ گیا تھا مگر اس کی آنکھوں کی نمی شمسہ بیگم کی جہاندیدہ آنکھوں سے چھپی نہ رہ سکی تھی طیبہ وہاں سے چلی گئی تو ارباب احمد بولے۔

''تمہارے آفس کے سیکیورٹی گارڈز کہاں تھے؟ تم نے پولیس کو کال نہیں کیا۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے اس ملک میں؟'' ارباب احمد کا انداز بے بسی اور لاچاری سے بھرا ہوا تھا۔

''گارڈز نے ہی ان پر قابو پایا ہے ان میں سے تین کو پکڑ لیا گیا ہے۔ آپ ٹی وی آن کریں ابھی پتہ چل جائے گا۔'' احمد فراز کی بات سن کر ڈرائنگ روم میں بڑی سکرین والی ایل سی ڈی آن کر دی گئی۔ ہر نیوز چینل پر مذمتی اور پُر جوش بیان بازی ہو رہی تھی۔

احمد فراز کے ٹی وی چینل کے جس حصے پر حملہ ہوا تھا اس کو ٹی وی سکرین پر دکھایا جا رہا تھا۔ کمپیوٹرز اور ٹی وی سکرینوں کو جس بیدردی سے توڑا گیا تھا ان کے شیشے بتا رہے تھے کہ ظلم و بربریت کی انتہا کر دی گئی ہے۔ حکومتی اور اپوزیشن لیڈروں کے مذمتی بیان جاری ہو رہے تھے۔ پھر احمد فراز کی تصویر بار بار دکھائی جانے لگی کہ اس پر کافی تشدد کیا گیا ہے جس سے احمد فراز کے بازو اور ٹانگ میں فریکچر ہو گئے ہیں۔

شمسہ بیگم تو رونے لگی تھیں جبکہ عدیم اور ریا سہمے ہوئے انداز میں سکرین پر آفس کی تباہی کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ طیبہ کے ہاتھ میں دودھ کا مگ تھا اس نے لا کر احمد فراز کو پکڑانا چاہا مگر وہ درد سے کراہ کر رہ گیا تو ارباب احمد نے آگے بڑھ کر اس کا سر اپنی گود میں لے لیا اور طیبہ نے دودھ کا مگ اس کے دوسرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

''میں تو کہتی ہوں چھوڑ دو اس نوکری کو۔ ہمیں نہیں کرنی اتنی خطرناک نوکری'' شمسہ بیگم کی نم آواز نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تو طیبہ ان کے پاس گئی اور ساتھ بیٹھ کر ان کو دلاسہ دینے والے انداز میں ان کا ہاتھ سہلانے لگی۔ ڈاکٹر ارباب بھی احمد فراز کو اس حالت میں دیکھ کر کافی دُکھ محسوس کر رہے تھے۔

''اماں کو تو نہیں بتایا کسی نے؟'' ارباب احمد بولے تو شمسہ بیگم نفی میں سر ہلا کر اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

''فراز بھائی! ہو نہ ہو یہ تو مجھے اسی وزیر کی شرارت لگتی ہے جس کا آپ انٹرویو کر رہے تھے۔'' عدیم نے کہا تو طیبہ اور ریا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے جبکہ خود احمد فراز بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ اس طرف ان کا کسی کا بھی دھیان نہ گیا تھا۔

''تم بھی تو بولتے ہوئے سامنے والے کی عزت ''پھیتی پھیتی'' کر دیتے ہو یار!'' ڈاکٹر ارباب احمد اب کچھ

ری لیکس ہو گئے تھے کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ احمد فراز کو کوئی دماغی یا سیریس چوٹ تو نہیں لگی تھی یہ بیرونی چوٹیں تھیں اور اب تو آہستہ آہستہ ہی آرام آنا تھا۔ انہوں نے اور عدیم نے اس کو سہارا دے کر اُٹھایا اور اس کے کمرے تک پہنچا دیا۔

''اب آرام کرو۔ رات کافی ہو گئی ہے۔'' ارباب احمد نے اس کو بیڈ پر لٹاتے ہوئے اس پر کمبل ڈال دیا تھا وہ اثبات سے سر ہلاتا ہوا رہ گیا۔

گرم دودھ نے اسے کافی تقویت دی تھی اور اس بات نے بھی اس کی ڈھارس بندھائی تھی کہ اس کو اس حالت میں دیکھ کر طیبہ کی آنکھوں میں آنسو تھے اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی دُکھی ہوئی ہے۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی احمد فراز زیر لب مسکرایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ انجکشن اور دوائی میں نیند کی دوائی بھی شامل تھی یہی وجہ تھی کہ اس کو آنکھیں بند کرتے ہی نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

رات کے پچھلے پہر طیبہ چپکے سے اپنے بیڈ سے اُٹھی اور ساتھ سوئی ہوئی ریا کو چھوڑ کر ننگے پاؤں اپنے کمرے سے نکلتی ہوئی احمد فراز کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کا انداز بلی کے چلنے جیسا تھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر کسی گھر والے نے دیکھ لیا تو اس کے بارے میں کیا سوچے گا۔ لیکن یہ پیار کی پہل تھی اور پیار کسی بھی دور میں کسی سے بھی ڈرا نہ تھا۔

وہ ننگے پاؤں چلتی ہوئی احمد فراز کے کمرے تک پہنچی تو دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ یہاں تک کیوں آ گئی تھی اسے اس بات کی سمجھ بھی تھی اور وہ جانتی بھی تھی کہ اگر احمد فراز کو ایک نظر دیکھ نہ لے گی اسے نیند نہ آئے گی۔

آہستگی سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو سامنے ہی بیڈ پر احمد فراز گہری نیند سویا ہوا تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ اور اس سوئے ہوئے احمد فراز کو جی بھر کر دیکھنے لگی۔ اس نے اس کا وہ بازو بھی دیکھا جو پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ طیبہ نے ہمت کر کے اپنے کانپتے اور لرزتے ہوئے ہاتھ کو اس کے بازو پر پھیرا تو دو آنسو آنکھوں سے نکل کر احمد فراز کے کمبل میں جذب ہو گئے۔

اس کے آنسوؤں کی اسے سمجھ نہ آئی تھی وہ کون سا اس سے محبت کرتا تھا یا پھر طیبہ اس سے محبت کرتی تھی لیکن من ہی من میں ایک ایسا رشتہ بن چکا تھا جو دلوں کا بے نام رشتہ ہوتا ہے اور اس بے نام رشتے کو لوگوں نے کئی نام دے رکھے تھے۔ وہ کئی ساعتیں وہاں کھڑی رہی جب اسے سکون ہو گیا کہ احمد فراز اب پُرسکون ہے تو وہ دبے پاؤں وہاں سے واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ وہ آنکھیں بند کرتی تو احمد فراز کا مسکراتا ہوا چہرہ اور پیار سے بھرپور الفاظ اس کی آنکھوں اور سماعتوں کو سکون دینے لگے تھے۔

''جسے چاہا جائے اس کی پسند اور ناپسند کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

O......❖......O

فواز احمد نے صباء بیگم کو دیکھا تو احتراماً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا وہ آج پھر اس کے کمرے میں آئی تھی اور اس کے تعارف کا روشنی کی زبانی علم ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ آج جیسے ہی صباء بیگم دروازے سے اندر داخل ہوئی تو فواز احمد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیسے ہو ماسٹر؟'' صباء بیگم بولی تو فواز احمد کو یوں لگا کہ شاید اس پر طنز کیا گیا ہے۔ وہ محض مسکرا کر رہ گیا۔

''کیا کچھ وقت ہمیں بھی مل سکتا ہے؟'' وہ دوبارہ بولی تو فواز احمد مسکراتا ہوا بولا۔

''آپ حکم کریں۔''

''مجھے کچھ لکھنا پڑھنا تو سیکھنا نہیں ہے بس تمہارا ساتھ چاہیے۔'' صباء بیگم کا فقرہ برملا تھا یا کوئی سنگین مذاق تھا فواز احمد کی سمجھ سے بالاتر تھا اس کے چہرے کا رنگ فق ہو کر رہ گیا۔ تو صباء بیگم کا جاندار قہقہہ سن کر اسے اور بھی حیرت ہوئی۔ ''ماسٹر جی!'' وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''ذرا اپنا رنگ تو دیکھو کس طرح ہلدی کی طرح زرد ہو رہا ہے۔'' اس کی بات سن کر فواز احمد کو احساس ہوا کہ وہ کافی نروس ہو گیا تھا۔ وہ زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکان سجاتا ہوا بولا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو بے ضرر سا بندہ ہوں۔ میں بھلا آپ کا ساتھ کیا دے سکتا ہوں؟'' صباء بیگم آگے بڑھتی ہوئی اس کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ اور فواز احمد پیچھے ہوتا ہوا دیوار کے ساتھ جا لگا تو اس کو صباء بیگم کی سانسیں تک محسوس ہونے لگیں۔ وہ کافی گھبرا گیا تھا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور پھر یہ عورت اس کے محسن صہیب احمد کی ماں تھی روشنی کی ماں تھی۔ اس روشنی کی ماں جسے اس نے دل ہی دل میں چاہا تھا۔

''میرے ساتھ چلو گے؟'' صباء بیگم اپنی انگلی اس کے گال پر پھیرتی ہوئی بولی تو فواز احمد کی حالت دیدنی تھی۔

''کک...... کہاں؟'' صباء بیگم ہنستی ہوئی اس سے دور ہوئی اور آ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور اسی لمحہ روشنی اندر داخل ہوئی تو فواز احمد مجرم بنتے بنتے رہ گیا تھا۔ اس نے قدرت کی مہربانی پر سکھ کا سانس لیا۔

''ارے مما! آپ یہاں؟'' روشنی نے صباء بیگم کو دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں بیٹا! مجھے ذرا بازار تک جانا ہے۔ میں فواز سے کہہ رہی تھی کہ میرے ساتھ چلیں۔ کچھ آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور اس علاقہ کی پہچان بھی۔'' روشنی فواز احمد کی طرف دیکھنے لگی تو صباء بیگم پھر بولی۔

''ویسے بھی جب سے فواز آیا ہے اس کمرے میں ہی قید ہے۔ مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے ہم جلد واپس آ جائیں گے۔'' صباء بیگم کا انداز ایسا تھا کہ وہ روشنی سے اجازت نہیں لے رہی بلکہ اسے بتا رہی ہے جبکہ جس کی بابت بات ہو رہی تھی اس سے کسی نے بات بھی نہ کی تھی۔

''سر! اگر آپ ڈسٹرب نہ ہوں تو پلیز...... ایکچوئیلی مما کبھی بھی اکیلی شاپنگ کے لیے نہیں جاتیں۔'' روشنی کا انداز منت بھرا لیکن پیار سے بھرپور تھا۔ فواز احمد سر کو اثبات میں ہلانے پر مجبور تھا۔

صباء بیگم کمرے سے نکل گئی تو روشنی شرمندگی سے بولی۔ ''آئی ایم سوری سر! یہ تو ایک الگ سے ہی ڈیوٹی ہے۔''

''کوئی بات نہیں روشنی!'' وہ اخلاقاً بولا۔ ''آپ کی مما ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ میں جب سے آیا ہوں اس کمرے میں ہی قید ہو کر رہ گیا ہوں۔''

''مما آپ کا ویٹ کر رہی ہوں گی۔'' روشنی بولی تو فواز احمد کمرے سے باہر نکل گیا اب اس کے کمرے میں روشنی ہی رہ گئی تھی روشنی نے دروازہ اندر سے بند کیا اور کمرے کی صفائی کرنے لگی ویسے تو اس کمرے میں گرد نام کی کوئی چیز نہ تھی لیکن بیڈ کی چادر کو ٹھیک طرح سے بچھایا تکیے طریقے سے رکھے اور پھر اس نے غیر اخلاقی طور پر فواز احمد کا بیگ کھول کر بھی دیکھا اس میں اس کے کپڑے اور جوتے تھے۔ جبکہ لیپ ٹاپ ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔

جس دن سے فواز احمد آیا تھا تب سے آج پہلی بار روشنی اس کمرے میں اس طرح اکیلی موجود تھی ویسے تو وہ روزانہ ہی فواز احمد سے پڑھنے اور سیکھنے آتی تھی لیکن آج وہ موجود نہ تھا اس کی چیزیں موجود تھیں۔ وہ فواز احمد کی ایک ایک چیز کو چھو کر پکڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس نے لیپ ٹاپ کھولا تو حیرت سے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی کیونکہ سکرین روشن ہوتے ہی اس کا خوبصورت چہرہ سکرین پر سامنے آ گیا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اور وہ سوچنے لگی کہ فواز احمد نے یہ تصویر کہاں سے لی اور کب لی؟

اس کا مطلب تھا کہ فواز احمد اس کو چاہتا ہے لیکن یہ اس کا اندازہ تھا اور وہ خود کو خوش نصیب سمجھ رہی تھی کیونکہ اس جیسی کئی نوجوان لڑکیاں فواز احمد کی پرستار ہوں گی لیکن وہ صرف اس کے پاس تھا۔ بہت ساری کیا بلکہ سبھی نے ہی فواز احمد کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ وہ نہ صرف اس کو ہر روز دیکھتی تھی بلکہ اس سے باتیں بھی کرتی تھی۔ اور باتیں بھی ایسی کہ اگر فواز احمد ان باتوں کو اپنے قلم سے صفحہ قرطاس پر بکھیرنے لگے تو ہزاروں لوگ اس کی باتوں کے دیوانے بن کر سامنے آ جائیں اور لاکھوں روپیہ فواز احمد کی جیب میں آ جائے۔ پبلشرز حضرات اس کی ان باتوں کو اپنے ادارے کی زیر ادارت شائع کرنے پر فخر محسوس کریں۔

اس کو وہ لمحہ یاد آنے لگا جب اس نے پہلی بار فواز احمد کو بس میں دیکھا تھا اور پہچان نہ پائی تھی۔ وہ اس کی تحریروں کی دیوانی تھی اور دورانِ سفر ایک لمحہ ایسا بھی آیا تھا کہ وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر سوتی رہی۔ وہ کتنے حسین اور خوبصورت پل تھے وہ روشنی کی زندگی کے یادگار ترین اور قیمتی پل تھے۔ کاش روشنی ان لمحات کو واپس لانے کی طاقت رکھتی ہوتی تو کئی بار دل سے مچلنے والی خواہش کو عملی جامہ پہنا چکی ہوتی۔

وہ سوچ کے ساگر سے خود ہی نکل آئی اور مسکراتی ہوئی لیپ ٹاپ پر فواز احمد کے نئے ناول کی سرخیاں پڑھنے لگی۔ کتنا دُکھ اور کرب ان الفاظ میں تھا۔ روشنی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ وہ فواز احمد کا تخیلاتی جائزہ لینے لگی تو وہ ہر لحاظ سے اسے اپنے ساتھ مکمل فٹ اور پرفیکٹ نظر آنے لگا تھا۔

روشنی کو وہ لمحات بھی یاد آنے لگے تھے جب وہ پہلی ہی بار فواز احمد سے مل کر گھر پہنچی تھی تو وہ کتنی ڈسٹرب ہو گئی تھی وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگی تھی کیونکہ نہ ہی گاڑی خراب ہوئی تھی اور نہ ہی موسم خراب ہوا تھا کہ جس کی وجہ سے وہ زیادہ سے زیادہ سفر اپنے پسندیدہ مصنف کے ساتھ طے کر سکتی لیکن اس دن کے بعد اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ فواز احمد کی تحریروں سے ہی نہیں اس سے بھی اتنی ہی محبت کرے گی کیونکہ تحریریں انسان کے اندر سے نکلتی ہیں اور انسان کا کتھا رس بن کر صفحہ قرطاس پر بکھر جاتی ہیں اور ان صفحات کو پڑھنے والے ان میں اپنا آپ تلاش کرتے ہیں اور روشنی سمجھتی تھی کہ فواز احمد کی تحریروں نے اسے محبت سکھائی ہے اور فواز احمد ہی وہ پہلا مرد ہے جس سے روشنی کو محبت ہو گئی ہے۔

اس نے فواز احمد سے ناول لکھنے کا سیکھنے کے لیے پلان بنایا اور اس کے ساتھ موبائل پر میسجنگ شروع کر دی وہ آہستہ آہستہ اپنے پلان پر عمل کرتی ہوئی اس کو اس ڈھب پر لے آئی تھی کہ وہ اس کے گھر آنے پر راضی ہو گیا تھا اور روشنی کو اپنی محبت کی کامیابی کا یقین اس طرح بھی پختہ ہو گیا کہ اس کے تمام کام میں اس کے بڑے بھائی نے اس کی مدد کی تھی۔ مراد خان جیسے سخت گیر انسان کا آسانی سے مان جانا اور پھر صہیب احمد اور فواز احمد کا کلاس فیلو نکل آنا۔ پھر مما صباء بیگم کا بھی فواز احمد کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اس بات کی نشانیاں تھیں کہ روشنی اگر فواز احمد کو دل کے مندر میں

بسا کر بھگوان بنانا چاہے تو کسی بھی پجاری کو اعتراض نہ ہوگا۔ وہ ایک خیال ذہن میں آتے ہی چونک گئی اور لیپ ٹاپ بند کرتی ہوئی بھاگتی ہوئی اس کمرے سے اپنے کمرے تک گئی اور وہاں پڑا ہوا ایک پیکٹ اُٹھا کر لا کر فواز احمد کے کمرے میں بھاگنے والے انداز میں واپس آئی اور وہ پیکٹ لیپ ٹاپ پر رکھ دیا اور خود کو بیڈ پر ڈھیر کر کے لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

فواز احمد صباء بیگم کے ساتھ خود کو بے بس پرندے کی مانند محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس کو لے کر مارکیٹوں میں شاپنگ کرتی پھر رہی تھی جبکہ فواز احمد اپنی بوریت کو ہونٹوں کی زبردستی کی مسکان میں چھپا کر دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک دکان پر ایک انگوٹھی دیکھی جو اسے بہت خوبصورت لگی لیکن اس کی قیمت اتنی تھی کہ اس کی جیب ہی اجازت نہ دیتی تھی۔

صباء بیگم نے اس کی مرضی کے خلاف اس کو کتنی ہی پینٹس شرٹس خرید کر دے دی تھیں وہ کافی انکار کرتا رہا اور صباء بیگم اس پر فریفتہ ہونے والے انداز میں اقرار تصور کرتی ہوئی ڈریسز خرید کر ملازم کو پکڑاتی رہیں۔ وہ ایک کافی ہاؤس میں کافی پینے بیٹھ گئے تو صباء بیگم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

''روشنی میری اکلوتی بیٹی ہے۔ میری اور مراد کی خواہش ہے کہ اس کی شادی کسی اچھے اور خاندانی گھر میں ہو۔'' صباء بیگم کے ہاتھوں میں دبے ہوئے فواز احمد کو اپنے ہاتھ میں لرزش نمایاں محسوس ہو رہی تھی۔

''لیکن میرا اس بات سے کیا تعلق ہے میڈم؟'' وہ یہ سن کر خوش ہوگئی اور بولی۔

''تم نے مجھے میڈم کہا مجھے بہت اچھا لگا۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ ماسٹر صاحب نجانے مجھے آنٹی ہی کہہ دیں۔'' وہ خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ زمانے کی چال چلنا ہو تو قدموں کو اس کا عادی بنانا پڑتا ہے۔'' وہ مصنف تھا الفاظ اس کے ساتھ اور وہ الفاظ کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔

''مجھے تمہاری زندہ دلی اچھی لگی ماسٹر!''

''میرا نام فواز احمد ہے۔'' اسے ماسٹر لفظ کچھ مناسب نہ لگتا تھا اسی لیے اس نے صباء بیگم کو ٹوکنے والے انداز میں کہا مگر انداز محبت بھرا ہی تھا۔ ''میں چاہوں گا کہ آپ مجھے میرے نام سے ہی پکارا کریں۔''

''جو دلوں میں بسنے کا فن جانتے ہوں ان کا ایک ہی نام ہوتا ہے۔ جانتے ہو کیا؟'' صباء بیگم اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی پوچھنے لگی تو فواز احمد نے نفی میں سر ہلایا تو وہ ہنسنے لگی اور بولی۔ ''قاتل!''

ان حالات سے وہ خاصا گھبرا گیا تھا اس نے یک دم اپنے ہاتھ کو جھٹکا دے کر صباء بیگم کے ہاتھوں سے چھڑایا تو وہ قہقہے لگانے لگی۔ جبکہ آس پاس کے لوگوں کی نظروں میں تماشہ بنا بیٹھا فواز احمد خیریت سے یہ وقت بھی کٹ جانے کی دعا میں مصروف تھا۔

''بہرحال تم مجھے میڈم صباء کہہ سکتے ہو؟''

''آپ صہیب احمد کی بھی ممی ہیں؟'' فواز احمد نے یہ سوال کیوں کیا تھا اسے علم نہ تھا لیکن اس کے سوال کو صباء بیگم نے کیسے لیا تھا یہ اس کے قہقہے نے بتا دیا تھا وہ پھر بولی۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم صہیب احمد کے کلاس فیلو ہو اور میں اس کی ممی ہوں اور تم مجھے آنٹی کہنا چاہتے ہو؟''

''میرا یہ مقصد نہ تھا۔'' وہ سادگی سے بولا تو کافی بھی آ گئی ویٹر کے جانے کے بعد وہ پھر صباء بیگم سے مخاطب ہوا۔ ''بڑھتی ہوئی عمر سے خوفزدہ ہونا قدرت کے ساتھ ٹکرانے کے مترادف ہے۔''

''مجھے اپنی عمر کے گھٹنے کا کوئی خوف نہیں ہے ماسٹر! لیکن میں ایک عورت ہونے کے ناطے اپنے جذبات و احساسات کی عزت بھی چاہتی ہوں۔ اپنے دل کی گھٹن اور دماغ کی چبھن کو کس کے ساتھ شیئر کروں؟''

''مراد خان جیسا وجیہہ مرد اور اتنی دولت آپ کے جذبات کی قدر نہیں کرتے کیا؟''

''مراد خان!'' اس کی زبان سے نفرت آمیز انداز میں اپنے خاوند کا نام نکلا تو فواز احمد چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کافی کا گھونٹ پیتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''دو بچوں کا باپ بننے کے لیے اس نے میری جوانی خراب کی ہے۔ وہ بستر پر جسمانی طور پر میرے ساتھ ہوتا ہے مگر اس کا ذہن اتنا منتشر ہوتا ہے کہ اسے بعض اوقات یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ کہاں اور کس حالت میں ہے؟''

فواز احمد کو صباء بیگم کی زبان سے اتنے کڑوے سچ کی شاید توقع نہ تھی وہ تو محض صباء بیگم کو ایک دولت مند اور بگڑی ہوئی خاتون سمجھ رہا تھا۔ لیکن اس کی تو الگ ہی کہانی تھی۔

○......❖......○

احمد فراز نے دیکھا کہ طیبہ اس کے لیے یخنی بنا کر لائی ہے تو اسے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی ہوئی تھی کیونکہ وہ گزشتہ تین دنوں سے بیڈ پر تھا اور دیکھ رہا تھا کہ طیبہ دن رات اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی ہے اور اس کو ڈانٹ کر بھی دوائی کھلا دیتی تھی اور اپنے ہاتھوں سے یخنی پلاتی تھی۔ نیک پرہیز گار اور پاک باز طیبہ کو دادی نے بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے روپ میں زمین پر آتا ہے اور اپنے بندوں سے امتحان لینے کے لیے کسی نہ کسی روپ کو دھارتا ہے اور دوسرے انسان کا امتحان لیتا ہے۔ اس کے فیل یا پاس ہونے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ایسی کسوٹی پر کرتا ہے جسے اس نے خلوص اور نیک نیتی کا نام دے کر انسان کے دل میں رکھ دیا ہے۔ وہ انسانیت کی خدمت کرنے والے کی نیت اور خلوص دیکھتا ہے اور اپنے قائم کردہ اصولوں اور کسوٹی پر پورا اترنے کے لیے ایک ایسا وقت مقرر کر دیتا ہے جو خود اس کو بھی چوبیس گھنٹوں میں سے بہت عزیز ہوتا ہے اور وہ وقت کئی منٹوں یا کئی گھنٹوں پر محیط نہیں ہوتا بلکہ ایک گھڑی ہی ایسی ہوتی ہے جب خدمت کرنے والے کی نیت دیکھی اور پرکھی جاتی ہے اس گھڑی میں خدمتگار کو دل سے ہر طرح کا میل کچیل نکال کر بیمار یا سائل کی دادرسی کرنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ اگر خدمت گار اس کڑی آزمائش پر پورا اُترا تو پاس ورنہ فیل اور فیل بھی ایسا کہ اس کے بعد نہ کوئی کمپارٹ کلیئر کرنے کا چانس اور نہ ہی دنیا کی کسی دوسری علمی ادبی اور ثقافتی یونیورسٹیوں میں داخلہ کی کوئی امید ہوتی ہے۔

طیبہ نے حال ہی میں دادی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بیت اللہ شریف دیکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر امتحان کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتی ہے وہ ہر آزمائش میں پوری اُترنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ کسی بھی کام کو اللہ کی رضا سمجھ کر اس کو کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ بس وہ ایک بار اسے اپنے گھر بلا لے اور احمد فراز پر حملہ ہونا اس کو اس بات کی پہلی آزمائش محسوس ہو رہا تھا کہ آیا وہ اس مصیبت میں انسانیت کی معراج کو بلند رکھنے کے لیے اپنی جان

جو کھم میں ڈالتی بھی ہے یا محض باتوں ہی باتوں میں اللہ کو راضی کرنے پر تلی ہوئی ہے اور پھر گزشتہ دنوں احمد فراز کی بات نے بھی اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا وہ اس ساز کی جھن جھن آج بھی اپنے دل کے دروازے پر میٹھی دستک کی طرح محسوس کرتی تھی۔ اسے اگر احمد فراز جیسا جیون ساتھی مل جائے تو وہ سمجھے گی کہ وہ بہت خوش نصیب لڑکی ہے۔ احمد فراز کے ساتھ اس کا اچھا اور بہترین روشن مستقبل جڑا ہوا تھا۔ وہ اچھی جاب کر رہا تھا۔ اس گھر میں وہ بچپن سے رہ رہا تھا لیکن وہ شادی کے بعد اپنا الگ سے ایک بہترین گھر بھی لے سکتا تھا۔ گاڑی اور دیگر آسائشیں اس کو دنیاوی لگتی تھیں لیکن ان کی ضرورت حقیقت تھی۔ وہ اپنے منہ سے احمد فراز کے لیے شمسہ بیگم یا ارباب احمد سے بات کرنے کی جرأت نہ کرسکتی تھی لیکن اس نے قدرت کی اس فیاضی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے عمل سے ہی ان دونوں کو فراز احمد کے حق میں فیصلہ کرنے کے لیے آسانی پیدا کردی تھی۔

''جناب کی طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے یخنی کا پیالہ ٹیبل پر رکھا اور احمد فراز کے بیڈ کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی تو اس کا اسکارف کچھ ڈھیلا ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے سیاہ اسکارف کو درست کیا تو انہماک اور محبت سے دیکھتے ہوئے احمد فراز کو دیکھ کر شرما گئی۔

''جب تیمار دار تم جیسا ہو تو بیمار بھلا اچھا ہونے کی دعا کیوں کرے گا؟'' احمد فراز شرارت سے مسکراتا ہوا کہنے لگا تو وہ جھینپ سی گئی۔ ''اب پہلے سے کافی بہتر ہوں اور یہ سب کچھ جناب کی مہربانی سے ہی تو ہے۔''

''آپ مجھے کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔ اس طرح تو میرا ثواب کم ہو جائے گا۔'' احمد فراز نے دیکھا کہ طیبہ نے یہ بات کہہ کر منہ نیچے کرلیا تھا یعنی وہ شرارتی فقرہ ادا تو کرگئی تھی لیکن احمد فراز کی غصیلی نظروں کی تاب نہ لاسکتی تھی حالانکہ احمد فراز کا غصہ مصنوعی لیول سے بھی انتہائی کم درجے کا تھا۔

''طیبہ! میں تمہارا مشکور ہوں۔'' وہ لجاجت سے بولا تو اس نے یخنی کا پیالہ اس کو پکڑا دیا اور خود چمچ لے کر اُٹھتی ہوئی اس کے پاس آگئی اور جھکتی ہوئی چمچ بھر کر اس کو سوپ پلانے لگی۔ احمد فراز چپ نہ رہ سکا پھر بولا سمجھ میں نہیں آتا کہ کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں؟''

''اسی ایک منہ سے کردیں نا اور کتنے منہ ہیں آپ کے پاس؟'' فی البدیہہ جملہ تھا کہ احمد فراز کو ہنستے ہنستے اچھو لگ گیا۔ اس کی کھانسنے کی وجہ سے آنکھوں سے پانی نکلنے لگا تھا۔ طیبہ پریشان ہوگئی تھی اس نے پانی کا گلاس اس کے منہ کو لگایا تو احمد فراز نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور پانی پینے کا انداز ایسا تھا کہ وہ طیبہ کی مدد کے بغیر پی نہ سکتا تھا۔ طیبہ کو پہلی بار کسی مرد کے ہاتھ نے چھوا تھا۔ اس کے پورے بدن میں بجلیاں سی دوڑنے لگی تھیں۔ وہ عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہوگئی تو اس نے چمچ پیالے میں رکھا اور گلاس ایک طرف رکھتی ہوئی بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کو سوپ خود پینا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح ہاتھ کو آہستہ آہستہ حرکت دینے سے ایکسرسائز بھی ہوگی اور آپ اپنی مرضی سے کھا پی بھی سکیں گے۔'' احمد فراز نے کوئی جواب نہ دیا تھا کیونکہ اس کے موبائل پر بیل ہونے لگی تھی اس نے دیکھا تو صہیب احمد کا نمبر تھا۔ کال ریسیو کرتے ہی وہ چیخ پڑا۔

''یار کہاں ہو؟ بھئی ہاسپٹل چھان مارے ہیں اور تمہارا سیل بھی آف جا رہا تھا آج تین دن ہوگئے ہیں۔''

''میں گھر پر ہی تھا بیٹا! اتنی ایفی شینسی نہ دکھاؤ اور آجاؤ۔'' احمد فراز نے کہا تو وہ دوسری جانب سے ہنستا ہوا بولا۔

''کھانا شانا میں تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گا۔ سمجھے تم؟''

''بیٹا! یہ گھر ہے کوئی ہوٹل نہیں اور پھر میرے ساتھ کھانا ہے تو کھچڑی، دلیہ، ساگودانہ، کالی مرچ والا شوربا اور......'' وہ ابھی گنوا ہی رہا تھا کہ صہیب احمد ہنستا ہوا بولا۔

''میں آرہا ہوں یار کھانا کھائے بغیر ہی پیٹ بھر گیا ہے۔ ٹیک کیئر۔'' رابطہ منقطع ہونے پر احمد فراز نے طیبہ کی طرف دیکھا جو استفہامیہ انداز سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میرا دوست ہے وہ میری تیمارداری کے لیے آرہا ہے۔'' احمد فراز نے کہا تو طیبہ پوچھنے لگی۔

''مجھے تو لگا تھا کہ تم اپنے آفس میں کافی خشک اور موڈی کے نام سے مشہور ہو گے۔ کیونکہ گزشتہ تین دنوں سے تو کوئی بھی نہیں آیا۔'' احمد فراز اس کے انداز پر ہنسنے لگا اور بولا۔

''یہ میرے آفس کا دوست نہیں ہے بلکہ خود بھی ایک مشہور اخبار کا چیف ایڈیٹر ہے اور اپنا بھی ایک نیوز چینل لاؤنچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' اخبار کے مالک کا سن کر طیبہ کے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ ربا کے لیے جس صاحب کا فون آیا تھا وہ بھی اخبار کا ہی مالک ہے اور احمد فراز کا کلاس فیلو بھی ہے۔

''اس کا نام؟'' طیبہ نے اس انداز میں پوچھا کہ احمد فراز کی پھر ہنسی نکل گئی۔

''اتنی تفتیش تو میری بیوی بھی نہ کرتی۔''

''اگر وہ موجود ہوتی تو......؟'' فی البدیہہ جواب سن کر وہ ہنستا ہوا اُٹھ کر بیٹھنے لگا تو درد سے کراہ کر رہ گیا۔ طیبہ نے آگے بڑھ کر اس کو سہارا دے کر اُٹھایا اور اس کی کمر کی ٹیک تکیے سے لگا دی۔ پھر اسی وقت بیگم و ڈاکٹر ارباب احمد کمرے میں داخل ہوئے اور اس منظر کو دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کیے اور دونوں نے بیک وقت گلا کھنکھارا تو طیبہ اور احمد فراز چونک پڑے۔ بلکہ طیبہ تو شرمندہ سی ہو گئی۔

''کیسے ہو جناب صحافی صاحب!'' ارباب احمد کی خوش مزاجی نے گھر میں ہمیشہ ہی ماحول کو خوشگواریت بخشی تھی۔

''بہترین ہوں انکل!'' احمد فراز پہلے سے واقعی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ طیبہ جانے لگی تو شمسہ بیگم بول پڑیں۔

''کہاں جا رہے ہو بیٹا؟'' طیبہ کو یکدم محسوس ہوا کہ اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہے یا پھر امی کی جہاندیدہ آنکھوں نے کچھ دیکھ لیا ہے اور اسے وہ خوف تھا کہ کچھ دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو لیکن وہ دونوں اس وقت طیبہ کے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے یہ بات طیبہ کے لیے پریشان کن بھی تھی اور فکرمندی کی بھی تھی۔

''کچھ نہیں امی!'' وہ شمسہ بیگم کو مطمئن کرنے والے انداز میں کہنے لگی۔ ''میں ذرا پیپرز کی تیاری کر لوں۔''

''تیاری ہوتی رہے گی۔ تم ادھر بیٹھو احمد فراز کے پاس۔ ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' احمد فراز اور طیبہ کے دلوں کی دھڑکنیں یکدم تیز ہو گئیں۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو چوری چوری نظروں سے دیکھتے ہوئے نظریں چرانے لگے۔

''بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے سوچا ہے۔'' ارباب احمد نے بات شروع کی تو طیبہ کے دل کی دھڑکنیں اتنے زور سے دھڑکنے لگیں کہ ان کی آواز طیبہ کو مزید چور بنانے لگی تھی۔ اتنی دیر میں ایک ملازم نے دروازہ کھٹکھٹا کر ایک کارڈ احمد فراز کو پکڑایا اور بولا کہ یہ صاحب نیچے آپ سے ملنے آئے ہیں۔

''فوراً اوپر لے کر آؤ۔'' احمد فراز نے ملازم سے کہا اور ملازم کے جانے کے بعد ان تینوں سے مخاطب ہوا۔
''میرا دوست ہے کلاس فیلو بھی ہے۔ صہیب احمد!'' یہ نام سن کر طیبہ چونک پڑی۔
''اچھا تو یہ وہی صہیب احمد ہے جو ریبا کو فون کرتا ہے۔'' طیبہ نے سوچا اور ایک طرف پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''اس صہیب احمد کو تو دیکھ کر ہی پتہ چلے گا کہ کیسا ہے اور ریبا کے ساتھ اتنا انوالو کیوں ہے؟'' یہ طیبہ کی سوچ تھی وہ اس زاویئے سے بیٹھی تھی کہ وہ آنے والے کو دیکھ سکے لیکن آ کر کرسی پر بیٹھنے والا اس کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ ارباب، شمسہ اور احمد فراز بھی جانتے تھے کہ طیبہ اجنبیوں سے کم ہی ملا کرتی ہے بلکہ دور ہی رہتی ہے۔
ارباب احمد کی بات اپنی جگہ پر ہی رہ گئی تھی کیونکہ صہیب احمد کمرے میں داخل ہونے کے لیے دروازے پر پہنچ چکا تھا۔
''السلام علیکم!'' صہیب احمد نے اندر داخل ہوتے ہی کہا تو شمسہ اور ارباب احمد اُٹھ کر کھڑے ہو گئے تو اسے شرمندگی ہونے لگی وہ فوراً بولا۔ ''ارے ارے بیٹھیے آپ لوگ کیوں مجھے شرمندہ کرتے ہیں؟'' وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔
''انکل! آنٹی! یہ میرا کلاس فیلو اور اچھا دوست صہیب احمد ہے۔'' احمد فراز نے صہیب کا تعارف کروایا اور پھر شمسہ اور ارباب سے مخاطب ہوتا ہوا بولا۔ ''یہ ایک مشہور اخبار کو بھی بڑی خوبی سے چلا رہا ہے۔ یعنی پرنٹ میڈیا میں اس کا طوطی بولتا ہے۔''
''کیوں شرمندہ کر رہے ہو؟ طوطی تو تمہارا بولتا ہے جس پر حملے ہوتے رہتے ہیں۔'' صہیب احمد کی بات پر سبھی ہنسنے لگے۔ طیبہ نے دیکھا کہ لڑکا تو اچھا ہے لیکن یہ ریبا کے ساتھ مخلص بھی ہے یا نہیں ابھی اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا وہ خاموشی سے باہر نکل گئی تو احمد فراز نے شمسہ اور ارباب احمد کا بھی تعارف کروا دیا۔
''کہو کیسی طبیعت ہے؟'' صہیب احمد نے کہا تو شمسہ اور ارباب احمد جانے کے لیے اُٹھ گئے تو صہیب احمد بھی احتراماً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ شمسہ بیگم کی پرسنالٹی خاصی متاثر کن ہے اور وہ ہر لحاظ سے ایک باوقار اور متانت بھری عورت ہیں۔ وہ شمسہ بیگم کی شخصیت سے خاصا متاثر ہو گیا تھا۔
''آپ لوگ بیٹھیں نا پلیز...... میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا ہے۔'' وہ اخلاقاً بولا تو شمسہ بیگم مسکان ہونٹوں پر سجاتی ہوئی بولیں۔ ''نہیں...... نہیں ایسی بات نہیں۔ تم لوگ باتیں کرو۔ میں چائے بھجواتی ہوں۔''
ارباب احمد اور شمسہ بیگم ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو صہیب احمد کرسی پر بیٹھتا ہوا احمد فراز سے بولا۔
''یار! آنٹی کی تو بہت گریس ہے۔ میں تو گرویدہ ہو گیا ہوں ان کی پرسنالٹی کا۔''
''تمہاری ماں جیسی ہے۔ شرم کرو۔'' احمد فراز نے اسے گھورا تو وہ ہنستا ہوا بولا۔
''ماں جیسی کیا؟ مجھے تو لگا کہ ماں ہی ہیں۔'' دونوں ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ملازم چائے لے کر آ گیا۔

O......❖......O

فواز احمد روشنی کو نوٹس لکھوا رہا تھا اور ناول لکھنے کے لیے کن کن خیالات اور موضوعات کو مدنظر رکھا جاتا ہے وہ اس کو بتا رہا تھا۔ بلکہ ایک چھوٹا سا افسانہ بھی روشنی نے لکھ کر فواز احمد کی خدمت میں پیش کیا تھا اس کی نوک پلک کو سنوارتے ہوئے اس نے سمجھانے کا بہترین انداز اختیار کیا ہوا تھا۔ اس ایک ماہ کے دوران فواز احمد نے محسوس کیا تھا کہ روشنی میں سیکھنے کی صلاحیت تو ہے لیکن اس کو سکھانے والا کوئی نہ تھا لیکن سیکھنے کے علاوہ جو قابل غور بات تھی وہ یہ تھی کہ روشنی اس کی سانسوں میں بس چکی تھی اور روشنی نے بھی اس بات کو بخوبی محسوس کیا تھا کہ اب فواز احمد ہی اس کی زندگی ہے لیکن اظہار کا موقع ابھی نہ مل سکا تھا یا پھر یہ کہ وہ ابھی اظہار نہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ سیکھنے سکھانے کے عمل کو استاد اور شاگرد کے مقدس رشتے کا نام دیا جاتا ہے اس بات کو فواز احمد نے بخوبی ذہن میں رکھا ہوا تھا اور روشنی بھی اسی رشتہ کو مقدم جانتی ہوئی اپنی کسی بھی دلی خواہش یا اظہار محبت سے اجتناب کر رہی تھی لیکن فواز احمد آج کسی اور ہی موڈ میں تھا۔

''ایک بات پوچھوں روشنی''

''جی سر پلیز......'' روشنی اس کی طرف متوجہ ہوگئی لیکن ایک بار ہی آنکھیں اٹھا کر وہ جھکانا بھول گئی تھی کیونکہ فواز احمد بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ فواز احمد کو ہی آنکھیں جھکانا پڑی تھیں۔

''آپ نے لیپ ٹاپ پر جو پیسوں کا پیکٹ رکھا تھا وہ کس لیے؟''

''آپ کے لیے سر!'' مختصراً جواب تھا۔

''میرا مطلب یہ نہ تھا بلکہ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ......'' فواز احمد جو کہ لفظوں کا کھلاڑی تھا لفظوں کو توڑنا اور مروڑنا اس کا فن تھا لیکن وہ اس وقت خود کو بے کار محسوس کر رہا تھا۔ وہ خاموش ہوگیا تھا روشنی اس کی طرف دیکھتی ہوئی رہ گئی۔ جب چند ساعتیں گزر گئیں تو وہ بولی۔

''میں منتظر ہوں سر! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' روشنی کے دل میں بھی ہلچل سی مچی ہوئی تھی وہ بھی فواز احمد کے منہ سے کوئی نئی اور اچھوتی بات سننا چاہتی تھی ایسی بات جو دل کے تاروں کو چھیڑ جائے ایسا ساز جو اس طرح بجے کہ اس کی جھن جھن سے سماعتیں سکون محسوس کرنے لگیں۔

''روشنی! آپ کو وہ پیسے مجھے نہیں دینے چاہئے تھے۔'' وہ دیر بعد بولا تھا لیکن ان الفاظ کی روشنی کو توقع نہ تھی۔

''لیکن سر! ایک ماہ تو ہوگیا ہے اور میں نے آپ سے یہی ایگریمنٹ کیا تھا کہ......'' روشنی بول رہی تھی کہ وہ

خود پر قابو نہ رکھتا ہوا بول پڑا۔ ''کیا ہمارے درمیان اس ایگریمنٹ کے علاوہ بھی کچھ ہے؟'' روشنی کی آنکھیں ایک بار پھر اُٹھیں لیکن اس بار جھکنا بھول گئی تھیں کیونکہ فواز احمد آنکھوں کے راستے دل میں اُتر چکا تھا۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ فواز احمد پھر بولا۔ ''روشنی! میں مقدس رشتے کے پیرہن میں لپٹ کر محبت اور اس مقدس رشتے کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔'' کھلم کھلا اظہارِ محبت تھا۔ فواز احمد نے کہہ دیا تھا کہ وہ بھی اسے ''سر'' کہنے کی بجائے صرف فواز احمد ہی کہے۔ اب جواب دینے کی باری روشنی کی تھی وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

''اگر تم کہو تو میں آج شام ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' فواز احمد کا جواب سن کر وہ تڑپ کر اس کی طرف دیکھتی ہوئی بے ساختہ بولی۔ ''لیکن کیوں فواز؟''

پورے کمرے میں عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی۔ روشنی کا پہلی بار ''سر'' نہ کہنا اور بے ساختہ الفاظ کی ادائیگی اور لہجے کی تڑپ نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ بھی اپنے جذبات واحساسات پر قابو نہیں رکھ سکی اور آج اس نے بھی وہ لبادہ اُتار دیا تھا جو اس نے استاد شاگرد کے مقدس رشتے کی آڑ میں پہن رکھا تھا۔ کمرے میں اتنی خاموشی تھی کہ دونوں کو ایک دوسرے کی دھڑکنیں بآسانی سنائی دے رہی تھیں۔

روشنی کو اپنی کہی ہوئی بات کا احساس ہوا تو اس کی نظریں جھک گئیں۔

''میری طرف دیکھو روشنی!'' فواز احمد اس کی طرف جھکتا ہوا بولا تو روشنی نے جھیل جیسی آنکھوں کی گہرائی میں فواز احمد کو غوطے دینا شروع کر دیئے تو وہ مخمور لہجے میں بولا۔ ''میں جس سفر پر چل نکلا ہوں وہ بڑا کٹھن اور دشوار ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔ خاردار راہیں، پُرخطر راستے اور کانٹوں بھری آزمائشیں میرے لیے منہ کھولے منتظر ہیں کہ کب میں ان کی جانب بڑھوں اور کب وہ میرے اس وجود کو اپنے نوکیلے دانتوں، خونخوار پنجوں اور دلفریب اداؤں سے نوچ نوچ کر اس طرح کھانا شروع کر دیں جس طرح گِدھوں کا غول کسی مردار کو کھاتا ہے۔''

''اگر آپ خوفزدہ ہیں تو ابھی ان راہوں سے لوٹ جایئے ...... لیکن......'' وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گئی اور فواز احمد کی طرف دیکھتی رہی تو وہ استفہامیہ انداز میں بولا۔ ''لیکن کیا روشنی؟''

''مجھے اپنے ہاتھوں سے زہر دے کر جانا۔'' وہ اُٹھ کر جانے لگی تو فواز احمد نے ہمت کر کے پہلی بار اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو روشنی کا دل اس زور سے دھڑکا کہ وہ بے ساختہ ہو کر واپس مڑی اور فواز احمد کی آنکھوں میں دیکھنے لگی جہاں اس کو پیار ہی پیار نظر آ رہا تھا۔ وہ پیار اور محبت کے اس سمندر میں ڈوبنے لگی تو فواز احمد بولا۔

''ان پُرخطر راہوں میں چلنے کے لیے میرا ساتھ دو گی روشنی؟''

''روشنی کبھی بھی تمہاری زندگی میں اندھیرا نہ ہونے دے گی۔'' وہ مخمور لہجے میں بولی۔

''تمہارا اسٹیٹس، خاندانی وقار، باپ کی عزت، بھائی کا بھرم، تمہیں اس بات کی اجازت دے گا؟''

''سچی محبت پر ان چیزوں کو سو بار بھی قربان کرنا پڑا تو ضرور کروں گی۔''

''کہنا اور کر کے دکھانا بہت مشکل ہے۔''

''آزما کر دیکھنا چاہتے ہو تو ابھی بتا دو۔ روشنی ہر آزمائش میں تم سے پہلے جلے گی۔''

''میں کون ہوتا ہوں کہ محبت کو آزماؤں۔ محبت اپنے امتحانات کا وقت خود ہی مقرر کرتی ہے۔''

''تو پھر اس بار محبت کو اپنی اوقات بھولنا ہوگی۔'' روشنی کا ارادہ مصمم اور لہجہ پختہ تھا۔

وہ گھوم کر روشنی کے سامنے آیا اور اپنے ہاتھ کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر اُٹھاتا ہوا بولا۔

''میں ہر طرح کے طوفانوں سے کھیل کر بھی تمہیں جیتنا چاہتا ہوں روشنی۔'' وہ محبت سے سرشار اور پیارے لہجے میں بولی۔ ''روشنی تو اس دن تم پر دل ہار گئی تھی جب سفر میں تمہارے کندھے پر سر رکھ دیا تھا۔ حالانکہ تب مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تم ہی فواز احمد ہو۔''

فواز احمد کو اس پر اس لمحہ بہت پیار آیا اس کا دل چاہا کہ ابھی آنکھوں ہی آنکھوں سے روشنی کو چومنا شروع کر دے اور اس پر اپنا سارا پیار نچھاور کر دے لیکن وقت اور حالات کا تقاضہ تھا کہ وہ روشنی کو چھوڑ دے تاکہ وہ ابھی یہاں سے چلی جائے کیونکہ کسی کے آنے کی چاپ سنائی دینے لگی تھی۔

روشنی نے اپنی نوٹ بک اُٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گئی تو فواز احمد نے ایک طویل سانس لی اور آگے بڑھ کر دروازہ بند کرنا چاہا تو صباء بیگم کو دروازے سے اندر داخل ہوتا دیکھ کر چونک پڑا۔

''کیا ہوا؟ کوئی چوری پکڑی گئی ہے ماسٹر جی؟'' فواز احمد کو آج بالکل بھی برا نہ لگا تھا کہ صباء بیگم نے اس کو ماسٹر کہا ہے آج وہ ویسے ہی بہت خوش تھا اس کو اس کی محبت نے محبت کرنے کی حامی بھر لی تھی۔

''میں علم بانٹنے نکلا ہوں میڈم! چوریاں کرنے نہیں۔'' وہ بولا تو صباء بیگم ہنسنے لگی۔

''پھر مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ علم بانٹنے کے دوران تم اپنی بھی کوئی اہم چیز گنوانے والے ہو۔'' وہ صباء بیگم کا فلسفہ سن کر مسکرانے لگا اور بولا۔

''ہم تو اپنا آپ گنوا کر ہی علم بانٹتے ہیں میڈم! اب کھونے یا گم ہو جانے کا کوئی ڈر یا خوف نہیں ہے۔''

''بے خوفی اچھی بات ہے مگر یہ کم عقلی کا دوسرا نام بھی ہے۔''

''کم عقل اور بے خوف لوگ اتنی دور سے اجنبیوں میں آ کر اپنا آپ نہیں کھوتے۔'' وہ لفظوں کا کھلاڑی تھا اور صباء بیگم نے دنیا گھومی ہوئی تھی وہ اس کی بات کو سمجھتی ہوئی بولی۔

''کیا مجھے محبت سکھا سکتے ہو ماسٹر؟'' وہ ہنسنے لگا بلکہ اس کا دل چاہا وہ قہقہے لگا کر دل کھول کر ہنسے لیکن وہ اس پوزیشن میں نہ تھا۔

''آپ محبت کرنا سیکھنا چاہتی ہیں یا محبت چھیننا؟'' بڑا ہی گہرا جواب تھا اور سوال بھی دلچسپ تھا۔

''جس نے اپنی جوانی محرومیوں کے بستر پر اور خواہشوں کی سلوٹ زدہ چادر پر گزاری ہو وہ کسی کی محبت کیا چھینے گی۔'' صباء بیگم کے اندر کا تلخ سچ الفاظ کی صورت میں باہر آنے لگا تھا اور فواز احمد کو اس کے اسی روپ سے بہت ڈر لگتا تھا۔

''مجھے محبت کرنا سکھاؤ ماسٹر! مجھے بتاؤ کہ محبت کیسے ہوتی ہے۔ کیسے ہو جاتی ہے اس کا جواب کیسے دیتے ہیں اس کو پاتے کیسے ہیں؟ اس کو چھن جانے پر زندگی کیسے گزارتے ہیں؟ مجھے کچھ بتاؤ ماسٹر! پلیز کچھ بتاؤ۔ ورنہ میں کسی نہ کسی روز ان دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود کو پاش پاش کر لوں گی۔'' اس نے فواز احمد کو شرٹ کے گریبان سے پکڑ لیا تو اس کی اوپر والی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ وہ کافی گڑبڑا گیا تھا کیونکہ اب صباء بیگم کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے

تھے۔''آپ بیٹھیں پلیز۔''وہ اس صورتحال سے سٹپٹا گیا تھا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔''مجھے لگتا ہے کہ آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''اس دل میں نجانے کون کون سے روگ پل رہے ہیں ماسٹر تمہیں کیا پتا؟''اس نے فواز احمد کی شرٹ چھوڑی تو فواز احمد کی واضح طور پر پُرسکون سانس کو اس نے بھی محسوس کیا تھا۔

''میرا ساتھ دو گے؟''عجیب سا سوال تھا جس کا سر پیر ہی سمجھ نہ آیا تھا وہ صباء بیگم کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگا تو وہ مسکرانے لگی۔''تم میرا خیال رکھو میں تمہارا خیال رکھوں گی۔''

''خیال؟''وہ اس لفظ کو چبا کر بولا تو صباء بیگم ایک بار پھر اس کے بالکل قریب ہوگئی حتیٰ کہ اس کا جسم فواز احمد کے جسم سے مس ہونے لگا فواز احمد کے پورے بدن میں کرنٹ سا دوڑ گیا تھا وہ صباء بیگم کی تیز ہوتی ہوئی سانسوں کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ اسے ایک جنونی کردار لگ رہی تھی۔ لیکن اس وقت آفت سے جان چھڑانا انتہائی ضروری تھا۔

''تم سمجھدار ہو۔ بھولے بننے کی اداکاری نہ کرو۔ جوان اور خوبصورت بھی ہو۔ میری جوانی کا خیال کرو۔ میں تمہیں روپیہ پیسہ دولت اور ہر وہ چیز دوں گی جس کی تمہیں خواہش اور طلب ہے۔''وہ واپس مڑی اور دروازہ بند کرلیا تو فواز احمد اپنی ہی نظروں میں خود کو گرا ہوا محسوس کرنے لگا۔ وہ خود کو پہلی بار چور محسوس کر رہا تھا۔

''اس دروازے کے پار کی دنیا کو کوئی خبر نہ ہوگی فواز احمد!''صباء بیگم نے پہلی بار اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔ وہ بانہیں کھول کر فواز احمد کی منتظر تھی اور فواز احمد دل کی بے قابو دھڑکنوں اور بے ترتیب سانسوں کو اعتدال پر لانے کی تگ ودو میں مصروف تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

اس نے قرآنی آیات کا ورد کرنا شروع کردیا۔ وہ دل ہی دل میں آیات کریمہ کا ورد کرتا ہوا دعا کر رہا تھا کہ اس گناہ کی گھڑی سے جان چھوٹ جائے۔ صباء بیگم نے آگے بڑھ کر اس کو بیڈ پر گرا لیا اور اپنا وجود اس پر اس طرح بچھا لیا کہ وہ ایک چادر کی طرح اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ فواز احمد کی آنکھوں سے آنسو نکلنے کو مچل رہے تھے۔ وہ خود کو بے بس اور بے چارہ محسوس کر رہا تھا وہ تو صرف روشنی کی محبت کی خاطر یہاں آیا تھا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اس بڑے محل میں کتنے چھوٹے لوگ رہ رہے تھے۔

اس کی دعائیں قبول ہوئیں کہ صباء بیگم کا موبائل بجنے لگا۔ صباء بیگم پر شیطان سوار تھا اس نے موبائل دیکھا تو مراد خان کا نمبر دیکھ کر وہ یکدم فواز احمد کو چھوڑ کر الگ ہوئی اور کال ریسیو کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ فواز احمد کے باقاعدہ آنسو آئے تھے۔ وہ فوراً سجدے میں گر گیا اور زار وزار رونا شروع کردیا۔ اسے اس بات کی بھی پرواہ نہ تھی کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ روشنی یا کوئی ملازم اس کو اس حال میں دیکھ لیتا تو اس کی ذہنی حالت پر شک ضرور کرتا۔ اس کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا وہ جس مقام پر آکر کھڑا ہوگیا تھا وہاں وہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے صباء بیگم کی آنکھوں میں ناچنے والی شیطنیت بہت پہلے پڑھ لی تھی۔ وہ اس بات اور صباء بیگم کے وار سے بچنے کے لیے وقت سے بہت پہلے ہی روشنی کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کر چکا تھا۔ وہ دل ہی دل میں روشنی کو چاہتے رہنے کا عزم کر چکا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ کبھی بھی روشنی سے اظہار کی جرأت نہ کرے گا کیونکہ وہ اربوں روپوں کی اکیلی وارث تھی جبکہ صہیب احمد کا اپنا الگ سے بزنس تھا جو کہ اچھے طریقے سے چل رہا تھا۔ وہ اپنی اوقات بھول کر روشنی

سے اظہار کی جلدی اسی بناء پر کر گیا تھا کہ اس محل میں رہنے کے لیے اسے روشنی کا سہارا تو میسر ہو۔

روشنی نے بھی اس کے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اس کی محبت کا جواب محبت سے دے کر اس کا دل جیت لیا تھا بلکہ اس کو اس محل میں رہنے کے لیے بہترین جواز مہیا کر دیا تھا۔ اس کی محبت اسے محبت سے چاہتی تھی اور صباء بیگم کی شیطانی خواہشات کو پورا کر کے انسانیت کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی گناہ کی دلدل میں خود کو لتھڑا ہوا پانا چاہتا تھا۔ وہ تو لفظوں کا کھلاڑی تھا۔ الفاظ کا سوداگر تھا پیار اور محبت کا تاجر تھا۔ وہ پاکیزہ محبت کو ہی عبادت سمجھتا تھا۔

صہیب احمد اس کا محسن بھی تھا اور دوست بھی اور صباء بیگم اس کے محسن کی ماں تھی۔ وہ کسی بھی صورت گناہوں سے لتھڑی زندگی اور محسن کشی کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ تو صرف روشنی کی ایک محبت بھری کرن کا طلبگار تھا اور روشنی نے اس کی محبت کی حامی بھر کر اس کو یہ بتا دیا تھا کہ وہ اس محل میں میری خاطر ہی رُک جائے۔ وہ صباء بیگم کی ان حرکات کو روشنی تک نہ پہنچا سکتا تھا کیونکہ کوئی بھی اس کی بات پر یقین نہ کرتا جبکہ اس کے پاس کوئی بھی ثبوت نہ تھا۔ وہ اس بات کو سوچ سوچ کر ہی پریشان ہو رہا تھا کہ اگر روشنی اس کو صباء بیگم کے ساتھ اس طرح بند کمرے میں اس حالت میں دیکھ لیتی تو اس کی عزت اور ساکھ مٹی میں مل جاتی۔

وہ سجدے سے اُٹھا اور خود کو بیڈ پر گرا لیا۔ وہ اس عجیب سی صورتحال کا شکار ہو گیا تھا وہ اس محل سے جا بھی نہ سکتا تھا کیونکہ روشنی سے جدا ہونے کا تصور ہی جان لیوا تھا۔ وہ اس محل سے جا کر روشنی سے مل نہ سکتا تھا اس کا دیدار نہ کر سکتا تھا اپنی محبت کو پروان نہ چڑھا سکتا تھا۔ آنکھوں اور دل کو کس طرح سکون دے پائے گا۔ وہ روشنی کی خاطر اس محل میں ہی رہے گا لیکن صباء بیگم کی خواہش کو پورا کیے بغیر ہی یہاں ٹھہرے رہنا اسے فی الحال ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔

○......❖......○

شہر کی مشہور اور پُر رونق جگہ پر اتفاق سے ریبا اور صہیب کی ملاقات ہو گئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ ریبا ماہانہ میگزین خریدنے کے سلسلہ میں جیسے ہی بک شاپ میں داخل ہوئی تو اس کو سامنے ہی صہیب احمد نظر آ گیا وہ کوئی کتاب دیکھنے میں مگن تھا۔ ریبا کچھ لمحہ وہاں ہی کھڑی سوچتی رہی کہ وہ اس کو بلائے یا نہ بلائے یا پھر خاموشی سے اپنے پسندیدہ میگزین خریدے اور خاموشی سے ہی شاپ سے باہر نکل جائے۔ لیکن اس نے دیکھا کہ صہیب احمد یکدم گھوما اور سامنے کھڑی ریبا کو دیکھ کر مسکراتا ہوا اس کی طرف بڑھ آیا۔

"کیسی ہیں آپ مس ریبا!" وہ باوقار لہجے میں بولا تو ریبا کو بھی اخلاقاً اس کی بات کا جواب دینا پڑا۔

"می فائن...... آپ کیسے ہیں؟"

"آپ کے سامنے ہوں۔"

"اچھے بھلے لگ رہے ہیں۔" ریبا شرارتی انداز میں بولی تو وہ مسکراتا ہوا کہنے لگا۔

"اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میں اچھا بھی ہوں اور بھلا بھی ہوں۔"

"آپ کو بھی کتب سے دلچسپی ہے کیا؟" ریبا آگے بڑھنے لگی تو وہ ایک طرف ہوتا ہوا بولا۔

"جی ہاں...... کیوں اچھی اور پاکیزہ کتب سے مخلص کوئی دوست نہیں ہے۔"

''واؤ......آپ کے خیالات تو کافی ملتے جلتے ہیں۔''
''کس سے؟'' وہ خوشگوار حیرت سے بولا۔
''مجھ سے۔'' وہ ان دولفظوں کوادا کرتے وقت شرما سی گئی تو صہیب احمد کو کچھ حوصلہ ہوا اس نے بات بڑھائی اور بولا۔''اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ایک کپ کافی میرے ساتھ پینا پسند کریں گی؟''
وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔''اگر کسی نے دیکھ لیا تو خواہ مخواہ ہی باتیں بنائیں گے لوگ۔''
''لوگوں کا کیا ہے؟ وہ تو ہمیں یہاں......میرا مطلب ہے کہ کتابوں کی دکان میں دیکھ کر...... یہ بھی کہہ دیں گے ہم ڈسکو میں ملتے ہیں۔'' ریبا اس کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔
''تو پھر چلیں؟'' ریبا کے لیے انکار کی گنجائش نہ تھی وہ صہیب کے ساتھ مسکراتی ہوئی دکان سے باہر نکلی اور اس کی گاڑی میں وہ دونوں ایک کافی شاپ پہنچ گئے۔
''ریبا کا پہلا موقع تھا اور وہ کافی نروس محسوس کر رہی تھی جبکہ صہیب احمد کو بھی اپنے اردگرد پر نظر رکھنا ضروری محسوس ہو رہا تھا کیونکہ وہ اخبار کا آدمی تھا اسے معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی صحافی اپنے کیمرے سے اس کی نجی زندگی میں دخل دینے کے لیے تیار بیٹھا ہوگا۔ وہ ابھی تک تو کافی محتاط تھا اور اپنے اس محتاط رویئے کو وہ ریبا پر ظاہر نہ کر رہا تھا بلکہ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بالکل ری لیکس ہے۔
اتنی دیر میں ویٹر آرڈر لے کر جا چکا تھا اس نے دیکھا کہ ریبا کچھ نروس ہے اس کی وجہ صہیب احمد کا ساتھ ہے۔ تو وہ گلا کھنکارتا ہوا بولا۔''کسی بھی خوبصورت لڑکی کے ساتھ اس طرح کی کافی شاپ میں بیٹھنا۔ میرا بھی پہلا تجربہ ہے۔'' ریبا اس کے انداز پر ہنستی ہوئی بولی۔
''اور آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ لڑکی کے لیے کتنے مسائل اور پریشانیاں بن سکتی ہیں۔''
''آپ کہہ دینا کہ میں......'' وہ ریبا کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔''اپنے دوست کے ساتھ تھی۔''
''دوست......'' وہ استفہامیہ انداز میں بولی تو صہیب احمد ہنستے ہوئے کہنے لگا۔
''کیا میں اس رشتے کے بھی قابل نہیں ہوں؟'' وہ فوراً بولی۔
''ارے نہیں......ایسی بات نہیں......میرا مطلب تھا کہ ہمارے معاشرے میں لڑکی اور لڑکے کی دوستی کو کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔''
''تو پھر کیا جواز پیش کریں گی آپ؟'' اس سوال نے کئی سوال پیدا کر دیئے تھے۔ اتنی دیر میں بہترین اور گرم کافی کے دو مگ ان کے سامنے رکھے جا چکے تھے۔
''ایسی نوبت ہی نہیں آئے گی۔'' ریبا بولی تو صہیب احمد کو بھی حوصلہ ہوا اور وہ بولا۔
''میں اکثر یہاں اکیلا ہی کافی پینے آتا ہوں۔ نجانے آج مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ آج کی کافی کافی مزیدار ہو گی۔'' اس نے ریبا کے ساتھ کو خوبصورت الفاظ کا لبادہ اوڑھا کر اس کی تعریف کی تو وہ ہلکا سا مسکرائی اور بولی۔
''مجھے معلوم ہے کہ الفاظ اور سچویشن کو موقع پر دیکھ کر آپ ایک اچھی نیوز کری ایٹ کر لیتے ہیں۔''
''ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم لوگ جن چہروں کو تلاش کرتے رہتے ہیں وہ دیر سے ملتے ہیں۔'' صہیب احمد کا

سوال سن کر وہ اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''ہوئی کچھ تاخیر تو باعث تاخیر بھی کچھ تھا۔'' وہ ہنسنے لگا اور کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

''مجھے آج ہی پتہ چلا ہے کہ آپ شاعری کا ذوق بھی رکھتی ہیں۔''

''شاعری بہت نازک اور حساس احساس کا نام ہے۔ میں اس قابل کہاں؟''

''آپ کو دیکھ کر تو کئی غزلیں اور اشعار معرض وجود میں آسکتے ہیں۔ آپ کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہے۔''

صہیب احمد کی بات سن کر وہ شرما گئی مگر آنکھیں جھکنے کی بجائے اُٹھا کر رہ گئی۔ کیونکہ اس کی آنکھوں میں جو کشش تھی وہ بتا رہی تھی کہ اب نگاہ پلٹ کر نہیں آئے گی وہ صہیب احمد پر قربان ہوگئی ہے۔

جب چلتی ہو تو کئی راہی ٹھہر جاتے ہیں
پلٹ کر جو دیکھو تو کاکل بکھر جاتے ہیں
طلسم اور بڑھ جاتا ہے جو لگاؤ آنکھ میں کاجل
زلفیں تیری دیکھ کر بادل بھی سنور جاتے ہیں

صہیب احمد نے اس کی خوبصورت الفاظ میں تعریف کی تھی وہ نظریں جھکاتی ہوئی بولی۔

''شاعر تو آپ ہیں۔''

''الفاظ آپ پر قربان ہونے کے لیے مچل رہے تھے۔'' صہیب احمد لفظوں کو پرو پرو کر پورا اخبار بناتا تھا اور اس کے چنے ہوئے الفاظ ہی اس کی کامیابی کا راز تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ریبا خود کو شرارتی، چالاک ہوشیار اور باتونی سمجھنے کے باوجود بھی خود کو گونگی محسوس کر رہی تھی۔

''کافی دیر ہوگئی ہے۔'' ریبا اپنی کافی ختم کر چکی تھی اور صہیب احمد بھی اپنا مگ ختم کر کے میز پر رکھ چکا تھا۔

''میں آپ کو گھر تک ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' صہیب احمد نے آفر کی تو ریبا یکدم گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''آپ کو خوامخواہ ہی زحمت ہوگی۔ میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔''

''آپ تو چاہتی ہی نہیں ہیں کہ میں آپ کے گھر آؤں؟'' صہیب احمد کا انداز شرارتی تھا۔

''میرا یہ مطلب نہ تھا بلکہ......'' وہ ڈری سی گئی تھی صہیب احمد مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں شام کو آؤں گا۔ احمد فراز کی خیریت پوچھنے کے لیے۔''

ریبا نے اپنا بیگ اُٹھایا اور ''تھینک یو'' کہتی ہوئی کافی شاپ سے باہر نکل گئی۔ مگر صہیب احمد کے دل کا قرار ساتھ ہی لے گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر ریبا اس کی زندگی میں نہ آئی تو وہ کیسے جی پائے گا۔

○......❖......○

انیل شرما نے تیرہواں مجسمہ بنانا شروع کر دیا تھا اس سے پہلے وہ بارہ مجسمے بنا کر ان کو گیت کا نام دے چکا تھا اور اس کے عشق کی انتہا یہ تھی کہ بارہ کے بارہ مجسمے ایک جیسے ہی تھے ان سب میں رتی برابر بھی فرق نہ تھا وہ بڑی محبت سے مجسمے کی آنکھیں تراشتا تو کتنی ہی ویران آنکھوں سے ہی باتیں کرتا رہتا تھا وہ اس خوبصورت چہرے کے گرد اسکارف بناتا تو اسکارف کی تعریف میں بھی کئی الفاظ اشعار بن کر اس کی زبان سے ادا ہوتے رہتے تھے۔ وہ ہندو

دھرم کا پجاری ہونے کے باوجود عبادت و پوجا میں کم ہی دلچسپی لیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بھگوان نے انسان کو اپنی پوجا کے لیے پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اس نے انسان کو انسان سے پیار کرنے کے لیے بنایا ہے۔ وہ جس انسان کو پیار کرتا تھا آج تک اس کو دیکھ نہ پایا تھا لیکن اس کا عشق اور وجود کہتا تھا کہ وہ اس مجسمے سے قطعی مختلف نہ ہوگی۔

لیکن وہ ابھی تک حیران اور پریشان بھی تھا کہ اتنا لمبا انتظار کرنے کے باوجود بھی وہ آج تک اس کو کسی بھی جگہ نظر نہ آئی تھی۔ گیت کی ہلکی سی جھلک بھی وہ کہیں نہ دیکھ پایا تھا۔ اس کو کھوجنے کے لیے ہندوستان کی سیر کر چکا تھا۔ قریہ قریہ گلی گلی ہر میدان، کوچے بازار، مارکیٹ اور شاپنگ سنٹرز کے ساتھ ساتھ وہ ساحل سمندر بھی گھومتا رہتا تھا۔ لیکن آج تک وہ کسی بھی لڑکی میں گیت کی جھلک نہ دیکھ سکا تھا۔

یہ بات اس کے لیے لمحہ فکریہ تھی کیونکہ وہ ایک مجسمہ بنانے میں تقریباً ایک سال لگاتا تھا اور پورا سال اس کو اس بات کا ہی انتظار رہتا تھا کہ کاش گیت اس کو آواز دے۔ اس کمرے کے کسی کونے کھدرے سے وہ اس کو پکار کر کہے کہ بس کرو انیل! تمہارا انتظار رنگ لے آیا ہے۔ میں آ گئی ہوں۔ تمہارا عشق زندہ باد ہے۔ تم جیت گئے ہو۔ تمہارا عشق واقعی فرشتوں جیسا ہے کیونکہ تم نے مجھے دیکھے بغیر ہی بنانا شروع کر دیا تھا لو میں آ گئی ہوں۔ تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ اور انیل شرما اس کو جی بھر کر دیکھتا رہے۔ محو حیرت ایسا ہو کہ اس کو خود اپنا وجود بھی مجسمہ ہی لگنے لگے۔ وہ اپنے قدموں کو ہلا جلا نہ سکے۔ اپنی پلکیں جھپکنا بھول جائے۔ اپنی سانسوں کو اتنا آہستہ کر لے کہ کہیں اس کی سانسوں کا شور گیت کو ڈسٹرب نہ کر دے اور وہ اپنی دھڑکنوں کو دل سمیت اس کے سامنے سجدہ ریز کر دے۔ اس قدر اپنے سر کو جھکا دے کہ اس کا وجود ایک گٹھڑی بن کر رہ جائے اور اس گٹھڑی کو دیکھنے والوں کو گماں ہو کہ کوئی زندہ انسان نہیں بلکہ ایک میت سجدہ ریز ہے۔

کاش کہ گیت اس کو آواز دے اور وہ اس کے یاقوتی ہونٹوں کو دیکھ کر بھگوان سے پوچھے کہ ایک ہی چیز پیدا کرنا تھی یاقوت یا گیت کے ہونٹ اور پھر وہ جھیل جیسی گہری آنکھوں کا موازنہ دنیا کی کسی بھی گہری جھیل سے کرتا۔ سیاہ اور لانبی زلفوں کو گھٹاؤں سے تشبیہہ دے کر بادلوں کو شرمسار کر دیتا۔ وہ اس کے قد کاٹھ کو دیکھ کر سرو کے پودے کو بھی اس بات پر آمادہ کرتا کہ تمہارا نام گیت کا مرہونِ منت ہے اور پھر وہ اس کے حُسن کی رعنائیوں کو مزید روشنی بخشنے والے سیاہ اسکارف کو دیکھتا اور بھگوان سے شکوہ کرتا کہ چاند کے گرد پہرہ ہی لگانا تھا تو پھر اس کی روشنی اور اس کی تجلی کو ہالے کا محتاج کیوں بنایا؟

وہ بھگوان سے اس بات پر بھی لڑتا کہ اگر یہ میری نہیں ہے تو پھر میرے دل میں اس کا بسیرا کیوں ہے؟ اگر یہ میری نہیں ہے تو پھر اس کا پہرہ میری نیندوں پر کیوں ہے؟

اگر یہ میری نہیں ہے تو پھر اس کا سایہ میرے وجود پر کیوں ہے؟

اگر یہ میری نہیں ہے تو پھر میرے دل کے مندر میں میری پوجا کی حقدار کیوں بنی گئی ہے؟

اگر یہ میری نہیں ہے تو پھر میرے تراشے ہوئے کسی بھی مجسمے میں رتی برابر فرق کیوں نہیں ہوتا؟

بھگوان اگر یہ میری نہیں ہے تو پھر کیوں اس کی خوشبو میرے وجود کو معطر کرتی رہتی ہے؟

اگر گیت میری نہیں ہے تو پھر کیوں پیار، محبت، عشق اور عبادت کا ڈھونگ رچا کر مجھے اس تماشائی دنیا کے

سامنے تماشہ بنایا ہے؟

بھگوان یاد رکھنا! اگر گیت مجھے میری زندگی میں نہ ملی تو تمہیں خود میرے سامنے جواب دینے ہوں گے۔ تمہیں بولنا ہوگا بھگوان۔ تمہیں بتانا ہوگا کہ یہ کون ہے؟ اس نے میرے دل کا قرار کیوں چھین لیا ہے؟ اس نے میری سوتی جاگتی آنکھوں کے تمام سپنوں پر قبضہ کیوں جمالیا ہے؟

تمہیں یہ بھی جواب دینا ہوگا کہ آج تک مجھے نظر بھی نہیں آئی اور میرے پورے وجود میں ایک پارے کی طرح حلول کر گئی ہے۔ مجھ سے میرا نام، میری ہستی، میرا رہن سہن میرا دین دھرم اور میری پہچان کے ساتھ ساتھ اس نے میرا خاندان بھی کیوں چھین لیا ہے؟

اس نے طاق میں رکھے ہوئے بھگوان کی طرف آنسو بھری نظروں سے دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولا۔ ''ہے کوئی جواب! ہے کوئی جواب تمہارے پاس میرے دل میں اُٹھنے والے سوالوں کا اور میرے دل و دماغ میں پلنے والے اس طوفان کا جو بہت جلد مجھے اس بات پر اُکسانے والا ہے کہ میں اپنے کپڑے پھاڑ کر جنگلوں کی طرف نکل جاؤں اور وحشیانہ حرکات کرتا ہوا عاشق سے ایک درندہ بن جاؤں۔'' وہ چند ساعتیں خاموش ہو کر پھر بولا۔

''تمہارے پاس کوئی جواب کیسے ہوگا؟ تم کون سا عاشق ہو؟'' ان الفاظ کے ادا کرتے ہی اس کو محسوس ہوا کہ زمین لرز گئی ہو۔ وہ بے اختیار ہو کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے یوں لگا تھا کہ جیسے کوئی زلزلہ آیا ہو لیکن کوئی بھی چیز اپنی جگہ سے ہلی تک نہ تھی۔ گری تک نہ تھی لیکن انیل شرمانے واضع محسوس کیا تھا کہ اس نے لفظ عاشق ادا کیا ہی تھا کہ یوں لگا بھگوان اس سے ناراض ہو گیا ہے یا اس پر راضی ہو گیا ہے۔

''واہ......واہ......واہ جی واہ......'' وہ خود ہی پاگلوں کی طرح بول رہا تھا اس کو اس حالت میں دیکھنے کے بعد ہر کوئی یہی سمجھتا کہ اس کی ذہنی رو بہک گئی ہے یا پھر اس نے گھٹیا شراب کا نشہ شروع کر دیا ہے۔ وہ چند قدم آگے بڑھا اور طاق میں رکھے ہوئے بھگوان کے بت سے بولا۔

''غصہ آ گیا نا؟ غصہ آ گیا نا؟ ہاں...... بالکل ایسے ہی مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ بالکل ایسے ہی غصہ آتا ہے جب مجھے تڑپاتے ہو، رلاتے ہو، جلاتے ہو، ہجر و غم کی اگن میں جلا جلا کر میرا وجود راکھ کر دیا ہے تم نے۔ جدائی اور برہا کے صدمے سہہ سہہ کر اپنے ہی دل کا مجرم بن گیا ہوں میں۔ ہر روز نئی امید نئی آس، نیا بہلاوا، کوئی نہ کوئی بہانہ، کیا کروں کیا کروں وہ...... وہ پری کہتی ہے کہ میں کافر ہوں۔ کافر ہوں میں...... کیا پری سچ کہتی ہے؟ مجھے جواب دو بھگوان! کیا پری سچ کہتی ہے کہ میں کافر ہوں۔'' وہ باقاعدہ رونے لگا۔ وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ پھر اس نے جی ہلکا ہونے پر خود کو زمین پر بچھے ہوئے کارپٹ پر گرا لیا اور اوپر کی جانب منہ کرتا ہوا بولا۔

''اگر پری سچ کہتی ہے تو پھر تُو ہی بتا! میں کافر کیسے ہو گیا؟ میں نے اس کو چھوا تک نہیں۔ میں کافر کیسے ہو گیا؟ میں نے اسے دیکھا تک نہیں۔ اس کی پوجا کرنے سے ہی اگر میں کافر ہو گیا ہوں تو پھر یہ سب بھی کافر ہیں۔ ایک پتھر کو پوجنے سے اگر میں کافر ہو سکتا ہوں تو پھر یہ بھی دھرم کے پجاری نہیں ہیں۔ یہ بھی تو پتھروں کو پوجتے ہیں۔ یہ بھی کافر ہیں۔''

وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا اس نے دیکھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہے اندر داخل ہونے والی پری ہے۔ وہ

لیٹے لیٹے ہی کن اکھیوں سے اس کو دیکھتا رہا۔ وہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کارپٹ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''عشقِ لا حاصل کافر ہی بنا دیتا ہے انیل شرما!'' وہ طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا بولا۔

''تم سب کچھ سن رہی تھی پری؟''

''اگر میں کہوں کہ تم میرے بھگوان ہو اور میں تمہاری پوجا کرتی ہوں تو تم کیا کہو گے؟'' وہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتی ہوئی بولی تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور پری کے چہرے پر آ جانے والی بالوں کی لٹ کو اپنی انگلی سے سلجھاتا ہوا بولا۔

''کافر!'' یہ لفظ سن کر وہ تڑپ کر بولی۔

''تو پھر کون ہوگا جو تمہاری ان حرکات کو دیکھ کر تمہیں دین و دھرم کا پجاری سمجھے گا۔ اپنی بات کا جواب بھگوان سے پوچھنے کی بجائے اپنے اندر سے پوچھو۔ پوچھو کہ تم کون ہو؟''

''تم تو انسان ہو۔'' وہ پھر بولا تو پری اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''اگر انسان دوسرے انسان کی پوجا کرے تو وہ دھرم کا دوشی کہلاتا ہے۔ میں دھرم کا دوشی نہیں ہوں پری! میں تمہاری پوجا نہیں کرتا۔ میں اس بھگوان کی پوجا بھی نہیں کرتا۔ کیونکہ میں پجاری نہیں ہوں۔ عاشق ہوں...... عاشق ہوں پری۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی اور تالی بجاتی ہوئی بولی۔

''اگر یہی بات اس کمرے کے باہر کہی ہوتی تو یقیناً انکل تمہیں پاگل خانے بھجوا چکے ہوتے یا پھر تم گلیوں میں اس طرح گھومتے بھاگتے پھرتے جیسے کہ کسی نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے ہوں اور سر میں خاک ڈال کر وہ ان بچوں سے بچتا پھرتا ہے جن کے ہاتھوں میں پتھر ہوتے ہیں۔''

اس بار انیل شرما کے زوردار قہقہے نے پری کو حیران کر دیا تھا۔ وہ ہنستا ہوا بولا۔

''جس طرح پھول مندروں میں بھی چڑھائے جاتے ہیں اسی طرح کسی کی خوشی میں ہار بنا کر اس شخص کو بھی پہنائے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح یہ پتھر بھی اپنے نصیبوں پر ایسے ہی روتے ہیں کہ جو انسان ان کو تراش کر بھگوان بناتا ہے۔ ان کو سجدے کرتا ہے کبھی اسی انسان پر ان پتھروں کو بارش کی طرح انسان ہی برساتا ہے۔''

''طاق میں بیٹھا یہ بھگوان تمہیں محض ایک پتھر کا ٹکڑا نظر آ رہا ہے اور یہ......'' پری گیت کے مجسموں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بول رہی تھی۔ ''ان کو تم نے تو اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے۔ پھر اس کی پوجا کیوں کرتے ہو۔ اس کی کیوں نہیں جو طاق میں ہے۔''

''بُرا نہ مناتا! اپنے اپنے نصیب کی بات ہے پری! کوئی اینٹ محل میں لگ جاتی ہے تو اس اینٹ کی قدر بڑھ جاتی ہے اور اگر وہی اینٹ نالی میں لگ جائے تو پتہ نہیں اس کو کتنی دیر اس گندگی میں گزارنا پڑتی ہے۔ حالانکہ وہ بھی اینٹ ہی ہوتی ہے۔'' وہ اب ہوش و حواس میں لگ رہا تھا۔

''تم عاشق ہو؟'' پری نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو وہ بھی پری کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''اگر سچے عاشق ہو تو پھر بتاؤ کہ اس کائنات کا پہلا عاشق کون تھا؟'' پری نے اس کے کانوں میں الفاظ کا

سیسہ اس انداز میں اُنڈیلا کہ وہ لاجواب ہو کر رہ گیا۔ وہ خالی آنکھوں سے پری کی طرف دیکھنے لگا جس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکان پھیل رہی تھی۔

''جواب دو انیل شرما! کائنات کا پہلا عاشق کون تھا؟''

انیل شرما ہونق بن کر پری کی طرف دیکھے جارہا تھا کہ دور سے لیکن واضح طور پر اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔

''اللہ اکبر......اللہ اکبر......''

اس آواز کو سن کر انیل شرما پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ وہ ہولے ہولے لرزنے لگا۔ پری جو چند لمحے پہلے اس کی حالت سے محظوظ ہو رہی تھی اب کچھ پریشان دکھائی دینے لگی تھی کیونکہ وہ سمجھ ہی نہ سکی تھی کہ انیل شرما کی یہ حالت کیسے ہو گئی ہے؟

''اشہد ان محمد رسول اللہ'' موذن کی محبت بھری صدا انیل شرما کو اور بھی تڑپا گئی۔ اس نے اپنے وجود کو کان بنا لیا تھا۔ اسے پورا وجود ہی موذن کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ کو سن کر تھر تھر کانپنے لگا تھا۔''اشہد ان محمد رسول اللہ۔''

اچانک انیل شرما کے منہ سے جھاگ بہنے لگی اس پر مرگی کے دورے جیسی حالت اور کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ پورے وجود کے ساتھ اس طرح کانپ رہا تھا جیسے کہ سردی لگ رہی ہو اور وہ بے پیرہن ہو۔ پری پریشانی کے عالم میں وہاں سے نکل گئی۔ وہ ''امیت انکل! امیت انکل'' چیختی ہوئی بھاگتی جارہی تھی۔ اس کی آوازیں سن کر آن کی آن میں سبھی محل کے باسی اکٹھے ہو گئے۔ اس نے روتے ہوئے انیل شرما کے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو سب اسی جانب بھاگے۔ دروازہ کھول کر جب اندر داخل ہوئے تو انیل شرما کو کھلی آنکھوں کے ساتھ بے حس و بے حرکت پا کر سب پریشان ہو گئے۔

○......❖......○
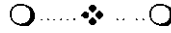
''ہر روز آئینہ دیکھ کر یہ ضرور سوچو کہ اگر تمہاری صورت اچھی اور خوبصورت ہے تو برا فعل نہ کرو کیونکہ اس طرح تم برا کام کر کے اس کی خوبصورتی کو تباہ کر لو گے۔'' دولت بی بی نے تسبیح پکڑی ہوئی تھی اور پاس بیٹھی ہوئی طیبہ ان کے سنہری اقوال سے اپنے علم میں اضافہ کر رہی تھی۔ ''اگر صورت بُری ہو تو پھر بھی کبھی گناہ کے راستے پر مائل ہونے کی کوشش نہ کرو کیونکہ دنیا میں آج تک کوئی بھی آئینہ ایسا نہیں بنا جس نے عورت کو یہ کہا ہو کہ تم بدصورت ہو۔''

''لیکن دادی جان! دوسروں کی جانوں پر ظلم کرنے والوں کو خدا کا خوف نہیں ہوتا؟'' طیبہ ایک معصوم بچی کی طرح سوال کر رہی تھی۔ ''اب آپ دیکھیں کہ جن لوگوں نے احمد فراز پر اتنا تشدد کیا ہے اس کو بیڈ پر لیٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کیا ایسے لوگوں کے لیے کوئی عذاب نہیں ہے؟ یا پھر حکومت ایسے لوگوں کو پکڑتی کیوں نہیں ہے؟''

صبح صبح گھاس پر گرنے والی شبنم کے قطرے ننھے ننھے موتیوں کی مانند اٹکھیلیاں کرتے ہوئے نظر آرہے تھے اور شمسہ بیگم ننگے پاؤں ان پر چلتی ہوئیں ان کو پاؤں کے نیچے دبا دبا کر اپنی صحت اور تندرستی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنا معمول کا کام بھی کر رہی تھیں۔ یعنی ان کے ہاتھ میں بھی تسبیح تھی جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کرتے ہوئے دانہ گرا رہی تھیں۔ وہ جب لان میں چکر کاٹ کر دولت بی بی اور طیبہ کے پاس آتیں اور پھر واپس جاتیں تو وہ یہی دعا کرتی تھیں کہ یا اللہ ان کی بیٹیوں کی عزتیں محفوظ رکھنا ان کو اچھے گھر دینا۔ ان کے نصیب اچھے کرنا۔ ایسی ہی کئی اور

دعائیں بھی وہ ہر بار کرتی تھیں اور اللہ تعالیٰ سے ان کی دعاؤں بھرے الفاظ ہر بار ہی مختلف ہوتے تھے۔
''حکومتیں ظالموں اور مظلوموں کے لیے ایک نظام وضع کرتی ہیں۔ تبھی تو یہ معاشرہ اس نظام کے تحت چلتا ہے اور پھر جب کوئی اس نظام سے بغاوت کا سوچتا ہے یا پھر اس نظام کو بگاڑنے کے لیے اپنا کردار ادا کرتا ہے تو پھر توازن بگڑ جاتا ہے اور توازن بگڑنے پر پھر ایسے ہی واقعات جنم لیتے ہیں۔''
دولت بی بی نے آج تک طیبہ کی بہت اچھی تربیت کی تھی ان کو طیبہ سے دلی لگاؤ تھا کیونکہ وہ ان کی بات کو سمجھتی تھی اور اپنی بات کو سمجھانا جانتی تھی اور جو بات سمجھ نہ آتی تھی وہ بار بار پوچھتی رہتی تھی یہی وجہ تھی کہ طیبہ اور دولت بی بی کی ہم آہنگی پر گھر والے بھی تبصرہ کرتے رہتے تھے۔ ریا اور عدیم ان کی بات کم ہی سنا کرتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ دولت بی بی کی عزت وتکریم نہ کرتے تھے۔ ارباب احمد اور شمسہ بیگم نے ان کو یہی سکھایا تھا کہ دولت بی بی کی عزت کرنے میں ہی ان کی عزت ہوگی۔
''تمہارے امتحانات کب ہو رہے ہیں؟'' دولت بی بی نے طیبہ سے اچانک موضوع تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ تو وہ چونک کران کی جانب دیکھنے لگی۔
''اگلے ہفتہ شروع ہوں گے دادی!'' وہ شمسہ بیگم کو دیکھ کر بولی۔ ''دادی! کیا آپ بھی امی کی طرح حسین اور خوبصورت ہوا کرتی تھیں۔ جوان بالکل ایسے جیسے امی کی پرسنالٹی ہے۔'' دولت بی بی اس کی بات سن کر ہنسنے لگیں۔
''انگریزی مجھے نہیں آتی یہ پرسنلٹی کیا ہوتی ہے۔'' طیبہ ان کی سادگی پر فریفتہ ہوگئی اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ''مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ میں تمہاری طرح اسکارف اوڑھ کر جب باہر نکلتی تھی تو کئی لڑکے دلوں پر ہاتھ رکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے۔'' دولت بی بی کے خوبصورت انداز پر طیبہ کو تجسس پیدا ہوا وہ ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''اور دادا جان کیسے تھے؟''

دولت بی بی ٹھنڈی آہ بھرتی ہوئی بولیں۔ ''تمہارا دادا تو فرشتہ تھا۔'' یہ الفاظ ادا کرتے ہی ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ طیبہ کو یکدم افسردگی کی چادر نے اپنے دامن میں لپیٹ لیا۔ ''وہ تو ایسا آدمی تھا اس نے مجھے دیکھا بھی نہ تھا۔ وہ میرے تایا کا بیٹا تھا۔ انتہائی محنتی، نیک، شریف اور ایماندار انسان میں نے ابھی تک اس نفسانفسی کی دنیا میں تمہارے دادا جیسا آدمی نہیں دیکھا۔ جو اپنے کام سے مخلص ہو۔'' دولت بی بی آنکھوں میں آجانے والی نمی کو صاف کرتی ہوئی بولیں تو طیبہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر ان کے ہاتھ پکڑ کر بولی۔
''آئی ایم سوری دادی! میں نے آپ کو دُکھی کر دیا۔''
وہ پیار سے اس کے سر پر چپت لگا کر ہنستی ہوئی کہنے لگیں۔
''مجھے گڈ گڈ لگا کہ تم نے میرے ساتھ اپنے دادا کی بات کی۔'' دونوں ہی دادی اور پوتی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔
تو شمسہ بیگم بھی ان کے پاس آکر بیٹھ گئیں کیونکہ اب سورج کی پہلی کرنیں ان کے لان میں روشنی بکھیرنے کے لیے گھاس پر اُتر چکی تھیں اور ہر چیز اس طرح روشن ہوتی جا رہی تھی کہ گویا قدرت کائنات کی ہر چیز پر سے اندھیرے کا راج ختم کر کے نور اور روشنی کا تسلط قائم کر رہی ہے اور یہ نظارہ ہر روز ہی ان کی آنکھوں کو بھاتا ہوا دل میں اُتر کر روح کو سکون اور دل کو قرار بخشتا تھا۔

''امتحان کب ہیں؟'' شمسہ بیگم نے بھی ان کے پاس بیٹھتے ہی پہلا سوال کیا تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکی لیکن کچھ بھی ایسا نہ کہہ سکتی تھی جوان کو بُرا لگتا۔

''اگلے ہفتے سے شروع ہو رہے ہیں۔'' وہ نیم دلی سے بولی تو شمسہ بیگم ہونٹوں پر سکون سجاتی ہو کر کہنے لگیں۔

''پیا گھر جانے کی تیاری کرو۔'' وہ یکدم چونکی اور شمسہ بیگم اور پھر دولت بی بی کی طرف دیکھتے ہوئے روہانسی انداز میں بولی۔ ''دادی! میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' ان الفاظ کو ادا کرتے ہی وہ زمین پر بیٹھ کر دولت بی بی کے گھٹنوں پر سر رکھ کر خاموش ہوگئی تو انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

''اب تم ماشاء اللہ بڑی ہوگئی ہو۔ جوان ہو اور خوبصورت بھی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ حالات کتنے خراب ہیں؟''

''لیکن دادی! حالات میں نے تو خراب نہیں کیے نا؟'' وہ یہ نہ سمجھ سکی تھی کہ شمسہ اور دادی کو کیا ہو گیا ہے جو یکدم اس کی شادی کی بات کرنے لگی ہیں۔ میں نہیں کروں گی شادی۔''

''ہاں..... تمہاری ماں نے بھی نہیں کی ہے نا؟'' شمسہ بیگم نے کہا تو دولت بی بی ہنسنے لگیں اور بولیں۔

''بہو تم جاؤ۔ میں اپنی بیٹی کو سمجھاتی ہوں۔''

''اماں! آپ جانتی ہیں نا۔ میں اس کی وجہ سے کتنی پریشان ہوں۔'' شمسہ بیگم اُٹھ کر جاتی ہوئیں دولت بی بی سے مخاطب تھیں۔ وہ چلی گئیں تو طیبہ نے سر اُٹھا کر دادی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''میری وجہ سے امی کیوں پریشان ہیں دادی! میں ان کو کوئی تنگ کرتی ہوں؟''

''نہیں میری بیٹی!'' دادی اس کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگیں۔ ''بہو کا مطلب تھا کہ آئے روز جو کالجوں میں واقعات ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے وہ کافی پریشان رہتی ہے۔''

''لیکن ریبا بھی تو کالج جاتی ہے۔'' وہ رونے والے انداز میں بولی۔

''وہ ابھی چھوٹی ہے اور پھر تم نے اپنی پڑھائی بھی تو مکمل کر لی ہے نا۔ آخر ایک دن تو پیا گھر سدھارنا ہی ہوتا ہے۔'' دولت بی بی اس کو سمجھاتی ہوئی بولیں تو جلدی میں کہہ گئی۔

''لیکن میں اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''

یہ فقرہ قدرتی تھا یا پھر اس کے دل کی آواز تھی یا پھر شمسہ اور دولت بی بی کی چال تھی کہ اس سے پوچھا جائے کہ وہ کسی کو پسند تو نہیں کرتی یا وہ اسی گھر میں احمد فراز سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کی زبان سے یہ فقرہ ادا ہوا ہی تھا کہ دولت بی بی کی آنکھیں مسکرانے لگیں وہ اس کا چہرہ اوپر اُٹھاتی ہوئی بولیں۔

''اس گھر میں ہی رہنا ہے؟''

طیبہ ان کی بات کو گہرائی تک سمجھتی ہوئی یکدم نروس ہوگئی اور اپنی صفائی میں بولنے لگی۔

''دادی! میرا یہ مقصد اور مطلب نہیں ہے۔ میں بس شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

''لیکن وہ تو کرنا چاہتا ہے۔'' دولت بی بی شرارتی انداز میں بولیں تو طیبہ یکدم کرسی سے اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''ایسا اس نے کہا ہے آپ سے؟'' وہ غصے سے پھنکارنے لگی تو دولت بی بی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ''وہ کیوں شادی

کرنا چاہتا ہے؟''

''تم بھی بھولی اور معصوم ہو۔ میں نے تو کسی کا ذکر تک نہیں کیا۔ کسی کا نام بھی نہیں لیا اور تم پتہ نہیں کس بے چارے پر غصہ نکال رہی ہو؟'' طیبہ کو واقعی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اپنا غصہ احمد فراز پر نکال رہی تھی لیکن دادی نے تو اس کا نام نہیں لیا تھا۔ کیوں نہیں لیا تھا دادی نے احمد فراز کا نام؟

○......❖......○

مراد خان نے غور سے صباء بیگم کی طرف دیکھا اور پھر ٹی وی دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ ''مجھے آپ کی اسی بات پر غصہ آتا ہے۔'' مراد خان خاموش بیٹھے رہے۔ ''صرف ایک ماہ کے لیے ہی وہ لوگ آ رہے ہیں پھر واپس چلے جائیں گے۔'' مراد خان نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا اور بیگم کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''اس دوران کیا کیا ہو گا؟''

''کیا مطلب کیا کیا ہو گا؟'' صباء بیگم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''ان کا شادی کا پروگرام بھی ہے؟'' مراد خان خاصا سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

''تو اور کیا وہ یونہی جھک مارنے آ رہے ہیں۔ علی اور روشنی کا نکاح ہو گا۔ اگر وہ روشنی کو ساتھ لے جانا چاہیں تو بخوشی لے جائیں آخر ان کی امانت ہے۔'' صباء بیگم نے کچھ تفصیل بیان کی تو مراد خان لمبی سانس اوپر کھینچتے ہوئے بولے۔

''مجھے تو ڈر لگتا ہے بیٹی کو اتنی دور بھیجتے ہوئے۔''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔'' صباء بیگم ہاتھ نچا کر بولی۔ ''وہ کون سا پرائے لوگ ہیں۔ میری بہن ہے۔ علی ان کا اکلوتا بیٹا ہے وہ پھولوں کی طرح روشنی کو رکھیں گے۔''

''لیکن وہاں کا ماحول۔'' مراد خان انجانے خدشے کے تحت بولے۔ ''کیا وہ اس ماحول سے جا کر وہاں ایڈجسٹ ہو پائے گی۔''

''علی سے اس کی منگنی بچپن میں ہی طے ہو گئی تھی اور وہ لوگ بھی روشنی کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھنے کے لیے بیتاب ہوں گے۔'' صباء بیگم نے اپنی بہن اور بھانجے کے حق میں دلیل دی تو مراد خان بولے۔

''تم نے روشنی سے بات کی ہے؟''

''اسے معلوم ہی ہو گا۔'' مختصراً اور بے نیازی سے بھرپور الفاظ سن کر مراد خان آگ بگولہ ہو گئے۔

''روشنی میری اکلوتی بیٹی ہے صباء بیگم!'' وہ غصے میں صوفے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تو صباء بیگم کا چہرہ بھی زرد ہونے لگا تھا۔ ''اگر یہ فیصلہ روشنی کو منظور نہ ہوا تو یاد رکھنا۔ کوئی بھی اس کے ساتھ زور زبردستی نہیں کر سکتا۔'' مراد خان یہ کہہ کر غصے سے باہر نکل گئے اور صباء بیگم اپنی جگہ پر تلملاتی کھڑی رہی۔

''مراد خان! تم دیکھنا کہ میں اپنے سپنوں کو کس طرح سچ کر کے دکھاتی ہوں۔ میرا نام صباء ہے صباء۔'' وہ زہریلی ناگن کی طرح پھنکاری تھی۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو زبیدہ آپا بھی وہاں موجود تھیں وہ نجانے کب اپنی وہیل چیئر کو چلاتی ہوئی وہاں آ گئی

تھیں۔ ''تم نے نورین سے بات کر لی ہے۔'' زبیدہ آپا صباء بیگم سے بولیں تو وہ ان کے پاس جا کر صوفے پر بیٹھ گئی جبکہ زبیدہ آپا نے اپنی وہیل چیئر اس کے پاس کر لی۔

''میری کل ہی لندن میں نورین سے بات ہوگئی ہے۔ وہ علی کو لے کر اگلے ہفتہ پہنچ جائے گی۔''

''صرف علی کو لے کر آئے گی؟'' زبیدہ آپا کا انداز چیخنے والا تھا۔ صباء بیگم ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''زبیدہ آپا! ہمیں تو علی سے ہی غرض ہونی چاہیے۔ ویسے وہ اپنی پوری فیملی کے ساتھ ہی آئے گی۔ ثانیہ، علی، نورین، جمشید بھائی بھی ساتھ ہی ہوں گے۔''

''جتنی جلدی ہوتا ہے اس کام کو نپٹاؤ۔ پھر اس کے بعد صہیب کی طرف بھی ہونا ہے۔'' زبیدہ آپا اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

''صہیب کا معاملہ تو بعد میں دیکھا جائے گا پہلے روشنی کو اس گھر سے بہت ساری جائیداد اور دولت و زیور کے ساتھ جا لینے دو۔''

''مجھے روشنی کا اس لڑکے سے ملنا اچھا نہیں لگتا۔'' زبیدہ آپا کی بات سن کر صباء بیگم چونک کر رہ گئی۔ ''یہ کیسی پڑھائی ہے کہ وہ اسے اپنے کمرے میں بلا کر تنہائی میں پڑھاتا ہے۔''

''وہ اچھا لڑکا ہے آپا! میں نے دیکھ لیا ہے وہ ایسا ویسا نہیں ہے۔'' صباء بیگم بولی تو زبیدہ آپا نے اس کی بات پکڑ لی۔ ''تم نے دیکھ لیا ہے؟ کیا مطلب کہ تم نے دیکھ لیا ہے؟'' صباء بیگم گڑبڑا گئی اور بولی۔ ''اوہو آپا! آپ بھی بات کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہیں۔ میرا مطلب تھا کہ میں بھی جہاندیدہ عورت ہوں مجھے تو اس لڑکے کی آنکھ میں کوئی بھی فتور نظر نہیں آیا۔''

''تو تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ ماسٹر! نورین اور علی کی موجودگی میں بھی یہیں رہے گا اور روشنی کو پڑھاتا رہے گا؟ کیا نورین اور اس کی فیملی اس بات کو قبول کر لیں گے؟'' زبیدہ آپا کی بات بڑے پتے کی تھی مگر اب صباء بیگم بھی اپنا دل فواز احمد پر ہار چکی تھی یا پھر اپنی بھوک مٹانے کے لیے اس کو اپنے حُسن کے جال میں پھانسنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکی تھی۔

''آپ فکر نہ کریں۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی۔'' صباء بیگم اُٹھ کر وہاں سے چلی گئی تو زبیدہ آپا نے ایک ملازمہ کو آواز دی۔ ملازمہ کے آنے پر انہوں نے حکم دیا کہ ان کی کرسی کو لان میں چھوڑا جائے اور ماسٹر فواز احمد کو بھی وہاں بلایا جائے وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔

پندرہ بیس منٹ بعد ملازمہ فواز احمد کے کمرے میں تھی اور آپا کا پیغام پہنچا رہی تھی۔ ملازمہ کے منہ سے سن کر فواز احمد حیران رہ گیا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے زبیدہ آپا نے بلایا تھا۔ اس نے کمرے کی کھڑکی سے صرف یہی دیکھا تھا کہ یہ معذور عورت ہے اور لان میں بیٹھی موسم سے انجوائے کرتی رہتی ہے۔ روشنی نے بتایا تھا کہ یہ اس کی بُوا ہیں اور بابا کی اکلوتی بڑی بہن ہیں۔ اس کے علاوہ فواز احمد کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ کیونکہ وہ اپنے کمرے تک ہی محدود تھا اور اس نے کبھی بھی روشنی یا صہیب احمد سے بوا کے متعلق کوئی بھی بات نہ کی تھی۔ آج ان کے بلاوے پر اس کو اچنبھا ہونا فطری امر تھا۔

وہ آج دوسری بار اس لان میں آیا تھا پہلے ایک بار جب وہ صباء بیگم کے ساتھ شاپنگ کرنے گیا تھا اور آج بوا زبیدہ کے کہنے پر اسے آنا پڑا تھا ورنہ وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہتا تھا۔ اس کا زیر قلم ناول بھی مکمل ہونے والا تھا۔ اب اس نے نئے پبلشرز سے نیا معاہدہ کرنا تھا اور اسے اچھی خاصی رقم ملنے کی توقع تھی۔ وہ زبیدہ آپا کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''السلام علیکم!'' فواز احمد کے سلام کہنے پر زبیدہ آپا نے اسے سر تا پاؤں دیکھا بلکہ حقیقت میں انہوں نے فواز احمد کو آج ہی دیکھا تھا اور وہ ان کے سامنے تین فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ زبیدہ آپا کو ایک اندرونی جھٹکا سا محسوس ہوا اور کچھ ایسی ہی کیفیت فواز احمد کی بھی ہوئی تھی۔ وہ سمجھا کہ بڑے لوگوں کے دلوں کا کوئی پتہ نہیں ہوتا کب اور کیا زبان پر آ جائے اور وہ حکم جاری ہو جائے جس کو وہ پورا کرنے کی پوزیشن میں قطعی نہ ہو اور پھر ایسا حکم کہ اس محل کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ وہ تو یہ سن کر ہی مر جائے گا۔ کیونکہ اب تو روشنی کے بغیر زندگی کا تصور بھی گناہ ہو گیا تھا۔

''بیٹھو۔'' زبیدہ آپا کی زبان سے شیرینی ٹپکی تو فواز احمد سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' پہلا سوال کیا گیا تو فواز احمد کو کچھ حوصلہ ہوا کہ بات انٹرویو تک ہی محدود رہے گی محل کو چھوڑنے کے حکم کی نوبت نہ آئے گی۔

''اسلام آباد۔'' مختصر جواب دے کر اس نے زبیدہ آپا کو یہ باور کرانے کی ضرورت سمجھی تھی کہ وہ مصنف ہے اور بولتا کم لیکن لکھتا زیادہ ہے اور اس کے لکھے ہوئے الفاظ بکتے ہیں۔

''یہاں کیوں آئے ہو؟''

''مجھے بلایا گیا ہے۔'' وہ بالکل سنجیدہ تھا جبکہ زبیدہ آپا اس سے بھی سنجیدہ تھیں۔

''کتنے بہن بھائی ہیں تمہارے؟''

''اکیلا ہوں۔''

''والدین؟''

''مجھے اکیلا چھوڑ کر خالق کائنات سے جا ملے ہیں۔'' ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی فواز احمد کے اندر کا دُکھ بھی باہر آ گیا۔

''باپ کیا کرتا تھا؟'' اسے سمجھ نہ آئی کہ زبیدہ آپا کے اس سوال کیا تُک ہے۔

''معلوم نہیں۔ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ابا وفات پا چکے تھے۔''

''روشنی کو کب سے جانتے ہو؟''

''ابھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں روشنی کو 'جانتا' ہوں۔'' عجیب گول مول سا جواب تھا۔

''یہ سلسلہ کب تک ختم ہو جائے گا؟'' زبیدہ آپا بھی مختصراً بات کر رہی تھیں۔

''کبھی بھی نہیں۔'' بڑا جراٴت مندانہ جواب تھا۔ زبیدہ آپا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ''میں سمجھی نہیں کہ کبھی بھی نہیں۔ اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''یہ ادب کا سلسلہ ہے ماں جی یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔'' فواز احمد نے اسے پہلی بار ماں جی کہہ کر پکارا تو وہ اپنی

وہیل چیئر پر پہلو بدل کر رہ گئیں۔

''ماں جی!'' زبیدہ آپا حیرت واستعجاب میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولیں تو وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

''ہاں ماں جی! میں نے کئی سالوں بعد کسی کو ماں کہا ہے۔''

''اور میں نے زندگی میں پہلی بار ان الفاظ کو اپنے لیے سنا ہے۔'' زبیدہ بی بی یہ الفاظ اپنی زبان سے ادا نہ کر سکیں اور آنکھوں میں آ جانے والی نمی میں سے فواز احمد کو دیکھنے لگیں جس کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی نم تھیں۔ کئی لمحات یونہی گزر گئے تو فواز احمد بولا۔

''میں جاؤں؟'' لیکن شاید زبیدہ آپا نے اس کی بات نہ سنی تھی۔ وہ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

''میں جاؤں ماں جی!'' آنسوؤں کی قطاروں نے زبیدہ آپا کے گالوں پر لکیریں بنانا شروع کر دی تھیں۔ وہ اپنے آنسو چھپاتی ہوئی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں تو فواز احمد وہاں سے چلا آیا۔ اس کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔

اس نے اپنی پالنے والی ماں کو کینسر جیسے موذی مرض سے اس طرح لڑتے دیکھا تھا جیسے کسی بچے کا کھلونا چھیننے کے لیے دوسرا بچہ لڑتا ہے۔ وہ ایک بہادر عورت تھی۔ فواز احمد نے دن رات ان کی خدمت کی تھی اور غریبی میں بھی ان کی ادویات کو پورا کرتا رہا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے اپنی ماں کے لیے دوائی خریدنے کی خاطر بھیک تک مانگی تھی۔ تمام دوستوں میں سے صہیب احمد واحد کلاس فیلو اور مخلص دوست تھا جس نے اس کی ماں جی کا علاج کروانے کا بیڑہ اُٹھایا تھا لیکن قدرت نے ان کو جتنا بھی عرصہ سانسوں کا تحفہ دیا تھا وہ وقت وہ عرصہ پورا ہوتے ہی فواز احمد اس دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔

اس دن کے بعد سے آج تک اس نے کسی کو ماں جی کہہ کر نہ پکارا تھا۔ مگر آج زبیدہ آپا کی آنکھوں میں جھانکنے کے بعد اسے ممتا اور پیار کا چھلکتا سمندر نظر آیا تو وہ بے اختیار انہیں ماں جی کہہ گیا اور یہی کیفیت زبیدہ آپا کی بھی ہو رہی تھی۔ وہ ابھی تک ان راستوں کو دیکھ رہی تھیں جن پر فواز احمد گزر کر گیا تھا زندگی میں پہلی بار انہیں کسی نے ماں جی کہا تھا ان کی آنکھیں زار و زار رونے لگی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ متحرک ہونٹوں سے الفاظ ادا کرنے لگیں۔

''شمسہ بیگم! تم نے تو کہا تھا کہ زندگی میں کوئی بیٹا مجھے ماں جی نہیں کہے گا۔'' وہ ان الفاظ کو ادا کر کے اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گئیں۔

○......❖......○

ریبا پہلی بار جھوٹ بول کر گھر سے آئی تھی اس نے بہانہ بنایا تھا کہ آج کالج میں ایک پارٹی ہے وہ لیٹ ہو جائے گی۔ شمسہ بیگم نے اجازت دے دی تھی جبکہ عدیم اور ارباب احمد نے کچھ احتجاج کیا تھا لیکن وہ بھی چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ریبا بھی طیبہ کی طرح اپنی تعلیم مکمل کر لے تاکہ اس کو بھی طیبہ کے فوری بعد پیا گھر سدھارنے کا بندوبست کیا جائے۔

ڈاکٹر ارباب احمد اپنے کام کے ساتھ انتہائی مخلص تھے جبکہ شمسہ بیگم اپنے فرائض امورِ خانہ داری انتہائی محنتی انداز میں انجام دے رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ گھر کا ماحول انتہائی خوشگوار اور پُراعتماد تھا۔ صہیب احمد نے آج ریبا کو اپنے آفس میں بلایا تھا۔ اس کا ارادہ تو کسی ہوٹل میں لنچ کرنے کا تھا چونکہ ریبا گھر والوں سے چوری اس کے آفس

میں آئی تھی اس لیے باہر جا کر لنچ کرنے کا پروگرام کینسل کر دیا اور آفس کو ہی ہوٹل سمجھ کر کھانا وہیں کھانے کا پروگرام طے ہو گیا تھا۔

وہ اپنا فیورٹ سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھی ٹیکسی والے نے اسے مشہور اخبار کے آفس کے سامنے اُتارا تو وہ اپنا تنقیدی جائزہ لیتی ہوئی آفس میں داخل ہوئی ریسپشن پر بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکی نے اس کا خوشدلی سے استقبال کیا اور اسے صہیب احمد کے کمرے تک پہنچا دیا۔ وہ صہیب احمد کے کمرے میں پہنچی تو حیران رہ گئی کیونکہ وہ خود تو کمرے میں موجود نہ تھا لیکن اس کی پرفیوم بتا رہی تھی کہ وہ آفس سے اُٹھ کر ابھی ابھی گیا ہے ریبا کمرے کا جائزہ لینے لگی تو اسے صہیب احمد کی پسند کی داد دینا پڑی کیونکہ آفس کو جس طرح ڈیکوریٹ کیا گیا تھا وہ واقعی قابل تعریف تھا۔

کیونکہ کسی بھی جگہ پر کسی بھی طرح کی ڈسٹ نظر نہ آ رہی تھی اور بہترین پردے کھڑکی اور دروازے کو اس طرح ڈھانپے ہوئے تھے کہ دیواروں کا گمان ہوتا تھا اور جس کرسی پر صہیب احمد بیٹھتا تھا وہ بھی کافی قیمتی تھی۔ وہ ایک طرف رکھے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی تو چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک ملازم کولڈ ڈرنک لے کر آیا اور ریبا کو بتایا کہ صہیب احمد میٹنگ میں ہیں اور کچھ ہی دیر بعد آتے ہیں۔

وہ یہ کہہ کر نکل گیا تو ریبا کولڈ ڈرنک سے لطف اندوز ہونے لگی۔ وہ گھومتی ہوئی صہیب احمد کی کرسی پر بیٹھ گئی اور لیپ ٹاپ پر اپنی تصویر دیکھ کر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئی۔ وہ بھی جب سے صہیب احمد سے ملی تھی اپنی نیندیں کھو چکی تھی اور دل کا قرار لٹ جانے کا شکوہ وہ اپنے آپ سے ہی کرتی نظر آتی تھی۔ آج وہ صہیب احمد سے دوٹوک الفاظ میں پوچھنے آئی تھی کہ اس کا حدود اربع کیا ہے۔ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اور ریبا کے ساتھ کتنا مخلص ہے۔ حالانکہ یہ بات اس کو تسلی بھی دیتی تھی کہ صہیب احمد فراز بھائی کا کلاس فیلو اور اچھا دوست بھی ہے کیونکہ فراز بھائی جیسے آپ اچھے تھے ان کی سوسائٹی اور ماحول بھی اتنا ہی اچھا اور سلجھا ہوا تھا لیکن وہ صہیب احمد سے خود بات کر کے دل کی تسلی چاہتی تھی۔

اس نے دیکھا کہ سامنے والی دیوار پر ایک رُعب دار شخصیت کی خوبصورت فریم میں فوٹو لگی ہوئی تھی جس کے نیچے ''مراد خان'' لکھا ہوا تھا۔ اس فوٹو اور صہیب احمد میں خاصی تو نہیں لیکن مشابہت ضرور موجود تھی۔ اتنی دیر میں دروازہ کھلا اور صہیب احمد اندر داخل ہوا تو اس کے ساتھ ہی پرفیوم کی خوشبوؤں کے حلقے بھی دفتر میں آ گئے۔ اس نے پینٹ شرٹ اور کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا اس کی پرسنالٹی پر یقیناً کئی لڑکیاں فریفتہ ہوں گی لیکن وہ تو ریبا کی اداؤں پر قربان ہو چکا تھا۔

''آئی ایم سوری! آپ کو انتظار کرنا پڑا۔'' وہ آتے ہی شرمندگی محسوس کرتا ہوا بولا تو ریبا کو بھی اخلاقاً مسکرا کر جواب دینا پڑا۔ ''کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی میں ابھی آئی ہوں۔''

وہ اپنی ریوالونگ کرسی پر بیٹھ گیا تو ریبا اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی ان دونوں کے درمیان بڑی سی شیشے کی میز حائل تھی۔

''یہ فوٹو کس کی ہے؟'' ریبا نے دیوار کی جانب اشارہ کیا تو وہ اس طرف دیکھتا ہوا مسکرا کر بولا۔

''میرے بابا جان ہیں۔''

''کیا یہ بھی آفس میں ہوتے ہیں؟'' ریبا نے دوسرا سوال کیا تو وہ بولا۔

''نہیں...... یہ کبھی کبھار آتے ہیں یہ ایبٹ آباد میں ہوتے ہیں۔''

''وہاں پر کوئی بزنس کرتے ہیں؟'' ریبا کے اس سوال پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تو ریبا کو حیرت ہوئی اس کے استفہامیہ انداز پر صہیب احمد بولا۔

''تم جس کرسی پر ہو وہاں بیٹھ کر انٹرویو دیئے جاتے ہیں اور تم میرا انٹرویو ہی کرنے لگی ہو۔'' اس نے پہلی بار ریبا کو ''تم'' کہہ کر پکارا تھا۔ ''انٹرویو تو مجھے کرنا چاہیے تھا۔'' ریبا بھی مسکرا پڑی۔

''آپ کو سب معلوم ہوگا ہمارے بارے میں؟''

''سب معلوم ہوتا تو اتنی دیر کیوں کرتا؟'' اس کا جواب کیا تھا ریبا کے لیے سوال ہی تھا۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''مس ریبا! زندگی گزارنے کے لیے ایک اچھا اور ایماندار جیون ساتھی ہونا بہت ضروری ہے۔'' وہ کہنے لگا تو ریبا کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ ''اور اچھا ساتھی ڈھونڈنے کے لیے کافی تگ ودو کرنا پڑتی ہے۔''

''آپ کر رہے ہیں؟'' ریبا کے اس سوال میں اپنے مستقبل کے لیے بھی سوال تھا اور وہ صہیب احمد کا ارادہ بھی جاننا چاہتی تھی۔ وہ طیبہ کی نسبت کافی ہوشیار اور چالاک بھی تھی لیکن صہیب کی دلکش شخصیت پر دل ہی دل میں قربان ہو چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صہیب احمد لفظوں کے ساتھ دن رات کھیلتا ہے لیکن اس نے بھی رسائل اور کتب میں بہت سے الفاظ پڑھ کر ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔

''نہیں......'' وہ ریبا کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''میری تلاش اور جستجو تو ساحر کی شادی پر ہی ختم ہوگئی تھی۔''

ریبا سمجھ گئی کہ وہ اسی کی بات کر رہا ہے۔

''وہاں آپ کو مخلص اور ایماندار جیون ساتھی مل گیا؟'' وہ بات کو آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔ ''میرا مطلب تھا کہ اچھا دوست! جس کی آپ کو جستجو اور تلاش تھی؟''

''یہ جو دل ہوتا ہے نا؟ یہ بہت ظالم بھی ہے اور مظلوم بھی ہے۔ ظالم اس لیے ہے کہ بعض اوقات بہت سے چہرے آنکھوں کو بھا جاتے ہیں لیکن دل ان آنکھوں سے بغاوت کر کے انکار کی جرأت کر جاتا ہے۔'' وہ براہ راست ریبا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ''اور مظلوم اس لیے ہے کہ ابھی آنکھوں نے اس کی مرضی بھی نہیں پوچھی تھی کہ یہ من پسند چہرے پر اس طرح قربان ہوتا ہے کہ اس کا خون تک نہیں نکلتا۔''

''الفاظ اور باتیں آپ اچھی کرتے ہیں کیونکہ یہی اچھائی آپ کو دوسروں سے معتبر کر رہی ہے۔'' ریبا کا اشارہ اس کے اچھے اخبار کی طرف تھا وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''کیا آپ نے کوئی ایسا رشتہ ڈھونڈا ہے جو آپ کو مخلص اور ایماندار لگا ہو؟'' براہِ راست سوال تھا ایک بار تو ریبا کا دل دھک کر کے رہ گیا۔ وہ صاف الفاظ میں کہنے لگی کہ ''وہ تم ہی تو ہو'' لیکن وہ الفاظ کے جادوگر کے سامنے بیٹھی تھی اور بات بھی لفظوں میں ہی کرنا تھی۔

''جب آپ خود سے مخلص ہو جائیں تو آپ کو اپنے جیسے بہت سے دوست ملتے ہیں۔''

''لیکن دوست تو دوست ہوتا ہے وہ جیون ساتھی تو نہیں بن سکتا؟''صہیب احمد نے اس کی بات سے بات نکالی تھی۔

''اچھا جیون ساتھی وہی ہو سکتا ہے جو اچھا دوست بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔'' ریبا بولی تو صہیب احمد ہنستے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ اگر کوئی مصنف ہماری گفتگو سن لے تو وہ یہی سمجھے کہ ہم اقوال زریں پڑھ رہے ہیں۔'' ریبا بھی مسکرا پڑی۔ اتنی دیر میں ملازم نے آ کر بتایا کہ کھانا تیار ہے تو صہیب احمد اُٹھتا ہوا بولا۔'' آیئے پلیز۔'' ریبا کو حیرت ہوئی کہ اس نے تو آفس میں کھانا کھانے کا کہا تھا۔ پھر بھی وہ اس کے ساتھ چل پڑی اس نے تعظیم دیتے ہوئے ریبا کے لیے دروازہ کھولا اور ایک راہداری میں چلتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچے تو وہ ڈائننگ روم تھا۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی میز پر کئی قسم کے کھانے رکھے ہوئے تھے جبکہ میز کے گرد صرف دو کرسیاں ہی تھیں جو آمنے سامنے رکھی گئی تھیں۔

''آپ نے خواہ مخواہ ہی اتنا تکلف کیا۔'' ریبا نے اخلاقاً کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''تکلف خواہ مخواہ ہی نہیں کیا جاتا۔ پلیز......'' اس نے کرسی سرکاتے ہوئے ریبا کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ پُرسکون انداز میں بے تکلفانہ ماحول میں کھانا کھایا گیا تو ریبا نے جانے کی ٹھانی کیونکہ اب کافی دیر ہو گئی تھی۔ صہیب احمد نے اس کو روکنا مناسب نہ سمجھا اور بلڈنگ کے مین گیٹ تک اس کو رخصت کرنے آیا۔ وہ ریبا سے مخاطب ہو کر بولا۔

''کیا میں اچھا دوست ہوں؟'' ریبا اس سوال کا مقصد نہ سمجھی۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں۔'' وہ بولی۔

''کیا میں اچھا اور مخلص جیون ساتھی بن سکتا ہوں؟'' ریبا کے دل کی دھڑکنیں ایک دم اتنی تیز ہو گئیں کہ اس کو شک پڑنے لگا کہ شاید اس کی بے ترتیب دھڑکنوں کی آوازیں صہیب احمد سن رہا ہو۔ وہ جانے لگی۔ تو صہیب احمد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ خاصی گھبرا گئی۔

''ریبا! میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے آپ کے فیصلہ کا انتظار رہے گا۔'' اس نے ریبا کا ہاتھ اس انداز میں چھوڑا کہ نہ چھوڑنے کو دل کر رہا ہو۔ ریبا تو پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو کر رہ جاتی اگر ملازم ٹیکسی کے آنے کا نہ بتاتا۔

وہ ایک ٹھنڈی اور لمبی سانس بھرتی ہوئی صہیب احمد کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''کھانا کافی اچھا تھا۔ اس کھانے میں مجھے ایک مخلص دوست اور...... خدا حافظ'' نامکمل فقرہ اور ادھورے الفاظ صہیب احمد کو بہت کچھ سمجھا گئے تھے۔ وہ چلی گئی لیکن صہیب احمد وہیں کھڑا اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔ وہ یقیناً کافی گہری لڑکی تھی بالکل اپنی جھیل جیسی آنکھوں کی طرح گہری۔

ریبا کو صہیب احمد نے کئی بار کہا تھا کہ ڈرائیور اس کو چھوڑ آتا ہے لیکن اس نے جھوٹ بول کر جو بھرم بنانے کی

کوشش کی تھی وہ چاہتی تھی کہ وہ بھرم قائم ہی رہے۔

وہ بھی سیٹ پر سر ٹکائے صہیب احمد کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ اس نے ریبا کی محبت کا برملا اعتراف کیا تھا اور اس کو اپنا شریک زندگی بننے کے لیے جو الفاظ استعمال کیے تھے ان میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔ وہ یہ بتا گیا تھا کہ اب وہ ریبا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن ریبا اپنی زندگی کا فیصلہ اکیلے نہ کر سکتی تھی اور ابھی تو طیبہ کی شادی ہونا تھی پھر ریبا کی تعلیم اور گھر والوں کی مرضی کے بغیر تو وہ اتنا بڑا فیصلہ نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ صہیب احمد کا اس سوسائٹی میں اگر کوئی مقام تھا تو ڈاکٹر ارباب احمد نے بھی اپنا نام اور عزت بنانے میں ایک عمر صرف کی تھی۔

وہ صہیب احمد کو صاف صاف کہہ دے گی کہ وہ گھر والوں کی مرضی کے بغیر اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اگر گھر والوں نے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا؟ وہ تو صہیب احمد کے بغیر مر جائے گی۔

ریبا کی اس انکار پر تان ٹوٹی تو گھر بھی آ گیا تھا وہ گاڑی سے اُتر کر گھر کے اندر چلی گئی لیکن لامحدود سوچیں اور کئی فکریں بھی اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گئیں۔

○....❖....○

انیل شرما طوائف کے کوٹھے پر شراب و شباب سے لطف اندوز ہو رہا تھا حسین اور خوبصورت رقاصہ اپنے اعضاء کی بے انتہا خوبصورت شاعری سے اس کا دل لبھا رہی تھی اس نے شراب کی بوتل ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی اور نوٹوں کی گڈیاں اس کے سامنے پڑی ہوئی تھیں۔ وہ ساتھ ساتھ جھوم بھی رہا تھا۔ نوجوان رقاصہ اس کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ اس کے فن کی داد دینے کے لیے نوٹوں کو اس پر بارش کی طرح نچھاور کر رہا تھا۔ نائیکہ کو ایسے ہی معزز گاہک کی ہمیشہ سے ضرورت رہتی تھی۔ اس کے سامنے پڑی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر نائیکہ کے منہ میں پانی بھر رہا تھا۔ وہ آنکھ کے اشاروں سے ہی رقاصہ کو اپنا کام جاری رکھنے کا حکم صادر کر رہی تھی اور رقاصہ بھی جان گئی تھی کہ آج تمام نوٹ اس پر نچھاور ہوں گے لہٰذا وہ بار بار انیل شرما کی جھولی میں گرتی اور ہر بار ہی بہت سے نوٹ اس پر نچھاور ہو جاتے تھے یہ سلسلہ تقریباً آدھا گھنٹہ تک جاری رہا۔ رقاصہ تو تھک گئی لیکن ابھی تک نوٹ بچے ہوئے تھے۔

انیل شرما نے بچے ہوئے نوٹ اُٹھائے اور نائیکہ سے مخاطب ہوا۔

''جو نوٹ تجوری سے اس بازار کے لیے نکلتے ہیں۔ سنا ہے ان کو واپس تجوری تک لے جانا پاپ ہے؟''

نائیکہ اس کی بات سن کر ہنسنے لگی اور بولی۔ ''تو پھر آپ پاپی کیوں بننا چاہتے ہیں یہ ہمارا مال ہے ہمیں ہی دے جائیں نا؟''

وہ نائیکہ کی بات سن کر مسکرایا اور کہنے لگا۔ ''اس بازار میں تمام نوٹوں کو پھیلاؤں گا۔ ہر ایک کوٹھے پر جاؤں گا۔ تاکہ سب کو پتہ چلے کہ انیل شرما جسم خریدنے کا سوداگر نہیں ہے بلکہ وہ اعضاء کی شاعری اور حُسن کا دیوانہ ہے۔''

''میں اور بھی کھرا مال سرکار کی خدمت میں پیش کر دیتی ہوں۔ جناب تشریف تو رکھیں۔'' نائیکہ ہاتھ آئی ہوئی مچھلی کو یوں پھسلتا ہوا دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئی تھی وہ الفاظ کے جال میں انیل شرما کو پھانسنے کے لیے چال چل رہی تھی۔ وہ اس کی بات سن کر ہنسنے لگا اور بولا۔

''نائیکہ جی! انیل شرما مرضی کا مالک ہے۔ اس کو لفظوں کی زنجیروں میں نہیں باندھا جا سکتا۔'' وہ نوٹ پکڑے سیڑھیاں اُترنے لگا تو نائیکہ پھر داؤ آزماتی ہوئی بولی۔

''حضور! اب ہوا کا رخ ادھر ہی رہے تو میری خوش نصیبی ہوگی۔''

''ہوا کو قید کرنے کی سوچ بے وقوفی ہے۔ پانی آگ اور ہوا اپنی طبیعت اور عادتوں کے محتاج اور پابند ہوتے ہیں۔ ان کو قید نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ان پر اپنی مرضی مسلط کی جا سکتی ہے۔'' وہ کوٹھے کی سیڑھیاں اُتر گیا تو نائیکہ کا موڈ خراب ہو گیا تھا حالانکہ وہ اچھی خاصی رقم اس کے کوٹھے پر لٹا چکا تھا۔

انیل شرما کو خود بھی معلوم نہ ہوا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں پری سے باتیں کرتا کرتا بے ہوش ہو گیا تھا۔ اب کچھ دنوں بعد اس کی حالت سنبھلی تو اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے اس بازار کا رُخ کیا تھا۔ پری نے تمام بات گھر والوں کو بتا دی تھی کہ کس طرح وہ دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک انیل شرما کی حالت بگڑ گئی اور طبیعت کافی خراب ہو گئی۔ امیت چوہان نے اکلوتے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو فوراً ہسپتال رابطہ کیا اور آن کی آن میں ہی کئی ڈاکٹرز اس کے گھر پہنچ گئے تھے۔

ان سب نے انیل شرما کی حالت کو مکمل بہتر قرار دیا تو امیت چوہان کو سکون ہوا۔ کچھ بھی تھا وہ ہر طرح کے اختلافات کے باوجود بھی انیل شرما پر اپنی جان چھڑکتا تھا کیونکہ یہ کافی منتوں مرادوں سے حاصل کیا گیا تھا اور اکلوتا بھی تھا۔ اس کے بعد بیٹی پیدا ہوئی تو امیت چوہان اور اس کی بیوی رادھا کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی وہ بیٹی کی پیدائش کو بھی انیل شرما کی پیدائش کے بعد بھگوان کی ان پر نظر کرم تصور کر رہے تھے اور انیل شرما کی پیدائش کو شگن قرار دیتے ہوئے اس کا ہر طرح سے خیال رکھ کر اس کی بہترین پرورش کی تھی۔ وہ انیل شرما کی خواہش پر اس کو ہر وہ کام کرنے کی اجازت دے دیتے تھے جو وہ اپنی خوشی سے کرنا چاہتا تھا حالانکہ امیت چوہان کی آرزو تھی کہ انیل شرما جس طرح پڑھا لکھا اور باشعور ہے وہ بزنس میں اس کا ہاتھ بٹائے لیکن انیل شرما نے کبھی بھی اس طرف توجہ نہ دی تھی بلکہ اپنے شوق کو جاری رکھا تھا۔

اس کو خواب میں آ کر ستانے والی لڑکی نے مجسمہ سازی پر مجبور کر دیا تھا۔ آج تک وہ اس لڑکی کی جھلک بھی نہ دیکھ پایا تھا لیکن خواب میں آ کر مسکرانے والی وہ لڑکی چہرے پر اسکارف سجائے ہی اس کو ملتی تھی۔ اس کا خوابوں میں ملنا ہی انیل شرما کو اس کی محبت اور پھر عشق میں مبتلا کرتا گیا یہاں تک کہ اب بات اتنی بڑھ گئی تھی کہ اب عشق نے عبادت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ اس لڑکی کے بنائے ہوئے مجسمے کو سجدے کرتا تھا نا کہ دوسرے بھگوانوں کے مجسموں کو۔

اس نے خود ہی اس مجسمہ کو گیت کا نام دے لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ گیت سننے کا بے حد شوقین ہے اور پھر جو اس کے خواب میں آتی ہے وہ جھرنوں کی طرح جھن جھن کرتی اور پائل کی طرح چھن چھن کرتی ہے۔ وہ کوئل کی طرح بولتی ہوگی اور پپیہا کی طرح پی پی کی رٹ لگاتی ہوگی۔ وہ رباب کی طرح تان پر ایسا سُر بکھیرتی ہوگی کہ سننے والوں کو مبہوت کر دیتی ہوگی۔ کاش وہ انیل شرما سے کبھی بات کرتی۔ وہ مسکرانے کی بجائے اس سے کوئی بات ہی کر لیتی تا کہ اس کو سکون ہو جاتا اور وہ اس کو گیت سے بھی بہتر اور اچھا نام دے پاتا لیکن فی الحال گیت ہی بہتر تھا۔ اس کا نظریہ تھا

کہ اگر گیت اس سے باتیں نہیں کرتی تو کیا ہوا وہ تو اس سے باتیں کر سکتا ہے۔ بس یہی سوچ کر وہ گیت کے مجسمے تراشنے لگا۔ اور دل کی بھڑاس اس مجسموں سے باتیں کر کے نکالنے لگا۔

اس کا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن گیت حقیقی زندگی میں اس سے ضرور ملے گی۔ کہاں ملے گی اس بات کا تعین بھی گیت نے ہی کرنا تھا کیونکہ وہ اس کے خوابوں تک پہنچی تھی تو حقیقت میں ملنے کے لیے جگہ اور وقت بھی گیت کا مرہونِ منت تھا۔

لیکن اس کو پری کی حالت پر بھی کافی دُکھ ہوتا تھا جو اس کی محبت پانے کی خاطر اس کے گھر میں رہ رہی تھی انیل شرما سمجھتا تھا کہ پری اس کو دل و جان سے چاہتی ہے۔ وہ اس پر اس طرح فریفتہ ہے کہ اس کی مثال بھی نہیں دی جا سکتی لیکن انیل شرما گیت کو چاہنے اور پوجنے کے علاوہ کسی اور سے پیار کرنے کو گناہ تصور کرتا تھا۔ اس نے کبھی بھی کھل کر پری سے یہ نہ کہا تھا کہ وہ اس سے پیار نہیں کرتا۔ بلکہ الفاظ کے خوبصورت پیرہن میں اس کی بحث ہوتی رہتی تھی۔ پری کو اس کی شراب نوشی اور اس بازار میں آنے کی عادت سے بھی خاصی چڑ تھی وہ باتوں باتوں میں ہی کئی بار اس کو سمجھا چکی تھی۔ لیکن وہ کبھی بھی انیل شرما پر زبردستی نہ کر سکی تھی کیونکہ وہ اس کا بھگوان تھا۔ وہ اس کی داسی تھی۔ وہ اس کی پجارن تھی۔ وہ بالکل اسی طرح انیل کو پوجتی تھی جس طرح انیل شرما گیت کے مجسموں کو پوجتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ گیت کوئی جواب نہ دیتی تھی جبکہ انیل شرما پری سے گھنٹوں باتیں کرتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی باتوں کا محور صرف گیت ہی ہوتی تھی۔

پری اس کی اس عادت اور حرکات سے بھی سخت خائف تھی کہ ایک لڑکی کو دیکھا بھی نہیں اس کا وجود بھی نہیں اور اس کی پوجا انیل شرما کو کافر کر دے گی اور وہ امیت چوہان کے بڑے نام کو مذاق بنا دے گا۔ کیونکہ جس طرح امیت چوہان نے اپنا نام اور مقام بنایا تھا اگر اس کے اکلوتے بیٹے کی اس حرکت کی خبر میڈیا کو مل جائے یا بھنک بھی پڑ جائے تو امیت چوہان کو جواب دینا مشکل ہو جائے گا بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں مذہبی جماعتیں یا انتہا پسند جماعتیں ان کا جینا حرام کر دیں یا ان کو کوئی نقصان ہی نہ پہنچا دیں۔

ابھی تک تو معاملہ امیت چوہان کے قلعہ نما محل کی چار دیواری میں ہی قید تھا لیکن امیت چوہان اور پری کو اس بات کا ڈر تھا کہ اگر یہ معاملہ باہر نکل گیا تو پھر انیل شرما کی وجہ سے امیت چوہان کی بنی ہوئی ساکھ خراب ہونے کا اندیشہ تھا اور حالات کے بگڑنے کا ڈر بھی تھا۔

انیل شرما نائیکہ کے کوٹھے سے نکلا اور شراب کے نشے میں دھت بازار میں بے مقصد ہی گھومنے لگا تھا اس کی تلاش اور جستجو کا محور صرف گیت تھی جو آج تک تو اسے نظر نہ آ سکی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک بیوڑہ (شرابی) نشے میں ایک کوٹھے کے باہر گالیاں دے رہا تھا۔ اس کا سب کچھ ہی اس بازار میں لٹ گیا تھا۔ وہ بول رہا تھا اور لوگ اس کی ہر بات پر ہنس رہے تھے۔

''سالی! حرام زادی کہتی تھی کہ تجھ سے شادی کروں گی۔'' وہ نشے میں ہی بولا تھا مگر اس کے اندر کی آواز اس طرح باہر آئی تھی کہ وہ ان بے وفا گلی کوچوں اور بازاروں میں وفا تلاش کرنے نکلا تھا لیکن سب کچھ لٹانے پر بھی اس کے دل کا کشکول خالی ہی تھا۔ انیل شرما کو اس لمحہ اس پر بہت ترس بھی آیا اور غصہ بھی آیا تھا کہ کیا ایسی عورتیں جو

دوزخ کا ایندھن ہوں۔ وہ گھروں کی زینت نہیں بنائی جاتیں۔ اب اپنی بے بسی پر ماتم کر کے تماشہ لگانے اور دکھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ یہاں پر گھنگرو اور کشکول کا کوئی ساتھ نہ تھا۔ کبھی بھی کسی طوائف کے گھنگرو کبھی بھی کسی کشکول میں نہیں گرتے یہاں تو شاہ آتے ہیں جو ننگ اور کنگال کا لبادہ اوڑھ کر واپس جاتے ہیں۔ انیل شرما نے اس کو مزید تماشہ بننے کے لیے وہیں پر چھوڑ دیا اور آگے بڑھ گیا۔

ایک کم ظرف گھٹیا شراب پی کر کسی سیڑھی کے پاس بیٹھا الٹیاں کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس کے اندر کا گند اس کے منہ راستے نکل کر اس کو دوزخ سے دور کرنے کے لیے موقع دے رہا تھا۔

اتنے میں سپیڈو انیل شرما سے آ کر ٹکرا گیا۔ دونوں کی کافی جان پہچان تھی خوش ہو کر گلے ملے اور پرانے گلے شکوے کرنے لگے۔ سپیڈو انیل شرما کو ایک ارب پتی کے حوالے سے جانتا تھا اور انیل شرما کو بھی معلوم تھا کہ بڑی منڈی سے اس بازار تک ہیرے پہنچانے والا یہ جوہری بڑا کمینہ اور لالچی ہے۔

''کیا بات ہے سیٹھ!'' سپیڈو نے بات شروع کی۔ ''نظر ہی نہیں آتے؟''

''تم کون سا ہمارا خیال کرتے ہو سپیڈو!'' انیل شرما نے گلہ کیا تو وہ مسکراتا ہوا اس کو کھینچتے ہوئے ایک طرف لے گیا وہ دونوں ایک بنچ پر بیٹھ گئے تو سپیڈو مسکراتا ہوا بولا۔

''سیٹھ! بس اگلی کھیپ آنے میں دیر ہو گئی ہے۔ قسم سے کیا شاندار مال ہوتا ہے۔ طبیعت تو دیکھ دیکھ کر ہی خوش اور فریش ہو جاتی ہے۔'' وہ مال کی تعریفیں کرنے لگا تھا۔

''سپیڈو صاحب! تمہیں تو معلوم ہے کہ ہم جسم کے نہیں بلکہ حُسن کے پجاری ہیں اور پجاری تو جسم سے نہیں کھیلتا بلکہ دل کے مندر میں سجی ہوئی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔''

''سیٹھ جی! آپ پوجا کے لیے ایک آدھ دیوی رکھ لیں۔ باقی دل بھی تو خوش کرنا ہوتا ہے نا۔ روح کی تسکین کے لیے میرے پاس بہت نایاب ہیرے ہیں جناب!'' سپیڈو پکا دلال تھا لیکن انیل شرما بھی بڑا کایاں تھا اور اس کی ہر چال کو سمجھتا تھا۔

''تم میرا نمبر لے لو اور جیسے ہی نئی کھیپ آئے مجھے بولی میں ضرور بلانا۔'' انیل شرما کی بات سن کر وہ ہنسنے لگا اور بولا۔ ''کیا بات ہے سیٹھ جی! آپ جیسے لوگوں کو وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم جو ہیں آپ کی نوکری کرنے کے لیے۔ ہم حاضر ہوں گے جناب!'' دونوں ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔'' انیل شرما اُٹھ کر چل پڑا اور سپیڈو بازار میں آگے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے دھندے کا ٹائم ہو گیا تھا۔

O......❖......O
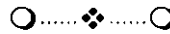
احمد فراز اب کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ کئی دنوں بعد آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک سن کر ''کھلا ہے'' بولا تو طیبہ اندر داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں یخنی کا پیالہ تھا۔ احمد فراز دیکھ کر ناک چڑھاتا ہوا بولا۔

''کیا ہے یار! اتنی یخنی پلا دی ہے کہ اب تو میرے وجود سے بھی یخنی کی خوشبو آنے لگی ہے۔'' طیبہ نے مسکرا کر پیالہ میز پر رکھا اور واپس جانے لگی تو احمد فراز نے اسے روک لیا۔

''سنو۔'' وہ اس کی آواز پر ٹھہر گئی تو احمد فراز آگے بڑھتا ہوا اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''تمہارے ایگزام کب ختم ہو رہے ہیں؟''

''ابھی تو کل سے سٹارٹ ہوں گے لیکن تمہیں کیا؟''

''طیبہ! بیماری کی اس حالت میں تم نے میرا کافی خیال رکھا ہے یار!'' وہ سنجیدہ ہو گیا تھا اور طیبہ کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تمہارا شکریہ ادا کروں۔''

''تو کر دو۔'' وہ بے نیازی سے بولی تو وہ ہنسنے لگا۔

''ایسے نہیں۔'' وہ طیبہ کے مزید پاس ہوا تو وہ گھبرا گئی اس کے چہرے کی رنگت زرد ہو گئی۔ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور احمد فراز یہ آج کیا کرنے والا تھا۔ وہ خوفزدہ لگنے لگی تو احمد فراز کا زوردار قہقہہ نکلا اور وہ ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ حیران کھڑی طیبہ اس کو دیکھنے لگی۔

''ذرا اپنا چہرہ تو دیکھو۔'' وہ بمشکل ہنسی پر قابو پاتا ہوا بولا۔ ''یوں لگ رہا ہے کہ کسی نے زرد رنگ کا پیکٹ تمہارے چہرے پر اُلٹ دیا ہو۔'' وہ مسلسل ہنسے جا رہا تھا اور طیبہ کو اس پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکلنے لگی تو احمد فراز اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''آئی ایم سوری یار!'' طیبہ نے نظریں اُٹھا کر دیکھا تو وہاں پیار ہی پیار اُمڈ رہا تھا وہ گھبرا کر نظریں جھکا گئی۔

''میں نے صرف مذاق کیا تھا۔ میں تمہاری دعوت کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟'' طیبہ نے ایک لفظ ہی بولا تھا۔

''تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔''

''شکریہ کیوں؟''

''کیونکہ اس دُکھ اور بیماری کی گھڑیوں میں تم نے مجھے ایک مخلص دوست کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔''

''یہ تو انسانیت کا تقاضہ ہے۔'' وہ طیبہ کی بات سن کر اس کے سامنے سے ہٹا اور بولا۔

''انسانیت بھی تو محبت کے تقاضوں کی محتاج ہوتی ہے۔''

''محبت تو خود ایک جذبہ ہے جس کے سب محتاج ہوتے ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی مگر احمد فراز گنگ کھڑا تھا ابھی طیبہ کو گئے ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ دولت بی بی اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو احمد فراز کو فریش دیکھ کر کھل سی گئیں۔ احمد فراز نے بھی ان کا استقبال محض مسکان سے کیا۔

''السلام علیکم دادی جان!'' دولت بی بی نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آئی ہوں۔'' احمد فراز نے دیکھا کہ دادی سنجیدہ ہیں تو وہ بھی ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''تمہیں دیر تو نہیں ہو رہی؟''

''نہیں دادی! آپ بات کریں۔'' وہ سعادت مندی سے بولا۔

''بیٹا! تمہارے والدین کے بعد ارباب اور شمسہ نے جس طرح تمہیں پالا پوسا ہے وہ تم سب جانتے ہو۔'' دولت بی بی کی بات کچھ زیادہ ہی سنجیدگی سے بھری ہوئی تھی۔ ''آج تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو تو ان دونوں کی اچھی

تربیت کی بدولت ہے۔''

''میں مانتا ہوں اور جانتا بھی ہوں دادی جان!'' وہ بولا۔ ''آپ کھل کر کہیں کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''بیٹا! جن بچوں کے سر پر ماں باپ کا سایہ نہیں ہوتا ان کا مستقبل مقدروں سے ہی اچھا ہوتا ہے ارباب اور شمسہ نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔'' دولت بی بی یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں اور احمد فراز کے چہرے پر اپنی کہی ہوئی بات کے تاثرات دیکھنے لگیں۔ ''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ یا پھر تم اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو بھی بتا دو۔''

احمد فراز کرب سے دادی کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھا اور دادی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ وہ ان کے ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔ ''آپ میرے ابو کی اماں ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو بھی میری زندگی کے اہم ترین فیصلہ پر آپ سے مشورہ کرتے آپ کی رائے کو اہمیت دیتے اور جہاں آپ چاہتیں وہیں میری شادی کروا دیتے۔'' دولت بی بی نے دیکھا کہ احمد فراز کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ماں باپ کو یاد کر کے دُکھی ہو گیا تھا۔

''اب بھی آپ جو فیصلہ کریں گی مجھے قبول ہوگا دادی!'' وہ فرمانبرداری سے بولا تھا۔

''مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ لیکن ارباب اور شمسہ کا خیال تھا کہ تم اگر اپنے دفتر میں کسی کو پسند کرتے ہو تو وہ اس سے بھی بات کر لیں گے۔''

''میں دفتر میں اپنے باس کو پسند کرتا ہوں دادی!'' وہ شرارتی انداز میں بولا تو دولت بی بی ہنسنے لگیں۔ ''اب باس سے تو میری شادی ہو نہیں سکتی۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ ارباب اور شمسہ نے تمہارے لیے ایک لڑکی پسند کی ہے۔ اس سے بھی بات کر لوں پھر تم سے بات ہوگی۔'' دولت بی بی جانے لگیں تو احمد فراز اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ان کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔

''دادی! اگر لڑکی گھر میں ہی ہو .....تو......زیادہ اچھا ہے۔'' دولت بی بی نے اس کا کان پکڑ کر کھینچا اور ہنستے ہوئے بولیں۔ ''اگر وہ نہ مانی تو......؟''

''تو پھر میں شادی نہیں کروں گا دادی!'' احمد فراز کا انداز بچوں جیسا تھا۔

''اچھا......اچھا مجھے بلیک میل نہ کر۔'' احمد فراز دولت بی بی کے منہ سے بلیک میل کو بلیک میل سن کر بہت ہنسا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر چومتا ہوا بولا۔ ''دادی! آپ دعا کرنا کہ گھر میں ہی لڑکی مان جائے۔'' وہ ہنستی ہوئیں اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں اور احمد فراز ''یاہو'' کا نعرہ لگاتے ہوئے کمرے میں ناچنے لگا تو فریکچر زدہ ٹانگ نے منع کر دیا اور وہ ''اوچ'' کی آواز نکالتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

دولت بی بی سیدھی طیبہ کے کمرے میں گئیں تا کہ اس کی رائے پوچھی جائے۔ ارباب اور شمسہ بیگم نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ طیبہ اور احمد فراز سے الگ الگ ان کی رائے پوچھ لیں۔ کیونکہ وہ اس گھر کی بڑی تھیں اور سیانی بھی تھیں۔

طیبہ ان کو دیکھ کر خوش ہو گئی اس نے کتابیں ایک طرف رکھیں اور دادی کو ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔ ''زہے نصیب آج میرے کمرے کی بھی قسمت جاگ گئی ہے۔'' وہ دولت بی بی سے از راہِ مذاق بولی تو دولت بی بی ہنسنے

لگیں۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ اللہ کے گھر کب تک جانا چاہتی ہو؟'' طیبہ یکدم سنجیدہ ہوگئی کیونکہ دادی اس ایک اہم ترین بات کو کرنے کے لیے تو اس کے کمرے میں نہ آئی تھیں۔ بات یقیناً گہری بھی تھی اور خاص بھی تھی۔

''جتنی بھی جلدی ہو سکے دادی!''

''امتحان کب ختم ہوں گے؟''

''یہ امتحان تو میری صوابدید پر ہیں۔ آج چاہوں تو آج ہی چھوڑ دوں۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' طیبہ مسکان ہونٹوں پر لاتی ہوئی بولی تو دولت بی بی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں نے ارباب سے بات کی تھی کہ تم اللہ کے گھر جانا چاہتی ہو۔''

''تو پھر دادی! کیا کہا ابو نے؟'' طیبہ کے اس فقرے میں جوش اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔ دولت بی بی ہنستے ہوئے بولیں۔ ''ارباب کہنے لگا کہ پہلے اپنے امتحان سے فارغ ہو جائے اور پھر ایک امتحان ہماری طرف سے ہوگا۔ پھر اللہ کے گھر بھلے چلی جائے۔''

''میں زندگی کے ہر امتحان کا سامنا کرلوں گی دادی!'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولنے لگی۔ ''اللہ کے گھر کو دیکھنے کے لیے میرے سامنے ہر امتحان ہیچ ہیں۔ آپ دیکھنا میں ہر امتحان میں سرخرو ہوں گی۔''

''میں نے تمہیں پہلے ہی کئی بار منع کیا ہے کہ ہر امتحان سے گزر جانے کی بات نہیں کیا کرتے۔ وہ بڑا رحمٰن و رحیم ہے لیکن کبھی بھی اس سے یہ مت کہو کہ تم اس کی ڈالی ہوئی کسی آزمائش کے قابل ہو۔'' دادی اس کو سمجھاتی ہوئی بولیں تو وہ مصنوعی ناراضگی سے کہنے لگی۔

''جایئے میں آپ سے نہیں بولتی۔''

''وہ کیوں؟'' دادی تھوڑا سا جھجکی ہوئی کہنے لگی۔ ''میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟''

''آپ پوری بات نہیں بتاتیں۔''

''ہاں......'' دادی کا انداز ایسا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی بھولی ہوئی بات کو یاد کرنے پر خوش ہوگئی ہیں۔

''میں تم سے یہ کہنے...... بلکہ پوچھنے آئی تھی کہ امتحان ختم ہوتے ہی تمہارا نکاح ہے۔'' یکدم اتنا بڑا فیصلہ دادی نے اسے سنایا تو وہ ہکی بکی رہ گئی۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا وہ دادی کی طرف ہونق بن کر دیکھتی رہ گئی۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے پھڑ پھڑائے لیکن دولت بی بی خاصی اچھی اداکاری کرتی ہوئیں اُٹھیں اور بولیں۔

''ہم نے لڑکا دیکھ لیا ہے اور لڑکے کو تم بھی پسند ہو۔'' دادی کی شاندار اداکاری کام کر گئی اور وہ جھٹکے سے ساکت حالت سے نکل آئی اور آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

''دادی! آپ نے لڑکا بھی دیکھ لیا اور لڑکے نے مجھے بھی دیکھ لیا؟ لیکن کب کہاں اور کیوں؟'' وہ روہانسی ہو رہی تھی لیکن دولت بی بی کے ہونٹوں پر مسکان بتا رہی تھی کہ وہ شرارت کے موڈ میں ہیں اور طیبہ کو مزید تنگ کریں گی۔

''کیوں بھئی؟'' وہ تنک کر بولیں۔ ''کیا ہم تمہارے لیے کوئی غلط فیصلہ کریں گے؟''

''دادی جان!'' وہ ہارنے والے انداز میں بولی۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''تو پھر تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''وہ کون ہے؟ میں اسے جانتی تک نہیں اور پھر اس نے مجھے کیسے دیکھ لیا دادی؟'' وہ رونے لگی تو دادی ہنسنے لگی۔

''اس نے تمہیں کالج جاتے ہوئے دیکھا تھا اور تم پر فدا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے بات کی اور میں نے تمہارے باپ سے اور اس نے تمہاری ماں سے اور اب میں تم سے بات کر رہی ہوں۔''

''کون ہے وہ دادی!'' وہ غصے سے بولی۔ ''میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔''

''توبہ کرو۔ ہونے والے شوہر کے بارے میں ایسے نہیں کہتے۔'' دادی اب اس کے سامنے منہ کرتی ہوئی بولیں۔

''لڑکا اچھا ہے۔ اچھی نوکری پر ہے۔ ہمارا اور تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اس بات کی میں گارنٹی دیتی ہوں۔''

''دادی! آپ تو رشتے کرانے والی مائی کی طرح اس کی تعریفیں کی جا رہی ہیں۔'' طیبہ کے ہاتھ نچا کر کہنے پر دولت بی بی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ''آپ ہنس رہی ہیں؟ میرا بھی فیصلہ سن لیں۔ میں اس گھر سے نہیں جاؤں گی۔ اور پھر میں نے ابھی لڑکا بھی نہیں دیکھا۔''

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

''ہاں......'' وہ دبنگ لہجے میں بولی۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ تم لڑکا دیکھنا چاہتی ہو نا پہلے؟''

''ہاں...... یہ شریعت میں بھی ہے۔''

''مجھے شریعت نہ سمجھاؤ۔ اپنی مرضی بتاؤ۔'' دادی شرارتی انداز سے پوچھ رہی تھیں۔

''ہاں...... میں پہلے اس سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''روز تو ملتی ہو۔'' دادی یکدم تیز لہجے میں کہہ گئیں تو طیبہ ان کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔

''کیا...... کیا...... کیا؟ میں روز ملتی ہوں اس لڑکے سے؟ توبہ کریں دادی توبہ...... طیبہ ارباب اور کسی غیر لڑکے سے روز ملتی ہو۔ توبہ یا اللہ مجھے اور دادی کو معاف کر دے۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی تو دادی کا قہقہہ لگا اور وہ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں۔

''تم روز ملتی ہو۔ کیونکہ احمد فراز میری بھی جان ہے اور میں جانتی ہوں کہ اب تک وہ تمہاری بھی جان بن گیا ہو گا۔'' دولت بی بی نے گھنٹہ بھر سے جو تجسس پیدا کیا ہوا تھا وہ احمد فراز کا نام لے کر ختم کیا تو طیبہ ایک بار پھر خود کو مجسمے کے روپ میں تبدیل ہوتا ہوا محسوس کر رہی تھی لیکن اس بار اس کے ہونٹوں پر ہنسی موجود تھی۔

وہ یکدم آگے بڑھی اور دولت بی بی کو گلے لگا کر گھومنے لگی۔

''مجھے گراؤ گی پاگل لڑکی! چھوڑو...... چوٹ لگ جائے گی۔'' طیبہ نے ہنستی مسکراتی دولت بی بی کو چھوڑ دیا اور

خود شرماتے ہوئے بولی۔

''مجھے وہ لڑکا پسند نہیں ہے۔''

''اچھا.....'' دادی نے اچھا کا لفظ لمبا کرتے ہوئے کہا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولیں۔ ''میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہوئے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں وہ پسند ہے بلکہ بہت پسند ہے۔''

دادی اور پوتی کے قہقہے کو سن کر دروازے کے باہر کھڑے احمد فراز نے بھی سکون کی سانس خارج کی اور وہاں سے نکل گیا۔

○.....❖.....○

زبیدہ آپا نے جس دن سے فواز احمد سے ملاقات کی تھی ان کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ وہ اس کو دیکھنے کے بہانے تلاش کرتی رہتی تھیں لیکن آج وہ مقدر سے انہیں لان میں ہی مل گیا تھا وہ روشنی کے ساتھ بیٹھا کوئی بات چیت کر رہا تھا کہ زبیدہ آپا اسے دور سے ہی دیکھتی رہیں ان کو اپنی معذوری پر بہت ترس آنے لگا تھا۔ کیونکہ وہ چل پھر نہ سکتی تھیں اور روشنی اور فواز احمد کے باتیں کرنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ کچھ خاص ہی باتیں کر رہے تھے کیونکہ دونوں کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پہلے تو انہوں نے سوچا کہ وہ خود ہی وہیل چیئر کو ہاتھوں کی مدد سے چلاتی ہوئی وہاں صبا تک لے جائیں لیکن لان میں کچی جگہ اور گھاس ہونے کی وجہ سے ان کا زور زیادہ لگتا تھا جس وجہ سے ان کا سانس بھی پھولنے لگتا تھا۔ اس لیے وہ دور سے ہی فواز احمد کو دیکھ رہی تھیں۔

''یہ لڑکا مجھے خاندانی لگتا ہے آپا!'' وہ صباء بیگم کی آواز سن کر چونک گئیں وہ نجانے کب سے اس کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ایک لمبی سانس بھرتی ہوئی بولیں۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس کی تربیت بہت ہی رکھ رکھاؤ والی عورت نے کی ہے۔'' صباء بیگم ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئیں وہ دونوں ہی آسانی سے روشنی اور فواز احمد کو دیکھ سکتی تھیں۔ ''کیونکہ اس میں عام لڑکوں والی کوئی بھی بات نہیں دیکھی۔''

''ہاں..... عام لڑکوں والی بات تو اس میں میں نے بھی نہیں دیکھی۔'' صباء بیگم کا ذومعنی فقرہ ان کی سمجھ میں نہ آ سکتا تھا۔ ''کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو اسی تھالی میں سوراخ کرنے کی عادت ہوتی ہے جس میں وہ کھاتے ہیں۔ لیکن ماننا پڑے گا کہ اس میں وہ بات نہیں ہے۔'' صباء بیگم کچھ کھوئے ہوئے انداز میں بولی تو زبیدہ آپا چونک کر پوچھنے لگیں۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

ان پانچ حرفی فقرے نے صباء بیگم کو چونکا کر رکھ دیا وہ جانتی تھی کہ زبیدہ آپا جہاندیدہ عورت ہیں اور ہر بات کو سمجھتی ہیں لیکن اب بات کو سنبھالنا بھی صباء بیگم کا فن تھا۔

میں نے اس سے کہا تھا کہ ہمیں اچھا نہیں لگتا کہ تم روشنی کو اس طرح بند کمرے میں پڑھاتے ہو۔'' وہ بات بنا گئی تھی اور صباء بیگم کا لہجہ زبیدہ آپا کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔'' وہ اگر ایسا ویسا ہوتا تو بحث کرتا یا پھر اپنی ضد پر اڑ جاتا۔'' زبیدہ بیگم اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

''آج کل مراد کم ہی نظر آتا ہے۔کہاں رہتا ہے وہ؟''

''برف کے گولے کی طرح کسی حسینہ کے بستر پر پڑے پگھل رہے ہوں گے۔'' صباء بیگم کا طنزیہ لہجہ اور اخلاقیات سے گرے ہوئے الفاظ نے زبیدہ آپا کی روح تک کو تڑپا دیا تھا۔

''تم اسے خود ہی کمپنی نہیں دیتی ہو۔اپنے این جی اوز کے جھمیلوں میں اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہو۔'' زبیدہ آپا کے الفاظ بھی کافی گہرے تھے۔صباء بیگم بھی خاموش رہنے والی نہ تھی۔

''کمپنی اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے آپا! میں جوان ہوں۔خوبصورت ہوں کیا مراد خان سے محبت کا ایک ایک لمحہ طلب کرنا میرا حق نہیں ہے؟'' اس کا انداز تڑپنے والا تھا۔

''روشنی اور صہیب احمد! مراد خان کی محبت کے زندہ اور خوبصورت ثبوت ہیں صباء بیگم۔'' زبیدہ آپا واقعی جہاندیدہ عورت تھیں وہ صباء کی روح کو گھائل کرنے والے رویے کو سمجھتی ہوئی بولیں۔

''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ بستر کی سلوٹ زدہ چادر پر چند بدبودار لمحوں کو محبت کا نام دے کر جسمانی بھوک کو مٹانا محبت کی توہین ہے۔'' صباء بیگم کی خواہش انگڑائی لے کر اس کے ہونٹوں پر آ گئی تھی۔ وہ دور بیٹھے ہوئے فواز احمد کو ترسی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''میں نے اپنی جوانی میں ہی بڑھاپے کا تار تار لبادہ اپنے بدن پر سجا لیا ہے۔میری خواہشوں اور چاہتوں کو ہمیشہ ہی وہ لمحات ملے ہیں جو بازار میں بیٹھی ہوئی کوئی بھی عورت خرید سکتی ہے۔'' اتنے سخت اور زہریلے الفاظ کی زبیدہ آپا کو صباء بیگم سے توقع نہ تھی کیونکہ ان کی خواہش پر ہی تو صباء بیگم کی شادی مراد خان سے ہوئی تھی۔

''خواہشات اور جذبات کو ادھار کے چند لمحوں کی بھینٹ چڑھا دینا محبت نہیں بلکہ جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کا وہ سودا ہوتا ہے جس میں دونوں ہی سوداگروں کا نقصان ہو جاتا ہے۔'' صباء بیگم کا لہجہ گو کہ دھیما تھا لیکن آگ میں جلتے ہوئے کوئلے چیخ چیخ کر اس بات کی غمازی کرنے لگے تھے کہ ان کو مزید ہوا کی ضرورت ہے۔

''میں مراد سے بات کروں گی کہ وہ تمہیں وقت دیا کرے۔تم ابھی جوان ہو تو وہ بھی بوڑھا نہیں ہوا۔''

''جوانی کو اتنے بڑے محل کی قلعہ نما عمارت میں قید کرنے کا اختیار صرف مرد کو ہی کیوں ہوتا ہے؟''

''صباء بیگم!'' زبیدہ آپا کو چیخ کر کہنا پڑا تو فواز احمد اور روشنی بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن وہ اپنی جگہ پر ہی بیٹھے رہے۔

''جوانی کے منہ زور گھوڑے کو لگام دے کر اس کا رُخ بچوں کے اچھے مستقبل کی طرف موڑ لو تو یہی بہتر ہے۔'' زبیدہ آپا کے پاس بھی بات سے بات کرنے کے لیے الفاظ کا وسیع ذخیرہ تھا۔''تمہیں محل کی دیواروں میں چنی ہوئی وہ انارکلی بھی یاد ہو گی جو جذبات کی رو میں بہک کر اپنی اوقات بھول گئی تھی۔''

صباء بیگم نے تڑپ کر زبیدہ آپا کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھتی ہوئی غصے میں بولی۔''اگر انارکلی دیواروں میں چنوائی گئی تھی تو سلیم نے بھی اس وقت کے فرعون باپ سے بغاوت کر دی تھی اور رہ گئی بات اوقات کی؟ تو یہ مت بھولیں کہ میں اس محل کی کوئی کنیز نہیں ہوں۔''

''منہ زور جذبات کو لگام دینے کے لیے صبر کا سہارا دینا چاہیے نا کہ گرم جوشی اور بیوقوفی کا۔'' زبیدہ آپا نے کہا

تو صباء بیگم کے تیور مزید بگڑ گئے۔

''آپ کی طرح؟'' تین حرفی فقرہ زبیدہ آپا پر ایٹم بم بن کر گرا تھا۔ انھوں نے وہیل چیئر کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ صباء بیگم تو چلی گئی لیکن زبیدہ آپا کو ابھی تک زمین و آسمان گھومتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے دھندلی آنکھوں سے دور دیکھنے کی کوشش کی لیکن ان کو فواز احمد اور روشنی نظر نہ آئے تھے۔

''میری طرح؟'' وہ خود ہی بڑبڑائیں تو آنسوؤں نے ان کی جھولی میں گرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے ماضی کو کئی بار دفن کر چکی تھیں لیکن وقت کے بے رحم اور سنگدل تھپیڑے اس کے ذہن پر اس طرح دستک دینے لگے تھے کہ وہ سر کو جھٹک کر پرانی یادوں سے چھٹکارہ پانا چاہتی تھیں لیکن آج تو صباء بیگم نے ان کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا وہ کوئی بھی وقت نہیں بھولی تھیں ان کو آج بھی یاد تھا جب ان کا باپ ان کے اکلوتے بچے کے لیے ہسپتال میں ہزاروں روپے لے کر گیا تھا ان کو سب یاد تھا اور ساری کہانی ان کے دماغ میں واضح ہونے لگی تھی۔

اورنگزیب کی شادی کو چار سال کا عرصہ بیت گیا تھا وہ اپنی جاگیر میں سہانا بیگم کے ساتھ اچھی خاصی زندگی گزار رہا تھا جو کہ ہر طرح سے آسودہ اور خوشحال تھی لیکن ایک کمی ایسی تھی جوان دونوں میاں بیوی کو شدید تکلیف دیتی تھی وہ کمی اولاد کی تھی۔ اورنگزیب اور سہانا بیگم نے کوئی ڈاکٹر، حکیم اور درگاہ نہ چھوڑی تھی۔ اللہ کے حضور رو رو کر سجدے کیے تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے تو نمی ان کی آنکھوں سے چھلکنے لگتی تھی۔ وہ پھر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ ایک دن تو سہانا نے صاف صاف ہی کہہ دیا کہ اس کی کوکھ سے اولاد جنم نہیں لے سکتی لہٰذا اورنگزیب دوسری شادی کر لے اس بات کو سن کر اورنگزیب نے انتہائی متحمل انداز میں سہانا کو سمجھایا کہ اگر اولاد ہمارے نصیب میں ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور دے گا وہ بڑا رحمٰن ہے اس کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں ویسے بھی اولاد مرد کی قسمت میں ہوتی ہے۔ ایسی باتوں کو سن کر سہانا کو کافی حوصلہ مل جاتا کہ اس کا شوہر دنیا کی طرح اس کی کوکھ کو بانجھ پن کے طعنے نہیں دیتا اور نہ ہی وافر روپیہ پیسہ ہونے کے باوجود دوسری شادی کا خواہشمند ہے۔ اورنگزیب اپنے ملنے جلنے والے اعلیٰ سٹیٹس کے لوگوں سے اپنی اس آرزو اور کمی کا اظہار کئی بار کر چکا تھا۔ ہر کوئی نیا مشورہ اور نیا ڈاکٹر اور حکیمی ٹوٹکا بتا کر اس کی اور سہانا کی اُلجھنیں مزید بڑھا دیتا تھا۔

تھک ہار کر دونوں میاں بیوی نے تمام حکیم اور ڈاکٹرز کے پاس جانا چھوڑ دیا اور اپنی اس دوڑ بھاگ کو اللہ کے ساتھ مقابلے کو قرار دیتے ہوئے رو رو کر سچے دل سے توبہ کی۔ اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور چند ماہ بعد سہانا اُمید سے ہوگئی نا قابل یقین خبر کو اورنگزیب نے کئی بار سنا اور کئی بار اس بات کی تصدیق بھی کروائی کہ سہانا واقعی ماں بننے والی ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے مسلسل چیک اَپ کراتے رہنے کا کہا اور کسی بھی کام سے سہانا کو سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس بات کی فکر کوئی نہ تھی کہ کام کون کرے گا ملازموں کی فوج نے تمام کام اپنے کندھوں پر اُٹھایا ہوا تھا۔

جیسے تیسے کر کے نو ماہ گزارے اور ڈلیوری کا دن آیا تو سہانا بیگم نے اورنگزیب سے معافی مانگی تو دونوں ہی زار و زار رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے سہانا کی جھولی بھر دی خوبصورت بیٹی کی پیدائش پر سہانا کو آپریشن کروانا پڑا تھا بچی بھی کافی کمزور تھی اس کی اُکھڑی اُکھڑی سانسوں نے ڈاکٹرز کو پریشان کر دیا تھا۔ لیکن مسلسل محنت اور دعائیں رنگ لے آئیں تو بچی کی جان بچ گئی۔ گھر میں خوشیاں رقصاں ہوگئیں۔ اورنگزیب کے پاؤں زمین پر نہیں

تک رہے تھے وہ بچی کو اُٹھاتا اور کئی کئی منٹ تک دیکھتا ہی رہتا۔ سہانا نے اس کا نام زبیدہ تجویز کیا تو اورنگزیب کو کوئی اعتراض نہ ہوا وہ بیوی اور بچی کی جان بچ جانے پر خوش تھا۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے نیاز دلوائی اور غریبوں کو کھانا اور کپڑے تقسیم کیے گھر کے تمام ملازموں کی تنخواہیں بڑھا دی گئی تھیں۔

ڈیڑھ دو ماہ بعد اورنگزیب نے اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں کو پُر تکلف دعوت دی اور بیٹی کے لیے نیک تمناؤں کے متمنی ہونے کی خواہشیں بھی کیں۔

گھر میں زبیدہ کی آمد سے خوشیاں لوٹ آئی تھیں اُداسی اور غم نے دوڑ لگا دی تھی سہانا اس کی اچھی پرورش میں مصروف تھی اور اورنگزیب اس کو لاڈ پیار سے پال پوس رہا تھا۔ ایک سال کے عرصہ نے پلک جھپکتے ہی گزر جانے میں عافیت سمجھی اب وہ بیٹھ بھی جاتی تھی اور منہ سے عجیب عجیب آوازیں بھی نکالتی تھی۔ اورنگزیب کو دیکھ کر وہ آگے لڑھکنے کی کوشش میں گر جاتی اور پھر رونے لگتی تھی لیکن جب باپ کی گود میں جاتی تو خاموش ہو جاتی اور اپنے ننھے منے ہاتھوں سے کبھی اس کا ناک پکڑ لیتی اور کبھی کان کھینچنے لگتی۔ کبھی بال پکڑ کر منہ سے ''غوں غوں'' کی آوازیں نکالتی اور خود ہی کلکاریاں مار کر ہنسنے لگتی تو سہانا اور اورنگزیب اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کو صبر کا انعام بہت ہی خوبصورت دیا تھا۔

زبیدہ کی پہلی سالگرہ پر اورنگزیب نے گھر کو کھلونوں سے بھر دیا تھا اور آنے والے عزیز رشتہ دار اور دوستوں نے بھی تحائف دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا اور رات گئے تک کافی ہلا گلا رہا تھا۔

اورنگزیب اور سہانا بیگم کے ہونٹوں کی ہنسی لوٹ آئی تھی۔

زبیدہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی ہونے لگی تو اس کو سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اسی دوران تقدیر ان پر ایک مرتبہ پھر مہربان ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس بار اورنگزیب کو بیٹے کی خوشیاں نصیب کیں تو گویا ان کے ویران دلوں میں بہار آ گئی تھی۔ بیٹے کی آمد پر زبیدہ کو اور بھی پیار ملنے لگا کیونکہ وہ بختاور بن کر آئی تھی جو بھائی کو بھی لائی تھی۔

زبیدہ سکول اور مدرسے سے واپس آ کر ننھے مراد کے ساتھ کھیلتی اور اس سے بات کر کے وقت گزارنے لگی۔ اورنگزیب تو خود کو دنیا کا خوش نصیب شخص تصور کر رہا تھا کہ تقدیر اس پر اتنے سالوں کے بعد مہربان ہوئی تھی تو اولاد کی صورت میں دونوں ہی نعمتیں انہیں نواز دی تھیں اور روپیہ پیسہ کی فراوانی نے ان کو کسی بھی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔

زبیدہ نے قرآن کریم حفظ کر لیا تھا اور سکول کی تعلیم کو پھر سے جاری رکھتے ہوئے وہ بالغ و عاقل ہونے تک کالج تک جا پہنچی تھی۔ شاندار گاڑی میں کالج جانے اور آنے میں اسے بہت مزہ آتا تھا۔ وہ حقارت سے ان لڑکیوں کو دیکھتی تھی جو پیدل یا موٹر سائیکلوں پر کالج آتی جاتی تھیں۔ دولت اور جاگیر کی وارث ہونے کے ساتھ ساتھ اس کو باپ کی آشیرباد بھی حاصل تھی وہ ملازموں کی بے عزتی کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی اور کئی پرانے ملازم تو اس نے چٹکی بجاتے ہی فارغ کر دیئے تھے۔

اس دوران مراد بھی کالج جانے لگا تھا۔ وہ بڑا لاابالی سا نوجوان تھا لیکن اس کی عادتیں اور طبیعت زبیدہ سے

قدرے مختلف تھیں اس کے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ تھا جس میں مراد کی عزت و تکریم کی جاتی تھی مراد کو دولت کی فراوانی اور جاگیر کا نشہ بھی اپنا اسیر نہ بنا سکا تھا وہ خوش مزاج اور باشعور نوجوان نکلا تھا۔ اس نے اپنے والدین کی فرمانبرداری اور اطاعت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اس کو کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا وہ اپنی پاکٹ منی سے کافی سارے پیسے کتابوں پر ضرور خرچ کرتا تھا اس وجہ سے اس کے گھر میں ایک چھوٹی سی لائبریری بن گئی تھی۔ وہ اپنا زیادہ وقت مطالعہ میں گزار کر دن گزارنے کی کوشش کرتا تھا۔

اسے کرکٹ کھیلنا اور دیکھنا پسند تھا لیکن یہ سب کچھ فارغ وقت پر منحصر تھا وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کلب بھی جاتا تھا۔ جہاں وہ جسمانی فٹنس کے ساتھ ساتھ دماغی طور پر بھی ورزش کرتے تھے۔ کالج کا سفر ختم ہوا تو مراد نے یونیورسٹی کے زینے پر پاؤں رکھا تو یونیورسٹی کا ماحول اور کھلا پیسہ اس کو کچھ کچھ خراب کرنے لگا لیکن اچانک ایسے حالات میں ارباب احمد اس کے بہترین دوست کے روپ میں مل گیا جو اس کو ہر قسم کی غلط اور بری عادتوں سے دور رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

ارباب احمد بھی ایک اچھے گھرانے کا نوجوان تھا وہ سگریٹ نوشی جیسی عادت کو لغویات گردانتا تھا اس کا کہنا تھا کہ اگر ڈاکٹر بننا ہے تو پھر اس عادت سے پرہیز خود کرو جس سے تم دوسروں کو پرہیز کرنے کا مشورہ دو گے۔ ارباب احمد نے بہت جلد اورنگزیب اور سہانا بیگم کے دل میں گھر بنا لیا تھا کیونکہ وہ اور مراد گھنٹوں بیٹھ کر اکٹھے پڑھتے تھے اور اورنگزیب نے بھی دیکھ لیا تھا کہ ارباب احمد ایک اچھا لڑکا ہے۔ اس دوران زبیدہ کالج سے فارغ ہو گئی تھی لیکن اپنی ایک سہیلی مریم کے بھائی ارسلان کے عشق میں ضرور گرفتار ہو گئی تھی اس کی اس حرکتوں سے گھر والے بے خبر تھے اور زبیدہ والدین کی عین ناک کے نیچے ایسے گل کھلا رہی تھی کہ اگر گھر والوں کو خبر ہو جاتی تو وہ شرم سے ہی ڈوب کر مر جاتے۔

ایک دن ارباب احمد نے زبیدہ کو ارسلان کے ساتھ دیکھ لیا۔ پہلے تو وہ حیران ہوا کیونکہ مراد نے اپنے کسی بھی کزن یا ایسے رشتہ دار کا تذکرہ نہ کیا تھا جو اتنا خوبصورت ہوتا جتنا ارسلان تھا۔ لیکن پھر اس کی حیرانگی خود ہی دور ہو گئی۔ جب اس نے زبیدہ کے ساتھ پیار و محبت بڑھانا شروع کر دیا۔ ارباب احمد زبیدہ کی بہت عزت کرتا تھا اس نے ارسلان کا پیچھا کر کے اس کا حدود اربع معلوم کر لیا اور یہ بات مراد کو اعتماد میں لے کر بتا دی۔

مراد کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا لیکن وہ ارباب احمد پر اندھا اعتماد بھی کرتا تھا اور اس کی باتوں پر یقین بھی رکھتا تھا۔ ان دونوں نے مل کر ارسلان کو ڈھونڈا اور اسے زبیدہ سے ملنے سے باز رہنے کی وارننگ کر دی۔ گھر آ کر مراد اور زبیدہ کی جھڑپ ہوئی کیونکہ ارسلان نے ساری بات زبیدہ کو بتا دی تھی۔ وہ آگ بگولا ہو گئی اور ارباب احمد کو کافی بُرا بھلا کہا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ آگ ارباب احمد کی ہی لگائی ہوئی ہے اور وہ اس پر آنکھ رکھتا ہے لیکن جب معاملہ اورنگزیب اور سہانا بیگم کے کانوں تک پہنچا تو زبیدہ بچے کی ماں بننے والی تھی۔

اس خبر نے پورے گھر میں مرگ کی سی کیفیت طاری کر دی تھی اورنگزیب کافی بیمار پڑ گیا جبکہ سہانا بیگم بھی بستر سے جا لگیں۔ زبیدہ کو اپنے کیے کا کوئی پچھتاوا نہ تھا وہ اس بچے کو جنم دینا چاہتی تھی اور ارسلان سے شادی بھی کرنا چاہتی تھی۔ اورنگزیب نے ارسلان کو بلا کر اس کا ارادہ پوچھا کہ وہ زبیدہ سے شادی کرنے کو تیار ہے تو اس نے چند

دنوں کا وقت مانگ کر زبیدہ کو حیران کر دیا لیکن وہ اس کی محبت میں اندھی ہو چکی تھی اس نے اپنے باپ اور چھوٹے بھائی کے سامنے ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ ارسلان نے اس کی محبت سے مجبور ہو کر زبیدہ سے چند افراد کی موجودگی میں نکاح کر لیا اور چند دنوں بعد اس کو اپنے ساتھ لے گیا۔

مراد اور ارباب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ لیکن سہانا بیگم کی بیماری زور پکڑ گئی اور وہ بستر پر لگ گئی اورنگزیب اس کی بیماری سے کافی پریشان تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بیٹی نے ان دونوں کو اس حال میں پہنچایا ہے۔ وہ بھی خاموش اور اُداس رہنے لگا تھا۔ ایک دن زبیدہ واپس آ گئی تو اس کے آنسوؤں نے بتا دیا کہ ارسلان نے اس کو کھلونا سمجھ کر کھیلا تھا اور اب ٹوٹ جانے پر طلاق تھما دی ہے۔

اورنگزیب بھی خاصا دلبرداشتہ ہو گیا تھا۔ زبیدہ بچے کو جنم دینے پر بضد تھی جبکہ اورنگزیب اور مراد چاہتے تھے کہ زبیدہ ابارشن کروا لے لیکن ڈاکٹروں کے مشورے کے بعد دونوں کو ہی اپنا فیصلہ بدلنا پڑا کیونکہ اب ابارشن کا مطلب تھا کہ بچے یا زبیدہ کی موت۔ اس لیے بچے کی پیدائش تک مراد اور اورنگزیب بدنامی کی سولی پر لٹکے رہے اس دوران ارباب اور مراد کی کلاس فیلو شمسہ مراد کے دل میں گھر کر گئی تھی اور مراد شمسہ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن زبیدہ کی ڈلیوری تک اس کام کو روک دیا گیا تھا۔ شمسہ بھی مراد کو پسند کرتی تھی لیکن ارباب احمد شمسہ کو دل سے چاہتا تھا لیکن اس نے کبھی بھی شمسہ پر اپنے جذبات کا اظہار نہ کیا تھا اور ویسے بھی وہ جان چکا تھا کہ مراد شمسہ کو دل و جان سے چاہتا ہے اور ارباب احمد کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ شمسہ کے والدین کو راضی کرے کہ وہ شمسہ کی شادی مراد سے کروا دیں۔

زبیدہ نے ایک خوبصورت بچے کو جنم دیا تو اس بچے کو سنبھالنے اور پالنے کا مسئلہ بن گیا۔ اورنگزیب اس بچے کو کسی کو دینے پر بضد تھا تا کہ زبیدہ کو کنوارہ ظاہر کر کے اس کی شادی کسی اچھے سے گھرانے میں کر دی جائے لیکن زبیدہ بچے کو کسی بھی طرح اپنی نظروں سے دور رکھنے پر راضی نہ تھی۔ اورنگزیب اور مراد نے زبیدہ کو بہت سمجھایا اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے طور طریقوں پر بھی کافی دلیلیں دیں بالآخر زبیدہ مان گئی وہ اپنی اولاد کو خود سے جدا کرتے ہوئے بلک بلک کر رو پڑی تھی اور بچے کو لے جا کر کسی کو دینے کی ذمہ داری ارباب احمد پر ڈالی گئی جس نے اس ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھانے کا وعدہ کیا اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب زبیدہ نے اپنا بچہ ارباب احمد کی جھولی میں ڈالا تو وہ بلک پڑا اور زبیدہ آنسوؤں پر قابو نہ رکھتی ہوئی اس کو چومنے اور چاٹنے لگی۔ بچہ ارباب احمد کی گود میں رو رہا تھا اور وہ اس کو لے کر گاڑی میں بیٹھا اور چلا گیا لیکن زبیدہ کی چیخ و پکار نے محل کے درو دیوار ہلا کر رکھ دیے تھے۔

زبیدہ آپا تڑپ کر خیالات کی دنیا سے واپس آئیں تو اندھیرا کافی بڑھ گیا تھا انہوں نے دور بیٹھے ہوئے فواز احمد اور روشنی کو دیکھنا چاہا تو وہ بھی نظر نہ آئے وہ نجانے کب کے جا چکے تھے۔ زبیدہ آپا کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر گالوں پر لکیریں بنا چکے تھے۔

آج اس کی بھابی صباء بیگم نے اس کو اپنے ماضی میں جھانکنے کے لیے ایک ہی فقرہ کہا تھا اور وہ الفاظ زبیدہ آپا کو روح کی گہرائی تو تڑپا گئے تھے اور وہ اپنے ماضی میں جھانکنے پر مجبور ہو گئی تھیں لیکن ماضی نے ان کے جسم و جان سے گویا جان ہی نکال دی تھی ان کو اپنا بچہ یاد آنے لگا تھا جو مراد کے دوست ارباب احمد نے ان کی گود سے لے کر نجانے کس کو دے دیا تھا۔ وہ ارباب احمد کو ڈھونڈے گی، اپنے بچے کا پتہ کروائے گی۔ وہ اپنے بچے کی خاطر کچھ بھی

کرے گی۔ وہ اپنے بچے کو ضرور ڈھونڈے گی۔ ان کے مصمم ارادوں کی راہ میں ان کا معذور ہونا بُری طرح حائل ہو رہا تھا اور وہ اپنی معذور ٹانگوں اور وہیل چیئر کو دیکھ کر رونے لگیں۔

○.....❖.....○

شہر کے مشہور اور بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور میں شمسہ اور طیبہ کچھ شاپنگ کر رہی تھیں کیونکہ طیبہ کے امتحانات ختم ہو گئے تھے اور اب اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ طیبہ بھی دلی طور پر اس بات پر راضی تھی کہ اسے احمد فراز جیسا جیون ساتھی ملنے والا ہے جو کہ بہت ہی کیئرنگ اور محبت کرنے والا بھی ہے اور اس کے ساتھ اس کا بہترین اور تابناک مستقبل بھی جڑا ہوا ہے۔ اچھی جاب اور عزت آج کل ہر لڑکی اور لڑکے کی خواہش ہوتی ہے اور طیبہ خود کو اس معاملے میں خاصا خوش نصیب تصور کر رہی تھی کہ احمد فراز کی عزت اور اچھی جاب اس کے لیے خوشیاں ہی خوشیاں لائے گی اور پھر اس کو اس گھر سے بھی رُخصت نہ ہونا پڑے گا۔ وہ اپنی شاپنگ کر رہی تھی جبکہ شمسہ اس کے لیے جو بھی ضروری تھا اس سامان کی فہرست بنا کر لائی ہوئی تھی۔

طیبہ کو ایک کلاس فیلو مل گئی تو وہ باتوں میں مگن ہو گئی اور شمسہ کو بوریت ہونے لگی تو وہ طیبہ کو اشارہ کر کے سٹور میں دوسری طرف چلی گئی لیکن سامنے سے آتے ہوئے مراد خان کو دیکھ کر وہ ٹھہر گئی اور یہی کیفیت مراد خان کی بھی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کافی عرصہ بعد دیکھا تھا۔ مراد خان کے دل کی دھڑکنیں اس قدر تیز ہو گئیں کہ وہ یوں محسوس کرنے لگا کہ دل ابھی سینے سے باہر آ کر شمسہ کے قدموں میں گر جائے گا۔ جبکہ شمسہ بیگم خود کو نارمل کرتی ہوئی دوسری طرف منہ پھیر کر ایک طرف کو نکل گئیں تو مراد خان کو جیسے ہوش آ گیا وہ اپنی جگہ سے ہلا اور شمسہ کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اس تک پہنچ گیا۔

''بات سنیں پلیز!'' اس کے لہجے میں کرب کو محسوس کرتے ہوئے شمسہ بیگم کو رک جانا پڑا۔ مراد خان ان کے پاس پہنچا اور شمسہ کے سامنے آتا ہوا اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''شمسہ......''

''میں کسی کی بیوی ہوں۔'' شمسہ بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اور میری بیٹی بھی میرے ساتھ اسی سٹور میں موجود ہے۔'' وہ تڑپ کر رہ گیا اور ارد گرد دیکھتے ہوئے آنکھوں میں آنے والی نمی کو قابو میں رکھتا ہوا بولا۔

''میری بیٹی کیسی ہے؟''

شمسہ بیگم نے طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو وہ ہاتھ جوڑتا ہوا بولا۔

''میں تمہارا گناہگار ہوں شمسہ! تمہاری بددعائیں میرا سکون اور قرار لوٹ کر مجھے پل پل مار رہی ہیں۔ مجھے معاف کر دو پلیز۔'' اس کے جڑے ہوئے ہاتھ دیکھ کر شمسہ بیگم طنز سے بولیں۔

''میں نے تو آپ کو کوئی بددعا نہیں دی۔ یہ آپ کے اعمال ہی ہیں جو آپ کو دن رات سکون نہیں لینے دیتے۔''

''مجھے میری بیٹی سے ملوا دو پلیز۔ ایک بار۔'' اس نے دوبارہ ہاتھ جوڑ دیئے تو شمسہ بیگم پھر بولیں۔

''خود تو تماشہ بنے ہی ہو اور مجھے بھی بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں آپ؟''

لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو مراد خان کو احساس ہوا کہ ایک پبلک مقام پر کھڑا ہے اور شمسہ سے اب اس کا

کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا۔

''میں اپنی بیٹی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہی بیٹی جس کو پیدا ہونے کی پاداش میں آپ نے زمین پر پٹخ دیا تھا۔'' شمسہ بیگم کا لہجہ تلخ اور آگ میں بھرا ہوا تھا۔ اتنی دیر میں طیبہ اس کو تلاش کرتی ہوئی وہاں آن پہنچی اس کے چہرے پر سیاہ رنگ کا اسکارف اس کے چاند جیسے حُسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ وہ شمسہ بیگم کو ایک اجنبی کے ساتھ ٹینس حالت میں دیکھ کر چونکتی ہوئی بولی۔

''امی! آپ یہاں کھڑی ہیں اور میں آپ کو اِدھر اُدھر ڈھونڈ رہی ہوں۔'' مراد خان نے کانپتے اور لرزتے ہونٹوں سے شمسہ سے پوچھا۔

''یہ تمہاری بیٹی ہے؟'' طیبہ نے واضح محسوس کیا کہ اجنبی کے الفاظ اس کے اندر کی ترجمانی کر رہے تھے۔

''امی یہ کون ہیں؟'' وہ شمسہ سے مخاطب ہوئی تو مراد خان کا دل زور سے دھڑک کر رہ گیا۔ پتہ نہیں اب شمسہ کیا کہنے والی تھی یا وہ مراد خان کا تعارف کس انداز میں کروانے والی تھی۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتی ہوئی بولی۔

''یہ تمہارے ابو...... ارباب احمد کے دوست ہیں۔'' شمسہ کا ''ابو'' کے بعد رُک جانا مراد خان کو بتا گیا کہ یہی اس کی بیٹی ہے۔ وہ نم آنکھوں سے طیبہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''السلام علیکم انکل!'' طیبہ نے جھٹ سے سلام کیا تو مراد خان نے روتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور کانپتے ہوئے ہاتھ کو طیبہ کے سر پر رکھا تو طیبہ کو واضح محسوس ہوا کہ ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

''آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا؟'' طیبہ کا سوال فطری تھا۔

''میں ملک سے باہر تھا۔ پچھلے ہفتہ ہی آیا ہوں۔'' مراد خان بمشکل کہہ پایا تھا۔

''تو آپ پاپا سے...... میرا مطلب ہے کہ ابو سے ملنے آئیں گے نا؟'' طیبہ بات کو بڑھا رہی تھی جبکہ شمسہ کا خیال تھا کہ اب چلا جائے۔

''میں کوشش کروں گا بیٹی!'' مراد خان کھڑا دیکھتا ہی رہ گیا جبکہ شمسہ طیبہ کو لے کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

مراد خان نے بائیس تئیس سال بعد طیبہ کو دیکھا تھا اس کا دل خون خون ہو گیا تھا۔ اس کا ماضی اس کو بچھو کے ڈنک لگانے لگا تھا۔ شمسہ نے اس پر یہ احسان کر دیا تھا کہ اس کو اشارے میں بتا دیا تھا کہ یہی اس کی بیٹی ہے۔

○......❖......○

''کیا بات ہے بابا جان! آج کل اسلام آباد میں ہی ڈیرے لگائے ہوئے ہیں؟'' صہیب احمد نے مسکراتے ہوئے مراد خان سے پوچھا تو وہ بھی مسکرانے لگے اور بولے۔

''تمہیں اچھا نہیں لگتا تو واپس چلا جاتا ہوں یار!'' مراد خان کا انداز دوستانہ تھا۔

''ارے نہیں بابا جان!'' صہیب احمد جلدی سے بولا۔ ''بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ بھی ادھر ہی آ جائیں، میرے پاس۔''

مراد خان نے چائے کا گرم گرم گھونٹ بھرا اور ہنستے ہوئے بولے۔

''میں کیا کروں گا؟ میرا مطلب ہے کہ اس شہر میں میری مصروفیت کیا ہو گی؟''

صہیب احمد چائے کا مگ اٹھاتا ہوا کہنے لگا۔

''بابا جان! آپ میرے ساتھ آفس جایا کریں۔ وہاں پر اپنے آپ کو مصروف رکھیں، اس طرح میرا کام بھی آسان ہو جائے گا اور آپ کی پرابلم بھی سولو ہو جائے گی۔''

صہیب احمد کے معصوم انداز پر مراد خان قہقہہ لگا کر بولے۔

''صاحبزادے! سیدھا سیدھا کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔''

صہیب احمد بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا۔

''بابا جان! میں آج جو کچھ بھی ہوں آپ کی وجہ سے ہی ہوں۔'' وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔'' آپ نے آج تک زندگی کی ہر اونچ نیچ میں مجھے اسسٹ ہی تو کیا ہے۔ اس طرح کہ میرے لئے ترقی اور عزت کی راہیں آسان ہوتی گئیں۔''

مراد خان اس سنجیدہ دیکھ کر اس کی طرف دیکھنے لگے اور بولے۔

''تم نے خود کو گروم کیا ہے یار! تم میں ٹیلنٹ تھا، حوصلہ اور سچی بات کہنے کی جرأت نے تمہیں آج یہ مقام دیا ہے...... کاش کہ......'' مراد خان ٹھنڈی سانس لینے کے لئے رکے اور بولے۔'' کاش کہ تمہاری تربیت اور پرورش میں تمہاری ماں کا بھی عمل دخل ہوتا۔ آخری الفاظ میں جو درد چھپا ہوا تھا اس کو صہیب احمد نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مراد خان کے قدموں میں آ کر گھاس پر بیٹھ گیا اور مراد خان کی ٹانگیں دبانے لگا تو انہوں نے جگتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو صہیب احمد بولا۔

''آپ کو معلوم ہی ہے کہ ماما اپنی دنیا میں مگن رہنے والی عورت ہیں۔''

''اس کی دنیا تو تم ہی ہو...... ہو کہ نہیں؟'' مراد خان کا جواب مدلل تھا۔

''لیکن ہماری دنیا کو سنوارا آپ نے ہے تو اس دنیا میں لانے کا سہرا تو ماما کے سر ہی ہے۔'' دونوں ہنسنے لگے تو صہیب احمد پھر بولا۔

''تو پھر آپ نے بتایا نہیں کہ کب شفٹ ہو رہے ہیں یہاں؟''

''بہت سے مسائل ہیں یار!'' مراد خان دور دیکھتے ہوئے بولے۔

''مثلاً۔'' صہیب احمد بولا۔

''ابھی تمہاری آنٹی آ رہی ہے انگلینڈ سے، تمہاری ماں چاہتی ہے کہ روشنی کی شادی علی سے کر کے اس کو لنڈن بھیج دیا جائے۔''

''کب آ رہے ہیں وہ لوگ؟ مجھے تو اس بات کا علم بھی نہیں ہے۔'' صہیب احمد کی لاعلمی حقیقی تھی۔

''دو دن بعد ہی وہ لوگ آ رہے ہیں۔''

''لیکن بابا جان...... روشنی تو ابھی پڑھ رہی ہے اور پھر...... وہ اس شادی پر کیسے رضامندی ہو گی؟'' صہیب احمد بھی پریشان ہو گیا تھا۔

''تم دونوں بچے میری آنکھوں کا نور ہو...... اور میں تمہیں دیکھ دیکھ کر جیتا ہوں۔'' مراد خان کا لہجہ اور الفاظ سنجیدگی سے بھرپور تھے۔ ''میں اندھا ہو کر نہیں مرنا چاہتا...... میں تو پہلے ہی مکافاتِ عمل کا شکار ہوں...... تقدیر مجھ سے نجانے ابھی کیا کیا انتقام لینا چاہتی ہے؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا جان؟'' صہیب احمد کچھ بھی نہ سمجھا تھا۔

مراد خان لمبی سی آہ بھرتے ہوئے بولے۔

''میں روشنی کی شادی اپنے ہی ملک میں کرنا چاہتا ہوں لیکن تمہاری ماما اس بات پر راضی نہیں ہیں۔''

''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔'' صہیب احمد فوراً بولا۔ ''آپ ماما سے کہہ دیں کہ ہم روشنی کی شادی علی کے ساتھ نہیں کرنا چاہتے۔''

مراد خان نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے۔

''میں دوسری بار اپنے گھر کو بکھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔''

''دوسری بار؟'' صہیب احمد کی حیرانگی سے بھرپور آواز ابھری۔

مراد خان اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور اٹھ کر کھڑے ہوئے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر استفہامیہ انداز میں بولا۔

''آپ کا لہجہ اور انداز کچھ پراسرار سے ہوتے جا رہے ہیں بابا جان!''

مراد خان قہقہہ لگا کر بولے۔ ''ہاں! مجھ پر تمہاری ماما کا سایہ ہو گیا ہے۔'' دونوں ہنسنے لگے اور مراد خان اندر کی جانب بڑھ گئے۔ صہیب احمد نے واضح محسوس کیا تھا کہ مراد خان کا یہ قہقہہ کھوکھلا تھا۔

مراد خان کا اس طرح گزشتہ ایک ہفتہ سے اسلام آباد میں صہیب احمد کے ہاں ٹھہرے رہنا خلافِ معمول بات تھی کیونکہ ایبٹ آباد میں ان کے بہت سے کام ہوتے تھے۔ لوگوں کی پریشانیوں پر مبنی ان کے حالات و واقعات کو نپٹانا ان کا معمول تھا لیکن آج آٹھ روز سے اس طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسلام آباد میں بیٹھے رہنا صہیب احمد کو حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ ان سے کرید کر نہ پوچھ سکتا تھا بس انتظار ہی کر سکتا تھا کہ اب کیا ہو گا اور آگے کیا ہونے والا ہے۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو چونک گیا کیونکہ اس نے ڈنر کا پروگرام بنایا تھا اور ڈنر بھی ریبا کے ساتھ تھا۔ ریبا نے اچھے مارکس سے کلاس کلیئر کی تھی۔ اس نے صہیب احمد کے ٹائم کو مدنظر رکھتے ہوئے فیصلہ اس پر ہی چھوڑ دیا تھا اور اس سے پہلے کہ اسے ریبا کی کال آتی وہ جلدی سے فریش ہونے چلا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ بالکل تیار تھا گاڑی ضیافت جیسے بہترین ریستوران کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ ٹریفک کے باوجود بھی وہ ٹائم پر پہنچ گیا تھا لیکن ریبا اس سے پہلے موجود تھی اور اس کا موڈ بھی کافی خراب لگ رہا تھا۔ اس نے صہیب احمد کو آتا دیکھ کر غصے سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

''آئی ایم سوری یار!'' وہ کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا لیکن ریبا نے منہ دوسری طرف ہی کیے رکھا۔ ''وہ ایکچوئلی بابا جان آئے ہوئے ہیں تو ان سے باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا۔ سوری یار!''

''میں کب سے ویٹ کر رہی ہوں۔'' ریبا کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کا غصہ مصنوعی ہے۔
''بولا نہ یار کہ بابا جان آئے ہوئے ہیں۔'' صہیب احمد اپنی صفائی میں کہہ رہا تھا۔ ''زوروں کی بھوک لگی ہے۔''
''اپنی پسند کا آرڈر دے دو۔'' ریبا کا موڈ کچھ فریش ہو گیا تھا۔
''کم آن یار! انوائٹ تو تم نے کیا ہے، آرڈر بھی تم ہی دو گی۔'' صہیب احمد اس کا موڈ ٹھیک کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا تھا۔
ویٹر کو آرڈر دیا گیا اور پھر دوبارہ باتیں شروع ہو گئیں۔
''میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہم اتنی جلدی اتنے قریب آ جائیں گے۔'' صہیب احمد بولا۔
''یہ تو تقدیر کے فیصلوں پر منحصر ہوتا ہے۔'' ریبا مسکراتی ہوئی بولی۔
''ویسے مجھے تو ساحر کی شادی کافی راس آ گئی ہے۔'' صہیب احمد اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا تو وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔ ''بابا جان آئے ہوئے ہیں۔ اگر کہو تو...... ان کو ساتھ لے کر آؤں تمہارے گھر؟'' وہ یک دم گھبرائے ہوئے انداز میں نظریں اٹھا کر صہیب احمد کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی جہاں معصوم شرارت اٹکھیلیاں کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔
''کیوں؟'' وہ سہمی ہوئی آواز میں اتنا ہی کہہ پائی تو صہیب احمد شرارت سے مسکراتا ہوا بولا۔
''تمہارا ہاتھ مانگنے کے لیے۔'' یہ بات کہہ کر اس نے ریبا کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ کافی نروس ہو گئی۔
''کیوں...... ارادہ نہیں ہے؟'' صہیب احمد اب سنجیدہ لگ رہا تھا۔ وہ اس کی سنجیدگی کو بھانپتی ہوئی بولی۔
''ابھی...... نہیں...... میرا مطلب ہے کہ ابھی تو آپی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔''
''تو انہوں نے کون سا گھر سے باہر جانا ہے۔ وہ تو احمد فراز کے ساتھ اسی گھر میں ہی رہیں گی نا؟''
''ہاں لیکن...... میں ابھی اپنی تعلیم مکمل کر لوں اور پھر ڈیڈی بھی نہیں مانیں گے۔'' ریبا انجانے خدشوں کا اظہار کر رہی تھی۔
''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' صہیب احمد اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ریبا کو پلکیں جھپکنا پڑ گئیں کیونکہ وہ ظالم آنکھوں کے رستے دل میں اترنے کا فن بخوبی جانتا تھا۔
ویٹر کھانا لے کر آ گیا تو میزبان ہونے کے ناطے ریبا نے پلیٹوں میں سالن نکالا اور صہیب احمد کو پیش کیا۔ دونوں نے پُرسکون ہو کر کھانا کھایا اس سے پہلے کہ ریبا اجازت لیتی اور صہیب احمد اس کو مزید تنگ کرتا احمد فراز ان کی ٹیبل پر آ پہنچا تو ریبا کے چہرے کی رنگت زرد ہونے لگی۔ وہ خاصی گھبرا گئی تھی کیونکہ وہ گھر والوں کو کوئی بہانہ لگا کر آئی تھی لیکن احمد فراز اس کا کزن بھی تھا، اس کا ہونے والا بہنوئی بھی تھا اور اس گھر میں اس سے بڑا بھی تھا۔
''واؤ!'' وہ صہیب احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا تو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہی اس ملک کے نامور صحافی تھے لیکن اس وقت دونوں کی پوزیشن خاصی غیر مستحکم تھی اور صہیب احمد اس کی نظر میں خود کو چور محسوس کر رہا تھا جبکہ احمد فراز کو لگ رہا تھا کہ صہیب احمد اس کے گھر میں نقب لگانے کی کوشش کر رہا تھا چونکہ دونوں ہی کلاس فیلو بھی تھے اور

اچھے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ اس ملک کے باشعور شہری بھی تھے۔ اس لئے کسی بھی بات کو تماشا بنا کر خود تماشا بننے سے بہتر تھا کہ سلیقے سے ہی بات کی جاتی۔ ''واقعی اس ہوٹل کا کھانا ٹیسٹی ہوتا ہے۔'' احمد فراز نے بات کا آغاز کیا تو صہیب احمد کھسیانی ہنسی سے بولا۔

''لیکن اب تو تم لیٹ ہو چکے ہو۔''

''نہیں یار!'' وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا پلیٹ میں سے ایک بوٹی اٹھا کر منہ میں رکھ کر بولا۔ ''صہیب احمد تمہیں یہ نہیں لگتا کہ میں وقت پر پہنچا ہوں اور وہ بھی عین وقت پر؟''

''ریبا ان کی گفتگو سن کر خاصی گھبرائی ہوئی پاس ہی کھڑی تھی اور صہیب احمد جان سکتا تھا کہ اس وقت ریبا کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ بات کو بناتا ہوا بولا۔

''وقت پر پہنچنا اچھی بات ہے لیکن کسی بھی غلط فہمی کو ذہن میں پالنا بری بات ہے۔'' احمد فراز اس کی بات سن کر ہنسنے لگا اور بولا۔ ''اگر تم ایسی باتیں نہ کرو تو کامیاب کیسے ہو گے۔'' پھر وہ ریبا کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''مس ریبا اگر پارٹی ختم ہو گئی ہو تو گھر چلیں؟'' وہ منہ سے تو کچھ نہ بولی بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

''فراز! میرا خیال ہے کہ تم کافی کچھ غلط سمجھ رہے ہو۔'' صہیب احمد نے ریبا کی پوزیشن واضح کرنا چاہی۔ ایکچوئلی میں نے ہی ریبا کو یہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔ ہم میں صرف دوستی ہے اور تم تو جانتے ہو کہ میں کیسا دوست ہوں؟''

احمد فراز ہنستا ہوا کہنے لگا۔ ''نہ ہی میں تھانیدار ہوں اور نہ ہی تم کسی کچہری میں کھڑے ہو۔ اگر تم دل کے اچھے اور من کے سچے ہو تو صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ریبا کو اشارہ کیا اور بولا۔ ''میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں پانچ منٹ تک پہنچو۔'' وہ صہیب احمد سے ہاتھ ملاتا ہوا بولا۔ ''سی یو۔'' اور چلا گیا۔

ریبا گھبرائے ہوئے انداز میں صہیب احمد کی طرف دیکھتی رہی۔

''تم فکر نہ کرو، فراز کو میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا کہ تمہیں گھر والوں کی نظروں میں شرمندہ ہونا پڑے۔''

''آپ پاپا کو نہیں جانتے۔'' وہ خاصی نروس بھی تھی اور روہانسی بھی ہو رہی تھی۔ صہیب احمد نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''اور پاپا مجھے نہیں جانتے، میں دوستی کرتا ہوں تو نبھانا بھی جانتا ہوں کیونکہ میں رشتے بناتا ہوں توڑتا نہیں۔''

ریبا پریشانی کی حالت میں وہاں سے چلی گئی تو صہیب احمد نے ویٹر کو بل لانے کا کہا۔ ''وہ اس بات سے خود کو پریشان کر رہا تھا کہ ریبا گھر والوں کی نظروں میں اپنی اہمیت کھو چکی ہے کیونکہ احمد فراز اب نامعلوم کس انداز سے اس ملاقات کو پیش کرتا ہے اور وہ کسی بھی قیمت پر ریبا کو اس کے مقام سے گرنے نہیں دے گا۔ کیونکہ اس نے محبت کی ہے اور محبت کی معراج کو بلند رکھنے کے لئے اسے کچھ بھی کرنا پڑا وہ کرے گا۔

وہ گاڑی نکال کر گھر کی جانب بڑھا اور سوچنے لگا کہ ابھی مراد خان سے ریبا کی بات کرے گا کہ وہ صبح ہی ڈاکٹر ارباب احمد اور ان کی مسز سے ریبا کا ہاتھ مانگ لیں۔

''کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ؟'' ریبا احمد فراز کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی گھر جا رہی تھی۔ یہ احمد فراز کا پہلا سوال تھا۔ وہ سکرین کے پار دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن یوں لگ رہا تھا کہ وہ اندھی ہوگئی ہے اور اس کی سماعتیں بہری ہوگئی ہیں۔ کیونکہ احمد فراز کے الفاظ کا مطلب وہ بخوبی سمجھ رہی تھی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے ریبا!'' احمد فراز نے گاڑی گیئر میں ڈالتے ہوئے پوچھا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''فراز بھائی! ایسا کچھ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔'' وہ اپنے تئیں اس کو مطمئن کرنے کی کوشش میں بہترین الفاظ تلاش کرنے لگی تھی اور دعا بھی کر رہی تھی کہ جلد از جلد گھر پہنچے کیونکہ راستے میں ہی احمد فراز پتہ نہیں کس کس غلط فہمی کا شکار ہو جائے۔

''تو پھر کیا ہے یہ۔ تم نے گھر والوں سے یقیناً جھوٹ بولا ہوگا۔'' احمد فراز کا لہجہ دھیما اور الفاظ سلجھے ہوئے تھے۔ ریبا کو کچھ حوصلہ تو ہوا تھا، وہ بات کو بڑھاتی ہوئی بولی۔

''فراز بھائی! ایکچوئلی ہماری پہلی ملاقات امبرین کے بھائی ساحر کی شادی پر ہوئی تھی۔''

''پھر اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا؟'' یہ طنز تھا جو ریبا بخوبی محسوس کر گئی تھی۔

''ہم دوست ہیں۔'' وہ بولی تو احمد فراز اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''کبھی طیبہ کو غور سے دیکھا ہے؟'' وہ اس سوال کا مقصد نہ سمجھ سکی، اس لئے خاموش ہی رہی۔ ''وہ لڑکیوں سے بھی دوستی رکھنے کی قائل نہیں ہے۔ اس کا کہنا اور نظریہ ہے کہ لڑکیوں سے دوستی کرو گے تو ان کے گھر بھی جانا پڑے گا یا پھر ان کو بھی گھر بلانا پڑے گا۔ ان کا بھائی یا کزن ان کو چھوڑنے یا لینے آئے گا اس طرح بات بڑھتی ہوئی دوستی کی حدوں کو توڑتی ہوئی بہت آگے تک جاتی ہے۔''

''فراز بھائی!'' وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ وہ اس کی بات کاٹتا ہوا بولا۔

''وہ تمہارے گھر میں ایک ایسا آئی کون ہے جسے دیکھ کر عزت، احترام اور محبت کا احساس ہوتا رہتا ہے۔'' ریبا اس بات کو سمجھ نہ سکی کہ یہ طیبہ کی تعریف ہے یا اس کی ذات پر کیچڑ اچھالا جا رہا ہے۔

''واپس لوٹ جاؤ ریبا!'' وہ اس فقرے پر چونکتی ہوئی احمد فراز کی طرف دیکھنے لگی۔

''واپس......؟'' وہ اس ایک لفظ کو چبا کر بولی۔

''ہاں واپس...... ان راہوں پر چلنے کے لئے لوہے سے بھی مضبوط دل اور فولاد جیسے ارادے درکار ہوتے ہیں۔'' گھر نزدیک آ رہا تھا لیکن بات الجھتی جا رہی تھی۔

''آپ کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں پڑی ہوگی فراز بھائی!'' یہ سیدھا سیدھا طنز تھا کیونکہ ریبا اب اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فراز طیبہ سے بہت محبت کرتا ہے۔

وہ ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا بولا۔

''ارادہ مضبوط اور نیت صاف ہو تو منزلیں خود ہی چل کر تمہارے پاس آ جاتی ہیں۔''

''میری نیت میں ایسی کوئی کھوٹ نہیں کہ میں اپنی منزل کا راستہ کھو دوں۔'' ریبا کافی حوصلہ مند بننے کی کوشش میں اچھے الفاظ کا سہارا لے رہی تھی۔

''اور یہ کون طے کرے گا کہ تمہاری منزل نظر کا دھوکا نہیں ہے۔ وہ کوئی سراب نہیں ہے؟'' احمد فراز کی اس بات نے اسے لاجواب کر دیا تھا کیونکہ ابھی تک وہ صہیب احمد کو اچھی طرح سے جان نہ پائی تھی۔

○......❖......○

دولت بی بی نے پُرسکون انداز میں ننگے پاؤں چلتی ہوئی طیبہ کو دیکھا تو آسمان کی جانب منہ کر کے اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ طیبہ کی وجہ سے کافی پریشان رہتی تھیں کیونکہ طیبہ کو زمانے کی اونچ نیچ کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ انتہائی سادہ تھی اس نے اپنی عمر اس طرح گزاری تھی کہ گھر سے کالج یونیورسٹی اور پھر سیدھی گھر۔ اگر کبھی بازار بھی جانا ہوا تو شمسہ یا ارباب احمد کے ساتھ ہی گئی تھی۔ اس نے سیاہ سکارف کو اپنی پہچان بنا لیا تھا۔ اب دولت بی بی کو یہ بھی سکون تھا کہ احمد فراز جیسا نیک اور خوبصورت لڑکا مل جانا بھی ایک نعمت ہے اور یہ نعمت اللہ نے طیبہ کی صاف نیت کی بدولت ہی اس کی جھولی میں ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جتنی سادہ تھی زمانہ اتنا ہی شاطر تھا۔

طیبہ کے لئے یہ بات بھی خوش کن تھی کہ اس کو اسی گھر میں رہنا تھا اور ساس بہو یا نندوں کی لڑائی جھگڑوں سے بھی اس کی جان چھوٹ گئی تھی اور پھر دونوں ہی ایک دوسرے کو دل سے پسند بھی کرتے تھے۔ طیبہ کے لئے دولت بی بی کا مطمئن ہو جانا اس بات کی علامت تھی کہ اب راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

لیکن تقدیر نے کیا لکھا تھا اس بات سے بے خبر طیبہ تھکاوٹ محسوس کرتی ہوئی دولت بی بی کے پاس آ گئی اور ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ دولت بی بی نے جو کچھ ابھی تک پڑھا تھا وہ پھونک کی صورت میں طیبہ کے چہرے پر انڈیل دیا تو وہ مسحور کن انداز میں مسکرائی۔

''کتنا مزہ آتا ہے دادی!''

''اللہ کی پاک کلام میں مزہ ہی مزہ ہے میری بچی!''

''دادی! اب میری شادی ہونے والی ہے۔'' وہ یک دم اداس سی ہو گئی۔ ''کیا اللہ مجھ سے ناراض ہے جو مجھے اپنے گھر نہیں بلانا چاہتا؟''

اس کی لگن اور تان اس بات پر ہی لگی ہوئی تھی کہ وہ ایک بار اللہ تعالیٰ کا مقدس گھر دیکھ آئے اور دولت بی بی اس کی تڑپ کو سمجھتی تھیں۔

''اللہ اپنے بندوں سے ناراض نہیں ہوتا میری بچی! وہ تو بس آزماتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس کا کون سا بندہ اس کے لئے کتنی حب اپنے دل میں رکھتا ہے۔''

''مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ وہ مجھے آزما رہا ہے؟'' بڑا معصوم مگر کٹھن آزمائش کو آواز دینے والا سوال تھا۔

''ایسا نہیں کہتے، بس یہی دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہمیں کسی بھی آزمائش میں نہ ڈالے کیونکہ ہم تو حقیر سے بندے ہیں اس کے امتحانات اور آزمائشیں بڑی کٹھن ہیں۔ اس سے ہمیشہ اس کا فضل اور رحم ہی مانگنا چاہئے۔''

''دادی! میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ میں اس کے گھر کو دیکھنے کے لئے کسی بھی آزمائش سے گزر جاؤں گی، ایک بار وہ مجھے اپنا سوہنا گھر دکھا دے۔'' وہ خوابناک انداز میں بولی تھی۔

''تم تو مجھے پاگل لگنے لگی ہو۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ اللہ سے فضل و کرم ہی مانگتے ہیں۔ دولت بی بی اس کا

دھیان بٹاتی ہوئی اس کو شرارتی انداز میں پوچھنے لگیں۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ اب تو فراز تمہیں چھپ چھپ کر نہیں دیکھتا۔''

طیبہ ان کی شرارت سمجھ کر اوپر کی جانب دیکھنے لگی جہاں کھڑکی کا پردہ ہل رہا تھا جو کہ احمد فراز کا کمرہ تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ''دادی جان! یہ سبھی لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

دولت بی بی کی نگاہیں بھی اوپر کھڑکی کی جانب اٹھ گئیں تو وہ بھی مسکرانے لگیں اور بولیں۔

''ارباب نے پروگرام بنایا ہے کہ ہم تمہاری شادی کے بعد سب لوگ عمرہ کی ادائیگی کے لئے جائیں گے۔''

''کیا دادی...... واقعی!'' طیبہ چیخنے والے انداز میں بولی تو دولت بی بی مسکراتی ہوئی کہنے لگیں۔

''بس اس بات کو اپنے تک ہی رکھنا۔ ارباب احمد نے مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ تمہیں یہ خوش خبری شادی والے دن ہی سنائی جانا تھی۔''

''دادی...... دادی دادی!'' وہ خوشی سے جھومنے لگی تھی۔ دادی! میں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے جاؤں گی؟ میں...... دادی جان میں یعنی کہ طیبہ ارباب؟''

وہ ہنستی ہوئی بولیں۔ ''تب تک طیبہ فراز بن چکی ہوگی۔''

طیبہ بھی مسکرانے لگی تھی اور فراز کے نام کے ساتھ اس کا نام جڑ جانا اس کی دلی خواہش تھی جو کہ اب تھوڑے ہی دنوں بعد پوری ہونے والی تھی۔ لیکن زور آور تقدیر نے ایک اور ہی پلاننگ کر رکھی تھی جس سے یہ سبھی گھر والے لاعلم تھے۔

○......❖......○

طیبہ تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلی تو سامنے ہی احمد فراز کھڑا تھا وہ اس کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی اور خاصی نروس ہونے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور گلابی گالوں پر شرم و حیا کی سرخی مزید بڑھنے لگی تو اس نے نظریں جھکا لیں۔

''میں وہی ہوں میڈم!'' احمد فراز کی شوخ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ ''کچھ بولو گی یا یونہی سکارف کی آڑ میں ہی تیر چلاتی رہو گی۔''

''فراز!'' وہ احتجاجی انداز اپناتے ہوئے مصنوعی غصے سے بولی تو وہ ہنسنے لگا۔

''طیبہ! میں کتنا بدنصیب ہوتا اگر تم میری کزن نہ ہوتی؟''

''مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ اس کے جواب میں ہونٹ کاٹتی ہوئی اتنا ہی کہہ پائی۔

''بندہ حاضر ہے۔'' وہ کورنش بجا لانے والے انداز میں جھکا تو طیبہ کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔

وہ جیسے ہی باہر نکلے تو شمسہ بیگم ان دونوں کو دیکھ کر مسکرانے لگیں اور بلائیں لینے لگیں۔

''جلدی آنا۔ آج میں نے تمہاری پسند کی ڈش بنائی ہے۔'' وہ طیبہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں تو طیبہ نے فراز کی طرف دیکھا اور شمسہ سے مخاطب ہوئی۔ ''بس امی! میری تو شاپنگ بھی کم ہے۔ اگر کوئی وقت لگا تو یونیورسٹی میں ہی لگے گا۔''

''فراز تم آفس سے آتے ہوئے میری بیٹی کو ساتھ لے آنا۔'' شمسہ بیگم نے آرڈر جاری کر دیا تھا ویسے بھی فراز

یہی چاہتا تھا کہ وہ طیبہ کے ساتھ ہی شاپنگ کرے لیکن طیبہ کو پہلے یونیورسٹی جانا تھا اور فراز کو آفس جانا تھا۔ دونوں کے کام بھی ضروری تھے دونوں نے ہی اپنے اپنے شادی کارڈز دینے تھے۔ طیبہ کی خواہش تھی کہ اس کے اساتذہ بھی اس کی شادی میں ضرور شریک ہوں۔

گاڑی گھر سے نکل کر کھلی سڑک پر آ گئی تو احمد فراز نے طیبہ کی طرف دیکھا تو وہ شرما گئی۔ حجاب سے چاند کی چاندنی کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ وہ نظریں جھکاتی ہوئی بولی۔

''سامنے دیکھو۔''

''یہ لمحے دوبارہ نہیں آئیں گے۔'' وہ گیئر بدلتا ہوا سامنے دیکھنے لگا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟'' طیبہ نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔

''جس کی طلب کی جائے وہ اتنی آسانی سے مل جائے تو تقدیر پر شک ہونے لگتا ہے۔''

''کاتب تقدیر کے قلم سے جو نکلا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ تقدیر پر شک نہیں بلکہ خود پر رشک کرنا چاہئے۔''

''طیبہ!''

''ہوں۔''

''اگر تم نہ ملتی تو پتہ ہے کیا ہوتا؟''

''کیا ہوتا؟''

''میں یہ گھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیتا۔''

''پھر کہاں جاتے؟''

''تمہاری یادوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے سر میں خاک ڈال لیتا..... گریبان چاک کر کے جنگلوں میں نکل جاتا۔''

''پھر.....؟'' وہ تجسس سے پوچھنے لگی۔ ''تو پھر مجھے بھلا پاتے؟''

''اگر اپنے حواس میں ہوتا تو یہ گناہ کر لیتا۔'' وہ محبت بھرے انداز میں بولا تھا۔ اس کے الفاظ اور لہجے کی سچائی ہر قسم کے شک سے مبرا تھی۔

''اگر کوئی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہو..... اور تم بھی مجھے کھونا نہیں چاہتے تو پھر کیا کرتے؟'' وہ شرارتی انداز اپنائے ہوئے تھی لیکن احمد فراز سمجھتا تھا کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے اور ان لمحات کو یادگار بنانے کے لئے وہ مستقبل کے خدشات کو دور بھی کرنا چاہتی ہے۔

''اگر کوئی خاندان میں ہوتا جو تم سے شادی کرنا چاہتا تو یقیناً وہ واجب القتل ہوتا اور میں سب سے پہلے اس کا خون کرتا۔'' طیبہ اس کے انداز پر نقرئی ہنسی کو ہونٹوں سے ادا کرتی ہوئی اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میرا یقین کرو..... میں تمہیں خود سے بھی بڑھ کر چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنا ہاتھ طیبہ کے گورے گورے ہاتھ پر رکھا تو وہ چونک گئی کیونکہ اس لہجے کی گرمی اس کے ہاتھ سے ظاہر ہو رہی تھی۔

''فراز! مجھے کبھی کبھی خوف آنے لگتا ہے۔''

''کیسا خوف؟''

''بس انجانے خدشات، وسوسے اور وہم مجھے رلانے لگتا ہے کہ میں دور نہ ہو جاؤں۔'' احمد فراز نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر ہلکی سی خوف کی پرچھائی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ کو دباتا ہوا بولا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔ خوفزدہ ہونے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بس تمہارا ساتھ ہی میرا سرمایہ ہے۔'' وہ اتنی بڑی بات آسانی سے نہ کہہ پائی تھی کئی سالوں پرمحیط عرصہ لگا تھا لیکن موقع آج ملا تھا۔ گاڑی رک گئی تھی کیونکہ یونیورسٹی آ گئی تھی۔ وہ نیچے اترنے سے پہلے احمد فراز کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''اب کمرے کی کھڑکی سے مجھے دیکھنا بند کر دو۔''

''وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا اور بولا۔'' ویسے یار! تم ہو بہت گھنی...... میں تو سمجھتا رہا کہ میری اس عبادت کا کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔'' اتنے بڑے الفاظ...... اتنا جاندار لہجہ اور شاندار انداز تھا کہ وہ گھائل ہو کر رہ گئی۔

''انسان انسان کی عبادت کرے تو کافر ہو جاتا ہے...... مجھے ایسی باتیں کر کے گناہگار مت کرو۔'' وہ اپنا بیگ پکڑتے ہوئے بولی۔ ''اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے۔''

''اللہ تعالیٰ ہی فرماتا ہے کہ میرے بندوں کو خوش رکھنا عبادت سے بھی افضل ہے۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ یہ سیاہ سکارف میری جان لے لے گا۔''

''شرم کرو......'' وہ تڑپ کر رہ گئی۔ ''کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' وہ فراز کو کھو دینے کے ڈر سے ہی لرز گئی تھی۔

''آئی ایم سوری بابا!'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا کہنے لگا تو وہ مسکراتی ہوئی گاڑی سے اتر گئی۔

''میں کال کروں گی تو مجھے شاپنگ سینٹر سے پک کر لینا۔'' وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ احمد فراز اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر گاڑی آگے بڑھا لی۔

○......❖......○

فواز احمد صبا بیگم کے رویے سے کافی پریشان تھا کیونکہ وہ کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی کہ تنہائی میں اس سے ایسی حرکتیں کرتی تھی جو اس عمر کی عورتوں کو زیب نہ دیتی تھیں اور پھر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ فواز احمد اس کی بیٹی کا استاد ہے اور اس کے بیٹے صہیب احمد کا دوست بھی ہے۔ وہ اپنی اس پریشانی کا اظہار اگر روشنی سے کرتا تو یقیناً اس کی نظروں سے گر جاتا کیونکہ ظاہر ہے روشنی نے بھی تو ماں کی فیور میں ہی بات کرنا تھی اور وہ فواز احمد کو بھی غلط سمجھتی۔ حالانکہ روشنی اس سے اپنی محبت کا اظہار کر چکی تھی۔ اگر وہ صہیب احمد سے بات کرتا تو یقیناً احسان فراموشی کی داستانیں سنا سنا کر صہیب احمد اس کو زندہ درگور ہونے پر مجبور کر دیتا اور آ جا کر مراد خان ہی رہ گئے تھے جن کی رعب دار شخصیت نے فواز احمد کو پہلے دن ہی قائل کر لیا تھا اور پھر وہ صبا بیگم کی کوئی بھی بات ان سے نہ کر سکتا تھا۔ کوئی ثبوت اور گواہ نہ تھا۔ صرف فواز احمد کا کہنا ہی کافی نہ ہوتا بلکہ الٹا آنتیں گلے پڑنے والی مثال سچ ثابت ہو جاتی اور وہ روشنی کی نظروں سے بھی گر جاتا۔ اس نے بہت سوچ و بچار کے بعد یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ خاموش رہ کر تیل اور تیل کی دھار دیکھے گا اور حتی الوسیع کوشش کیا کرے گا کہ صبا بیگم سے دور رہے اور صبا کمرے میں آئے تو خود فواز احمد کمرے سے

نکل جایا کرے۔ کئی دنوں کی کشمکش کے بعد وہ اس فیصلہ کو کر کے خود کو کچھ پُر سکون محسوس کرنے لگا تھا۔

وہ پہلی بار اس محل سے روشنی کے ساتھ باہر نکلا تھا۔ وہی شاندار گاڑی جو پہلے دن اس کو بس سٹینڈ سے لینے آئی تھی اس کا سٹیئرنگ آج روشنی کے ہاتھ میں تھا اور وہ صرف ایک پورے دن کے لئے ایبٹ آباد کے گلیات اور گرد و نواح کی سیر کے لئے نکلے تھے۔ خوبصورت اور حسین مناظر قدرت کے شاہکار اور رب عظیم کی نعمتوں سے مالا مال ہونے کی گواہی دینے کے لئے آنکھوں کے راستے دل میں گھر کرتے جا رہے تھے۔ روشنی اس کے پہلو میں تھی اور وہ روشنی کے ساتھ کو اس طرح محسوس کر کے خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ گاڑی میں کولون کی مہکی مہکی خوشبو نے ماحول کو مزید رومانوی بنا دیا تھا۔ وہ مسحورکن انداز میں آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا تھا اور روشنی اس کی طرف پیار بھرے انداز میں دیکھ کر یہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ کتنی خوش نصیب ہے کہ اس کے پہلو میں اس ملک کا عظیم قلمکار بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اس احساس کو دل میں جگہ دے چکی تھی کہ فواز احمد اس کا ہے اور اسی کا رہے گا۔ وہ اس کو پانے کی خاطر معاشرتی نظام اور خاندان کی تمام روایات کو توڑ دے گی۔ اگر اسے مراد خان سے بھی ٹکر لینا پڑی تو وہ دریغ نہیں کرے گی۔ وہ کسی بھی صورت فواز احمد کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جب سے فواز احمد نے اسے بتایا تھا کہ وہ روشنی سے محبت کرتا ہے تب سے اس کے پاؤں ہی زمین پر نہ پڑ رہے تھے۔ آج وہ صبا بیگم سے ضد کر کے ایک پورے دن کے لئے اپنی مرضی سے وقت گزارنے کے لئے فواز احمد کے ساتھ خوبصورت علاقوں کی سیر کے لئے نکلی تھی۔

گاڑی ایک چھپر ہوٹل پر رک چکی تھی روشنی کا خیال تھا کہ اس جگہ سے دور دور تک با آسانی دیکھا بھی جا سکتا ہے اور قدرتی مناظر سے آنکھوں و دل کو راحت بھی مل جاتی ہے اور یہ جگہ قدرے اونچائی پر واقع تھی اور آج کل چونکہ سیاح کم ہی ہوتے تھے اس لئے رش نہ ہونے کے برابر تھا یہی روشنی چاہتی تھی کہ وہ فواز احمد سے تجدید عہد کرے اور اس کی محبت کی گہرائی اور سچائی کو بھی جان لے گی۔ وہ گاڑی روک کر محبت بھری نگاہوں سے فواز احمد کی طرف دیکھنے لگی تو وہ آنکھیں کھولتا ہوا بولا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' روشنی اس کے اس اچانک سوال پر ٹپٹا گئی اس کا انداز ایسا تھا کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔ ''کچھ نہیں سر!''

فواز احمد نے قہقہہ لگایا تو وہ بھی ہنسنے لگی کیونکہ اس کا انداز ایسا تھا کہ ایک استاد کے سامنے سہمے ہوئے سٹوڈنٹ سے فوری طور پر جب کوئی بھی جواب نہ بن پڑے تو وہ روہانسا بھی ہو جاتا ہے اور پریشان بھی۔ وہ گاڑی سے اترے تو ہوٹل والے کی باچھیں کھل گئیں کیونکہ شاندار گاڑی کا اس جگہ رکنا اس بات کی علامت تھا کہ آج اس کی بکری میں اضافہ ہونے والا ہے۔

کچی اور بربری زمین پر کرسیاں لگی ہوئی تھیں اکا دکا جوڑے اور شرارتی لڑکوں سے ماحول اچھا بن گیا تھا اور پھر آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں نے ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا سے اردگرد کے درختوں پر رومانس کی چادر تان دی تھی۔ آنکھوں کو بھا جانے والا سبزہ اور قدرتی مناظر دل کو تقویت بھی دے رہے تھے اور بہت کچھ کہنے پر مجبور بھی کر رہے تھے۔ وہ چلتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھے تو ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکا ان کے پاس آیا اور کھانے کو پوچھا۔

''کیا لیں گے؟'' روشنی نے فواز احمد سے پوچھا تو وہ روشنی کی طرف دیکھنے لگا اور بولا۔

''اگر یہی سوال مجھ سے کاتب تقدیر نے کیا ہوتا تو صاف صاف کہہ دیتا کہ روشنی لوں گا'' روشنی اس کے اس انداز پر دل و جان سے قربان ہوگئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''میرے علاوہ۔''

''زندگی کی ہر نعمت ہیچ ہے...... '' وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا کہنے لگا تو روشنی کے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ ''تمہارے علاوہ زندگی کا تصور بھی گناہ ہے روشنی۔''

''صاحب! آپ بیگم صاحبہ سے پوچھ لیں کہ وہ کیا لیں گی؟'' لڑکا بولا تو دونوں اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے اور روشنی کو بیگم صاحبہ کا لفظ اچھا لگا اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کو دیا اور ساتھ ہی مچھلی فرائی کر کے لانے کا آرڈر بھی دے دیا۔ وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اس کو پانچ یا دس روپے سے زیادہ کسی نے آج تک ٹپ نہ دی تھی۔ وہ کام سے پہلے ہی اتنی بھاری ٹپ دیکھ کر پھولے نہ سماتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

''کبھی کبھی زندگی یک دم خوبصورت اور حسین کیوں لگنے لگتی ہے؟'' روشنی نے اردگرد کے لہلہاتے درختوں پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا تو فواز احمد اس کو مزید گھائل کرنے کے لئے اس کی آنکھوں کے راستے دِل میں اترتا ہوا بولا۔

''زندگی ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر چلتی رہتی ہے بس کسی کا ساتھ اس کو حسین اور خوبصورت بنا دیتا ہے۔'' وہ اس کے خوبصورت جواب پر ہلکا سا مسکراتی ہوئی بولی۔

''یہ ساتھ کب تک ہوگا؟'' اس سوال میں ایک خوف بھی چھپا ہوا تھا جسے فواز احمد نے واضح محسوس کیا تھا۔ وہ روشنی کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس کو سہلانے لگا اور بولا۔

''میری طرف سے آخری سانس تک۔''

یک دم اردگرد کے ماحول نے ترنم چھیڑا اور ٹھنڈی ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا روشنی کے وجود کو تر و تازہ کر گیا۔ فواز احمد کی بات اور احساس نے اس کو اندر تک محبت سے شرابور کر دیا تھا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ فواز احمد کے ہاتھ کے اوپر رکھا اور بولی۔

''میں محبت کے اس ہاتھ پر بیعت کرتی ہوں اور عہد کرتی ہوں کہ مرتے دم تک فواز احمد کی ہی رہوں گی۔'' وہ اس ادا پر قربان ہو گیا اور مسکراتا ہوا بولا۔

''بیعت کا مطلب جانتی ہو؟''

''سنا ہے کہ اپنا آپ...... اپنا آپ نہیں رہتا۔'' وہ مخمور لہجے میں بولی تھی۔

''بک جانا۔'' وہ دو حرف ادا کر کے اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ روشنی نے مخمور انداز میں آنکھیں بند کر رکھی تھیں اس کا ہاتھ فواز احمد کے ہاتھ میں تھا اور وہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی بن گئی تھی کیونکہ اس نے فواز احمد کی تحریروں سے محبت کا آغاز کیا تھا اور پھر ایک یادگار سفر نے اسے س کی محبت کی سچائی ماپنے کے لئے موقع فراہم کیا اور وہ فواز احمد سے اس طرح ٹکرا گئی کہ ان جانے میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر سو گئی اور وہی لمحات تھے جو اس کی روح کی گہرائی میں اتر گئے تھے اور دل و جان سے گھائل ہوگئی تھی اس نے رات کو بھی جاگتے میں فواز احمد کے خواب ہی

دیکھے تھے اور تقدیر اس پر مہربان ہوئی تو وہ اس کے پاس اس طرح آ گیا کہ خود تقدیر بھی حیران رہ گئی ہوگی اور آج وہ محبت کی تجدید کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر محبت کی مریدنی بن گئی تھی۔ اس نے فواز احمد کے ہاتھوں پر بیعت کر کے محبت کو عبادت بنا دیا تھا اور وہ ان مسحور کن لمحات کو اپنی آنکھوں کے راستے دل کے نہاں خانوں میں محفوظ کر لینا چاہتی تھی۔ یک دم کمرے کا فلیش روشن ہوا اور وہ دونوں ہی چونک گئے۔ فوٹو گرافر نے اس منظر کو بہت خوبصورتی سے فلمایا تھا اور نہ جانے وہ کب سے ایسے منظر کی تلاش میں تھا وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ فواز احمد نے اسے پیسے ادا کر کے وہ یادگار فوٹو لے لیا تو روشنی نے وہ فوٹو اپنے بیگ میں رکھ لی۔

مچھلی عمدہ طریقے سے بنائی گئی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں ہی لطف اندوز بھی ہو رہے تھے اور مزہ بھی آ رہا تھا۔ روشنی نے بل ادا کیا اور واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔

''اب کہاں چلیں؟'' روشنی نے سوال کیا تو وہ مسکان ہونٹوں پر سجاتا ہوا بولا۔

''تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''تمہارے ساتھ کہیں بھی جانے کو تیار ہوں۔''

''کہیں بھی؟'' خوشگوار حیرت سے بولا تھا۔

''ہاں فواز احمد میں تمہارے ساتھ کہیں بھی جانے کے لئے تیار ہوں صرف تمہاری آواز کی ضرورت ہے۔'' وہ دھیرے سے سر اس کے کندھے پر ٹکاتی ہوئی بولی تو فواز احمد کو وہ منظر یاد آ گیا جب وہ روشنی سے اور وہ اس سے نا آشنا تھے کتنی سچائی اور خلوص تھا ان لمحات میں وہ ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا۔

''روشنی!''

''ہوں۔'' وہ خوابناک لہجے میں بولی۔

''کیا میری محبت اتنی اونچی دیوار پھلانگ سکتی ہے؟''

''محبت تو قلعوں کی چوڑی اور اونچی دیواریں پھلانگنے کا ہی نام ہے۔''

''دولت، جاگیر اور سٹیٹس کے قلعے اتنے مضبوط اور طاقتور ہوتے ہیں کہ ان کی دیواروں میں غربت کے لئے نفرت اور سزا کا کنکریٹ بھرا ہوتا ہے اور غریب کی محبت ہمیشہ محل کی دیواروں میں ہی چنوائی گئی ہے۔''

''تمہیں کس بات کا خوف ہے فواز؟'' وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اپنے کمتر ہونے کا احساس ہے۔ محبت کر کے میں خوفزدہ نہیں ہوں۔'' وہ اپنی شہادت کی انگلی سے اس کے بالوں کی آوارہ لٹ کو اس کے چاند چہرے سے ہٹاتا ہوا بولا تو روشنی نے اس کی انگلی کو چوم لیا اور بولی۔

''محل کی اونچی دیواروں اور محل کے مکینوں سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے وہ سب کچھ بھی چھوڑنا پڑا تو میں تمہاری محبت پر قربان کر دوں گی۔''

''یہ گاڑیاں، محل، آسائش و آرام دولت اور اتنا اعلیٰ سٹیٹس صرف ایک محبت کی خاطر تیاگ دو گی؟'' وہ اسے ڈھب پر لا رہا تھا یا اپنے دل کا چور باہر نکال رہا تھا فواز احمد خود بھی اپنے الفاظ کی اہمیت کا اندازہ نہ کر پایا تھا۔ روشنی نے حیران کن انداز میں فواز احمد کا ہاتھ پکڑا اور اس پر بوسہ دیتی ہوئی بولی۔

''فواز......'' میں نے تم سے محبت کی ہے اور ان ہاتھوں میں ہاتھ دے کر تجدید محبت کی ہے۔ میں اپنی جان ہار کر بھی محبت نبھاؤں گی تم دیکھنا کہ میں محبت کی ایک ایسی مثال قائم کروں گی جس کی کوئی مثال نہ ہوگی۔''

''تم اس وقت جذباتی ہو رہی ہو۔''

''مجھے آزمانا چاہتے ہو؟'' وہ اٹل ارادہ سے بولی تو فواز احمد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سہلاتا ہوا کہنے لگا۔

''محبت کو کم ظرف آزمایا کرتے ہیں۔ میرا ظرف تو سمندر سے بھی وسیع ہے۔ کبھی آزمالینا۔'' روشنی کے دل کی بستی کھل اٹھی تھی۔ ''اور ہاں...... تمہیں یہ سب کچھ چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں باعزت طریقے سے اپناؤں گا۔ خان صاحب کی مرضی سے اور ان کی خوشی سے تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''اگر بابا نہ مانے تو......؟'' وہ شرارتی انداز میں بولی۔

''وہ مانیں گے...... میری محبت سچی اور جذبہ مخلص ہے۔'' وہ پراعتماد انداز میں بولا تھا۔

''اگر میں انکار کر دوں تو؟'' اس کے ہونٹوں پر شرارتی مسکان پھیل گئی تھی۔

''تو...... تو...... فواز احمد اسی دن مر جائے گا۔''

''فواز!'' وہ خوف سے چلائی اور اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ ''ایسی باتیں مت کرو...... میں مر جاؤں گی...... میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔'' وہ اس سے والہانہ لپٹی ہوئی تھی فواز احمد اس کی پشت کو سہلاتا ہوا بولا۔

''روشنی...... اتنی محبت کرتی ہو مجھ سے؟'' یک دم روشنی کو بھی احساس ہوا کہ وہ کہاں اور کس حالت میں ہے وہ فواز احمد سے الگ ہوتی ہوئی نظریں جھکا کر بولی۔

''ہاں...... شاید اس سے بھی زیادہ۔'' ٹھنڈی اور نم ہوا نے موسم خراب ہونے کی اطلاع دی تو فواز احمد بولا۔

''ہمیں گھر چلنا چاہئے، موسم بھی خراب ہو رہا ہے اور کافی دیر بھی ہوگئی ہے۔''

''روشنی نے خود کو سنبھالا اور ٹھنڈی سانس بھرتی ہوئی اثبات میں سر ہلا کر گاڑی کو گیئر میں ڈال کر مین روڈ پر لے آئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جس طرح وہ بے خود ہو کر فواز احمد سے چمٹی تھی اگر اس کی جگہ کوئی کم ظرف ہوتا تو اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھالیتا اور پھر کیا ہوتا؟ روشنی یہ سوچ کر ہی کانپ کر رہ گئی تھی۔

فواز احمد کی عزت اس کے دل میں اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ اسے سب مردوں سے قد آور لگنے لگا تھا اور اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے صاف دل اور صاف نیت نے روشنی کو قائل کر لیا تھا کہ فواز احمد کو اس کے جسم دولت یا کسی اور چیز کا لالچ نہیں ہے بلکہ وہ اس کی روح سے محبت کرتا ہے اور ایسے عظیم لوگ مقدر والوں کو ہی ملا کرتے ہیں اور روشنی خود کو مقدر والی اور خوش نصیب سمجھ رہی تھی۔

گاڑی سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی اور فواز احمد آنکھیں بند کئے ان مسحور کن لمحات میں کھویا ہوا تھا جب روشنی اس سے لپٹ گئی تھی۔ ان لمحات میں خود پر قابو رکھنا بہت ضروری تھا اور فواز احمد سچی محبت کا تاجر تھا لالچ یا ہوس اس کی محبت پر غالب نہ آسکے تھے۔ اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے شیطان کے اس وار کو بڑی مہارت اور خوبی سے سہا تھا اور اسے خود پر فخر تھا کہ اس نے محبت کی معراج کو بلند رکھا تھا۔

○......❖......○

احمد فراز کو خاصی حیرانگی ہوئی تھی جب طیبہ کا موبائل آف مل رہا تھا وہ آفس سے واپسی پر اسے لینے والا تھا اور پروگرام کے مطابق اس نے یونیورسٹی سے واپسی پر کچھ شاپنگ کرنا تھی اور فراز سے رابطہ کر کے اسے جگہ بتانا تھی کہ وہ اسے وہاں سے پک کر لیتا۔ لیکن بار بار نمبر ڈائل کرنے کے باوجود بھی طیبہ کے موبائل کا آف ملنا اُسے کچھ پریشان کر گیا تھا۔ وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا تھا کہ واپس گھر جائے یا طیبہ کا انتظار کرے لیکن الجھن یہی تھی کہ وہ انتظار بھی کس جگہ پر کرے اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ شہر میں کس شاپنگ سینٹر پر طیبہ مل سکتی ہے۔ اگر وہ واپس گھر چلا جائے اور طیبہ خود ہی گھر پہنچ جائے گی۔ وہ یہ بات سوچ کر بھی نفی میں سر ہلا کر رہ گیا کیونکہ وہ گھر میں کہہ کر آیا تھا کہ آفس سے واپسی پر طیبہ کو لیتا آئے گا۔ اگر وہ اکیلا ہی گیا تو چچی شمسہ پریشان بھی ہوں گی اور اسے ڈانٹ بھی پڑے گی۔

اس نے ایک بار پھر ٹرائی کیا لیکن نتیجہ وہی نکلا جواب سے دو گھنٹے پہلے کا تھا۔ اس نے گھر فون کیا تو ریا نے کال ریسیو کی اس نے بھی حیرانگی سے بتایا کہ طیبہ گھر نہیں پہنچی تھی۔ اب تو تشویش والی بات تھی کیونکہ ارباب احمد کو رابطہ کر کے بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گئے تھے لیکن انہوں نے فراز کو تسلی دی کہ طیبہ بچی نہیں ہے وہ خود ہی گھر پہنچ جائے گی۔ موبائل کی چارجنگ ختم ہو گئی ہو گی لیکن خود ارباب احمد بھی پریشان ہو گئے تھے کیونکہ گزشتہ دو تین برسوں سے جو اغوا کی وارداتیں ہو رہی تھیں ان وارداتوں کے تناظر میں اگر سوچا جاتا تو بات روح کو لرزا دینے والی تھی۔

شام تک گھر میں پریشانی اور مختلف وسوسوں نے اپنا گھر بنا لیا تھا۔ طیبہ کی ایک ہی سہیلی تھی اس کے گھر بھی بار بار کال کر کے دیکھ لی تھی۔ شمسہ بیگم تو باقاعدہ رونے لگی تھیں جبکہ دولت بی بی ہاتھ میں تسبیح پکڑے کسی بھی ناگہانی آفت کو ٹالنے کے لئے اللہ کے حضور گڑگڑا رہی تھیں۔ ریا کی پریشانی بھی فطری تھی۔ احمد فراز نے اپنے طور پر یونیورسٹی میں بھی پتہ کروا لیا تھا لیکن چوکیدار اور دوسرا عملہ کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دے پایا تھا۔ ہر اس جگہ فون کر لیا تھا جس جگہ طیبہ کے جانے کا امکان تھا۔ رات کے اندھیرے نے کئی وسوسوں کو جنم دے دیا تھا گھر بھر میں پریشانی اور سوگ کی فضا طاری تھی۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر پریشان اور مختلف قیاس آرائیوں میں مبتلا ہو کر خود سے ہی الجھ رہا تھا۔

''انکل! ہمیں چاہئے کہ پولیس میں رپورٹ کرتے ہیں۔'' احمد فراز کی بات سن کر شمسہ بیگم کے آنسو مزید بہنے لگے۔ ''پولیس؟'' ارباب احمد تھوک نگل کر بولے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جوان بیٹی کا نہ ملنا اور پھر معاملہ پولیس تک پہنچنے کا مطلب تھا کہ طیبہ کی پاکیزہ ذات پر کیچڑ اچھالنا کیونکہ جس طرح کے سوالات تھانے میں ہوں گے وہ سوچ کر ہی کانپ گئے اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''پھر کیا کریں؟'' احمد فراز بھی اس ملک کے فرسودہ قانونی نظام کو اچھی طرح جانتا تھا۔

''ارباب کچھ کریں...... میری معصوم بچی نہ جانے کہاں ہے...... کس حال میں ہو گی؟'' شمسہ بیگم کی سسکیاں الفاظ بن کر ان کے ہونٹوں پر آئیں تو ریا نے انہیں کندھے سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور دلاسہ دینے لگی۔

''ارباب! ہسپتالوں میں پتہ کرواؤ کہیں خدانخواستہ میری بچی کے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔'' دولت بی بی کی روہانسی آواز نے ارباب احمد کو چونکا دیا انہوں نے اپنے جاننے والے ہسپتالوں میں فون کرنا شروع کر دیئے اور احمد فراز بھی اپنے طور پر ہسپتالوں کی ایمرجنسی میں کالز کرنے لگا لیکن طیبہ کا کوئی بھی اتہ پتہ نہ مل رہا تھا۔ شمسہ بیگم کی

آنکھیں رونے کی وجہ سوج گئی تھیں۔

رات ڈھلنے لگی تو عزت دار گھرانے کی بے داغ عزت پر شکوک کے بدنما دھبے گہرے ہونے لگے تھے سیاہ رات نے کئی خدشات اور کئی وسوسوں کو جنم دے کر اس گھر کی چوکھٹ پر بٹھا دیا تھا۔ گھر کے سب افراد میں سے کسی نے بھی کچھ نہ کھایا پیا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ لگی تھی وہ ہر آہٹ پر چونک جاتے اور دروازے کی طرف دیکھتے تھے۔

فجر کے وقت دولت بی بی جائے نماز پر کھڑی ہوئیں تو اپنے برابر میں خالی جاء نماز دیکھ کر ان کے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی طیبہ ان کے برابر میں کھڑے ہو کر نمازیں ادا کیا کرتی تھی۔ وہ سجدہ میں گر پڑیں اور رب تعالیٰ کے حضور گڑگڑانے لگیں۔

''میرے مالک و معبود! تو کل کائنات کا رکھوالا اور مالک ہے۔ میری بچی کی آبرو کی حفاظت کرنا۔ میری بچی کو اپنی امان اور پناہ میں رکھنا۔ میرے اللہ ہم تیرے گناہگار بندے ہیں ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا اس صورت میں نہ دے۔ میرے مالک! ہم پر رحم فرما۔ ہم پر...... اس گھر پر رحم فرما میرے اللہ!''

دولت بی بی کی آہیں اور سسکیاں سن کر ارباب احمد اور عدیم بھی رو پڑے تھے۔ عدیم بھی اپنے طور پر کئی جگہوں میں فون کالز کر چکا تھا اور وہ تو کافی دیر سے شاپنگ سینٹروں میں ہی گھوم رہا تھا۔ اب رات ڈھلی تو وہ گھر آیا تھا پورے گھر میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو طیبہ کے کردار پر شک کرتا۔ وہ اس حادثے کو تقدیر کی چال سمجھ رہے تھے۔ اگر طیبہ اغوا ہو گئی تھی تو پھر اغوا کنندگان نے کوئی بھی رابطہ نہ کیا تھا اور نہ ہی ابھی تک کوئی ڈیمانڈ سامنے آئی تھی۔ یہ معاملہ کچھ اور ہی لگتا تھا۔

ارباب احمد اور احمد فراز متعلقہ تھانے پہنچ گئے تھے۔ کیونکہ شمسہ بیگم کے آنسو اور دل کو چیرنے والی باتیں ان سے برداشت نہ ہو رہی تھیں۔ احمد فراز کی بطور صحافی ملک میں اچھی خاصی پہچان تھی۔ وہ انٹرنیشنل لیول پر بھی ایک اچھا مقام رکھتا تھا۔ جبکہ ارباب احمد بھی اس ملک کے نامور نیورو سرجن ہونے کی بناء پر اعلیٰ حلقوں میں جانے جاتے تھے۔ انسپکٹر محمد فیاض نے پوری بات سنی اور بولا۔

''آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ملک میں اغوا کی کتنی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی طالبات کو اغوا کر کے دوسرے ملک میں فروخت کیا جا رہا تھا۔'' اس انکشاف کا علم تو احمد فراز کو پہلے سے ہی تھا اور وہ اس موضوع پر کئی پروگرام بھی کر چکا تھا لیکن طیبہ کے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہو گا اس کا دل ماننے پر تیار نہ تھا یہ اس کی دلی وابستگی تھی جو کسی بھی منفی سوچ کو طیبہ کی پاکیزہ ذات کے ساتھ نہ جڑنے دیتی تھی۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے طیبہ کو چاہا تھا چاہت کو محبت اور محبت کو عبادت کو درجہ دیا گیا تھا تبھی جا کر طیبہ اس کی ہوئی تھی اور وہ تقدیر کے بے رحم قہقہے پر اس معصوم کی مانند کھڑا تھا جس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو اور اس کے پاس مزید کھلونا خریدنے کے لئے کوئی بھی پیسہ نہ ہو۔

''آپ یونیورسٹی سے اگر تفتیش کریں تو میرا خیال ہے کہ کوئی نہ کوئی سراغ مل سکتا ہے۔'' ارباب احمد بولے تو انسپکٹر محمد فیاض کہنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں قانون کا وہ مہرہ ہوں جس پر کئی شاہوں کے ہاتھ ہیں۔ ہماری ڈور بڑے بڑے عہدہ والوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ہم اپنی مرضی سے کوئی بھی کام کرنا چاہیں تو ہمارے دھاگے کھینچ دیئے جاتے ہیں۔''

''تو پھر اس وردی کو پہننے کا اختیار بھی آپ کو نہیں ہونا چاہئے۔'' ارباب احمد غصے سے چیخ پڑے تو احمد فراز نے انہیں ریلیکس کر دیا۔

''میں آپ کے جذبات سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اس وقت گہرے صدمے سے دوچار ہیں۔'' محمد فیاض پُرسکون انداز میں بات کو آگے بڑھاتا ہوا بولا۔''میری مانیں تو اپنی آواز کو دھیما رکھیں کیونکہ جوان بیٹی کا معاملہ ہے۔ میں بھی بیٹیوں والا ہوں۔ آپ کو پرخلوص مشورہ دینا چاہتا ہوں۔''

''آئی ایم سوری انسپکٹر صاحب!'' ڈاکٹر ارباب احمد کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ کس جگہ پر ہیں اور معاملہ کیا ہے۔ وہ خود کو پُرسکون کرتے ہوئے بولے تو انسپکٹر محمد فیاض ایک سانس خارج کرتا ہوا بولا۔

''آپ اس معاملے کو پولیس تک نہ لے جائیں کیونکہ آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیسے کیسے سوالات اور کیسی کیسی غلیظ باتیں آپ کو سننا پڑیں گی کیونکہ بیٹی کا معاملہ ہے۔''

''تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہئے انسپکٹر صاحب!'' احمد فراز پوچھنے لگا۔''آپ کا مطلب ہے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟'' انسپکٹر محمد فیاض نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔

''میں آپ کو ایک آدمی کا پتہ بتاتا ہوں آپ اس سے مل لیں۔ میرے خیال میں آپ کی پریشانی کا حل اس کے پاس ضرور ہو گا۔''

''اب آپ ہمیں عاملوں کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے؟'' ارباب احمد تیکھے انداز میں بولے تو وہ ہنسنے لگا۔

''وہ عامل نہیں ہے بلکہ بڑے بڑے عامل اس کا پانی بھرتے ہیں۔'' ارباب احمد اور احمد فراز کو وہ کھسکا ہوا لگنے لگا تھا۔''اس کا نام تصور خان ہے وہ ایک نوجوان ہے اور ہمارے لئے اکثر جاسوسی کرتا ہے۔ اس کی پٹاری میں بڑے بڑے ناگ ہر وقت قید رہتے ہیں۔ وہ اتنا چالاک اور پھرتیلا ہے کہ ہر تھانے اور ہر علاقے کی رپورٹ پہلے اس کے پاس آتی ہے۔ بڑے بڑے صحافی اور نامور اخبارات والے بھی اس کے مرہون منت ہیں کیونکہ اس کی اطلاعات پکی ہوتی ہیں ہنڈرڈ پرسنٹ۔'' محمد فیاض نے ایک کارڈ نکالا اور اس کے پیچھے کچھ لکھنے لگا۔

''یہ لیں، آپ کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا مشورہ مانیں تو آپ ایک بار تصور سے ضرور مل لیں۔''

انسپکٹر نے کارڈ احمد فراز کی طرف بڑھا دیا ارباب احمد بے دل سے ہو کر کرسی سے اٹھے تو انسپکٹر محمد فیاض بولا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں بھی بیٹیوں والا ہوں۔ آپ کے دکھ کو سمجھتے ہوئے اتنا ہی کہوں گا کہ جوان بیٹی گھر واپس نہ آئے تو اس کو ڈھونڈنے کے لئے شور نہیں کرنا چاہئے۔''

اس کی بات سن کر احمد فراز نے اس سے ہاتھ ملایا اور کارڈ پکڑتے ہوئے ارباب احمد کے ساتھ تھانے سے باہر نکل آیا۔''ہمیں ایک بار اس سے ضرور مل لینا چاہئے۔'' احمد فراز نے گاڑی مین روڈ پر دوڑاتے ہوئے کہا تو ارباب احمد نے ستے ہوئے چہرے سے اس کی طرف دیکھا اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتے ان کے موبائل پر شمسہ کی کال آنے لگی کئی بار مس ہوئی تو احمد فراز بولا۔

''آپ آنٹی کی کال ریسیو کیوں نہیں کرتے؟''

''کیا کہوں اس سے؟'' وہ بے دلی سے بولے۔

''کیا پتہ طیبہ کے بارے میں ان کے پاس کوئی اطلاع ہو۔ یا پھر اغوا کرنے والوں کا فون ان کو آیا ہو۔ آپ کو کال ریسیو کرنا چاہئے پلیز۔'' احمد فراز کی بات میں وزن محسوس کرتے ہوئے ارباب احمد نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے شمسہ بیگم کی تڑپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ارباب...... ارباب میری بچی کا کچھ پتہ چلا؟'' ان کی آواز اور لہجے کی تڑپ نے ارباب احمد کو بھی تڑپا دیا تھا۔ انہوں نے اپنے سامنے سٹریچر پر پڑے ہوئے دلدوز کیس دیکھے تھے لیکن ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کو اس طرح ڈیل کیا تھا کہ ان کی آنکھ کبھی بھی نم نہ ہوئی تھی۔ اپنے دماغ کو حاضر رکھتے ہوئے انہوں نے ہر کیس میں کامیابی حاصل کی تھی لیکن یہ معاملہ نہ تو ایکسیڈنٹ کا تھا اور نہ ہی کسی مریض کے آپریشن کا تھا۔ ان کی ذات سے جڑی ہوئی طیبہ کا معاملہ تھا جو ان کے خاندان کا اہم ترین حصہ تھی۔ گھر بھر کی لاڈلی اور بڑی بیٹی کا معاملہ تھا۔ پورے خاندان کی عزت کا معاملہ تھا۔ بس یہی عزت اور پیارڈاکٹر ارباب احمد کو رلا گیا۔ وہ کوئی بھی بات نہ کہہ سکے اور موبائل احمد فراز کی طرف بڑھا دیا۔ احمد فراز ان کی حالت کو بہتر سمجھتا تھا وہ جانتا تھا کہ شمسہ بیگم کے پاس طیبہ کی بابت کوئی معلومات نہیں ہے بلکہ ان کے دل کو تڑپا دینے والے سوالات کے جوابات اس طرح دینے ہوں گے کہ ان کی تسلی ہو سکے۔

''آپ فکر نہ کریں ہم پتہ کر رہے ہیں۔'' اس نے اپنے تئیں چچی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف سے سسکیوں اور آہوں میں بھیگا ہوا ایک اور سوال تیر بن کر احمد فراز کے دل میں کھلتا گیا۔

''تم تو جانتے ہو فراز کہ میری بچی ایسی نہیں ہے؟'' موبائل پر تو رابطہ کٹ گیا لیکن یہ فقرہ احمد فراز کو بہت کچھ سمجھا گیا تھا کہ طیبہ کی پاکیزگی پر کسی بھی قسم کا شک نہ کرنا وہ نام کی طرح پاکیزہ اور معصوم ہے۔ وہ اپنی مرضی سے کہیں بھی نہیں گئی بلکہ اس کے ساتھ کوئی انہونی ہو گئی ہے۔ شمسہ بیگم کی آہیں یہ پیغام بھی دے رہی تھیں کہ طیبہ اپنی معصومیت کی وجہ سے کسی ناگہانی مصیبت کا شکار بن گئی ہے۔

شادی کی تاریخ بھی نزدیک آ رہی تھی دو تین روز بعد گھر میں مہمان آنا شروع ہو جانا تھے ارباب احمد یہی سوچ رہے تھے کہ کس کس رشتہ دار کو کیا جواب دیں گے کون کون سی جھوٹی دلیلیں دے دے کر ان کے منہ بند کرنے کی کوششیں کریں گے۔ ان کے دل و دماغ میں بسنے والے شک کے کیڑے کو کلبلانے سے کس طرح روکیں گے۔ وہ انہی باتوں کو لے کر کافی ڈسٹرب ہو گئے تھے۔

دو تین جگہوں سے پوچھنے پر وہ تصور خان کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے تھے۔ یہ ایک پوش ایریا تھا جس میں شاندار کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں اور ان کی تعمیر کے جدید انداز بتا رہے تھے کہ ان کے مکین بھی آسودہ حال اور خوش و خرم زندگی کے مزے لے رہے ہیں۔ احمد فراز نے کوٹھی کے نمبر پڑھتے ہوئے گاڑی روک دی اور ارباب احمد کو اشارہ کیا کہ وہ بھی باہر آ ئیں۔ ارباب احمد نہ چاہتے ہوئے بھی مردہ دل کے ساتھ گاڑی سے باہر نکلے تو احمد فراز نے گیٹ کے پاس لگے ہوئے ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی دروازہ کھلا اور ایک نوجوان کا چہرہ بمعہ وجود برآمد ہوا وہ شکل

وصورت سے ہی احمق نظر آ رہا تھا لیکن اس کی پیشانی بتا رہی تھی کہ وہ بلا کا ذہین ہے اس کے چہرے پر بڑی بڑی گول آنکھیں اور پھر تیلے جسم نے اس کی شخصیت پر خاص ہی چادر چڑھا رکھی تھی اور یک دم ان کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی چھا گئی کہ وہ کوئی مفکر لگنے لگا۔

اسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ کر ڈاکٹر ارباب احمد خاصے متاثر ہوئے وہ بولے۔

''ہمیں تصور خان صاحب سے ملنا ہے۔''

''خان صاحب!'' وہ مسکرانے لگا۔ ''یہ لفظ کوئی غیر مناسب نہیں ہے؟'' اس کے سوال کی ان دونوں کو سمجھ نہ آئی تو وہ اپنی بات کی وضاحت خود ہی کرتا ہوا کہنے لگا۔ ''اگر تصور خان ہی کہہ دیں تو چلیں مناسب لگتا ہے۔''

وہ گیٹ سے ایک طرف ہو گیا اس کا مطلب تھا کہ تصور خان صاحب گھر پر ہی تھے وہ اس نوجوان کی سربراہی میں چلتے ہوئے ایک لان کو کراس کر کے ایک شاندار ڈرائنگ روم میں پہنچے تو وہ نوجوان ان کو صوفوں پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود ان کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا تو احمد فراز اور ارباب احمد کو خاصی حیرانگی ہوئی۔

''میں ہی تصور خان ہوں کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' ارباب احمد کو وہ کوئی جاسوس لگا تھا جو یک دم اپنے چہرے اور تاثرات پر قابو رکھنے کا ماہر تھا وہ انتہائی سنجیدہ لگ رہا تھا۔

احمد فراز نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو وہ کارڈ کو غور سے دیکھتے ہوئے ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ اپنی پریشانی بتائیں میں کوشش کروں گا کہ اس کا حل ڈھونڈ سکوں۔''

''کوشش نہیں جناب...... بلکہ حل۔'' احمد فراز بولا تو وہ ہونٹوں پر مسکان سجاتا ہوا بولا۔

''میں کوئی عامل یا فقیر نہیں ہوں جس کے پاس موکلوں کی فوج ہوتی ہے..... ہاں البتہ میری کوشش بیکار نہیں جاتی اللہ تعالیٰ اپنا کرم کر کے میری عزت رکھ لیتا ہے۔''

ارباب احمد اس کو تمام معاملہ بتانے لگے وہ غور سے سنتا رہا۔ اس دوران چائے بھی آ گئی تھی اس نے جانے کب ملازم کو چائے کا کہہ دیا تھا لیکن اس کی پھرتی اور چستی کو دیکھتے ہوئے اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ وہ اگلے آنے والے لمحات میں کیا کہہ جائے یا کیا کر جائے۔ اس نے تحمل اور توجہ سے پوری بات سنی اور اپنی طرف سے کئی سوالات بھی کیے جو کہ احمد فراز اور ارباب احمد کے لئے خاصے تکلیف دہ تھے۔ لیکن اس کی باتوں کے جوابات دینا ضروری بھی تھا اور اہم بھی تھا۔

''دیکھیں ڈاکٹر صاحب! آپ کی بیٹی آپ کی عزت ہے اور میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ اور آپ کی فیملی اس وقت کس کرب سے گزر رہی ہے۔'' وہ ایک بار پھر کوئی مفکر لگنے لگا تھا۔ اس کے لہجے اور الفاظ سے معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ یہ وہی ہے جو پہلی ہی نظر میں احمق نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک گہرا سانس لیتا ہوا پھر گویا ہوا۔

''آج کل کالجز اور یونیورسٹیز سے نوجوان لڑکیوں کا اغوا معمول بن گیا ہے..... خدا نہ کرے آپ کے ساتھ بھی کوئی حادثہ ہو گیا ہو..... مسٹر فراز!'' وہ احمد فراز سے مخاطب ہوتا ہوا بولا۔ ''آپ میرے ساتھ رابطے میں رہیں گے۔ میں چند دنوں میں ہی پتہ چلا لوں گا کہ مس ارباب کے ساتھ کیا انہونی ہوئی ہے۔ ان شاء اللہ۔'' ''آپ کی کوئی

فیس؟'' ارباب احمد لرزتے لہجے سے بولے تو وہ قہقہہ لگا کر اپنے وجود اور شخصیت پر سے مفکری کی چڑھی ہوئی چادر کو اتارتا ہوا بولا۔

''پچاس لاکھ۔'' ارباب احمد اور احمد فراز کے ہاتھوں کے طوطے حقیقت میں اڑ گئے تھے۔ وہ دونوں ہی منہ کھولے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے تو وہ اپنا سنجیدہ انداز اپناتا ہوا بولا۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ عزت کا معاملہ ہے اور میں عزت دار کی عزت سے کبھی بھی نہیں کھیلا کیونکہ میں بھی عزت دار ہوں اور عزت داروں میں ہی اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ اور آپ کی عزت کو اپنی ہی عزت سمجھتے ہوئے یہ کام فری میں کروں گا...... آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی بیٹی عزت و آبرو سے گھر آ جائے پھر بعد میں جو بھی ''خدمت'' کرنا ہو گی کر دینا...... کیش میں۔'' آخری دو لفظ ادا کرتے ہوئے وہ پھر احمق لگنے لگا تھا۔

احمد فراز اور ارباب احمد تھکے ہوئے انداز میں گھر میں داخل ہوئے تھے ان کا انداز ایسا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ ہار کر آئے ہوں اور بمشکل ہی خود کو بچا پائے ہوں۔ انداز سے اور توقع کے مطابق ان کو سب لوگ لان میں ہی مل گئے تھے۔ شمسہ بیگم بھاگنے والے انداز میں ارباب احمد کی طرف بڑھیں تھیں۔

''میری بچی کو نہیں لائے ارباب؟''

''ارباب احمد ان کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریزاں تھے وہ نظریں چرا گئے اور فراز سے مخاطب ہوئے۔

''فراز! ٹی وی آن کرو اور دیکھو کوئی اغوا وغیرہ کی خبر ہے تو پھر اعلیٰ سطح پر رابطہ کرتے ہیں۔'' احمد فراز اندر کی جانب بڑھا تو دولت بی بی، ریبا، عدیم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ اب لان میں شمسہ اور ارباب ہی رہ گئے تھے۔ ارباب احمد شمسہ کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے ان کی پشت سہلانے لگے اور بولے۔

''اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ ہماری بیٹی جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔''

''اب تو دعائیں ہی ایک آسرا ہیں ارباب!'' وہ روتی ہوئی بولیں۔ ''میری بیٹی ..... پھول جیسی بچی کہاں ہو گی کس حال میں ہو گی؟...... اسے تو دنیاداری کی بالکل بھی سمجھ نہیں ہے۔ ارباب! وہ ان درندوں کے جنگل میں اپنا آپ کیسے بچا پائے گی؟''

''اللہ بہت بڑا ہے۔ بس تم دعا کرو۔'' ارباب احمد نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

''اس کی شادی کے دن قریب آ رہے ہیں۔ ہم رشتہ داروں کو کیا جواب دیں گے۔'' شمسہ بیگم کے آنسوؤں نے جھڑی لگا دی تھی۔ ''ہر کوئی میری معصوم بچی پر کیچڑ اچھالے گا...... اس کی پاکیزگی کو اپنے اندازے اور الفاظ سے داغدار کرنے کی کوشش کرے گا...... میں کیا کروں ارباب ..... میں کیا کروں؟'' اب تو شمسہ بیگم کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

ارباب احمد ان کو دلاسہ دیتے ہوئے اندر لائے تو ٹی وی چینلوں پر دلدوز خبر ان کی منتظر تھی۔ ایک بار پھر اغوا کاروں نے بخوبی اپنا کام کر دکھایا تھا اور یونیورسٹی سے تین طالبات کو اغوا کر لیا گیا تھا جن میں طیبہ ارباب بھی شامل تھی۔ سڑکوں پر طلباء و طالبات نے ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ یونیورسٹی میں خاصی توڑ پھوڑ کی گئی تھی اور کلرک کے دفتر کو نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ یونیورسٹی غیر معینہ مدت کے لئے بند ہو گئی تھی۔

طالبات کے والدین کے ستے ہوئے چہرے اور روتی ہوئی آنکھوں کو بار بار دکھایا جا رہا تھا۔ وہ یونیورسٹی انتظامیہ کو اس پوری واردات میں ملوث قرار دے رہے تھے۔ اور یہ بات ارباب فیملی کے دل کو بھی لگتی تھی کیونکہ آج تک جتنی بھی وارداتیں ہوئی تھیں ان میں سے زیادہ تر اسی یونیورسٹی میں ہوئی تھیں قانون بنانے والے ادارے حرکت میں آ گئے تھے یونیورسٹی کے کلرک، چوکیدار اور مالیوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور یہ محض ان والدین کی اشک شوئی کے لئے ہی کیا گیا تھا کیونکہ ابھی تک کسی بھی بڑی مچھلی کو قانون کے کانٹے میں نہ پھانسا گیا تھا۔

میڈیا متعلقہ اداروں اور پولیس افسران کے ''پھوکے'' بیان نشر کر رہا تھا۔

وہ رات بھی قیامت کی رات بن گئی تھی اک اک لمحہ صدی کی صورت میں گزر رہا تھا۔ رات تین بجے ہوں گے کہ ارباب احمد کے موبائل پر بیل ہونے لگی۔ گھر بھر کے کان کسی بھی اچھی خبر کو سننے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

''السلام علیکم ڈاکٹر صاحب!'' دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز ابھری تو اداس اور پریشان ارباب احمد غمگین لہجے میں بولے۔''وعلیکم السلام!''

''تصور خان بات کر رہا ہوں۔'' یہ نام سن کر ارباب احمد چونک پڑے اور ان کی حسیات پوری طرح بیدار ہو گئیں۔ سبھی لوگ ان کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

''جی جی...... کہئے خان صاحب! میں سن رہا ہوں۔'' ارباب احمد کا لہجہ یک دم تیز ہو گیا تھا کیونکہ تصور خان کا رات کے اس پہر فون کرنا یقیناً کوئی ایسی خبر ہو گی جو اس نے خان کو سونے نہ دیا تھا۔

''ارباب صاحب! آپ کے لئے بری خبر ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا تو ارباب احمد پریشانی سے سب کی طرف دیکھ کر نظریں چرا گئے اور بے دلی سے بولے۔

''جو بھی ہے کہہ دیں...... میں ذہنی طور پر تیار ہوں۔'' سب کے دل لرز گئے تھے۔ شمسہ بیگم تو کانپنے لگی تھیں۔ ریبا نے ان کو سہارا دیا ہوا تھا دولت بی بی کی آنکھیں برسات بن چکی تھیں۔ احمد فراز بھی ستے ہوئے چہرے سے ارباب احمد کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ عدیم احمد بوجھل آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔''ڈاکٹر صاحب! میں نے کافی تفتیش کے بعد پتہ چلایا ہے کہ آپ کی بیٹی کو یونیورسٹی سے اغوا کر لیا گیا ہے۔'' تصور خان کی آواز نے ڈاکٹر ارباب احمد کی سماعتوں میں سیسہ انڈیلنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آواز دوبارہ ابھری۔''یہ گروہ بہت بڑا ہے اور کافی اثر و رسوخ بھی رکھتا ہے۔ یہ لڑکیوں کو اغوا کر کے ہمسایہ ملک کی ہیرا منڈیوں میں فروخت کرتے ہیں۔'' ارباب احمد اپنا دل پکڑ کر رہ گئے تھے۔

''کیا کہہ رہا ہے، کون ہے...... آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟'' شمسہ بیگم چیخنے چلانے لگی تو ارباب احمد نے ان کی طرف نم آنکھوں سے دیکھا اور پھر موبائل کے سپیکر میں ''ہوں...... میں سن رہا ہوں'' کے الفاظ ادا کر کے تصور خان کی بات سے سننے لگے جو کہہ رہا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! میری ناقص معلومات کے مطابق آپ کی بیٹی کو بھی اغوا کاروں نے وہاں فروخت کر دیا ہے۔ وہ بہت بڑا ملک ہے وہاں ایسی منڈیاں لگتی رہتی ہیں۔ آپ ایسا کریں صبح مجھ سے لازمی مل لیں۔'' یہ کہہ کر تصور خان نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ارباب احمد نے ریبا کی طرف دیکھا اور پھر عدیم اور ریبا سے مخاطب ہوئے۔

''بیٹا! تم بہن بھائی آرام کرلو..... تمہاری طبیعت نہ خراب ہو جائے۔'' پڑھے لکھے اور باشعور بچے سمجھ گئے کہ کوئی بات ایسی ہے جو ان کے سامنے کرنے والی نہیں ہے۔ وہ سب کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے اپنے کمروں کی جانب چلے گئے۔

''کیا کہا اس نے..... کس کا فون تھا؟'' شمسہ بیگم کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

''تصور خان کا فون تھا۔'' احمد فراز یہ سن کر چونکا اور آگے بڑھتا ہوا پوچھنے لگا۔

''کیا کہہ رہا تھا انکل؟''

اس نے جو کچھ کہا ہے..... دعا کرو کہ جھوٹ ہو۔'' ارباب احمد دھڑام سے صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گئے۔

''ارباب پتر..... کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہو..... مجھ سے صبر نہیں ہوتا..... میرے بچے اب بتا بھی دو..... کیا ہوا ہے میری بیٹی کے ساتھ؟'' دولت بی بی کے صبر کا دامن بھی چھوٹ گیا تھا۔

ارباب احمد نے ایک ٹھنڈی اور غمگین سانس خارج کی اور تصور خان کی بات بتانے لگے۔

دولت بی بی اور شمسہ بیگم تو آنسوؤں کی جھڑی میں اللہ تعالیٰ سے اپنے کسی گناہ کی معافی مانگنے لگیں جبکہ احمد فراز حیرانگی اور پریشانی سے ارباب احمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جن کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ان کے گالوں پر لکیریں بنا رہے تھے۔

O..... ❖ .....O

انیل شر ماہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا تھا اس نے اپنے آس پاس آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا تو وہ اپنے ہی کمرے میں تھا وہ اٹھ کر گیت کے مجسموں کی طرف بڑھا اور غور سے ان کو دیکھنے لگا۔ پھر ایک مجسمہ کو ہاتھ لگا کر دیکھنے لگا۔'' بے جان ہوا بھی تک؟'' وہ بے دلی سے بڑبڑایا۔'' تم تو ابھی ابھی میرے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔'' وہ گیت کے مجسمے سے باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ اپنے اردگرد بھی دیکھ لیتا جیسے کہ اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ وہ اپنے ہی کمرے میں ہے۔

''گیت..... کہاں ہو تم؟ ابھی تو تم یہیں تھیں..... ابھی ابھی تو تم نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ ابھی تو تم مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ ابھی تو عہد و پیمان ہو رہے تھے۔ ابھی تو تم سیاہ سکارف اوڑھے چاند جیسے مکھڑے کو میرے سامنے ہی لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ کہاں چلی گئی ہو گیت۔ مجھے ایسے مت تڑپاؤ۔ مجھے ایسے مت الجھاؤ۔ مجھے ایسے مت ستاؤ۔ مجھے اپنی دید کے لئے ایسے مت ترساؤ۔ ایک بار تو آ جاؤ۔ اک بار تو چلی آؤ۔ خواب کو سچ کر دکھاؤ۔ آؤ گیت..... اک بار تو میرے ہاتھوں کو تھام کر ان سب کو بتا دو کہ تم میرا خواب نہیں حقیقت ہو۔ تم میری محبت کی پاکیزگی ہو۔ تم میرے عشق کی وہ سچائی ہو جسے یہ زمانہ چاہ کر بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ چلی آؤ گیت..... چلی آؤ۔ تمہیں میری چاہت کا واسطہ تمہیں محبت کی پاکیزگی کا واسطہ تمہیں تمہاری خوبصورتی کا واسطہ..... چلی آؤ..... چلی آؤ۔'' وہ اس طرح بول رہا تھا کہ اس کے منہ سے رالیں بہہ بہہ کر اس کے کپڑوں کو گندا کر رہی تھیں۔ اس کے آنسو بہہ بہہ کر اس کے گالوں پر انکھیلیاں کرتے ہوئے قمیص کے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ گرنے والے انداز میں گیت کے مجسمہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کا جھکا ہوا سر اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ گیت

کو سجدہ کر رہا ہے۔

''پتھروں کو مت پوجو یہی رو رہا ہے کوئی
کہ اس زعم میں خدا ہو رہا ہے کوئی''

وہ اس آواز کو سن کر چونک کر اٹھا اس کی نظریں دروازے کی طرف گئیں تو وہاں پری اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے مختصر لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ انیل شرما اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا اور وہ اپنی خاص اداؤں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔ اس کے بدن کی خوشبو انیل شرما کو مسحور کرنے لگی تھی۔ پری نے اپنا ہاتھ انیل شرما کے منہ پر پھیرنے کے لئے اپنے بدن کو نیچے جھکایا تو اعضاء کی شاعری نے اسے داد دینے پر مجبور کر دیا۔

''پری...... پری...... اپنی خوبصورتی کے تمام ہتھیار لے کر میرا صبر آزمانے آئی ہو؟''

پری اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کے آنسو صاف کرتی ہوئی بولی۔

''پیار سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے انیل شرما! اور میرا پیار عبادت کی طرح پاکیزہ ہے۔'' وہ ہنسا اور بولا۔

''تو پھر اس پیار کو عبادت ہی رہنے دیتی...... کیوں اس طرح بے بہروپ کر کے کسی کی پوجا میں خلل ڈال رہی ہو؟''

پری نے اپنے ہونٹ اس کی آنکھوں سے لگا دیئے اور کہنے لگی۔

''میرے دل میں بھی ایک صحرا ہے جو مدتوں سے پیاسا ہے۔ مجھے ان آنسوؤں کو جی بھر کر پی لینے دو۔ انیل! میری ترستی بلکتی روح کی تسکین شاید ایسے ہی ہو جائے...... ان آنسوؤں کو مجھے پی لینے دو۔'' اس نے انیل شرما کا سر اپنے دھڑکتے سینے سے لگا لیا تھا۔ پری کا انداز ایسا تھا کہ اسے آج سکون مل گیا تھا۔ وہ پُرسکون سانسیں لے رہی تھی اور اس کے سینے کی دھڑکن انیل شرما کو بے تاب و بے قرار کر رہی تھی۔ انیل شرما کی آنکھیں بند تھیں مگر ذہن جاگ رہا تھا۔ وہ تڑپ کر پری سے الگ ہوا اور گیت کے دوسرے مجسمے کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ پری اسے حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ پری کا انداز ایسا تھا کہ جیسے مدتوں کے بعد ہاتھ آنے والی سنہری مچھلی اس کے ہاتھ سے اس وقت پھسل گئی جب وہ اسے پانی سے نکال کر اپنی مٹھی میں قید کرنے ہی والی تھی۔ پری کی بے ترتیب اور بے چین دھڑکنیں اس کے اعضاء کی شاعری کر رہی تھیں مگر انیل نے نظریں جھکا لیں اور بولا۔

''پلیز چلی جاؤ پری...... میری پوجا میں دخل اندازی مت کرو۔''

''اور جو میں تمہاری پوجا کرتی ہوں؟'' وہ دکھ سے بولی اور ایک قدم اور آگے بڑھ گئی۔

''انسان کا انسان کو پوجنا جرم ہی نہیں گناہ بھی ہے۔'' اس نے گیت کی طرف دیکھا جو خاموش اور بے جان مجسمے کی صورت میں اس کے سر پر کھڑی تھی۔

''رام...... بھی تو انسان تھے۔ پھر لوگ ان کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟''

''بھگوان کے جتنے بھی مرضی روپ ہوں...... جتنے بھی چاہے نام ہوں، میں سب کی قدر اور عزت کرتا ہوں

لیکن پوجا صرف اس گیت کی کرتا ہوں۔"

"اگر یہ انسان ہے تو پھر تم بھی جرم دار ہو، گناہگار ہو...... مذہب سے بغاوت کر رہے ہو۔" پری کی آواز میں جو دلیل تھی اس نے انیل شرما کو ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"پوجا کا اپنا اپنا انداز ہے پری! کوئی برہنہ ہو کر اپنے بھگوان کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کوئی اس کے قدموں میں سجدہ کر کے اپنا فرض پورا کرنے میں لگا ہوا ہے۔"

"یہ روپ میں نے تمہارے لئے بھرا ہے انیل!" وہ کرب سے بولی۔

"میں نے تو کبھی ایسی خواہش نہیں کی۔"

"لیکن میں تمہاری روح کی پیاس کو اپنے حسن کے آب سے سیراب کرنے کا جذبہ رکھتی ہوں۔"

"انیل شرما کی اگر پیاسی روح بدن کی بھوکی ہوتی تو وہ بہت پہلے اپنے ارمانوں کی تسکین کر لیتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر مجھ سے پیار کرتی ہو تو آئندہ کبھی بھی اس پیار کو گالی بنانے کی کوشش میں ننگی مت ہونا۔"

پری کے دل کو گھائل کرنے والے الفاظ انیل کی زبان سے ادا ہوئے تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں تمہیں اپنا بھگوان سمجھتی ہوں انیل...... اور مجھے انتہائی دکھ ہے کہ میں آج ایک بار پھر اپنی پوجا کے مندر سے خالی ہاتھ لوٹ رہی ہوں۔" وہ واپس جانے لگی تو انیل شرما بولا۔

"کیا تمہارے لئے اتنا کافی نہیں کہ تمہارا بھگوان تم سے باتیں کرتا ہے؟"

پری تڑپ کر واپس مڑی اور پھر اس کے پاس آ کر بولی۔

"مجھے باتیں نہیں...... اپنی محبت کا جواب محبت میں چاہئے۔"

"بھگوان سے تو پاکیزہ محبت کی جاتی ہے پری! اس میں جسمانی اور نفسانی خواہش کہاں سے آ گئی؟"

"تو پھر میری طرف محبت سے کیوں نہیں دیکھتے۔ میری خوبصورتی کی تعریف کیوں نہیں کرتے۔ میری محبت کی عزت اور احترام کیوں نہیں کرتے۔ تم کیسے بھگوان ہو...... تم کیسے بھگوان ہو۔" وہ آگے بڑھ کر انیل کی قمیص کے گریبان کو جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔

"تمہارے محبت کے مندر سے ایک داسی بے مراد اور ناکام لوٹ رہی ہے کیا تمہیں اپنے بھگوان ہونے پر شرم نہیں آتی؟ کیا تمہیں یہ بھی احساس نہیں کہ ناکام لوٹنے والی داسیاں مر جاتی ہیں؟ کیا یہ بھی اندازہ نہیں کہ مندروں میں بھگوانوں کی پوجا صرف اس لئے ہی ہوتی ہے کہ وہ کسی کو نامراد و ناکام نہیں لوٹاتے۔" وہ ایک بار پھر اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا سر انیل کی گود میں جھکا ہوا تھا۔

"مجھے میری محبت لوٹا دو انیل...... ورنہ میں مر جاؤں گی...... مر جاؤں گی۔ اور یاد رکھنا یہ پورے ہندوستان میں واحد موت ہو گی جس کا قاتل بھگوان ہو گا۔" وہ اٹھ کر واپس چلی گئی اور انیل شرما اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر پری کے دروازے سے نکل جانے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے گیت کی طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھرتا ہوا بولا۔

''دیکھ لو گیت...... یہ کیا کہہ گئی ہے؟ اگر اسے اس کی محبت نہ ملی تو یہ مر جائے گی......اور اگر مجھے تم نہ ملی تو میرا کیا ہو گا؟'' وہ گیت کو پکڑتا ہوا اٹھا اور سامنے کھڑا ہو گیا۔

''میں ان گلیوں کی خاک چھان لوں گا۔ ان بازاروں اور راہوں کا کوڑا بن کر جی لوں گا۔ اپنا ہر ایک آنسو بہا دوں گا، آخری سانس تک۔ خون کی آخری بوند تک...... دھڑکنوں کی آخری دھڑکن تک بھی تمہارا انتظار کروں گا...... میں مروں گا نہیں۔ کبھی بھی موت مجھے اس سے پہلے نہیں چھو سکتی کہ میں اپنے بھگوان کو دیکھ نہ لوں...... تمہیں چھو نہ لوں۔ تمہیں پا نہ لوں...... تمہیں حاصل کرنا تمہاری پوجا کرنا ہی میری زندگی ہے گیت۔ میرے زندہ رہنے کا مقصد میری اس زندگی کا مقصد اور دل کی تمنا یہی ہے کہ صرف ایک بار......صرف ایک بار تم حقیقت میں میرے سامنے اس طرح آؤ کہ تمہاری پلکیں ہل رہی ہوں۔ تمہاری آنکھیں مجھ سے باتیں کر رہی ہوں۔ تمہارے ہونٹوں سے جھڑنے والے پھولوں سے یہ کمرہ مہک جائے۔ تمہارے بدن کی خوشبو میرے اس مے کدے پر حاوی ہو جائے۔'' اس کی آواز میں جوش اور تیزی آ گئی تھی۔ ''میں تمہارا انتظار کروں گا گیت قیامت تک، سانسوں کی ڈور ٹوٹنے تک، اس کائنات کے آخری انسان کے ختم ہونے تک تمہارا انتظار کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا عشق سچا ہے اور تم ضرور آؤ گی۔'' وہ بے سُدھ ہو کر گیت کے قدموں میں گر گیا۔

○......❖......○

''تمہارے والدین کیا کرتے ہیں؟'' زبیدہ آپا نے آج پھر فواز احمد کو اپنی عدالت میں طلب کر لیا تھا اور وہ سر جھکائے ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

''ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ ابو کو تو میں نے دیکھا ہی نہیں ہے اور امی...... '' وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا ان کی طرف دیکھنے لگا تو زبیدہ آپا کی دل کی دھڑکنیں یک دم تیز ہو گئیں۔ امی بھی اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔'' اس نے نظریں جھکا لیں تو زبیدہ آپا مشکوک سے لہجے میں بولیں۔

''کیا وہ تمہاری سگی ماں تھی؟'' اس فقرے نے فواز احمد کو تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ ان جانے سے دکھ کی ایک لہر کو اپنے وجود میں محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے دکھ اور کرب سے زبیدہ آپا کی طرف دیکھا جو کہہ رہی تھیں۔''

''کیا تمہاری ماں تمہاری سگی ماں تھی؟'' زبیدہ آپا کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔

''لازمی نہیں کہ جنم دینے والی ہی ماں ہوتی ہے۔ پالنے والی کا زیادہ حق ہوتا ہے۔ وہ میری سگی ماں ہی تھی۔'' فواز احمد نے جواب دیا تو زبیدہ آپا تڑپا دینے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''تو پھر سگی ماں کہاں گئی؟''

''وہ مر گئی تھی۔'' مختصراً جواب میں نفرت بھی پوشیدہ تھی۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا؟''

مجھے میری ماں نے بتایا تھا۔

''تم نے اپنی سگی ماں کو دیکھا بھی نہیں؟'' زبیدہ آپا نجانے کیا کریدنا چاہتی تھیں اور فواز احمد نہ جانے کیا ان سے چھپانا چاہ رہا تھا۔

''میں ان سوالوں کے جواب دینے کا پابند نہیں ہوں ماں جی!''

''ماں جی بھی کہتے ہو اور بے رخی سے بات بھی کرتے ہو؟ کیا تمہاری پالنے والی ماں نے تمہیں یہی تربیت دی ہے؟'' زبیدہ آپا کا لہجہ دکھ اور غم سے لبریز تھا۔ ''تم جانتے ہو کہ میرا بھی ایک بیٹا تھا؟'' زبیدہ آپا نے کہا تو فواز احمد چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا وہ مر گیا؟''

''اللہ نہ کرے کہ وہ مر گیا ہو...... میں نے پروردگار سے یہی دعا مانگی ہے کہ مجھے مرنے سے پہلے ایک بار اپنے

بیٹے کی صورت ضرور دکھا دے۔'' زبیدہ آپا تڑپ گئی تھیں۔

''وہ کہاں ہے؟'' فواز احمد اب سوال کر رہا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم؟'' زبیدہ آپا نے مختصراً مگر دکھ بھری آہ بھرتے ہوئے جواب دیا تو فواز احمد کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکان ابھری اور وہ بولا۔

''کیسی ماں ہیں آپ جن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کا اکلوتا بیٹا کہاں ہے؟''

''وہ پیدا ہوتے ہی مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔'' زبیدہ آپا کو اس کا لہجہ تلخ اور انداز برا تو لگا تھا لیکن وہ اپنا غم اس کے ساتھ باتیں کر کے بانٹ بھی رہی تھی اور کم کرنے کی کوشش بھی کر رہی تھیں۔ مدت بعد تو کوئی ان کو ملا تھا جو ان کی باتیں سن رہا تھا اور باتوں کے جواب بھی دے رہا تھا چاہے اس کا لب ولہجہ تلخ اور انداز روکھا ہی کیوں نہ تھا۔

''وہ آپ کا بیٹا تھا..... کوئی کھلونا تو نہ تھا..... جو آپ سے چھن گیا۔'' فواز احمد مصنف تھا الفاظ کا خزانہ اس کے دماغ میں جمع رہتا تھا لیکن وہ کوئی وکیل نہ تھا جو جرح کرتا یا مناسب جواب دینے کے لئے دلیل ڈھونڈنے لگتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی بھی لگی لپٹی کے بغیر ہی زبیدہ آپا سے مخاطب تھا۔

''میں اس وقت ہوش میں نہ تھی۔'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولیں تو وہ طنزیہ انداز میں اٹھ کر ہنستا ہوا بولا۔

''جس ماں کی اولاد چھن رہی ہو..... وہ تو موت سے بھی لڑنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ اگر گہری قبر میں بھی ہو تو بے چین ہو کر کاتب تقدیر کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے..... یہ کیسی بے ہوشی تھی کہ آپ کو پتہ ہی نہ چلا کہ آپ کی کوکھ اجڑ گئی؟''

وہ الفاظ کے نشتر برساتا ہوا وہاں سے چلا گیا لیکن زبیدہ آپا کے لئے ندامت اور شرمندگی کے آنسو چھوڑ گیا تھا۔ ان کو وہ لمحات یاد آنے لگے تھے جب مراد خان نے ان کی گود سے بچہ لے کر ارباب احمد کو پکڑا دیا تھا۔ اس کے بعد ان کو ارباب احمد کبھی بھی نظر نہ آیا تھا اور نہ ہی ان کو یہ معلوم تھا کہ ان کا بچہ کہاں ہے۔ ارباب احمد نے کس کو ان کا بچہ دیا ہے۔ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں..... اب یہ بات تو ارباب احمد ہی بتلا سکتا تھا۔ لیکن ارباب احمد کو ڈھونڈنا اگر مشکل نہ تھا تو یہ بات بھی آسان نہ تھی کہ وہ اس سے اپنے بچے کی بابت دریافت کر سکے۔ انہوں نے اپنی معذور ٹانگوں کی طرف دیکھا اور ان پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں۔

''ارباب احمد! کاش کہ تم اک بار مجھے مل جاؤ..... میں تمہارے پاؤں پکڑ کر بھی تم سے اپنے بیٹے کے متعلق پوچھ لوں گی..... مجھے اک بار مل جاؤ ارباب احمد!''

''ماضی کی تلخ یادیں کبھی پچھتاوا بن جائیں تو ان پر آنسو بہانے کی بجائے توبہ کرنا چاہئے۔'' یہ صبا بیگم کی آواز تھی۔ وہ چائے کے دو کپ لے کر آئی تھی ایک زبیدہ آپا کے سامنے رکھ کر آگے بڑھ گئی۔ زبیدہ آپا اس کے طنز کو بخوبی سمجھتی تھی لیکن مجبور تھیں کچھ بھی نہ کر سکتی تھیں۔ ویسے بھی گھر بھر میں صبا بیگم کا سکہ ہی چل رہا تھا کیونکہ مراد خان تو صہیب کے پاس اسلام آباد گیا ہوا تھا۔

زبیدہ آپا نے صبا بیگم کو اپنا شریک راز بنا کر ارباب احمد سے ملنے کا فیصلہ کیا لیکن اس بات پر ابھی صبا بیگم کو قائل کرنا باقی تھا جو خطرناک ترین مرحلہ تھا۔

دروازے پر دستک سن کر فواز احمد نے دروازہ کھولا تو سامنے صبا بیگم کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اس نے غصے سے منہ پھیر لیا تو صبا بیگم نے اندر داخل ہو کر دروازے کی کنڈی لگا دی۔ فواز احمد نے تیزی سے مڑ کر دیکھا مگر صبا بیگم کے ہونٹوں پر شریر اور شیطانی مسکان پھیل چکی تھی اور وہ دروازے کے آگے کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چائے کا مگ تھا جو وہ فواز احمد کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔ ''میں خود تمہارے لئے چائے لائی ہوں۔''

''لیکن مجھے تو طلب نہیں ہے۔ جب طلب ہو تو میں منگوا لیتا ہوں۔'' فواز احمد نے تیز اور بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا تو وہ آگے بڑھی اور مگ کو میز پر رکھتی ہوئی فواز احمد سے لپٹ گئی۔

''لیکن مجھے تو طلب ہو رہی ہے۔'' اس کی سانسیں فواز احمد اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا تھا اور یہ بہت ہی خطرناک سچویشن تھی اگر باہر سے کوئی آ جاتا تو فواز احمد وہ چور بن جاتا جس نے ابھی تک کوئی بھی چیز نہ چرائی تھی۔

''تو پھر آپ چائے پئیں نا۔'' فواز احمد دیوار سے لگ گیا تھا اور صبا بیگم اس کے سینے سے چمٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہوئی بولی۔

''میری طلب چائے کا ایک مگ نہیں بلکہ تمہارا ساتھ ہے...... مجھے تمہارا ساتھ چاہیئے فواز احمد مجھے تمہارا ساتھ چاہیئے۔'' صبا بیگم کی سرگوشیاں پیاس اور حسرت بن کر فواز احمد کے کانوں میں زہر گھول رہی تھیں۔ وہ بہت پریشان تھا اور خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کرتا ہوا بولا۔

''آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کے بیٹے کا دوست ہوں...... اور روشنی کا ٹیچر ہوں...... یہ آپ اچھا نہیں کر رہی ہیں۔ پلیز یہاں سے چلی جائیں۔''

''مجھے میری خواہشات کے مطابق نواز دو...... وعدہ کرتی ہوں کہ روشنی کو تمہاری جھولی میں ڈال دوں گی۔'' وہ مخمور انداز میں بولی تو فواز احمد کا پارہ ہائی ہونے لگا تھا۔ ''جانے سے پہلے روشنی کو بھی تمہارے اس کمرے میں روشنی بکھیرنے کی اجازت دے دوں گی...... اور......'' لیکن وہ اپنی بات مکمل ہی نہ کر سکی تھی کہ ایک زوردار تھپڑ ''تڑاخ'' سے اس کے گال پر اپنا نشان بناتا ہوا کمرے میں اپنی آواز چھوڑ گیا۔ وہ تھپڑ مارنے والے فواز احمد کی طرف حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ جس کے ہونٹ اور وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیض و غضب کی چنگاریاں دہک رہی تھیں۔ صبا بیگم کو فواز احمد کے اس روپ سے خوف آنے لگا تھا مگر اس کی جو بے عزتی ہو گئی تھی اسے گال پر جلن ہونے کا احساس ہوا تو وہ گال پر ہاتھ رکھتی ہوئی نفرت سے پھنکاری۔

''حرامزادے...... تمہاری اتنی جرأت کہ تم صبا مراد کے چہرے پر تھپڑ مارو...... میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔''

وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گئی اور فواز احمد کے چہرے اور سینے پر اپنے ہاتھوں سے ناخن مارنے لگی۔ فواز احمد خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگا اور اس کے ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس عظیم الشان محل میں تم جیسے بے غیرت اور بے ضمیر انسان بستے ہیں۔ جو اپنے ہی خون کے دلال اور بیٹی کی عزت کی سوداگر ہے۔'' اس نے صبا بیگم کو زور سے دھکا دے کر بیڈ پر گرایا اور نفرت سے بولا۔ ''اگر جوانی نہیں سنبھالی جاتی تو جاؤ اس محل سے نکل کر اس بازار کی زینت بن جاؤ جہاں ہر روز نیا گدھ تمہارے

جسم کو نوچنے کے لئے تیار ہو..... تمہاری عزت کا خون پینے والے ڈریکولا چند دنوں میں ہی کس طرح تمہارے بدن کی پیاس بجھا دیں گے کہ تم اس زندگی سے مرجانے کو ترجیح دینے لگو گی۔'' وہ آگے بڑھا اور صبا بیگم کو بالوں سے پکڑتا ہوا بیڈ سے گھسیٹ کر دروازے تک لے آیا اور پھر بولا۔

''میں خونخوار درندہ نہیں ہوں۔ عاشق ہوں عاشق..... اگر چور یا لٹیرا ہوتا تو اس محل سے کبھی نہ جاتا تمہاری جسمانی تسکین بھی کرتا اور تمہاری دولت سے بھی کھیلتا..... تھو ہے تم پر صبا بیگم تھو ہے تم پر۔''

صبا بیگم کی رگیں غصے سے پھولنے لگی تھیں۔ وہ پھنکارتی ہوئی بولی۔''تم..... تم مجھے جانتے نہیں ہو حرامزادے! تم نے صبا بیگم کو للکارا ہے۔ شیطان مجھ سے پناہ مانگتا ہے۔ تم دیکھنا میں تمہارا کیا حال کرتی ہوں..... تمہیں کتے کی طرح بھونکنے پر مجبور نہ کر دیا تو میرا نام بھی صبا بیگم نہیں.....'' وہ کنڈی کھول کر باہر نکلی تو سامنے ہی روشنی کو کھڑے دیکھ کر اس کا کلیجہ بھک سے اڑ گیا۔ اندر کھڑے فواز احمد کا بھی یہی حال تھا وہ چور بن گیا تھا۔ اس کی مثال اس چور کی تھی جو کسی کے بٹوے سے پیسے چراتا ہوا نہیں بلکہ رکھتا ہوا پکڑا جائے۔ وہ روشنی کو دیکھ کر حیران اور پریشان رہ گئے تھے اور پھر فواز احمد اور صبا بیگم کی حالت بھی خاصی مشکوک تھی۔

صبا بیگم نے پیچھے مڑ کر فواز احمد کو دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور پھر روشنی کی طرف دیکھا جس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور وہ پلکیں بھی نہ جھپک رہی تھی۔

صبا بیگم نے ہاتھ کو روشنی کی آنکھوں کے سامنے لہرایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو صبا بیگم پیچھے مڑتی ہوئی بولی۔

''اسے نیند میں چلنے کی عادت ہے۔'' اور روشنی کو لے کر واپس چلی گئی۔

فواز احمد کسی بے جان مجسمے کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی شرٹ کے بٹن ٹوٹ چکے تھے اور جسم پر جگہ جگہ صبا بیگم کے ناخنوں سے لکیریں پڑی ہوئی تھیں جن میں سے ہلکا ہلکا خون رسنا شروع ہو گیا تھا اور پھر صبا بیگم کی حالت ایسی تھی کہ اس کے بے ترتیب لباس اور گھونسلہ بنا ہوا بالوں کو بھی ان دونوں کی جسمانی قربت کا جواز بنا کر بدنام کرنے کے لئے بہترین اور زندہ دلیل تھے۔ فواز احمد نے ایک پُرسکون سانس خارج کی اور دروازے کی کنڈی لگا کر اس نے خود کو بیڈ پر گرا لیا۔

○.....❖.....○
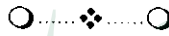
طیبہ کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ وہ یہاں تک کیسے پہنچی تھی اسے ابھی تک معلوم نہ ہو سکا تھا اور یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ کمرہ کس جگہ پر واقع ہے اور اس کمرے کا تعلق شہر کے کس علاقہ سے ہے اور اسے یہاں کیوں رکھا گیا ہے۔ کتنے دن ہو گئے ہیں اور کون اسے یہاں لایا ہے۔

اسے پہلا شک یہی گزرا تھا کہ وہ اغوا ہو گئی ہے کیونکہ یونیورسٹی سے آئے روز طالبات کا اغوا معمول بن گیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہی کانپ گئی۔ اگر وہ اغوا ہو گئی ہے تو پھر اس کے گھر والوں سے تاوان کی رقم لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا یا پھر رقم نہ ملنے پر اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

وہ گھر والوں کی فکر میں گھل رہی تھی۔ اسے احمد فراز کا خیال آیا تو آنکھیں برسات برسانے لگیں وہ شمسہ بیگم اور گھر والے تمام افراد کو یاد کر کے رونے لگی۔ اس نے اپنے ہاتھ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نازک اندام تھی اور

باندھنے والے وحشی قصائیوں کی طرح اس کی مشکیں کس گئے تھے۔ وہ اپنی بے بسی پر آنسو بہانے لگی۔ اس ہفتہ میں اس کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ اپنے احمد فراز کے ساتھ سہانی زندگی کا سفر شروع کرنے والی تھی۔ وہ اپنے ارمان اپنا پیار اور چاہت احمد فراز پر قربان کرنے والی تھی۔ وہ اپنے شریک سفر کے ساتھ زندگی کی نئی راہوں پر اٹھکیلیاں کرتے ہوئے سہانے دنوں کا آغاز کرنے والی تھی۔ لیکن تقدیر نے یہ کیا کیا تھا اس کے ساتھ ابھی تک اسے سمجھ ہی نہ آئی تھی کہ اس کے ساتھ یہ کیوں ہو گیا تھا۔ اسے یاد آنے لگا تھا کہ وہ وائس چانسلر کے کمرے میں پہنچی تھی اور ان کو اپنی شادی کا کارڈ دے کر شادی پر آنے کی تلقین کر رہی تھی اور اس کی وائس چانسلر بھی خوش دلی سے اس کو مبارک باد دیتے ہوئے اس سے وعدہ کر رہی تھی کہ وہ طیبہ کی شادی پر ضرور آئے گی۔ اسی اثنا میں اس نے محسوس کیا کہ ایک ایسا غیر معمولی اشارہ جو کہ سر کے ساتھ کسی کو بھی ''ہاں'' کا اشارہ ہوتا ہے وائس چانسلر نے کیا شاید کوئی اندر آنے کی اجازت مانگ رہا تھا طیبہ نے غور نہ کیا لیکن اس کے لاشعور میں ایک چیز بری طرح کھٹکی کہ دروازہ تو کسی نے بھی نہیں کھٹکایا تھا اور نہ ہی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تھی پھر میڈم نے کس کو اشارہ کیا ہے کہ وہ اندر آ جائے یا پھر وہ کام کر دے جس کے لئے وہ تیار ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کے منہ پر کلوروفارم والا رومال رکھ کر اسے اغوا کرنے والا میڈم کے کمرے میں پہلے سے ہی موجود تھا اور میڈم کے خفیف اشارے پر اپنا کام کرنے کے لئے تیار بھی تھا اور ہوشیار بھی تھا۔ اس کی سوچ اس نقطے پر آ کر ٹھہر گئی تھی کہ اس کے اغوا میں یونیورسٹی کی وائس چانسلر ملوث ہے اور اس کی طرح کئی لڑکیوں کو اغوا کروا چکی ہے۔ وہ قتل ہو جانے کے خوف سے زار و زار رونے لگی تھی کمرے میں اس کی سسکیاں اور رونا سننے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن اسے ایک آواز روح کی گہرائی تک تڑپا گئی۔ وہ گھنگروؤں کی تھی۔ طیبہ نے پہلے تو اس آواز کو اپنا وہم سمجھا لیکن پھر تسلسل سے اس آواز کے ساتھ گانے کی آواز نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ اس نے پڑھا بھی تھا اور ٹی وی سکرینوں پر دیکھا بھی تھا اور سمجھتی بھی تھی کہ ایسا ماحول صرف اُن جگہوں یا ان بازاروں کا ہوتا ہے جہاں عزتیں شوکیس میں سجا کر نیلام کی جاتی ہیں اور عزت دار ہونے کا پرچار کیا جاتا ہے۔ کیا وہ طوائفوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی؟

اس خیال کے آتے ہی آنکھوں کی رم جھم نے پیہم برسات کی صورت اختیار کر لی۔ اسے یاد آنے لگا کہ اس نے کوئی بہت ہی بڑا گناہ کر لیا ہو گا جس کی سزا اُسے ملنے والی تھی یا پھر سزا ملنا شروع ہو گئی تھی۔ لیکن اسے یاد نہ پڑتا تھا کہ کون سا گناہ تھا جس کی یہ سزا تھی۔ اس نے تو ہمیشہ رب تعالیٰ کی ثنا ہی بیان کی تھی۔ اسی وحدہ لاشریک کو سجدہ کیا تھا۔ اپنے چہرے اور وجود کو ڈھانپ کر رکھا تھا۔ اس نے کبھی بھی غیر محرم سے دوستی نہ کی تھی کبھی بھی ایسی نگاہ سے نہ دیکھا تھا کہ جس سے اُسے آج خود پر شرمندگی ہوتی۔ تو پھر کون سا گناہ اور کون سی خطا تھی کہ وہ آج گھنگھروؤں کی چھن چھن سے اپنی سماعتوں کو زخمی کرنے پر مجبور تھی۔ اسے یاد نہ آیا تو سسکیاں آہوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ اتنی دیر میں دروازہ کھلا تو ایک لڑکی جو کہ اس کی ہم عمر تھی کھانا لے کر آئی۔

پہلے تو وہ طیبہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر آگے بڑھ کر اس نے کھانے والی ٹرے طیبہ کے سامنے رکھی اور اس کے ہاتھ کھولنے لگی۔ طیبہ کو وہ بھی اداس اور غمزدہ ہی لگی تھی۔ طیبہ کو اپنے ہاتھ کھلنے پر سکون محسوس ہوا۔ خون کی گردش رواں ہونے لگی تو اس کے چہرے پر کچھ سکون طاری ہو گیا۔

''میں کہاں ہوں؟ کیا مجھے اغوا کیا گیا ہے؟ میرے گھر والوں سے کوئی رابطہ ہوا کہ نہیں؟'' وہ ایک ہی سانس میں سوال کرتی گئی تو وہ لڑکی بولی۔

''تم جہاں بھی ہو...... اتنا یاد رکھنا کہ بھاگنے کی سزا صرف دو چھٹانک سیسہ ہے جو کسی بھی اندھی راہ سے آ کر تمہارے سینے میں پیوست ہو سکتا ہے۔'' اس کا لہجہ گو کہ سرگوشیانہ تھا مگر دھمکی بھرے الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تیر بن کر طیبہ کے دل میں کھب گئے تھے۔

''کھانا کھالو...... مجھے لگتا ہے کہ تم نے دو دن سے کچھ بھی نہیں کھایا۔'' لڑکی کے بتانے پر وہ بھونچکی رہ گئی کہ وہ دو دن سے بھوکی ہے اور اسی حالت میں ہے۔ وہ حیران زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ پھر بولی۔ ''کھانا اچھی طرح کھالینا کیونکہ رات کو سفر کرنا ہے...... راستے میں کچھ نہیں ملے گا۔'' وہ اٹھ کر جانے لگی تو طیبہ نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور روتی ہوئی بولی۔

''تمہیں خدا کا واسطہ...... مجھے اتنا تو بتا دو کہ میں کہاں ہوں۔ میں اپنے گھر والوں سے بات کرنا چاہتی ہوں پلیز تمہیں رسول کا واسطہ۔'' وہ اس کے پاؤں میں گری ہوئی تھی۔ لڑکی نیچے بیٹھ گئی اور اس کا منہ اوپر کرتی ہوئی بولی۔ ''تمہیں یونیورسٹی سے اغوا کیا گیا ہے۔ اب تمہارا سودا ہوگا۔ تمہیں فروخت کیا جائے گا۔ ہم نے تمہیں ڈھائی لاکھ میں خریدا ہے۔ تم اپنے ہی ملک کے مشہور (شہر کا نام بتاتی ہے) شہر میں ہو۔ تمہارے گھر والوں سے رابطہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ تمہیں تاوان کے لئے اغوا نہیں کیا گیا بلکہ کاروبار کی ساکھ اور شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے اغوا کیا گیا ہے۔ تمہیں طوائفوں کی منڈی میں بیچا جائے گا...... وہ بھی دوسرے ملک کے دلالوں کے ہاتھوں۔'' وہ بجلی گرانے والے الفاظ ادا کر کے باہر چلی گئی اور پھر کمرے کا اکلوتا دروازہ بند ہو گیا۔

اس کی سسکیاں آہیں اور پھر چیخ پکار بن گئیں۔ وہ زار و زار رونے لگی۔ مگر کوئی بھی اس کا درد بٹانے والا نہ تھا۔ اسے گھر والوں کے چہرے یاد آنے لگے۔ دادی، امی، ابو...... ریا اور عدیم...... اور پھر خاص طور پر احمد فراز...... وہ سب لوگ کیا کر رہے ہوں گے؟ وہ اس کو جگہ جگہ تلاش کر رہے ہوں گے۔ وہ اس کو تلاش کرنے کے لئے در بدر مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔ امی کا تو رو رو کر برا حال ہو گیا ہوگا اور دادی جان وہ تو ان کی لاڈلی تھی۔ احمد فراز؟

احمد فراز کے نام پر اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ کتنی آہوں اور مرادوں سے اس نے احمد فراز کو مانگا تھا اور جب وہ اس کا ہونے ہی والا تھا کہ اس کی بھیانک اور ڈراؤنے خواب والی مثال کی طرح آنکھ کھل گئی تھیں تقدیر کا بے رحم تھپڑ اس کے گالوں کو ہی نہیں اس کے وجود کو بھی جھلسا گیا تھا۔ اس نے کس گناہ کی سزا پائی تھی اسے یاد نہ آ رہا تھا۔ اس نے کمرے کی چھت کی طرف منہ کر کے اللہ کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔

○...... ❖ ......○

پورا ہفتہ گزر گیا تھا طیبہ کی کوئی خبر نہ تھی تمام عزیز رشتہ داروں سے بھی پتہ کروالیا تھا۔ ارباب احمد نے پولیس کو اطلاع دے کر یونیورسٹی انتظامیہ کے خلاف ایکشن بھی کروایا تھا۔ سٹوڈنٹس نے توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ سے پورے شہر کا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ اخبارات اور چینلز پر ان لڑکیوں کی بار بار تصاویر دکھائی جا رہی تھیں جن کو یونیورسٹی سے اغوا کیا گیا تھا۔

ارباب احمد کے گھر میں فون کالز کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ وہ رشتہ داروں کے سوالوں کے جواب دے دے کر اکتا چکے تھے۔ تمام رشتہ داروں میں سے زیادہ تر ایسے تھے جنہوں نے طیبہ کو تو بدچلن اور بدکردار ثابت بھی کر دیا تھا۔ دولت بی بی اور شمسہ بیگم کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ ارباب احمد نے تو اپنا نمبر تبدیل کر لیا تھا وہ لوگوں، رشتہ داروں اور میڈیا کی باتوں کا جواب دے دے کر تھک چکے تھے۔ احمد فراز اور عدیم اپنی اپنی کوشش کر چکے تھے۔ وہ بھی ہر اس جگہ تلاش کر چکے تھے جہاں جہاں پر ان کی رسائی تھی۔

احمد فراز کو وہ ہر ایک لمحہ ناگ بن کر ڈس رہا تھا جو اس نے طیبہ کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ یادوں کی زہریلی رسی کو زہر بھرا سانپ سمجھ کر ان کے پاس جانے سے گھبرا رہا تھا۔ وہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا تو گھر بھر کے ستے ہوئے چہرے اس کے دل کو چیرنے لگتے تھے۔ اس کی آنکھیں مسلسل جاگنے اور رونے سے سوج گئی تھیں۔

موبائل کی گھنٹی سن کر اس نے دیکھا کہ صہیب احمد کا نمبر تھا۔ پہلے تو اس نے کال ریسیو نہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن چونکہ وہ بھی میڈیا کا فعال کردار تھا شاید اس سے کوئی کام کی بات ہی مل جاتی یہ سوچ کر ہی اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے صہیب احمد کی آواز ابھری جس میں فکر اور دکھ نمایاں تھا۔

''فراز...... مجھے کافی افسوس ہے کہ یہ حادثہ انکل ارباب جیسی فیملی کے ساتھ بھی ہو گیا۔'' اس کے الفاظ میں تاسف جھلک رہا تھا۔

''کیا کر سکتے ہیں ہم لوگ؟ کتنے طاقتور ہونے کے باوجود بھی ہم اندھے، گونگے، بہرے اور لولے لنگڑوں کی طرح جینے پر مجبور ہیں۔'' احمد فراز دل کا دکھ اور غبار الفاظ کی صورت میں نکال دیا تھا۔

''تم تو بہادر ہو یار، اس مشکل وقت میں تمہیں حوصلے اور ہمت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔'' صہیب احمد کی آواز ابھر رہی تھی اور احمد فراز کی آنکھوں سے برسات جاری تھی۔ ''ان حالات میں تم ارباب انکل اور آنٹی کو سہارا دو۔''

''وہی کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔'' احمد فراز نے جواب دیا۔

''میں تم سے ملنے آؤں گا۔ آج کل بابا جان آئے ہوئے ہیں تو ٹائم ہی نہیں ملتا پلیز ٹیک کیئر۔'' رابطہ منقطع ہو گیا تو احمد فراز موبائل کو دیکھنے لگا۔

''مجھے کال کرو طیبہ۔ مجھے کال کرو...... میں تمہارا منتظر ہوں...... پلیز......تم کہاں ہو۔ کہاں چلی گئی ہو؟'' اس کے الفاظ اور لہجے کی لجاجت اور منت بھرا انداز اگر طیبہ دیکھ اور سن لیتی تو فراز پر ہزاروں جان سے فریفتہ ہو جاتی۔ احمد فراز کو اپنے الفاظ یاد آنے لگے جو طیبہ سے آخری ملاقات میں کہے تھے۔

''جس کی طلب کی جائے اگر وہ آسانی سے مل جائے تو تقدیر پر شک ہونے لگتا ہے۔''

اسے اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ تقدیر نے اس کے ساتھ کوئی نہایت ہی گھناؤنا مذاق کیا ہے۔ کیونکہ اسے پہلے طیبہ کے خواب دکھائے۔ پھر ان خوابوں کی تعبیر بھی پوری ہو گئی۔ طیبہ اس کی ہونے لگی تھی کہ تقدیر کی الٹی چال نے ساری گیم ہی الٹ پلٹ کر دی۔ وہ پھر تنہا رہ گیا تھا۔ اسے طیبہ کی غیر موجودگی سے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے اردگرد کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ وہ تنہا ہے، اکیلا اور بالکل تنہا۔

دروازے پر دستک سن کر وہ چونک پڑا اور آنسو صاف کرتا ہوا دروازہ کھول کر سامنے کھڑے ارباب احمد کو دیکھ کر نظریں جھکاتا ہوا بولا۔

''آپ؟'' ارباب احمد اندر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

''تصور خان سے کوئی بات ہوئی؟''

''نہیں انکل اس نے کوئی فون نہیں کیا۔'' وہ بے دلی سے بولا۔'' ارباب احمد کمرے میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''تم خود کال کرلو۔ پتہ تو کرو شاید اس نے کچھ کام کیا ہو۔''

''آپ نے رابطہ نہیں کیا اس سے؟''

''میں نے اپنا سیل آف کر دیا ہے۔'' ارباب احمد کرب سے بولے تو وہ چلتا ہوا ان کے قدموں میں آ کر بیٹھ گیا۔

''انکل! ہم کب تک اس طرح لوگوں کے خوف سے گھٹ گھٹ کر جینے کی ناکام کوشش کرتے رہیں گے۔''

''تم بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟'' ارباب احمد اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔''رشتہ دار، عزیز اور جاننے والے میری تہجد گزار بیٹی پر طرح طرح کے الزامات لگا رہے ہیں۔ ان کے الفاظ بلکہ ان کے زہر بھرے الفاظ میری سماعتوں کو زخمی کر رہے ہیں۔ یہ فون کی گھنٹیاں......میرا دل چیر دیتی ہیں۔ ڈور بیل سیدھی میرے دل پر تیر کی طرح کھب جاتی ہے۔ میں کیا کروں...... میں کیا کروں فراز میں کیا کروں؟'' ارباب احمد بچوں کی طرح رونے لگے تھے۔

احمد فراز کو سمجھ نہ آ رہا تھا کہ ان کو دلاسہ دینے کے لئے کن الفاظ کا سہارا ڈھونڈے۔ وہ گونگا ہو کر ان کو دیکھے جا رہا تھا۔ یہ وہی احمد فراز تھا جو بڑے بڑے سیاستدانوں اور نامور اداکاروں کی بولتی بند کروانے میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔ وہ لفظوں کا کھلاڑی آج اس قدر بے بس اور مجبور تھا کہ الفاظ اس کے حلق میں گولے کی صورت میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

''ہمیں صبر کرنا ہوگا انکل اور طیبہ کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''مگر کب تک بیٹا؟''

''جب تک یہ پتہ نہیں چل جاتا کہ کاغذ کی کشتی جیسی نرم و نازک طیبہ حالات کے بے رحم دھاروں پر ڈولتی ہوئی کس ساحل پر پہنچی ہے؟'' الفاظ کا کھیل شروع ہو گیا تھا وہ اینکر تھا تو ارباب احمد نشتر اور آپریشن تھیٹر کے ''ماسٹر'' تھے۔

''ایسا نہ ہو کہ زمانے کے بے رحم تھپیڑے اس کاغذ کی کشتی کو اپنی ظالمانہ موجوں میں الجھا کر اس قدر شل کر دیں کہ وہ بیچ راہ میں ہی رہ جائے اور کسی بھی منزل تک نہ پہنچ پائے۔'' ارباب احمد کا خدشہ الفاظ بن کر زبان پر آیا تو آنکھیں پھر برسات بن گئیں۔

دروازے پر دستک سن کر دونوں نے دیکھا تو شمسہ بیگم روئی ہوئی آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے سے اندر

داخل ہوئیں ان کی حالت اس طرح تھی کہ کوئی معصوم بچے سے اس کا پسندیدہ کھلونا چھین کر لے گیا ہو اور بچہ اس کھلونے کو دوبارہ حاصل کرنے کی خاطر نیم پاگل ہو گیا ہو۔

''کچھ پتہ چلا ارباب؟'' ان کا سوال اور الفاظ پرانے تھے لیکن دکھ اور کرب ہر بار نیا ہوتا تھا۔

''معلوم کر رہے ہیں ابھی تک تو کچھ معلوم نہیں ہوا؟'' ارباب احمد ان سے نظریں جھکا گئے تھے۔ وہ چلتی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں اور احمد فراز کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوئی بولیں۔

''مجھے معاف کر دو فراز!'' ارباب احمد اور احمد فراز کے لئے یہ رویہ اور ان کا انداز حیران کن تھا۔ وہ تڑپ کر ان کی طرف بڑھا اور ان کے جڑے ہوئے ہاتھ چومتا ہوا کہنے لگا۔

''کیوں مجھے شرمندہ کر رہی ہیں آپ؟''

''مجھے آج نہ جانے کیوں لگتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ وہ رشتہ نہ بنا سکی جس کی تمہیں ہمیشہ سے ضرورت رہی ہے۔ ماں باپ کے بنا بچے کیسے پلتے اور کیسے پالے جاتے ہیں؟ شاید میں اس حقیقت سے نابلد تھی۔ تم خدا کے واسطے مجھے معاف کر دو'' وہ رونے لگیں تو ارباب احمد نے بھی ان کو دل کا غبار نکالنے دیا۔ وہ خاموشی سے معاملہ فہم اور باشعور شمسہ بیگم کو دیکھتے رہے۔

''مجھے میری نظروں سے نہ گرائیں چچی!'' احمد فراز تڑپ رہا تھا۔

''مجھے یوں لگتا ہے کہ میری طرف سے تمہاری پرورش میں کوئی کوتاہی ہو گئی ہے۔ یا پھر مجھ سے کوئی ''جھوک'' ہو گئی ہے۔ تبھی تو تقدیر نے مجھے اتنی سخت سزا دی ہے۔ میری طیبہ...... میری طیبہ میرے ہاتھوں سے اس طرح چھن گئی جیسے کسی کینسر کے مریض کے ہاتھوں سے اس کی زندگی جا رہی ہو اور وہ مجبور و بے کس اور بے بسی سے موت کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہا ہو...... میں طیبہ کے بغیر زندہ ہوں...... میں روزِ محشر اپنے خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی کہ ایک بیٹی کی حفاظت بھی نہ کر سکی۔''

آنسوؤں اور آہوں نے الفاظ کی قدر و قیمت مزید بڑھا دی تھی اور سامنے بھی وہ تھا جو لفظوں سے کھیلنے کا فن جانتا تھا لیکن مقصد کسی کو مات دینا یا کسی کی بولتی بند کروانا نہ تھا بلکہ وہ سب کچھ بیان کرتا تھا جو آج تک اس نے پایا اور کھویا تھا۔ وہ ماں باپ کے بغیر پلنے والا بچہ تھا جس کو جوانی کی سیڑھیوں پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھ کر چلانے کا قرینہ اس عظیم عورت نے سکھایا تھا جو آج اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ان جانے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی اس نے شمسہ بیگم کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور بولا۔

''میں نے ماں کو نہیں دیکھا لیکن آپ کی صورت میں آج تک مجھے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ میری ماں زندہ نہیں ہے۔'' آنسوؤں کو موقع درکار تھا وہ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے آنکھوں کے شیشوں پر جھلملانے لگے بس اس موقع کی تلاش میں تھے کہ کب قید خانے کا دروازہ کھلے ضبط اور صبر کے بندھن کا بند دروازہ ان کی مجبوری تھا ورنہ وہ کب کے لڑھک کر احمد فراز کے گالوں پر لکیریں بناتے اور اس کی شرٹ کے کالر کو بھگوتے ہوئے اس کے گریبان تک جا پہنچتے۔

''میں نے ان ہاتھوں سے کھانا کھایا ہے۔ ان ہاتھوں نے بچپن میں میری گندگی کو دھویا ہے۔ مجھے نہلا دھلا کر صاف ستھرا بنایا ہے۔ چچی...... اگر میری ماں زندہ ہوتی تو شاید مجھے آپ کی صورت میں اتنی محبت کرنے والی، ہمدرد

اور خلوص سے تربیت کرنے والی ماں نہ ملتی۔'' اب آنسوؤں کے لئے قید خانہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ وہ ان کو پینے کی ناکام کوشش میں شکست خوردہ بن کر پھر شمسہ اور ارباب احمد سے مخاطب ہوا۔

''میرے ننھے منے ہاتھوں کو پکڑ کر آپ لوگوں نے میرے لرزیدہ پاؤں کی لرزش ختم کی...... زمانے کی ہر اونچ نیچ کو سمجھنے کی تربیت دی۔ حالات اور گردش کی لرزتی کانپتی سیڑھی پر پاؤں رکھنے کا طریقہ سکھایا۔ مجھے منزل پر پہنچنے کی ترغیب اس طرح دی کہ مجھے محسوس ہی نہ ہوا اور میں منزل پر بھی پہنچ گیا تھا۔ آج اگر میں اس ملک کا باشعور شہری ہوں تو آپ دونوں کی بدولت ہوں۔''

احمد فراز نے ارباب احمد اور شمسہ بیگم کو ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔

''کاش کہ میں آپ کا سگا بیٹا ہوتا اور چچی...... کاش کہ میں نے آپ کی کوکھ سے جنم لیا ہوتا۔'' یہ کہہ کر وہ ان دونوں کے قدموں میں گر گیا۔ اس کا وجود ہولے ہولے لرزنے لگا تھا۔

ارباب احمد نیچے کو جھکے اور اس کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا کر اس کی پشت تھپتھپانے لگے شمسہ بیگم اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں تو احمد فراز ان کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ ''تم نے میری عزت رکھ لی ہے فراز، میرا مان رہ گیا ہے۔ میرے ذہن اور دل سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے......'' وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ لیکن جانے سے پہلے انہوں نے احمد فراز کی پیشانی پر اپنے ممتا بھرے ہونٹوں کی مہر ثبت کر دی تھی۔ جس سے احمد فراز کی آنکھیں جگنے لگی تھیں۔

''میں تو اس حق میں ہی نہ تھا کہ طیبہ چار پانچ سال تک تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے کے بعد دوبارہ کالج یونیورسٹی جوائن کرتی...... خیر اب ہمیں بہت سا کام کرنا ہے۔'' ارباب احمد نے گویا اس کو یاد دلایا تو وہ اپنے ہاتھوں سے زخمی آنکھوں کو صاف کرتا ہوا بولا۔

''یہ طیبہ کیا سمجھتی ہے...... اس طرح چھپ کر مجھے شکست دے لے گی؟ نہیں انکل...... میں اس کو اس طرح تلاش کر لوں گا جیسے کوئی سمندر کی گہرائیوں سے سیپ اور پھر سیپ سے موتی نکال لیتا ہے۔'' ارباب احمد اس کی طرف دیکھ کر دکھ سے مسکرائے اور بولے۔

''مجھے تمہاری محبت اور پر خلوص ارادوں پر پورا بھروسہ ہے۔ کم آن۔'' دونوں ہی کمرے سے باہر نکل گئے۔

○......❖......○

''بابا آپ نے کبھی محبت کی ہے؟'' صہیب احمد نے مسکراتے ہوئے کپ مراد خان کی طرف بڑھایا اور پوچھا تو مراد خان کھلکھلا کر ہنس پڑے اور شکریہ کہہ کر اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ پکڑ کر اپنے سامنے میز پر رکھ لیا اور بولے۔

''کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ یا پھر کس بات کی اجازت لینا چاہتے ہو؟'' صہیب احمد مراد خان کی ذہانت کا دل سے ہی قائل نہ تھا بلکہ وہ اس بات پر بھی فخر کرتا تھا کہ وہ مراد خان جیسے ذہین اور سمجھدار شخص کا بیٹا ہے اور یہی ذہانت اور سمجھداری خود اس میں بھی تھی لیکن یہ سب مراد خان کی اچھی تربیت کی مرہون منت تھی۔ ''بابا! یہ محبت کیا ہوتی ہے؟'' وہ پھر سوال کو گول کرتا ہوا چائے کے گھونٹ لینے لگا۔

''یار میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے ہو اور سمجھدار بھی ہو...... یہ سوال تو میرا بنتا ہے۔'' دونوں ہی ہنسنے لگے۔

''آپ تو بات کو ٹال رہے ہیں۔'' صہیب احمد ان کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا تو اس کو کرب کی ایک ہلکی سی جھلک مراد خان کی آنکھوں میں دکھائی دی لیکن وہ کمال کے اداکار تھے آنکھوں سے مسکرانے کا فن جانتے تھے۔''یہ بتاؤ کہ وہ جو تمہارا دوست ہے کیا نام ہے اس کا؟'' مراد خان ذہن پر زور دینے لگے۔

''کون بابا...... میرے تو کافی دوست ہیں۔'' صہیب احمد حیرانگی سے بولا۔

''وہی یار...... جو روشنی کو لکھنا سکھا رہا ہے۔'' مراد خان الجھے ہوئے انداز میں بولے تو صہیب احمد ہنستا ہوا بولا۔

''فواز احمد!''

''ہاں، فواز احمد سے کوئی رابطہ ہوا یا نہیں؟'' مراد خان نے گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''اس سے کیوں بابا؟''

''تم بھی بدھو ہی ہو...... یار اگلے ہفتہ تمہاری خالہ آرہی ہے جو کہ تمہاری ماں کے فرمان کے مطابق اپنے بیٹے علی کے لئے روشنی کا ہاتھ مانگنے آرہی ہے...... بلکہ ان کی منگنی کی تقریب بھی یہیں ہوگی۔'' مراد خان کے منہ سے سن کر صہیب احمد حیران ہو رہا تھا۔

''مجھ سے تو مما نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

''تم کون سا اس ہٹلر کے سامنے جاتے ہو۔'' صہیب احمد ان کے اس انداز پر ہنس پڑا اور بولا۔

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے بابا! مما اچھی ہیں بہت اچھی ہیں۔''

''کاش وہ اچھی بیوی بھی بن سکتی۔'' مراد خان کی یہ بڑبڑاہٹ صہیب احمد کی سماعتوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی لیکن وہ خاموش رہا۔''تم فواز احمد سے رابطہ کر کے اسے بتاؤ کہ اب وہ روشنی کو لکھنا پڑھنا سکھانا چھوڑ کر واپس اپنے گھر کی راہ لے۔ اس کے سسرال والے اس طرح فواز احمد کا ہمارے گھر میں رہنا پسند نہیں کریں گے۔''

''لیکن بابا یہ تو روشنی کا شوق ہے بھلا اس کے سسرال والوں کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟'' صہیب احمد روشنی کی حمایت میں دلیل دیتا ہوا بولا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم دونوں بہن بھائی کا پیار مثالی ہے لیکن تم ذرا یہ سوچو کہ بیٹیوں کے ناز نخرے اور لاڈ صرف ماں باپ ہی سہتے اور اٹھاتے ہیں۔ سسرال والوں کو اس سے کیا غرض ہے کہ اس کو ناول لکھنا آتا ہے یا نہیں۔ یا نہیں اس سے کیا کہ یہ اس کا شوق ہے۔'' مراد خان بیٹی کا باپ بن کر سوچ رہے تھے۔

''میں فواز احمد سے بات کروں گا۔'' صہیب احمد اپنی چائے ختم کر چکا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ اب تمہارا شادی کا کیا ارادہ ہے؟'' مراد خان اس کی جانب اسی کا سوال موڑتے ہوئے بولے تو وہ مسکرانے لگا۔

''ویسے بابا جان! آپ نے سوال کو گول کیا خوب کیا ہے؟'' دونوں باپ بیٹا ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔''بابا! میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے۔'' صہیب احمد کا رویہ مراد خان سے دوستانہ تھا لیکن وہ یہ بات کرتے ہوئے کچھ جھجک سا

گیا تھا۔اس نے نگاہیں جھکالی تھیں۔
''ابھی تک صرف ایک ہی لڑکی دیکھی ہے؟'' مراد خان کا لہجہ شرارتی تھا۔
''بابا!'' وہ مسکراتے ہوئے مراد خان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔مراد خان کے چہرے پر شفقت اور پیار کے سوا کچھ نہ پا کر وہ ہمت کرتا ہوا بولا۔''بس یہ سمجھ لیں کہ بہت سی لڑکیوں میں سے یہی ایک اچھی لگی ہے۔''
''کون ہے، کب ملوا رہے ہواس سے؟'' مراد خان سرگوشی میں بولے۔
''بابا جان ان کے گھر میں آج کل ایک خاصی پرابلم چل رہی ہے۔''
''تمہاری وجہ سے؟'' مراد خان نے مشکوک لہجے میں پوچھا تو وہ اپنی صفائی بیان کرتا ہوا کہنے لگا۔
''نہیں نہیں بابا جان! میری وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس دکھ کی گھڑی میں مجھے ان کے پاس ہونا چاہئے تھا۔ریبا کی بڑی بہن کو یونیورسٹی سے اغوا کرلیا گیا ہے اور آج تقریباً آٹھ دن ہو گئے ہیں۔نہ ہی اغوا کاروں نے تاوان کے لئے کوئی رابطہ کیا ہے اور نہ ہی ابھی تک طیبہ کا کہیں اتہ پتہ ہے۔''
''یہ ریبا اور طیبہ کون ہیں؟'' مراد خان نے پوری بات سن کر دونوں ہی ناموں کا ذکر کیا جو اس کے لئے پوری طرح اجنبی تھے۔
''ریبا وہ لڑکی ہے میں جسے پسند کرتا ہوں...... میرا مطلب ہے کہ مجھے اچھی لگتی ہے اور طیبہ اس کی بڑی بہن ہے اور یہ دونوں لڑکیاں ملک کے نامور نیورو سرجن ڈاکٹر ارباب احمد کی نورچشمی ہیں۔'' مراد خان کے وجود پر زوردار بم پھٹا جوان کے وجود کو ریزہ ریزہ کرگیا۔

○......❖......○
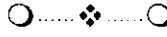
مراد خان اس وقت سے حیران تھے جب صہیب احمد نے بتایا تھا کہ ریبا اور طیبہ ڈاکٹر ارباب احمد کی بیٹیاں ہیں۔ارباب احمد کوئی بھی ہوسکتا تھا لیکن ڈاکٹر ارباب احمد اس شہر میں ایک ہی تھا اور پھر اس دن شمسہ نے بھی جس بچی سے اس کا تعارف کروایا تھا اس کا نام بھی طیبہ ہی بتایا تھا۔وہ تڑپ کر رہ گیا کہ اس طیبہ کو اغوا کرلیا گیا تھا جو شمسہ کی بیٹی تھی۔نہیں نہیں صرف شمسہ کی بیٹی ہی نہ تھی بلکہ شمسہ نے تو اسے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا اس کا باپ تو مراد خان تھا۔
یہ سوچ کر ہی مراد خان کانپ کر رہ گئے ان کی بیٹی کو یونیورسٹی سے اغوا کرلیا گیا تھا وہ کتنا بے بس اور مجبور محسوس کر رہے تھے۔وہ شمسہ سے بات نہ کرسکتے تھے۔وہ ارباب احمد سے بھی ہمدردی کا اظہار نہ کرسکتے تھے۔وہ صہیب احمد کو بھی نہ بتا سکتے تھے کہ طیبہ اس کی بڑی بہن ہے اور شمسہ ان کی پہلی بیوی ہے۔وہ کمرے میں بیٹھے خود کو لاچار اور مجبور محسوس کرتے ہوئے رونے لگے۔
''میں کیا کروں بیٹی...... میں تمہیں کیسے ڈھونڈوں، کہاں تلاش کروں، کس رشتے اور کس ناطے سے تمہیں تلاش کروں۔میں نے تمہارا کوئی بھی حق پورا نہیں کیا۔میں نے تو تمہیں پیدا ہوتے ہی نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہیں دیا۔'' وہ اونچی آواز میں چیخنے لگے تھے۔یہ تو اچھا تھا کہ صہیب احمد آفس گیا ہوا تھا اور کسی بھی ملازم کو اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اس طرف آنکلتا اور صاحب کے اس طرح رونے کی وجہ ہی پوچھنے کی جرأت کرتا۔ویسے بھی کمرہ بند تھا۔
''مجھے معاف کردو شمسہ، مجھے معاف کردو شمسہ...... میں تمہارا مجرم ہوں۔میں تمہاری خوشیوں کا قاتل ہوں۔

مجھے معاف کر دو پلیز مجھے معاف کر دو" وہ گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے ان کا انداز ایسا تھا کہ شمسہ ان کے سامنے کھڑی ہے۔ وہ سر جھکائے اس کے قدموں میں گرے ہوئے تھے۔

درد اور یادوں کی تیز لہروں نے ساحل پر آنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے دل میں موجزن سمندر کی تہہ میں طوفان نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ اندر کی دنیا اتھل پتھل ہونے جا رہی تھی۔ مراد خان بار بار سر کو جھٹکے کو دے کر اپنے تلخ اور ظالم ماضی سے جان چھڑانے کی تگ و دو میں مصروف تھے لیکن بعض اوقات ایسے زخموں کو بھی چھیڑنے میں مزہ آنے لگتا ہے جو پرانے ہو چکے ہوں اور ان پر کھرنڈ بھی آ چکا ہو۔

مراد خان نے پرانے زخموں کو کریدنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں کوئی نشتر نہ تھا بلکہ یادوں کے زہریلے تیر ان زخموں کو اس انداز میں کرید رہے تھے کہ ان سے ماضی کی محبت اور نفرت کا خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ مراد خان کمرے میں فرش پر بچھے ہوئے کارپٹ پر ہی بیٹھ گئے ان کی ٹیک بیڈ سے لگی ہوئی تھی اور جھلمل کرتی آنکھیں ماضی کے اوراق کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

○ ❖ ○

اورنگزیب نے حیرانگی سے اکلوتے بیٹے مراد خان کی طرف دیکھا تھا جو کہہ رہا تھا کہ وہ شادی کرے گا تو اپنی کلاس فیلو شمسہ سے ہی کرے گا۔ اورنگزیب جہاندیدہ آدمی تھے انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مراد خان کے لب و لہجے میں عزم اور پختگی اس کے ارادوں کو متزلزل نہیں کر سکتی لیکن وہ ابھی زبیدہ کی طلاق سے سنبھل نہ پائے تھے اور پھر زبیدہ کا بیٹا جو مراد خان کے بہترین دوست ارباب احمد کو دے دیا گیا تھا کہ وہ اس کو کسی کو بھی دے دے۔ ارباب احمد نے وہ بچہ اپنی ملازمہ کو دے دیا تھا اور اس سے اورنگزیب خاندان کا ہر قسم کا ناطہ ختم ہو گیا تھا اور گھر بھر میں زبیدہ کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ ارسلان نے تمہیں کھلونا سمجھ کر کھیلا ہے اور بچہ بھی چونکہ نکاح سے پہلے ہی شکم میں آ چکا تھا اس لئے اورنگزیب اس ناجائز بچے کو اس گھر میں رکھنا بھی اپنی توہین سمجھتے تھے۔ اس لئے زبیدہ کو صبر و شکر کرنا ہو گا۔

ارسلان سے اپنی پسند اور اپنی مرضی کی شادی کر کے زبیدہ نے خاندان کی ناک کٹوا دی تھی اور پھر ناجائز بچے کی پیدائش پر اورنگزیب اور سہانا بیگم اتنے دلبرداشتہ تھے کہ وہ زبیدہ کو جان سے مارنا چاہتے تھے لیکن ارباب احمد نے اس معاملے کو احسن طریقے سے نپٹایا تھا اس نے بچہ کسی کو دینے کی ذمہ داری اپنے سر پر لی اور اپنا کام بخوبی نپٹا کر اورنگزیب کے سر سے بہت بڑا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔

مراد خان کا اکلوتا اور بہترین دوست ہونے کی وجہ سے ارباب احمد کو اس گھر میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور کوئی بھی ایسا فیصلہ جو اورنگزیب کے لئے مسائل بن کر سامنے آ جائے وہ اس کو ڈسکس کرنے کے لئے ارباب احمد کو ہی بلاتے تھے۔ اب بھی شمسہ سے شادی کے لئے ضد اور انا کا مسئلہ بنا کر مراد خان نے اورنگزیب کو ایک بار پھر ایسے دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا کہ وہ خود سے کوئی بھی فیصلہ کرنے سے نالاں تھے۔ کیونکہ سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے کہ مصداق وہ زبیدہ اور ارسلان کی ناکام شادی کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے مراد خان سے کوئی بھی بحث کرنے سے گریزاں تھے۔ اس لئے انہوں نے ارباب احمد کو شام کو بلا لیا تھا۔

مراد خان ان کا اکلوتا بیٹا تھا وہ اپنے دونوں بچوں کے لئے دنیا بھر کی خوشیاں خریدنے کی خواہشیں اور

استطاعت بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے زبیدہ کے لئے جن ارمانوں اور خوابوں کو دل میں بسایا تھا وہ زبیدہ کی من مرضی کی بدولت چکنا چور ہو گئے تھے۔ ان کو اس بات کا غم بھی کھائے جاتا تھا کہ ان کی اکلوتی اور جوان بیٹی بیوگی کا لبادہ اوڑھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے زندہ لاش کی طرح پھرتی رہتی ہے لیکن وہ مجبور تھے اس کو شادی کے لئے نہ کہہ سکتے تھے۔ کیونکہ سہانا بیگم نے دو ایک بار بات کرنے کی کوشش کی تو زبیدہ ہتھے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔ وہ دوسری شادی نہ کرنا چاہتی تھی اس کا کہنا تھا کہ گھر والوں نے اس سے اس کا بچہ چھین کر زیادتی کی ہے اور وہ اس زیادتی کا بدلہ لینے کے لئے احتجاج کے طور پر زندگی بھر دوسری شادی نہیں کرے گی اور اپنا بچہ کھو جانے کا انتقام اس طرح لے گی کہ اس خاندان کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔

شمسہ سے شادی کی بات کرنے کا ٹاسک ارباب احمد کو سونپ دیا گیا تھا۔ جبکہ ارباب احمد نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی کیا لیکن مراد خان کی دوستی اور اورنگزیب کی بزرگی کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی۔ اس نے بڑی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شمسہ کو یونیورسٹی کی کینٹین میں روک لیا تھا۔ وہ دونوں ہی ایک میز کے گرد رکھی گئی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے ارباب احمد کو سمجھ نہ آ رہا تھا کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع کرے۔ اس کی اس مشکل کو شمسہ نے ہی حل کر دیا تھا۔ گفتگو کا آغاز تعلیم سے ہوا تھا اور بات شادیوں پر جا کر رک گئی تھی۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم ڈاکٹر بننے سے پہلے شادی نہیں کرو گے؟'' شمسہ ارباب احمد کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی تو نہ چاہتے ہوئے بھی ارباب اس کی آنکھوں کی جھیل میں ڈوب گیا ابھی اس نے پہلا ہی غوطہ لگایا تھا کہ اسے ہوش کے کناروں پر واپس لوٹنا پڑا کیونکہ وہ شمسہ سے مراد کی بات کرنے آیا تھا۔ ''شادی ضرور کروں گا اگر میری تعلیم ڈسٹرب نہ ہو۔'' وہ شمسہ کی جھیل جیسی آنکھوں سے کناروں تک تو پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ابھی تک پوری طرح باہر نہ نکل سکا تھا۔

''اگر کوئی جیون ساتھی اچھا مل جائے تو؟'' شمسہ نے اسے ایک بار پھر مخمور آنکھوں کی جھیل کا گہرا غوطہ دیا تو اس کی سانس پھولنے لگی۔ وہ شمسہ کے اس سوال کا مقصد نہ سمجھا تھا۔

''تب بھی میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد ہی اس جھنجھٹ میں پڑنا پسند کروں گا۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ ''اگر میں تمہیں پرپوز کروں تو؟'' دِل کے تاروں میں رباب بج اٹھا تھا۔ آنکھیں آنکھوں کی زبان سمجھنے اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔ ارباب احمد نے اپنے آس پاس دیکھا تو شمسہ کی کھنکتی ہنسی نے اسے شرمندہ کر دیا۔ کیونکہ ارباب کا انداز ایسا تھا کہ وہ کوئی چوری کرنے جا رہا ہو۔

''ذرا شکل تو دیکھو کس طرح بارہ بج رہے ہیں۔'' وہ کھن کھن کرتی ہوئی ہنسے جا رہی تھی اور سٹوڈنٹس اسے دیکھ کر دیوانی قرار دینے لگے تھے۔ ''توبہ توبہ یا اللہ، ارباب تم اتنے شرمیلے ہو۔'' وہ ہنسی پر قابو پاتی ہوئی کہنے لگی۔ ''کم آن یار...... میں تو مذاق کر رہی تھی۔''

اس بار اس کی آنکھیں جو اٹھیں تو ان میں جو یاس اور حسرت تھی وہ شمسہ دیکھ نہ پائی تھی۔ ''مذاق۔'' ارباب احمد صرف یہی کہہ سکا اور ہونٹوں پر زبردستی کی ہنسی سجاتا ہوا بولا۔ ''مذاق تم اچھا کر لیتی ہو شمسہ۔''

''اچھا بتاؤ کیا کھاؤ گے؟'' وہ کچھ سنجیدہ ہوتی ہوئی بولی۔

''تمہیں کوئی اور بھی چاہتا ہے شمسہ!'' ارباب احمد کے اس فقرے نے شمسہ کی ہنسی اور شوخی کافور کر دی تھی وہ ارباب احمد کے چہرے پر چھانے والے تاثرات اور اتار چڑھاؤ سے اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ یہ بات ارباب احمد نے اپنے لئے یا کسی اور کے لئے کی ہے۔مگر ہنوز وہ اس بات کا صحیح اندازہ کرنے میں ناکام ہی تھی۔

''کون؟'' صرف ایک لفظ ادا کرنے کے لئے اسے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کرنا پڑا تھا۔

''شمسہ! کیا ہم دوست ہیں؟'' ارباب احمد معاملہ فہم اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ وہ آہستہ آہستہ شمسہ کو اپنے ڈھب سے بات کی طرف لانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

''آف کورس یار! ہم اچھے دوست ہیں۔'' وہ مزے میں بولی۔

''صرف دوست!'' ارباب احمد اپنے دل کا چور نکالنا چاہتا تھا یا پھر شمسہ کے دل کے تاروں کو چھیڑ کر اندر کی مدھر موسیقی کو سننا چاہتا تھا اس بات کی سمجھ خود اور ارباب احمد کو بھی نہ آئی تھی۔

''ابھی تک تو اچھے دوست ہیں۔'' وہ گلا کھنکھارتی ہوئی بولی۔''کیا بات ہے تم کچھ الجھے الجھے سے لگ رہے ہو۔کوئی بات بھی پوری نہیں کر پا رہے۔'' اس نے ویٹر کو چائے کا آرڈر دے دیا تھا۔

''دیکھو شمسہ! خوش قسمت وہ انسان ہوتا ہے جسے چاہنے والے کتنے ہی زیادہ ہوں اسے کم ہی لگتے ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے کہ میں اس ٹائم یونیورسٹی میں ہاٹ کیک کا درجہ رکھتی ہوں۔ بہت سے لڑکے مجھ پر مرتے ہیں لیکن میری شخصیت اور سٹیٹس کی وجہ سے ان کی جرأت نہیں کہ مجھ سے اپنے دلی جذبات کا اظہار بھی کر سکیں۔''

شمسہ نے اپنی بات مکمل کی تو ارباب احمد ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا بولا۔

''اگر میں......یعنی کہ تمہارا اچھا دوست کہے کہ تم فلاں نوجوان سے شادی کر لو......تو کیا تم کر لو گی؟''

شمسہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تو ارباب احمد کو بہت دکھ ہوا وہ اپنی بات پر پچھتانے لگا تھا لیکن بات زبان سے اور تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

''تمہیں شرم نہیں آئے گی ایسی بات کرتے ہوئے......وہ بھی مجھ سے......یعنی کہ شمسہ کریم سے۔'' وہ چیخنے والے انداز میں بولی تو اردگرد کے سٹوڈنٹس ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ارباب احمد اس سچویشن سے خاصا گھبرا گیا تھا کیونکہ ابھی چند لمحے قبل تو شمسہ کے نقرئی قہقہوں سے سارا ماحول مسحور کن ہو رہا تھا اور ابھی وہ غصے میں لال پیلی ہو کر کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور غصے میں پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

ارباب احمد کو بھی اس کے پیچھے جانا پڑا وہ گراؤنڈ کے وسط میں جا کر رک گئی۔وہ اپنے آنسو صاف کر رہی تھی کہ ارباب احمد اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ آہستگی سے بولا۔

''پھر؟'' وہ مختصراً ہی پوچھ سکی۔

''کیا ہم دوست ایک دوسرے کے دل کی بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟''

''یہ تو فقرہ مجھے ادا کرنا چاہئے تھا'' وہ اس فقرے کو ادا کر کے ارباب احمد کو زمین میں گاڑھ گئی تھی۔
شمسہ وہاں سے تو چلی گئی تھی لیکن ارباب احمد سے اپنی وابستگی کا اظہار ان الفاظ میں کر گئی تھی کہ وہ سمجھنے میں دیر نہ کر سکا۔ وہ اپنے دل کی آواز کو الفاظ کا پیرہن اوڑھا کر ارباب احمد کو یہ سوچنے پر مجبور کر گئی تھی کہ محبت الفاظ اور اظہار کی مرہونِ منت نہیں ہوتی۔
''ہاں کیا بنا؟'' وہ مراد خان کی آواز سن کر چونکا تو وہ مراد خان اس کے سامنے کھڑا تھا۔
''میں نے بات شروع کی ہے......ابھی صبر سے کام لو...... کچھ دن لگ جائیں گے۔'' ارباب احمد وہاں سے تھکے تھکے انداز میں گیٹ کی جانب چل پڑا۔
''اسے کیا ہو گیا؟'' مراد خان نے خود ہی کہا اور کندھے اچکاتے ہوئے کینٹین کی طرف چل پڑا۔
شمسہ کریم نے اپنا بیگ غصے سے صوفے پر پھینکا اور اپنے کمرے کی جانب چلی گئی۔ کریم خان گھر پر ہوتے تو بیٹی کی آنکھوں میں تیرنے والی نمی کو دیکھ کر تڑپ جاتے کیونکہ انہوں نے بیوی کے فوت ہو جانے کے بعد شمسہ کی پرورش اس طرح کی تھی کہ وہ ان کی آنکھ کا پانی اور ہتھیلی کا چھالا بن گئی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے لئے اپنی جان بھی بیچ کر دنیا بھر کی خوشیاں خریدنے کی طاقت اور جرأت رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی شمسہ کو آزردہ نہ کیا تھا بلکہ اس کی ہر خواہش کو یوں پورا کیا تھا کہ الفاظ اس کے ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی خواہش پوری ہو جاتی تھی۔ اب شمسہ میڈیکل کی طالبہ تھی اپنا اچھا برا جانتی اور سمجھتی تھی وہ خود بھی اپنے آنسو کریم خان سے چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔
''اگر میں کہوں کہ تم فلاں نوجوان سے شادی کر لو......تو کر لو گی؟'' ارباب احمد کے الفاظ آری کی طرح اس کے دل کو چیر رہے تھے۔ وہ بیڈ پر سیدھی لیٹ گئی تو آنسو ڈھلک کر دائیں بائیں گالوں پر لڑھک گئے۔ اس نے بے مروت اور کم ظرف آنسوؤں کو بہنے دیا جب رو کر جی ہلکا ہوا تو اٹھی اور بیڈ کے دراز سے ایک فوٹو البم نکالا اور اس کو کھولتی ہوئی بولی۔
''میں نے تو تمہاری محبت میں خود کو ہی بھلا دیا ہے ارباب!'' البم میں تمام تصاویر ارباب احمد کی تھیں اور ان میں یونیورسٹی کے فنکشن اور ٹورز کی تصاویر بھی تھیں جن میں شمسہ ارباب کے ساتھ کئی جگہوں پر خوشگوار موڈ میں کھڑی تھی۔ وہ ان تصاویر پر ہاتھ پھیرنے لگی تو ارباب احمد کے الفاظ اس کی سماعتوں میں گونجنے لگے۔
''کیا ہم دوست ہیں؟''
''ہاں!'' وہ خود ہی بولی۔
''صرف دوست؟''
''اچھے دوست۔'' وہ پھر بولی تو چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی بھی نہ تھا وہ تخیل میں ہی ارباب احمد کی باتوں کا جواب دیئے جا رہی تھی۔
اس نے تو ارباب احمد سے کہا تھا کہ ہم اچھے دوست ہیں۔ اگر وہ اس کی اچھی دوست تھی تو پھر اس کی بات کو سننا بھی گوارہ کیوں نہ کیا۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا تھا۔ اگر وہ ارباب احمد سے محبت کی دعویدار ہے اور اس کی دوستی کو اپنی محبت اور محبت کو سچائی کے ترازو میں تولتی ہوئی عبادت تک کا درجہ دینا مانتی ہے تو پھر اس نے آج اپنے ایک اچھے

دوست کو ہی نہیں اپنے محبوب کو بھی ناراض کر دیا تھا۔ اسے اپنی عادت اور حرکت پر رہ رہ کر غصہ آنے لگا تھا۔ اب اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اڑ کر ارباب احمد کے پاس پہنچ جائے اور اس سے معذرت کرے اور اس کی بات تو سن لے کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مذاق ہی کر رہا ہو؟ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی کیونکہ یہ وہ وقت تھا جب ارباب احمد یونیورسٹی سے گھر پہنچ جاتا تھا۔

اس نے اپنے کمرے میں پڑے ہوئے فون سیٹ کا ریسیور اٹھایا اور ارباب احمد کے گھر کا نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ پہلی اور دوسری گھنٹی کے درمیان کا فاصلہ اسے قیامت لگ رہا تھا۔ چوتھی گھنٹی پر فون کسی نے ریسیو کیا تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے ارباب احمد کی آواز سن کر اس نے مخمور انداز میں آنکھیں بند کر لیں اور ارباب احمد کی آواز کا حظ اٹھانے لگی۔ ''ہیلو۔'' ارباب احمد پھر بولا لیکن وہ خاموش کھڑی رہی اور ریسیور کو چومنے لگی۔ ''ہیلو...... اگر کوئی بات ہی نہیں کرنی تو پھر فون کیوں کیا تھا جناب!'' ارباب احمد نے بمشکل اپنے غصے کو کنٹرول کیا ہوگا۔ شمسہ مسکرانے لگی۔

''جمیل...... یہ ریسیور پکڑو اور دیکھو کہ دوسری طرف سے کون ہے؟'' ارباب احمد نے اپنے ملازم کو ریسیور پکڑا دیا۔

''ہیلو جی...... کون ہوتسی جی؟'' جمیل کی آواز ابھری تو شمسہ نے بارعب آواز میں کہا۔

''میں شمسہ بول رہی ہوں۔''

''کون شمسہ جی؟'' جمیل ملازم کی آواز میں ادب نمایاں تھا مگر وہ شمسہ نام سے ناواقف تھا۔

''جمیل! اس شمسہ سے کہہ دو کہ مجھے اس سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔'' ارباب احمد کی آواز سن کر شمسہ کو دلی طور پر جھٹکا لگا اور وہ ریسیور کی طرف دیکھنے لگی جس کے ایئر پیس سے جمیل کی آواز ابھر رہی تھی الفاظ وہی تھے جو ارباب احمد نے ادا کئے تھے۔

رابطہ منقطع ہونے پر وہ آنکھوں میں آنسو بھرتی ہوئی خود سے ہی بولی۔

''شمسہ کی بچی اب تم بچی نہیں رہی ہو۔ تمہاری جلد بازی تمہیں مروا دے گی۔ تمہیں ارباب احمد کی بات سن لینا چاہئے تھی۔'' وہ روتی ہوئی بیڈ پر گر گئی۔ ''ارباب مجھے معاف کر دو۔ میں بہت گندی ہوں پلیز ارباب آئی ایم سوری...... سوری۔'' وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے کان پکڑتی ہوئی بول رہی تھی۔

اگلا دن شمسہ کے لئے حیران کن انکشاف لانے والا تھا وہ اس بات سے بے خبر یونیورسٹی پہنچی تو ارباب احمد اور مراد خان اسے گراؤنڈ میں ہی مل گئے۔ ہیلو ہائے کے بعد وہ بھی ان کے پاس گھاس پر ہی بیٹھ گئی۔ ''کیسے ہو مراد؟'' شمسہ نے پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''تم نے پوچھ لیا بس سمجھو ہر بیماری دور ہو گئی۔'' تینوں ہی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

ارباب احمد نے محسوس کیا تھا کہ شمسہ رات بھر سو نہ سکی ہے یا پھر صبح جلدی اٹھ کر کالج آ گئی ہے۔ اس نے مراد کو مخصوص اشارہ کیا تو وہ اٹھتا ہوا بولا۔

''میں آپ کے لیے ناشتہ بھجواتا ہوں اور خود بھی کچھ کھانے کی کوشش کروں گا۔'' اس کے آخری فقرے کی سمجھ ارباب کو تو آ گئی تھی لیکن شمسہ نہ سمجھ سکی اسی لیے مراد کے جانے کے بعد وہ ارباب احمد سے استفہامیہ انداز میں بولی۔

''کیا تم لوگ ناشتہ کیے بغیر ہی آ گئے ہو؟''

''ہاں بالکل اسی طرح جس طرح تم بغیر ناشتہ کے آ گئی ہو۔'' ارباب احمد اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا تو وہ نظریں جھکا گئی۔

''لیکن میں تو ناشتہ کر کے آئی ہوں۔''

''آنکھیں اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہیں جو کبھی جھوٹ نہیں بولتیں۔'' ارباب احمد کی نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ ''سچ بتاؤ...... ناشتہ کر کے آئی ہو یا نہیں؟''

''ارباب پلیز...... یہ کوئی اہم ایشو نہیں ہے۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''لیکن میرے لیے ہے کیونکہ......'' وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گیا تو تڑپتی مچلتی نظریں اک لحہ کو اٹھیں اور ارباب احمد کے دِل کو گھائل کرتی ہوئی پھر جھک گئیں۔

''کیونکہ؟'' وہ بولی۔

''کیونکہ میں نے بھی کل سے کچھ نہیں کھایا۔'' چونکنا اور لرزنا فطری امر تھا لیکن شمسہ نے بے اختیار ہو کر ارباب احمد کا ہاتھ پکڑ لیا یہ غیر ارادی اور جذباتی عمل تھا۔ ارباب احمد نے شمسہ کا ہاتھ دیکھا جو اس کے ہاتھ کو پکڑے ہوئے تھا۔

''مگر کیوں ارباب۔'' اتنا کہہ کر شمسہ کو احساس ہوا کہ وہ یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں ہیں اور ان کے اردگرد مستقبل کے ڈاکٹرز گھوم رہے ہیں وہ کوئی بھی سکینڈل بنا سکتے ہیں۔ اس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

''تم جو مجھ سے ناراض ہو کر گئی تھیں۔''

وہ اتنی بڑی بات سن کر بھونچکی رہ گئی اور قربان ہونے والی نظروں سے ارباب کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں بھی ناشتہ نہیں کر کے آئی۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''لیکن مراد کو کیا ہوا یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے بھی ناشتہ نہیں کیا اور وہ بھی کچھ کھانے کی کوشش کرے گا۔''

''مراد!'' ارباب احمد ہونٹوں پر مسکان سجاتا ہوا بولا۔ ''اسے کسی لڑکی سے پیار ہو گیا ہے۔''

شمسہ ہنسنے لگی۔ ''پیار ہو گیا ہے تو ناشتہ تو کرے...... کیا پیار یہ کہتا ہے کہ کچھ کھاؤ پیو نہ؟''

''مراد کا کہنا ہے کہ جب تک وہ لڑکی 'ہاں' نہیں کرے گی وہ کچھ نہیں کھائے پیئے گا۔'' ارباب احمد کی زبانی یہ انکشاف سن کر شمسہ کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی ہوئی کہ ایک لڑکی نے مراد خان جیسے نوجوان کی نیندیں اور بھوک اڑا دی ہے۔

''اور وہ لڑکی کیا کہتی ہے؟'' شمسہ نے پوچھا تو اتنی دیر میں کینٹین والا لڑکا ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے ان کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اصولی طور پر تو ان کو ناشتہ کینٹین پر ہی کرنا چاہئے تھا لیکن یونیورسٹیوں اور کالجز کے اصول سٹوڈنٹس کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ لڑکا ناشتہ رکھ کر چلا گیا تو پر تکلف اور مزیدار ناشتے نے دونوں کی بھوک کو اور

بھی چمکا دیا تھا۔

سلائس اور فرائی انڈوں کے ساتھ گرم گرم چائے نے ان کو تقویت پہنچانا شروع کر دی تھی۔ ارباب احمد کا یہی ذہن تھا کہ شمسہ اچھی طرح ناشتہ کر لے تو پھر مراد کے متعلق بات کرے گا۔ اگر ابھی بات شروع ہو گئی تو پھر اسے قوی امید تھی کہ ناشتہ چھوڑ چھاڑ کر شمسہ پھر سے ناراض ہو جائے گی۔

''وہ لڑکی مراد سے پیار کرتی ہے؟'' شمسہ نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کپ ٹرے میں رکھا اور ارباب سے مخاطب ہوئی۔

''میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی کسی اور سے پیار کرتی ہے۔'' ارباب احمد نے اس بار اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اسے وہ لڑکا بھی نظر آ گیا جس سے وہ پیار کرتی تھی۔ آنکھوں کی سچائی نے ارباب احمد کو اسی کی تصویر واضح کر کے دکھا دی تھی۔

''چچ چچ چچ...... بے چارہ مراد خان!'' شمسہ تاسف سے بولی۔ ''اب یہ کیا کرے گا اور وہ لڑکی کیا کرے گی۔''

''میں اس لڑکی سے پوچھوں گا کہ کیا وہ مراد خان سے پیار کرتی ہے؟''

''اگر وہ انکار کر دے گی تو پھر تم کیا کرو گے؟'' شمسہ دلچسپ کہانی کو آگے بڑھاتی ہوئی بولی۔

''میں اس لڑکی کی منت کروں گا۔'' ارباب احمد شمسہ کو اپنے طریقے سے مراد خان کے لئے قائل کرنے لگا تھا۔

''اگر وہ منت سے بھی نہ مانی تو؟''

''میں اسے پیار سے قائل کروں گا۔''

''پھر بھی فرض کرو اگر وہ نہ مانی تو؟'' شمسہ ضدی بچے کی طرح بولی۔ ''تو مراد خان بھوکا ہی رہے گا؟''

''وہ میرا دوست ہے۔ میں اسے بھوکا نہیں دیکھنا چاہتا...... میں اس لڑکی کو پیار کا واسطہ دوں گا۔'' اس بار ارباب احمد کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور شمسہ کی نظریں اس کے چہرے پر گڑھی ہوئی تھیں اس کی نظروں میں شوخی نہ تھی بلکہ کرب کی لکیریں نمایاں تھیں۔

''تم اس لڑکی کو اپنے پیار کو واسطہ دو گے جس سے مراد خان محبت کرتا ہے؟'' درد اور غم کا پیرہن اوڑھے ہوئے الفاظ شمسہ بمشکل ہی ادا کر پائی تھی۔

''ہاں شمسہ! میں اسی لڑکی سے محبت کرتا ہوں جس سے مراد خان شادی کرنا چاہتا ہے۔'' ارباب احمد نے اس بار محسوس کیا کہ شمسہ کی آنکھیں نم ہو گئی ہیں۔

''لیکن...... یہ سب کچھ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔'' وہ غصے سے اٹھی تو ارباب احمد کو بھی اٹھنا پڑا۔ شمسہ آگے آگے چلنے لگی تو ارباب احمد کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لئے۔

''تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' اس فقرے پر شمسہ کو خوشی کے شادیانے بجانے چاہئے تھے مگر وہ سوگ کی ردا اوڑھے ہوئے واپس مڑی اور ارباب احمد کی طرف دیکھنے لگی۔

''وہ تم ہو شمسہ! جس سے مراد خان شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ تم ہو شمسہ جس سے میں بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ دوستی اور محبت کی دو دیواروں کے درمیان میں پس کر رہ گیا ہوں شمسہ، میں کیا کروں؟'' ارباب احمد کی آنکھوں میں

آنسو تیرنے لگے تھے شمسہ تڑپ کر رہ گئی۔ وہ چند قدم اس کی طرف بڑھی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔
''میں مراد خان سے شادی نہیں کروں گی۔'' اس کا لہجہ اور الفاظ اس کے اٹل ارادوں کو ظاہر کر رہے تھے۔
''تو پھر یہ ڈھونگ بھی چھوڑ دو شمسہ کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔'' ارباب احمد کا بے رخی والا انداز اس کو اندر سے قتل کر گیا تھا۔
''میرا انکار ہی میری محبت کی سچائی کی دلیل ہے ارباب احمد!''
''محبت تو قربان ہونے کا نام ہے۔ دلیلوں سے قائل ہونے والی محبت نہیں سمجھوتہ ہوتا ہے۔''
''ارباب احمد اپنے دل کو چیرتے ہوئے محسوس کر رہا تھا وہ ان الفاظ کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ وہ ہر لحاظ اور اعتبار سے دوستی کی معراج کو بلند رکھنا چاہتا تھا۔
''یہ کیسی محبت ہے کہ ہر بار ہی قربانی لڑکی دے؟'' وہ کرب سے بولی۔
''نہیں اس بار تو لڑکا اپنی محبت قربان کرنے جا رہا ہے۔ ذرا سوچو تو سہی۔'' وہ مدلل انداز میں بولا تھا۔
''دوستی اور محبت میں سے ایک کو چن لو ارباب! ورنہ دیواروں میں اس بار لڑکی نہیں لڑکا چنوایا جائے گا۔'' وہ یہ کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی مگر ارباب احمد خالی خالی نظروں سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔
وہ اس کو آواز دے کر روکنا بھی چاہتا تھا اور روک بھی سکتا تھا لیکن نجانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ اب اس کی آواز شمسہ تک نہیں پہنچ پائے گی۔ یا پھر یہ ہوا ہے کہ شمسہ اس سے اتنی دور جا چکی ہے کہ اسے آواز دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ آنکھوں کی نمی کو چھپاتا ہوا واپس مڑا تو مراد خان کو آتا دیکھ کر ہونٹوں پر ہنسی لانے کی کوشش کرنے لگا۔
''کیا ہوا ارباب! مجھے تو لگتا ہے کہ شمسہ ناراض ہو کر گئی ہے۔'' مراد خان قریب پہنچ کر بولا۔
''میں نے اس سے تمہاری بات کر دی ہے۔ اب تم ایسا کرو کہ انکل اورنگزیب کو شمسہ کے گھر بھیجو۔''
''مجھے معلوم ہے کہ بابا کبھی بھی نہیں جائیں گے۔'' مراد خان مایوسی سے بولا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ شمسہ نے میرے بارے میں کیا کہا؟''
''کچھ نہیں...... بس غصے میں اٹھ کر چلی گئی ہے۔'' ارباب احمد کا خالی لہجہ مراد خان کے دل پر گھونسہ بن کر لگا تھا۔
''اگر مجھے شمسہ نہ ملی تو ارباب احمد...... میں اپنے آپ کو شوٹ کر لوں گا۔'' وہ جانے لگا تو ارباب اس کے پیچھے لپکتا ہوا اسے کندھے سے پکڑ کر بولا۔
''اتنی جلدی مت کرو یار...... مرنا تو ایک دن ہے ہی...... اس لڑکی کی خاطر مرنے پر تیار ہو گئے ہو؟''
''وہ میری زندگی بن گئی ہے ارباب میں راتوں کو سوتا ہوں تو میرے خواب اس کی امانت ہوتے ہیں۔ جاگتا ہوں تو وہ تصویر بن کر میرے سامنے آ جاتی ہے۔ نماز میں سجدہ تو خدا کو کرتا ہوں مگر آنکھوں کے سامنے شمسہ کی تصویر ہوتی ہے تو میں اپنی نماز اور تسبیح بھول جاتا ہوں۔ میرے سجدے غیر ارادی طور پر اتنے طویل ہو جاتے ہیں کہ دوسری نماز کا وقت ہو جاتا ہے۔ میں کیا کروں میرے یار میں کیا کروں؟'' مراد خان اس کے گلے لگ کر رونے لگا تو ارباب احمد اس کو دلاسہ دینے کے لئے اس کی کمر سہلانے لگا۔

''اتنا پیار کرتے ہو اس سے۔''

''بس...... یہ سمجھ لو کہ اسے ''رب'' نہیں کہہ سکتا۔''

''پھر مجھ پر بھروسہ رکھو...... اپنے اس دوست پر بھروسہ رکھو...... خدا کی قسم اگر تقدیر سے بھی لڑنا پڑا تو لڑ جاؤں گا۔لیکن تمہاری محبت تمہاری جھولی میں ضرور ڈال دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' ارباب احمد اس سے الگ ہو کر اسے دیکھے بغیر وہاں سے چل دیا۔

وہ تقدیر سے ٹکرانے چلا تھا۔خود تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر ادھر اُدھر کھیلنے کی وجہ سے اندر اور باہر سے ٹوٹ چکا تھا لیکن وہ دوستی کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔مراد خان اس کے بچپن کا دوست اور کلاس فیلو تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا اور کچھ بھی کرنے کا ارادہ اس نے کر لیا تھا۔

تقریباً ایک ہفتہ بعد وہ شمسہ سے ایک شاپنگ سینٹر میں ملا تو وہ اس سے ناراض لگ رہی تھی۔اس نے ارباب کو دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا لیکن وہ اس کے پاس پہنچا اور بولا۔

''اپنی محبت کسی دوسرے کی جھولی میں ڈالنے کے لئے جذبے اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' وہ روکھے انداز میں بولی۔

''لیکن میں ایسا کرنے پر تیار ہوں شمسہ!'' وہ مصمم ارادہ سے بولا۔''تم مراد خان سے شادی کر لو یہ میرا حکم ہے۔''

''میں تمہارا حکم کیوں مانوں؟''

''تو پھر یہ دعویٰ کیوں کرتی ہو کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔جھوٹ بولتی ہو تم۔ مجھے بھی دھوکا دے رہی ہو اور خود کو بھی دھوکا میں رکھا ہوا ہے۔ ذہنی مریض بنا کر رکھ دیا ہے تم دونوں نے مجھے۔'' ارباب احمد چیخنے لگا تو شاپنگ حال میں بہت سے لوگ ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔شمسہ کو لوگوں کی کوئی پرواہ نہ تھی وہ بے فکری سے دیکھتی رہی۔

''اب تم دیکھنا کہ میں کیا کرتا ہوں، کیا کرتا ہوں۔'' وہ جانے لگا تو شمسہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔''کیا کرو گے؟ مجھے مار دو گے، گولی مارو گے، ہاں بتاؤ کیا کرو گے؟''

''میں خود کو ختم کر لوں گا۔'' وہ یہ کہہ کر مال سے باہر نکل گیا لیکن شمسہ کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ گیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ارباب احمد اتنی بڑی بات یونہی نہیں کر سکتا وہ جو کہتا ہے وہی کر بھی جاتا ہے۔اس نے گھر پہنچ کر سوچنا شروع کر دیا۔وہ اتنی خود غرض کیوں ہو رہی تھی۔وہ اگر ارباب سے محبت کرتی ہے تو پھر یہ کیسی محبت ہے جو قربانی نہیں دے سکتی۔ یہ کیسی محبت ہے جو خود غرضی کے لبادے میں لپٹی ہوئی ہے۔ یہ کیسی محبت ہے جو محبوب کی بات ماننے سے انکاری ہے۔

لیکن اس نے تو ارباب احمد کو اپنا شریک زندگی دیکھا تھا۔ اس نے تو زندگی گزارنے کے لئے جس ساتھی کو اپنے سپنوں کا راجہ بنایا تھا وہ تو صرف ارباب احمد ہی تھا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر جس شخص کو من کے مندر میں پوجا تھا وہ صرف ارباب احمد تھا۔زندگی گزارنے کے سہانے خواب اس نے ارباب احمد کے ساتھ میں ہی دیکھے تھے۔وہ مراد خان سے پیار نہیں کرتی تھی۔ وہ تو صرف ان کا دوست تھا ان کا کلاس فیلو تھا۔وہ برا نہ تھا مگر دل کو تو ارباب احمد اچھا لگا

تھا۔

وہ کیا کرے؟ اگر محبت قربان کرتی تھی تو ارباب احمد اس کا نہ ہوسکتا تھا۔ اگر وہ قربانی نہ دیتی تھی تو پھر اس کی محبت ایک طعنہ بن کررہ جاتی تھی۔ وہ محبت کو ذلیل ورسوا کرتی تو پھر دل کونظروں میں ہمیشہ کے لئے گر جاتی تھی۔ اگر وہ محبت کو بھینٹ دیتی تو پھر ارباب احمد کھو جاتا تھا۔

وہ عجیب سے مخمصے میں الجھ کررہ گئی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ اپنا سر اس گھر کی دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش کر لے اور جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ لیکن خودکشی تو مذہب میں حرام ہے اور محبت کی یہ بھی توہین ہے کہ محبت کو تنہا چھوڑ کر بیچ راستے ہی سے فرار اختیار کرلیا جائے۔

وہ ارباب احمد کو صحیح صحیح بتا ہی نہ سکی تھی کہ وہ اس سے کتنا پیار کرتی ہے۔ اس نے پیار کو ایمان اور محبت کو عبادت سمجھ کرارباب احمد کو دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ اب چاہت کو سچ ثابت کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ وہ سچی تھی تو پھر قربانی سے کیوں ڈرتی تھی۔ اگر وہ جھوٹی ہے تو پھر ارباب احمد ہو یا کوئی اور ہو پھر کیا فرق پڑتا ہے؟

نہیں نہیں وہ سچی ہے اور ارباب احمد کو یہ باور کرا کے ہی رہے گی کہ وہ محبت کرتی ہے اور محبت کی عظمت کو عقیدت اور عبادت میں بدلنے کے لئے وہ اپنے محبوب کی بات مانے گی۔ وہ اسے خوش کرنے کے لئے تپتے صحرا میں ننگے پاؤں بھی چلنے کو تیار ہے۔ وہ آگ کے کئی دریا عبور کرنے کے لئے خود کو تیار کر چکی تھی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ ارباب احمد اس کی آنکھوں کے سامنے ہی رہے اس کا دیوتا بن کر وہ سامنے بیٹھا ہی رہے اور وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی پرستش کرتی رہے۔ ایسا اسی صورت میں ممکن تھا کہ اگر ارباب احمد زندہ ہوتا۔

جس طرح وہ ناراض ہوکر گیا تھا اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے یا پھر کیا کر جائے گا۔ کیونکہ شمسہ کو اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار اس نے کالج میں مذاق میں ہی ارباب احمد سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ کہے تو کیا ارباب احمد کالج کی بلڈنگ سے کود سکتا ہے؟

ارباب احمد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور بھاگتا ہوا بلڈنگ پر چڑھ گیا تھا اور چھلانگ لگا دی تھی۔ بس دو تین ماہ تک بستر پر رہنے کی وجہ سے چلنے پھرنے کے قابل ہوا تھا۔ یہ تو اچھا تھا کہ بلڈنگ پرانی تھی اگرچہ جدید دور کی ہوتی تو اونچائی بھی زیادہ ہوتی اور آج ارباب کی روح کو ایصال ثواب پہنچانے کے لئے اس کی تربت پہ لوگ حاضری دے رہے ہوتے۔

اب بھی وہ جس خطرناک ارادے اور موڈ سے باہر گیا تھا شمسہ کو رہ رہ کر یہی خوف ستار ہا تھا کہ وہ کچھ الٹا سیدھا کام نہ کر بیٹھے ورنہ شمسہ خود کو ساری زندگی معاف نہ کر پائے گی۔ اس نے تو ارباب احمد کی زندگی اور سلامتی کی دعائیں مانگی تھیں اگر وہ آج کوئی کام غلط کر بیٹھتا ہے تو اس کی ذمہ دار شمسہ ہی ہوتی۔ اس نے ارباب احمد کے گھر فون کرنا شروع کر دیا لیکن کافی دیر تک فون بجتا رہا اور کسی نے بھی کال ریسیو نہ کی تھی۔ ایسا کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ ملازم جمیل کی ڈیوٹی ہی یہی تھی کہ وہ پہلی یا دوسری گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھا کر کال سنتا تھا۔ لیکن آج کیا ہو گیا تھا۔ وہم اور خدشے اس کی پریشانی کو بڑھانے لگے تھے۔ وہ رات شمسہ پر قیامت بن کر گزری تھی کیونکہ وہ رات بھر ارباب کے گھر فون کرتی رہی لیکن کسی نے بھی فون اٹینڈ نہ کیا تھا۔ آنکھوں اور انتظار کی سولی پر لٹکتے ہوئے رات گزری تو اس

نے صبح صبح ہی ارباب کے گھر کا نمبر ڈائل کیا تو دوسری تیسری بیل پر ہی جمیل کی آواز سنائی دی۔
''ہیلو جی کون؟''
''شمسہ بول رہی ہوں، کہاں تھے تم لوگ میں کل سے فون کر رہی ہوں۔'' شمسہ اپنے غصے کو قابو میں کرتی ہوئی بولی۔
''ہم لوگ تو کل سے ہسپتال میں تھے میڈم!'' جمیل کی بات سن کر اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔ وہ انجانے خدشات کو بالائے طاق رکھتی ہوئی بولی۔
''ہسپتال......مگر کیوں؟''
''وہ جی......آپ کو نہیں پتہ؟''
''پہیلیاں مت بجھواؤ جمیل جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔ ہسپتال میں کون ہے؟'' وہ روہانسی ہو گئی تھی اور اس کی آواز بھی پھٹ گئی تھی۔
''وہ جی ارباب صاحب نے کالج کی بلڈنگ سے چھلانگ لگا دی ہے اور ان کی حالت خطرے میں ہے جی۔'' جمیل سے جو بھی جواب بن پڑا تھا اس نے دے دیا لیکن شمسہ کے دل و دماغ پر بم گر رہے تھے۔ یہ سن کر کہ ارباب نے کالج کی عمارت سے کود کر جان دینے کی کوشش کی تھی لیکن کیوں؟ ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا اور جمیل نے بتا دیا کہ وہ کون سے ہسپتال میں ہے۔
وہ بھاگنے والے انداز میں گھر سے نکلی تھی حالانکہ گھر میں اس کی اپنی گاڑی بھی کھڑی تھی لیکن اس کو اس بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ وہ مین روڈ پر آئی تو ٹیکسی والے کو ہسپتال کا بتا کر دعا کرنے لگی کہ ارباب احمد کو کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ یہ سب جمیل نے جھوٹ بولا ہو۔ یا پھر ارباب احمد کو کوئی چوٹ نہ لگی ہو اور یہ بھی دعا کر رہی تھی کہ ارباب احمد کے پاس جلد از جلد پہنچنے کے لئے اس ٹیکسی کو پر لگ جائیں اور وہ اڑتی ہوئی ہسپتال پہنچ جائے۔
اس نے ارباب احمد کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی تھی وہ اس کی مجرم تھی اگر ارباب احمد کو کچھ ہو گیا تو وہ اس کی قاتل ہو گی۔ وہ تاحیات اپنے آپ کو اس قصور پر معاف نہیں کرے گی۔ اس جرم کی سزا قانون تو بعد میں دے گا یا بعد میں دینے والا تھا لیکن شمسہ کو ضمیر کی عدالت نے اپنے کٹہرے میں طلب کر لیا تھا لا علاج مرض محبت نے اس کے خلاف گواہیاں دینا شروع کر دی تھیں جس میں سب سے بڑا طعنہ اس کی خود غرضی کا تھا۔
''میڈم ہسپتال آ گیا ہے۔'' ڈرائیور کی آواز نے اسے چونکا دیا تو وہ کرایہ ادا کرتی ہوئی اتری اور جمیل کے بتائے ہوئے کمرہ میں چلی گئی۔ جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو سامنے ہی بیڈ پر ارباب احمد لیٹا ہوا تھا جس کا سر منہ اور جسم پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور وہ بے ہوش تھا۔ اس کے سرہانے کی طرف اس کی ماں دولت بی بی بیٹھی تسبیح کر رہی تھیں وہ بھی شمسہ کو دیکھ کر حیران رہ گئیں کیونکہ اس طرح کسی نوجوان لڑکی کا کمرے میں آ جانا اس کے لئے حیرانگی کا باعث ہی تھا۔ ''کون ہو بیٹی؟''
شمسہ پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو جاتی اگر وہ دولت بی بی کی آواز پر نہ چونکتی۔
''میں شمسہ ہوں......ارباب کے ساتھ کالج میں پڑھتی ہوں۔'' اتنا سننا تھا کہ دولت بی بی کی آنکھیں اور تیور

بدل گئے وہ غصے سے اٹھیں اور شمسہ کا بازو پکڑتی ہوئیں کمرے سے باہر لے آئیں اور اپنے پرس سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا اور غصے سے پھنکارتی ہوئی بولیں۔

''اگر میرے بیٹے کو کچھ ہو گیا......تو یاد رکھنا روز محشر تمہارا گریبان میں نہیں بلکہ وہ محبت پکڑے گی جو ارباب احمد نے تم سے کی ہے۔'' شمسہ حیرانگی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی اس کے ہاتھ میں جو کاغذ تھا پتہ نہیں اس پر کیا لکھا تھا لیکن دولت بی بی جو کچھ بھی کہہ رہی تھیں وہ اس بات کو ثابت کرتا تھا کہ ارباب احمد نے اپنی ماں کو ضرور بتا دیا ہے کہ وہ کسی شمسہ نامی لڑکی سے محبت کرتا ہے اور یہ خط اسی کو دینا ہے۔

''محبت......اونہہ......'' دولت بی بی کا غصہ ہنوز قائم تھا ان کی آواز اگرچہ ہلکی تھی مگر لہجہ اور الفاظ آگ برسا رہے تھے۔ ''جاؤ جاؤ لڑکی......تم محبت کے معنی ہی نہیں جانتی ہو......تم جیسی لڑکیاں تو محبت کی توہین ہوتی ہیں...... جاؤ......پہلے قربان ہونا سیکھو پھر اس فیلڈ میں آنا۔ یہ جگہ یہ شعبہ تم جیسی امیر زادیوں کے لئے نہیں ہے......محبت کی عظمت سیکھنی ہے تو میرے اس بیٹے سے سیکھو جس نے دوستی کی معراج کو بلند رکھنے کے لئے اپنی محبت کی قربانی اپنی جان قربان کر کے دینے کی کوشش کی ہے۔ جاؤ چلی جاؤ'' دولت بی بی غصے میں ہی دوبارہ کمرے میں چلی گئیں۔

شمسہ روتے ہوئے برآمدے میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں رم جھم برسات برسا رہی تھیں اور وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو کر دھاڑیں مارنے لگی وہ دیواروں سے سر ٹکرانے لگی تو کسی نے اپنا ہاتھ اس کے ماتھے کے آگے رکھ دیا اور کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر دبایا تو وہ مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔ وہ مراد خان تھا جس کی آنکھوں میں پیار ہی پیار جھلک رہا تھا۔

''ایسا کیوں کر رہی ہو شمسہ؟''

''میں نے اسے مار دیا ہے مراد میں اس کی قاتل ہوں۔ میں نے اسے مار دیا ہے۔'' وہ ہذیانی انداز میں روتی ہوئی مراد خان کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

''تم فکر نہ کرو اسے کچھ نہیں ہوگا۔ میں موت سے لڑ کر بھی اسے چھین لوں گا۔'' مراد خان کے لہجے کی سچائی نے نظریں اٹھا کر شمسہ کو دیکھنے پر مجبور کیا تو وہ چونک گئی اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی کہ وہ کب مراد خان کے اتنا قریب آ گئی تھی کہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر اپنا غم ہلکا کرنے لگی تھی۔ وہ روتی ہوئی وہاں سے نکلی اور گھر جانے کے لئے ٹیکسی رکوائی۔

اسے خبر نہ تھی کہ ارباب احمد اس کے انکار پر اتنا اہم قدم اٹھا لے گا۔ اس کی زندگی موت سے جنگ لڑ رہی تھی اور نامعلوم کہ جیت زندگی کی ہوتی ہے یا موت کی۔ شمسہ اس بات سے بے خبر تھی لیکن وہ بڑی حد تک اس تمام حادثے کی ذمہ دار خود کو ہی سمجھتی تھی۔ اس کی آنکھیں رم جھم برسات کا منظر پیش کرنے لگی تھیں۔ وہ گھر پہنچ کر اپنے کمرے میں پہنچی تو ضبط کے سبھی بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو بیڈ پر گرا لیا اور آنسوؤں کی موجیں لگ گئیں۔

کچھ دیر بعد رو رو کر جی ہلکا ہوا تو اسے اس کاغذ کا خیال آیا جو دولت بی بی نے اسے تھمایا تھا۔ اس نے مڑے تڑے کاغذ کو بہت احتیاط سے کھولا وہ تڑپ کر رہ گئی کیونکہ اس پر ارباب احمد کا خون جگہ جگہ لگا ہوا تھا۔ تحریر کچھ یوں

تھی۔

''ڈیئر شمسہ! میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بے حد پیار کرتی ہو اور یہ پیار ہی ہے جو تمہیں اس خوف میں مبتلا کر رہا ہے کہ تم میری نہیں ہو رہی ہو۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مراد تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ کیونکہ شاید وہ تمہیں مجھ سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔ میں نے اور مراد نے شرط لگائی تھی کہ جو بھی شمسہ سے زیادہ پیار کرتا ہے وہ کالج کی عمارت سے چھلانگ لگا کر اس بات کا ثبوت دے گا کہ اس کا پیار سچا ہے۔ شمسہ میں مراد سے بھی بہت پیار کرتا ہوں میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں شمسہ سے نفرت کرتا ہوں۔ اس نے مجھ سے اس بات کا ثبوت مانگا ہے لیکن کیا کروں...... اب جھوٹ کو سچ ثابت کرنا بہت مشکل نظر آ رہا ہے۔ اسی لئے اپنی جان دے رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہارے پیار کے قابل نہیں تھا اور ویسے بھی محبت قربانی مانگتی ہے۔ تم نے کہا تھا نا کہ ہر بار لڑکی ہی قربانی کیوں دے چلو اس بار لڑکا قربانی دے کر اپنی محبت کو امر کر رہا ہے۔ شاید اس طرح محبت کی نظروں میں میں خود کو سرخرو کر سکوں۔ خدا حافظ۔ فقط ارباب احمد''

وہ خط کو بار بار چوم رہی تھی اور آنسوؤں سے اس ندامت کے داغ کو دھونے کی کوشش کرنے لگی تھی جو اس نے بے خیالی میں محبت کے اجلے دامن پر لگا دیا تھا۔ وہ البم نکال کر ارباب احمد کی تصویروں کو چومنے لگی۔ میں تمہاری ہر بات مانوں گی ارباب احمد۔ پلیز لوٹ آؤ'' وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی تھی۔

''ارباب احمد تمہیں خدا کا واسطہ، تمہیں محبت کا واسطہ پلیز لوٹ آؤ۔ میں مراد سے شادی کروں گی۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی کروں گی۔ مجھے یوں چھوڑ کر مت جاؤ۔ مجھ سے روٹھ کر مت جاؤ اور ارباب احمد میں مر جاؤں گی میں تمہارے بنا زندہ نہیں رہ سکتی۔'' اس نے البم اور خط دراز میں رکھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ارباب احمد پٹیوں میں لپٹا ہوا بیڈ پر پڑا تھا اور دولت بی بی اس کے سرہانے بیٹھی تسبیح کر رہی تھیں۔ ''ارباب احمد!'' وہ پھر پھٹ پڑی۔ ''میری محبت سچی ہے۔ میں نے تمہیں چاہا ہے۔ اگر میری محبت میں سچائی اور عبادت شامل ہوئی تو مجھے یقین ہے کہ تم میرے ضرور ہو گے۔ میرے خوابوں کو تعبیر ملے گی۔ میں تمہاری دلہن بنوں گی۔ میں تمہاری سیج سجاؤں گی۔ تمہاری پالکی میں بیٹھ کر تمہارے گھر ضرور آؤں گی۔ لیکن اب تقدیر نے جو چال چلی ہے میں اس چال میں مات کھا گئی ہوں۔ لیکن ایک دن میرا ہو گا اور اس دن تقدیر میری چوکھٹ پر سوالی بن کر کھڑی ہو گی۔ وہ دن میرا ہو گا۔ اس دن فیصلے کا اختیار مجھے ہو گا...... میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کروں گی۔ مگر اب تمہاری بات تمہاری رضامندی تمہاری خواہش اور تمہاری آرزوؤں کا جال تقدیر نے جس طرح بچھایا ہے میں اس میں پھنس چکی ہوں۔ میرا بدن تو مراد خان کا ہو گا مگر روح تمہاری ہو گی مراد مجھے اپنا تو سکے گا مگر حاصل نہ کر سکے گا۔ کبھی نہیں...... کبھی نہیں...... کبھی نہیں۔'' وہ یہ کہتی ہوئی کرسی سے گری اور بے ہوش ہو گئی۔

O.....❖.....O
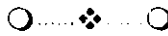
ارباب احمد کو آج آٹھواں روز تھا اسے ہوش آ گیا تھا لیکن سر میں کافی گہری چوٹیں ہونے کی وجہ سے وہ اٹھ کر نہ بیٹھ سکتا تھا۔ مراد خان نے اس کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ دولت بی بی نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ مانگ کر بیٹے کی زندگی موت سے چھین لی تھی۔ ڈاکٹرز اب مطمئن تھے اور ایسے ہی آثار اور تاثرات دولت بی بی

اور مراد خان کے چہرے پر بھی تھے۔ ارباب احمد اب آہستہ آہستہ بول سکتا تھا۔ وہ مراد خان سے کوئی نہ کوئی بات پوچھ لیتا تھا اور اس کی بات پر مسکرانے کی کوشش کرتا تھا۔

''اب تم اورنگزیب انکل کو شمسہ کے گھر بھیجو۔'' وہ آہستگی سے بولا تو مراد خان نے تھوڑا سا جھک کر اس کی بات سنی اور نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ ''تم اچھی طرح ٹھیک ہو لو۔ اصل سلسلہ میں پھر بات کریں گے۔''

''مری مانو تو آج کل ہی میں انکل کو کریم خان کے گھر بھیج دو۔ اگر وقت ہاتھ سے نکل گیا تو ہاتھ سے ملتے رہ جاؤ گے۔'' ارباب احمد اس کو سمجھا رہا تھا اور مراد خان کی سمجھ میں اس کی بات آ گئی تھی۔

''میں ابا جی سے بات کروں گا۔'' وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔'' اور باہر نکل گیا۔

ارباب احمد کی نظریں دروازے پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ اسے جس کا انتظار تھا وہ دروازے سے داخل ہوئی تو اس کی حالت دیکھ کر ارباب احمد کو بہت دکھ ہوا۔ الجھے اور پریشان بال ہونٹوں اور گالوں کی قدرتی سرخی غائب ہو چکی تھی۔ آنکھوں کی ویرانی بتا رہی تھی کہ وہ کئی راتوں سے نیند کو ترس گئی ہیں۔ شکن زدہ لباس نے محبت کی انتہا کا بھید کھول دیا تھا۔ ارباب احمد کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر گالوں پر بہہ گئے۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے بیڈ کے پاس پہنچی اور ارباب احمد کا ہاتھ پکڑ کر اسے ہونٹوں سے لگایا اور آنسوؤں کی زبان میں کہنے لگی۔

''محبت کے اظہار کا کتنا غلط طریقہ اپنایا ہے تم نے ارباب احمد۔''

''میں مجبور تھا۔ دوستی اور محبت کی جنگ میں میں اس مقام پر کھڑا تھا جہاں ننانوے پر سانپ اپنا منہ کھولے کھڑا تھا اور نیچے سیڑھی پر دوستی سسک اور بلک رہی تھی...... میں کیا کرتا۔ اگر ایک ہی چھلانگ میں سو پر پہنچ جاتا تو دوستی ہار جاتی۔ میں نے خود کو سانپ سے ڈسوایا تا کہ دوستی محبت کی سیڑھی پر چڑھ کر سو تک پہنچ سکے اور اپنی منزل پا لے۔''

''لیکن اس کھیل میں میں کہاں ہوں ارباب احمد!'' وہ آنسوؤں کو اس کے سینے پر گراتی ہوئی بولی۔ وہ دھیرے سے کربناک مسکان ہونٹوں پر سجاتا ہوا بولا۔ ''سو کے بعد وہ منزل تم ہی تو ہو۔'' اتنا بڑا رتبہ اس نے شمسہ کے لئے سوچا تھا وہ زار و زار رونے لگی۔

''ارباب احمد!'' وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر روتی ہوئی بولی۔ ''تم نے اپنی جان دینے کی کوشش کر کے میری زندگی خرید لی ہے۔ اب یہ زندگی تمہاری امانت ہے۔ جیسا کہو گے ویسا ہی کروں گی۔ میں مراد خان سے شادی کے لئے راضی ہوں.....صرف اس شرط پر کہ تم زندہ رہو گے۔ میرے ہو کر۔''

ارباب احمد دھیرے سے مسکرایا اور آہستگی سے بولا۔

''تم نے میرا مان رکھ لیا ہے شمسہ! میں اللہ کے حضور سرخرو ہو گیا ہوں کہ میں نے دوستی نبھانے کی جو قسم کھائی تھی وہ پوری کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔'' اس نے زخمی ہونٹوں سے شمسہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر کہنے لگا۔ ''میں تمہارا احسان کبھی بھی نہیں بھولوں گا۔'' وہ تڑپ کر اٹھی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

''محبت کو احسان جیسے چھوٹے لفظ کے سامنے شرمندہ نہ کرو..... میری محبت کی سچائی ایک نہ ایک دن مجھے صلے میں تمہیں ضرور سونپے گی۔'' وہ اٹھ کر جانے لگی تو وہ دھیرے سے بولا۔

''تمہیں جیت مبارک ہو شمسہ! تم نے ارباب احمد کو اپنی عظیم قربانی سے شکست دے دی ہے۔'' وہ تڑپ کر

مڑی اور اس کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے چومتی ہوئی بولی۔

''میں دوسروں کی جیت پر ماتم نہیں منایا کرتی بلکہ شادیانے بجا کر ان کی جیت کا حصہ بننے کی کوشش کرتی ہوں۔ جلدی ٹھیک ہو جاؤ...... میری شادی آنے والی ہے۔'' آخری پانچ الفاظ آنسوؤں سے نہیں بلکہ خون میں بھیگے ہوئے تھے۔ اس کے تھرتھراتے ہونٹوں سے یوں لگ رہا تھا کہ ابھی لفظوں کے ساتھ یہی خون بھی اُگلا جائے گا۔ لیکن اس کو کمال حاصل تھا وہ ضبط و تحمل میں پی ایچ ڈی کر چکی تھی۔ وہ باہر نکل گئی اور ارباب احمد کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے گریبان میں جذب ہونے لگے تھے۔

''اس سے اگر اتنا ہی پیار کرتے ہو تو پھر اسے خود ہی مراد خان کی ہونے کے لئے زور کیوں دے رہے ہو؟''

یہ دولت بی بی تھیں جو شمسہ کے جانے کے بعد کمرے میں اس طرح داخل ہوئی تھیں کہ ارباب احمد کو پتہ بھی نہ چل سکا تھا۔ ان کی بات سن کر ارباب احمد نے آنکھیں کھولیں اور کرب سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''اس شکست میں جو لطف ہے وہ شمسہ کو پالینے کے بعد اس جیت میں نہ ہوتا۔''

''تو پھر رو کیوں رہے ہو؟'' دولت بی بی بیٹے کے آنسو پونچھتی ہوئی بولیں تو ان کی آواز بھرا گئی۔

''رو تو اس لئے رہا ہوں کہ میں نے مراد خان کو شکست دے دی ہے۔ وہ میرا دوست ہے ماں جی اور اس کی شکست پر دل کے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہیں۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ میں نے دوستی کی سربلندی کے لئے کون سی چال چلی ہے...... بس ماں جی...... شمسہ کی شادی مراد سے ہو جائے یہی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔''

دولت بی بی نے منہ میں سبق پڑھ کر بیٹے کے چہرے پر پھونک ماری۔ ادھر مراد خان دروازے کے باہر کھڑا ماں بیٹے کی گفتگو سن کر آنسو بہا رہا تھا۔ ارباب احمد پکا جواری تھا۔ اس نے بہت گہری چال چل کر دوستی کی معراج کو بلند رکھا تھا۔

مراد خان کی جیت کے لئے اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر بھی شمسہ کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ مراد خان سے شادی کر لے۔ اب اگر مراد خان اس شادی سے انکار کرتا تھا تو یقیناً ارباب احمد کی موت واقع ہو جاتی۔ کیونکہ وہ کتنا جذباتی تھا اس بات کا اندازہ مراد خان کو ہو گیا تھا۔

مراد خان عجیب سے مخمصے میں پڑ گیا تھا۔ وہ ارباب احمد کو نہ بتا سکتا تھا کہ اس نے ماں جی کی وہ گفتگو سن لی ہے جو انہوں نے ارباب احمد سے کی ہے۔ شمسہ سے شادی کروانے کے لئے تو ارباب احمد نے ہسپتال کا منہ دیکھا تھا بلکہ اجل سے باتیں کی تھیں۔ اب شمسہ سے شادی کر کے وہ بھی ارباب احمد کی بات کی لاج رکھے گا۔ اس کے پاس یہی ایک حل تھا۔

وہ بھی اپنی دوستی کو خراج پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس شادی کو دھوم دھام سے کر کے زبیدہ کی شادی سے جو داغ اس کے خاندان پر لگا تھا اس کو دھونے کی پوری کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اورنگزیب کو تیار کر لیا تھا کہ وہ شمسہ کے والد کریم خان سے جا کر بات کریں۔ سہانا بیگم نے بھی بیٹے کی ضد کے آگے ہار مان لی تھی اور سب سے بڑی بات اور گارنٹی تو ارباب احمد کی تھی جسے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا مشن سونپا گیا تھا اور وہ باعزت اپنے کام میں سرخرو ہو گیا تھا۔

O.....❖.....O

کریم خان با آسانی مان گئے تھے کیونکہ اورنگزیب ان کے بڑوں کے جاننے والے نکل آئے تھے اور پھر ان کو یہ بات بھی اطمینان دے رہی تھی کہ شمسہ نے بھی ہاں کر دی تھی۔ لیکن تعلیم کا مسئلہ آڑے آ رہا تھا۔ مراد خان نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ شمسہ شادی کے بعد بھی تعلیم جاری رکھ سکتی ہے اسے تو یہیں تک پڑھنا تھا اب وہ اپنی تعلیم مزید جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ ارباب احمد بھی تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ اس کے کلاس فیلوز اور رشتہ دار وغیرہ اس کی تیمارداری کے لئے آتے رہے تھے۔ دولت بی بی نے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر بیٹے کی زندگی واپس لے لی تھی۔

آج مراد خان کی مہندی تھی۔ پوری گلی میں چراغاں کیا گیا تھا۔ مصنوعی روشنیوں کا ایک سیلاب تھا جو کہ اس گلی میں آ گیا تھا۔ برقی قمقموں نے اپنی رنگینی سے مزید حسن پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ گلی کے دونوں اطراف میں لائٹیں اس طرح لگائی گئی تھیں جیسے کہ زمین سے اگ رہی ہوں۔ الیکٹریشن اپنے کام میں ماہر تھا اس نے پوری گلی کے حسن کو مزید چار چاند لگانے کے لئے تمام گھروں کو بھی سجا دیا تھا گویا روشنیوں کی ایک فصل تھی جو اس گلی میں زمین سے اُگی تھی اور آسمان تلک جانے کی تگ و دو میں تھی۔ اسی طرح ڈھولچی بھی اپنے ڈھول تیار کر کے بیٹھے تھے۔ وہ اپنے ڈھول کی تھاپ چیک کرنے کے لئے وقفے وقفے بعد ''ڈگا'' لگا دیتے تھے اور پھر مراد خان کے دوستوں میں پارہ بھر جاتا تھا۔ لیکن ابھی مراد خان گھر سے باہر نہ آیا تھا۔

سرد اور خشک رات بیت رہی تھی لیکن یہاں کسی کو اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ موسم کی شدت کیا کہہ رہی ہے کیونکہ بہت سوں نے تو اپنے بدن کو گرمانے کے لئے شراب کی خدمات لے رکھی تھیں یہ تو وڈیروں اور امیروں کا عام مشروب تھا۔ مراد خان کے رشتہ دار اور دوست احباب سبھی امیر اور تگڑے بندے تھے۔ اورنگزیب نے اپنی عزت و آبرو قائم رکھنے کے لئے پینے پلانے کا بہت اچھا اور اعلیٰ اہتمام کر رکھا تھا۔ آخر اُن کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔ وہ اپنی خوشیاں اور ارمان اس شادی پر پورے کر لینا چاہتے تھے کیونکہ زبیدہ نے ان کی پگڑی میں جو کالک مل دی تھی وہ کسی بھی طرح نہ ڈھل سکی تھی۔ وہ زبیدہ کی شادی بھی اسی طرح دھوم دھام اور عزت سے کرنا چاہتے تھے لیکن زبیدہ کی مرضی اور جلد بازی نے ان کی عزت خاک میں ملانے کے لئے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

سہانا بیگم تو خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں کیونکہ شمسہ ان کے بیٹے کے ساتھ بہت جچی تھی۔ وہ جب سے شمسہ کو دیکھ کر آئیں تھیں ان کے تو پاؤں ہی زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ وہ تو چاہتی تھیں کہ کب نکاح ہو اور شمسہ اس گھر کی بہو بن کر ان کے سونے آنگن میں اپنی مسکراہٹوں کے پھول بکھیرے۔ انہوں نے بیٹے کی بلائیں لیں اور مراد کے ساتھ کھڑے ارباب احمد کو بھی دعائیں دیں تو وہ گھر سے باہر نکل کر گلی میں آ گئے۔ پھر کیا تھا ڈھولچیوں نے ڈھول کو بجانا اور تڑپانا شروع کر دیا تھا۔ یار دوست بھڑکیں مارتے ہوئے آگے بڑھے اور مراد خان کو کندھوں پر اٹھا لیا۔ ڈھول کی تھاپ پر رقص ہونے لگا تو ہر کوئی اپنے اپنے انداز سے اس میں اپنا حصہ ڈالنے لگا۔ شراب کا نشہ اور پھر ٹھنڈی رات نے ان کے دل و دماغ کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ اسلحہ اور فائرنگ کا بے دریغ استعمال اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ واقعی شادیاں ایسے ہی ہوتی ہیں۔ غریب غرباء تو شادی محض رسمیں نبھانے کے لئے کرتے ہیں۔

ناچ گانا اور بھنگڑا صبح تک جاری رہا ارباب احمد چونکہ ناچ نہیں سکتا تھا اس لئے وہ ان ساری رسومات سے لطف اندوز ہونے کے لئے مراد خان کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ ارباب احمد وہ واحد فرد تھا جو بلا روک ٹوک اورنگزیب کے گھر کے اندر آ جا سکتا تھا اب بھی وہ کسی کام سے ہی اندر آیا تھا کہ اس کا سامنا زبیدہ سے ہو گیا جس کے ماتھے پر تیوری پڑ جانا فطری عمل تھا کیونکہ ارباب احمد ہی وہ شخص تھا جو اس کے بیٹے کو اس کی گود سے نکال کر لے گیا تھا حتیٰ کہ اس میں ارباب احمد کی مرضی شامل نہ تھی وہ تو صرف حکم کا غلام تھا اس نے وہ کام بھی دوستی کے لئے کیا تھا اور زبیدہ کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ارباب احمد کی وہ نیکی اس کے گلے پڑنے والی ہے۔ وہ آنکھ بچا کر نکلنے لگا تو زبیدہ کی آواز پر رک جانا پڑا۔

''سنو ارباب احمد!'' وہ پیچھے کی جانب پلٹنے کی بنائے وہیں کھڑا رہا۔ مہمانوں سے گھر بھرا ہوا تھا اور لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر گیت گا رہی تھیں۔ ارباب احمد کو زبیدہ کی ہر بات کا جواب تحمل اور صبر سے دینا تھا کیونکہ وہ مراد خان کا بہترین دوست بھی تھا اور اس گھر کا خیر خواہ بھی تھا۔ زبیدہ گھوم کر اس کے سامنے آ گئی تو اس نے نظریں جھکا لیں اور بولا۔

''جی ..... کہو کیا بات ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی غصے سے بولی۔

''میری کوکھ اجاڑ کر سکھ اور چین کا سانس تمہیں بھی نصیب نہیں ہو گا ارباب احمد!'' زبیدہ کا لہجہ گو کہ دھیما ہی تھا لیکن الفاظ زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح ارباب احمد کے کلیجے کو چھلنی کر رہے تھے۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو وہی کیا جو مجھے مراد نے کرنے کو کہا تھا۔'' ارباب احمد مہمان لڑکیوں کی طرف دیکھتا ہوا زبیدہ سے بولا۔

''میری زندگی اجیرن بنا کر مراد خوشی سے کس طرح رہ سکتا ہے۔'' وہ ایک بار پھر ناگن کی طرح پھنکاری تھی۔''میں اس کی زندگی جہنم بنا دوں گی..... اور تم دیکھنا..... تم دیکھنا کہ شمسہ اس گھر میں کتوں سے بھی بدتر زندگی گزارے گی۔''

''زبیدہ!'' ارباب احمد یک دم چلایا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ زبیدہ کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیتا لیکن اسے حالات اور مقامات کی نزاکت کا احساس تھا اس لئے وہ خود پر قابو پاتا ہوا بولا۔

''اس میں شمسہ کا کیا قصور ہے؟''

''وہی قصور ہے جو میرے بیٹے کا تھا۔'' وہ تنک کر بولی۔

''وہ ناجائز تھا۔''

''میرے پیار کی توہین کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے ارباب احمد!'' زبیدہ ناگن بنی ہوئی تھی اور اس وقت ارباب احمد کا وہاں سے جانا ہی بہتر تھا۔ وہ آگے بڑھنے لگا تو زبیدہ کی آواز نے اس کے کانوں میں سیسہ انڈیلا۔

''سنا ہے..... شمسہ تم سے محبت کرتی ہے؟'' وہ یہ الفاظ سن کر تڑپ کر مڑا تو سر کا درد جاگ اٹھا اور پورے بدن میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ خود پر قابو پاتا ہوا بولا۔

''اگر شمسہ کی ہنستی بستی زندگی میں تم نے زہر گھولنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا زبیدہ..... میں تمہارے بچے کو.....'' اس کی انگلی کھڑی تھی اور بدن غصے سے کانپ رہا تھا۔ وہ زبیدہ کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ اب دوستوں نے مراد خان کو مہندی لگانا شروع کر دی تھی۔

شرارتوں اور قہقہوں کے ساتھ ساتھ دلچسپ جملوں کے تبادلے میں رات بیت گئی تو اذان کی آواز پر سب ہلا گلا ختم کرنا پڑا۔ اورنگزیب نے سب کو اپنے اپنے گھروں میں جانے کے لئے کہا تو سب باری باری اپنی گاڑیوں میں وہاں سے کھسکنے لگے۔

آدھے گھنٹے میں ارباب احمد اور مراد خان ہی سٹیج پر رہ گئے۔

''ارباب احمد!'' مراد اس کا ہاتھ تھامتا ہوا بولا۔''تم نے دوستی کا فرض نبھا دیا ہے یار!''

وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا اور بولا۔

''دوستی کا فرض بھی کہتے ہو اور شرمندہ بھی کرتے ہو۔''

''اگر تم نہ ہوتے تو کبھی بھی میری شادی شمسہ سے نہ ہو پاتی۔'' مراد خان اس کا تہہ دل سے مشکور لگ رہا تھا۔ ارباب احمد نے اسے کندھے پر تھپکی دی اور اٹھتا ہوا بولا۔

''میں نہ ہوتا تو پھر کوئی اور ارباب احمد ہوتا جو تمہارے لئے شمسہ سے بات کرتا اور بات پکی بھی ہو جاتی کیونکہ شمسہ تمہارے نصیب میں لکھی تھی۔'' وہ جانے کے لئے سٹیج سے اترا تو مراد خان بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا۔

''واقعی کسی سیانے نے سچ ہی کہا ہے کہ ''سنجوگ ڈاہڈے ہوتے ہیں'' ارباب احمد اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا وہ یہ اندازہ نہ کر پایا تھا کہ مراد خان نے اس سنجوگ پر طنز کیا ہے یا اپنے سنجوگ شمسہ سے طے ہو جانے پر خود پر رشک کیا ہے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی جانب چل پڑا اور مراد خان واپس اندر آ گیا۔

شمسہ کی خواہش پر ارباب احمد اس سے ملنے اس کے گھر پہنچا تھا آج شمسہ کی رخصتی تھی اور اس نے بہت بڑا رسک لے کر ارباب احمد کو اپنے پاس کمرے میں بلوایا تھا۔ گھر میں مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ کریم خان جانتے تھے کہ ارباب احمد شمسہ کا کلاس فیلو اور بہترین دوست بھی ہے اس لئے انہیں اس ملاقات پر کوئی اعتراض نہ تھا ویسے بھی وہ کافی مصروف تھے۔

ارباب احمد شمسہ کے کمرے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ شمسہ ہاتھوں پر مہندی لگائے بیٹھی تھی اور شاید اسی کی منتظر تھی وہ ارباب احمد کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کمرے کا دروازہ چونکہ کھلا ہی تھا اور ارباب احمد دروازے کے بالکل سامنے والی بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیسی لگ رہی ہوں ارباب احمد!''

یہ طنز تھا یا پھر شمسہ کریم کے دل کی آواز تھی ارباب احمد ہونٹوں پر مسکان سجاتا ہوا بولا۔

''یہ تو مراد خان سے پوچھنا۔''

''جس طرح محبت زندگی میں ایک ہی بار اور صرف ایک سے ہی ہوتی ہے...... بالکل اسی طرح شادی کی مثال بالکل الٹ ہے۔ شادیاں کئی بار ہو سکتی ہیں۔''

شمسہ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگی تھی۔ ارباب احمد اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''شمسہ! اگر محبت پر احسان کر رہی ہو تو اس طرح کرنا کہ محبت اپنے ہی بوجھ تلے دبی رہے۔''

''محبت نے مجھے دیا ہی کیا ہے ارباب احمد!'' وہ نم آواز میں بولی۔

''محبت نے تم سے چھینا ہی کیا ہے؟''

''محبت نے مجھے ڈاکو بن کر لوٹا ہے۔ جس جگہ پر تمہیں ہونا چاہئے تھا وہاں آج مراد کھڑا ہے۔''

''ہوسکتا ہے کہ مراد خان کی محبت میں وہ تڑپ اور سچائی ہو جو میری محبت میں نہیں تھی۔'' ارباب احمد اس کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔''اسی لئے جیت اس کی ہوئی۔''

''تو پھر اس سارے کھیل میں ہار تو میری ہوئی نا؟'' وہ کرب سے بولی تو آنسو چھلک پڑے۔

''بعض اوقات جان بوجھ کر ہارنے میں بھی بہت مزہ آتا ہے۔ کیا تم اس شکست پر خوشیاں نہیں منا رہی؟''

ارباب احمد اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو دیکھ کر تڑپ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا تو شمسہ نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے اپنے پاس آنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

''میرے آنسو پونچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ارباب احمد...... یہ میرے ساتھ ہی جہیز میں جائیں گے اور میری تنہائیوں کے مخلص دوست ہیں۔''

ارباب احمد ٹھنڈی سانس بھرتا ہوا بولا۔''اگلے مہینے میں امریکہ جا رہا ہوں پی ایچ ڈی کے لئے۔''

''مبارک ہو تمہاری ذہانت تمہیں ہر قدم پر فتح دلا رہی ہے۔'' طنز یہ الفاظ آنسوؤں میں بھیگے ہوئے تھے لیکن ارباب احمد کے دل کو چیر گئے۔

''مراد خان تمہیں خوش رکھے گا۔'' وہ واپس جانے لگا تو شمسہ بولی۔

''میری محبت کی سچائی تمہاری اس کمزور دلیل کو ماننے سے انکاری ہے...... دنیا میں کہیں بھی جانا ارباب احمد...... بس اتنا یاد رکھنا کہ شمسہ تمہاری ہے اور تمہاری ہی رہے گی......'' وہ آگے بڑھی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی مصمم ارادے سے بولی۔

''جسم اور چہرے کی خوبصورتی دیکھ کر محبت کا دعویٰ کرنے والا مرد عورت کو کبھی بھی روح کی گہرائی سے نہیں چاہ سکتا...... اس بار محبت حیران تو ضرور ہوگی کہ اسی کی بچھائی ہوئی بساط اسی کے لئے کانٹوں بھری راہ بن گئی ہے۔ جس پر محبت کے لئے بھی چلنا دشوار ہو گیا ہے۔''

''شمسہ! شاید اب ہم دوبارہ کبھی نہ مل سکیں ، مجھے بھولنے کی کوشش کرنا۔'' وہ دروازے تک پہنچا تو شمسہ کی آواز نے ایک بار پھر اس کے قدم جکڑ لئے۔

''میں تمہارا اسی دہلیز پر انتظار کروں گی ارباب احمد!'' یہ کہہ کر شمسہ نے منہ موڑ لیا۔ ارباب احمد اس کے الفاظ سن کر تڑپ گیا تھا۔ یہ فقرہ اس نے کیوں کہا تھا اس کی ارباب احمد کو سمجھ نہ آسکی تھی۔ وہ وہاں سے نکل کر گھر پہنچا تو طبیعت کافی بوجھل تھی۔ وہ صوفے پر لیٹ گیا۔

دولت بی بی بیٹے کا درد سمجھتی تھیں انہوں نے ارباب احمد کے چہرے پر لکھی ہوئی شکست کی تمام داستان پڑھ لی تھی۔ وہ اس کے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گئیں اور لیٹے ہوئے ارباب احمد کے ماتھے پر اپنا ممتا بھرا ہاتھ رکھا تو ارباب احمد کو محسوس ہوا کہ وہ کڑی اور جھلسا دینے والی دھوپ سے نکل کر یک دم ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں تلے آ گیا ہو۔

اس کی پلکوں پر آنسو ٹھہر گئے تھے۔ وہ آنکھیں کھول کر ماں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا چاہتا تھا لیکن ماں نے بچے کو نو ماہ تک جس کوکھ میں رکھا ہوتا ہے وہ کوکھ بیٹے کا یہ حال دیکھ کر تڑپ کر رہ گئی۔ ''اپنی شکست پر رو رہے ہو ارباب احمد!'' وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی بولیں۔

''یہ تو میری جیت ہے ماں جی!'' ارباب احمد نے آنکھیں کھولیں تو آنسو ڈھلک کر گالوں پر بہہ گئے۔ ''یہ آنسو تو خوشی کے ہیں۔ اپنی جیت کا جشن منا رہے ہیں۔'' اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں تو دولت بی بی نے اپنی انگلی کی پور سے ایک آنسو صاف کیا اور بولیں۔

''خوشی کے آنسوؤں میں خون کی آمیزش نہیں ہوتی ارباب احمد!''

''یہ تو خوشی سے دل سے نکلے ہیں اور شاید کوئی زخم رسنے لگا ہو جس کا رنگ ان میں حلول کر گیا ہو۔''

وہ آنسو چھپانے کی ناکام کوشش میں رونے لگا تو دولت بی بی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بولیں۔

''میں تمہاری شادی اچھی سی لڑکی سے کروں گی۔''

''اچھی لڑکی شمسہ تو نہیں بن سکتی نا؟'' وہ دکھ سے بولا تو دولت بی بی مسکراتی ہوئی بولیں۔

''تو پھر مان کیوں نہیں لیتے کہ تم محبت اور دوستی کی اس بازی میں مات کھا گئے ہو۔''

''تو کیا کرتا ماں جی!'' وہ تڑپ کر اٹھا اور ان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''اگر محبت کی بات مانتا تو دوشی ٹھہرایا جاتا اگر دوستی کو انکار کرتا تو صدیوں پرانی روایتیں باتیں اور قصے سب کچھ جھوٹ بن جاتے اور میں ان سب جرموں کا گناہگار نہیں بننا چاہتا تھا۔''

''دوستی نبھانا اچھی بات ہے لیکن محبت کی قربانی دے کر اس پر ماتم کرنا بالکل اسی طرح ہے کہ تم نے اللہ کے حکم پر عمل تو کر لیا لیکن اندر سے اللہ سے بغض رکھا۔'' دولت بی بی کی دلیل مدلل تھی اور لہجہ ٹھوس تھا۔ ''تم آرام کر لو۔ رات بھر کے جاگے ہوئے ہو اور پھر شام کو بھی تم کافی مصروف ہو گے۔''

دولت بی بی وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں تو ارباب احمد کو شمسہ کے ساتھ گزارا ہوا ہر وہ لمحہ یاد آنے لگا جو ان دونوں کی محبت میں بدلتا ہوا یادگار اور سنہرا وقت بنتا گیا تھا اور آج وہی وقت ان دونوں سے نگاہیں پھیر کر ان کو دھوکا دے گیا تھا۔ وقت سدا ایک جیسا اور ہمدرد نہیں رہتا۔ یہ کہاوت اس نے کئی بار سنی تھی لیکن آج خود ایک ہارے ہوئے جواری کی مانند وہ وقت کے ظالم تیر کا گھائل بنا تھا تو یوں لگ رہا تھا کہ ایک ہی تیر نے پورے وجود کو چھلنی کر دیا ہو۔

یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ پورے وجود کے سوراخوں سے خون ہی خون رسنا شروع ہو گیا ہے۔ آنکھیں تو پانی کی طرح برسات برسانا بھول ہی گئی تھیں۔ پلکوں پر ٹھہرنے والے آنسو اس طرح جم گئے تھے گویا کسی پرانے زخم پر کھرنڈ آ گیا ہو۔ اس نے سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کیں تو شمسہ کی آواز سماعتوں سے ٹکرانے لگی۔

''میں تمہیں اسی دہلیز پر ملوں گی۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ ہم پھر ملیں گے ارباب احمد۔ میری محبت کی سچائی تمہیں مجھ سے ضرور ملوائے گی۔ کسی بھی بڑے فیصلے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ شمسہ تمہاری منتظر ہے۔ جیت میری محبت کی ہو گی ارباب احمد!''

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اردگرد دیکھنے لگا تھا۔ اسے یقین نہ ہو رہا تھا کہ شمسہ اتنے اعتماد کے ساتھ کیوں کہہ رہی

تھی۔ جبکہ وہ ارباب احمد کی بات مان کر محبت کو اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ بھینٹ میں دینے کے لئے راضی بھی تھی اور تیار بھی تھی۔ ارباب احمد کانوں پر ہاتھ رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

○......❖......○

کریم خان نے بہترین کھانوں سے بارات کی تواضع کی تھی شمسہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اس کی پرورش اور تربیت کے ساتھ ساتھ تعلیم اور اب شادی کا مرحلہ بھی احسن طریقے سے طے ہو گیا تھا۔ کریم خان نے بیوی کی موت کے بعد شمسہ کو باپ اور ماں بن کر پالا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رخصتی کے وقت ضبط کے سبھی بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ کریم خان اور شمسہ نے سب رشتہ داروں کو بھی رلا دیا تھا۔

رخصتی کے بعد شمسہ جب مراد خان کے گھر پہنچی تو ارباب احمد بھی ساتھ تھا۔ سب دوستوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد مراد خان ارباب احمد کو لے کر لان میں آ گیا اور بولا۔

''ارباب احمد میں جانتا ہوں کہ تم نے اور شمسہ نے قربانی دے کر اپنی محبت کی معراج کو بلند رکھنے کی کوشش کی ہے۔'' اس کا لہجہ اور الفاظ ارباب احمد کو اجنبی سے لگے تھے۔ وہ حیرت سے مراد خان کی طرف دیکھنے لگا جو کہہ رہا تھا۔

''اب شمسہ میری بیوی ہے۔ وہ تمہاری کلاس فیلو یا دوست نہیں رہی۔''

ارباب احمد حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو کر اس گہرے دوست کی طرف دیکھ رہا تھا جو نا معلوم کیا کہنا چاہتا تھا۔ ارباب احمد اتنا ہی کہہ پایا۔

''میں سمجھا نہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

وہ دھیرے سے مسکرایا اور ارباب احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''تم انتہائی سمجھدار ہو ارباب احمد!''

ارباب احمد کی آنکھوں میں ناسمجھی کی واضح لکیریں موجود تھیں اسی لئے اس کا انداز ہنوز استفہامیہ تھا۔

''آج کے بعد تم کبھی بھی شمسہ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ کیونکہ وہ میری بیوی ہے۔'' وہ بم جو کافی دیر سے ارباب احمد کی طرف مراد خان کی جانب سے پھینکا گیا تھا ارباب احمد کے سر پر آ کر پھٹ گیا تھا۔ وہ ہونق بن کر مراد خان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اسے جب کچھ بھی سمجھ نہ آیا تو وہ قہقہہ لگا کر اندر کے درد کو چھپاتا ہوا بولا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم شمسہ کو پا کر بہت خوش ہو اور میرے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔''

''میں سنجیدہ ہوں ارباب احمد! آج کے بعد اس گھر کا گیٹ بھی کراس کرنے کی جرأت نہ کرنا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی تمہیں دیکھ کر اپنی محبت پر نوحے پڑھتی رہے۔''

''کالج میں بھی اسے روک دو گے؟'' ارباب احمد کی مردہ آواز نکلی تو مراد خان کا قہقہہ بلند ہو گیا۔

''ہمارے خاندان کی کنواری لڑکیاں کبھی کالج نہیں گئیں...... یہ تو پھر میری بیوی ہے۔'' یہ دوسرا بم دھماکہ تھا جس نے ارباب احمد کے بدن کو پرزوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ مراد خان پھر بولا۔

''کالج والج بند، پڑھائی ختم، محبت وحبت کا کھیل ختم...... ویسے بھی ہم یہاں سے ایبٹ آباد شفٹ ہو رہے ہیں۔ تمہیں دکھ تو ہو گا کہ اب کبھی بھی اس شہر میں تم شمسہ کی صورت نہیں دیکھ سکو گے۔''

''مراد خان! ایسا نہ کرو یار...... اس کا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ وہ اگلے سال ڈاکٹر بننے والی ہے۔ اچھا ایسا کرتے ہیں...... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد شمسہ سے کبھی بھی نہیں ملوں گا...... لیکن تم اس کی تعلیم کو فل سٹاپ مت لگاؤ یار!'' ارباب احمد کا انداز منت بھرا تھا۔

مراد خان اس کی طرف دیکھتا ہوا طنز سے بولا۔

''مجھے تم پر ترس آ رہا ہے ارباب احمد...... تم پڑھے لکھے ہو، باشعور ہو، یہ محبت قربانی دوستی اور یہ سب جان قربان کرنے والے ڈرامے تمہیں زیب نہیں دیتے...... یہ تو سب فلموں، ڈراموں اور کتابوں میں اچھا لگتا ہے...... ویسے بائی دے وے...... نئی زندگی مبارک ہو۔''

وہ واپس جانے لگا تو ارباب احمد نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

''تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو۔ میں نہیں جانتا...... لیکن اتنا ضرور جان گیا ہوں کہ جس کا دوست تم جیسا کمینہ اور کم ظرف ہو اس شخص کو کسی دشمن کی ضرورت نہیں ہے۔''

مراد خان کے یک دم تیور بدل گئے اس کے ماتھے پر تیور پڑ گئی۔ وہ غصے سے حلق کے بل چیخا۔

''دلاور حسین...... دلاور حسین۔'' اس کی دھاڑ سن کر دلاور حسین اور اورنگزیب و دیگر لوگ بھی لان میں پہنچ گئے۔ سہانا بیگم اور اورنگزیب حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

''جی حضور!'' دلاور حسین ساڑھے چھ فٹ کا کڑیل جوان تھا جو ان کا ملازم بھی تھا اور چوکیدار بھی تھا وہ ادب سے بولا۔

''اس حرامزادے کو اٹھا کر کوٹھی سے باہر پھینک دو۔ اگر دوبارہ یہ اس کوٹھی کے آس پاس بھی نظر آئے تو بلا دریغ گولی مار دینا۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھنے لگا تو اورنگزیب نے اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا وہ حیرت سے بولے۔

''تم...... ارباب احمد کے متعلق کہہ رہے ہو؟''

''جی!'' مختصر مگر رعونت سے بھرپور جواب نے سہانا بیگم اور زبیدہ کو بھی حیران کر دیا تھا...... ان سب کو معلوم نہ تھا کہ معاملہ کیا ہے۔

''لیکن کیوں؟ مجھے اس کی وجہ بتاؤ، ارباب احمد میرے بیٹے جیسا ہے۔ تم اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہے ہو؟'' اورنگزیب کی دھاڑ نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا جبکہ ارباب احمد بے گناہ مجرم کی طرح خاموش کھڑا تھا۔

''میں نہیں چاہتا بابا جان کہ میری بیوی کا عاشق اس گھر میں دندناتا پھرے اور ہم بے غیرت بن کر دوستی کا پیرہن اوڑھ کر آنکھیں بند کئے اس کی خدمت کرتے رہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، مراد خان!'' اورنگزیب پھر دھاڑے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں...... اگر نہیں یقین تو پھر اس سے پوچھئے۔ مجھے جانے دیں...... رات کافی ہو گئی ہے۔''

مراد خان یہ کہہ کر اندر کی جانب بڑھ گیا تو زبیدہ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکان پھیل گئی۔ وہ ارباب احمد کو ذلیل کرنا چاہتی تھی اور قدرت نے اس کی سن لی تھی۔

اورنگزیب آگے بڑھے اور ارباب احمد سے مخاطب ہوئے۔

''مراد کیا کہہ رہا ہے بیٹا!''

''انکل! شمسہ ہم دونوں کی کلاس فیلو ہے.....اگر میرے من میں کوئی کھوٹ ہوتی تو میں خود کیوں اس کی شادی مراد سے کرواتا اور اگر ایسی کوئی بات بھی تھی تو شمسہ میری مرضی کی پابند تو نہ تھی وہ انکار بھی کر سکتی تھی۔''

اورنگزیب اثبات میں سر ہلا کر بولے۔

''اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔تم جاؤ، میں صبح اس سے بات کروں گا۔'' وہ ارباب احمد کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے بولے تو وہ کرب بھری مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''اب کوئی فائدہ نہیں ہے انکل! شک دوستی کا دشمن ہے اور مراد خان شک کو دل و دماغ میں بٹھا چکا ہے..... اب اگر وہ چاہے بھی تو مجھے واپسی کے لئے پکار نہیں سکتا۔'' ارباب احمد وہاں سے لٹے پٹے مسافر کی طرح چل پڑا اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات جاری تھی۔اس نے کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل کر واپس اس کوٹھی کی طرف دیکھا جہاں اس نے اپنی محبت کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے پھانسی پر چڑھا دیا تھا۔

اس نے دیکھا کہ مراد خان کے جس کمرے کو اس نے مسہری کے لئے سجایا تھا اس کی روشنی ابھی تک جل رہی تھی۔اس کوٹھی میں اس نے بہت اچھا وقت گزارا تھا ابھی وہ گزرے ہوئے وقت پر ماتم ہی کر رہا تھا کہ اس کے پاس سے ہی ایک نسوانی قہقہہ گونجا آواز گو کہ ہلکی تھی لیکن قہقہہ لگانے والی کے انداز میں جو زہر بھرا تھا اس زہر کے چھینٹے ارباب احمد نے واضح طور پر اپنے وجود پر گرتے ہوئے محسوس کئے تھے۔اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا تو زبیدہ کو کھڑے دیکھ کر وہ چونک گیا اور بولا۔''تم.....؟''

''میں تمہیں اور تم مجھے زندگی بھر نہیں بھول پاؤ گے ارباب احمد!'' وہ طنز سے مسکرائی۔''میں نے کہا تھا نا کہ میں تمہاری زندگی اجیرن کر دوں گی.....لیکن تقدیر کی ستم ظریفی دیکھو کہ ابھی ایک رات بھی نہیں گزری اور تم محبت اور دوستی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہو۔''

''کسی نے پہلے ہی کہا ہے کہ کتا بھی پالو تو نسل دیکھ کر پالو۔دوست بناؤ تو ایک بار ہی بناؤ مگر خوب تصدیق اور تحقیق کے بعد بناؤ۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا۔''مجھ سے کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہوئی ہے زبیدہ جو میں نے مراد خان جیسا دوست بنانے میں اس کی نسل کی تصدیق نہیں کی۔''

''ہماری نسل کو برا کہنے سے پہلے یہ تو سوچو ارباب احمد کہ تم آج جن حالات و حادثات کا شکار بنے ہو۔یہ تو مکافات عمل ہے.....'' وہ گھوم کر اس کے سامنے آ گئی۔''تم نے مجھ سے میرا بیٹا چھینا اور تقدیر نے تم سے تمہاری محبت اور بچپن کا دوست چھین لیا۔اب ساری زندگی شمسہ کی صورت دیکھنے کو ترسو گے ارباب احمد!''

''اور تم اپنے بیٹے کو پانے کی حسرت دل میں ہی لئے قبر میں اتر جاؤ گی۔'' ارباب احمد کا لہجہ بھی زہر میں بجھے ہوئے تیر کی مانند زبیدہ کے دل میں سیدھا کھب گیا تھا۔''تمہاری پوری نسل بھی میرے سامنے آ کر ناک رگڑے گی تو بھی نہیں بتاؤں گا کہ وہ بچہ کہاں ہے۔''

''ارباب احمد! تم بھی یہ بھول رہے ہو کہ تمہاری سب سے قیمتی چیز اس گھر میں ہے۔'' زبیدہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہوئی بولی۔''مراد خان اور میں اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے.....اگر تم سن لو یا تصور ہی کر لو تو مجھے قسم ہے اپنے بیٹے کی ارباب احمد کہ تم خوف سے مر جاؤ۔''

''یہ جو اوپر والا ہے نا بہت رحیم اور جبار وقہار ہے۔ رحم کرنے پر آئے تب بھی اور قہر ڈھانے پر آئے تب بھی یہ تم جیسوں یا غدار مراد خان جیسوں کے فیصلوں کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ کل کائنات اس کے بہترین فیصلوں کی محتاج ہے۔'' ارباب احمد اوپر کی جانب انگلی کرتا ہوا کہنے لگا۔

''اس وقت سے ڈرو جب شمسہ کی آہیں اس گھر کے در و دیوار کو چیخنے چلانے پر مجبور کر دیں گی۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا اگر تم شمسہ کو تکالیف دو گے تو تمہیں زیادہ تکلیف اور دکھ کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ مراد خان نے اسے اپنی بیوی مان کر اور بنا کر مجھ سے اس کا ہر قسم کا ناطہ ختم کر دیا ہے۔''

وہ وہاں سے جانے لگا تو زبیدہ کی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

''میں تمہیں شمسہ سے ہفتہ میں ایک بار ملوا سکتی ہوں۔ اگر تم چاہو تو؟'' زبیدہ اس سے کوئی سودا کرنا چاہتی تھی لیکن وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔

''میں بے ایمان نہیں ہوں کہ دوست کی بیوی سے چھپ چھپ کر ملوں اور وہ بھی ایک کم ظرف اور جاہل عورت کے توسط سے جس نے نکاح سے پہلے ہی حرام کو اپنی کوکھ میں پالنا شروع کر دیا تھا۔'' وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا اور جانتا تھا کہ اس کی آخری بات پر زبیدہ زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی ہو گی اور اپنا زہر اگلنے کے لئے کسی شکار کی تلاش میں ہو گی۔ اسے مراد خان سے ایسے سلوک کی توقع نہ تھی۔ وہ اور مراد بچپن سے دوست تھے ان کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا۔ شمسہ ان کی کلاس فیلو بنی تو یہ دوستی اور بھی مضبوط ہو گئی اور پھر اس کو ایک دن دوستی اس مقام پر لے آئی کہ اسے اپنی محبت دوستی پر قربان کرنا پڑی تھی اور آج وہ بالکل ہی خالی ہاتھ لوٹ رہا تھا اس کی جھولی بالکل خالی تھی نہ دامن میں محبت کی مہربانیاں تھیں اور نہ ہی دوستی کا دلاسہ تھا۔ وہ شکست خوردہ کھلاڑی کی مانند تھکے تھکے قدموں سے گھر کی جانب چل رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کسی شاعر کے الفاظ گونجنے لگے تھے۔

ہنستے ہنستے رلا دیتی ہے دوستی کی ادا بھی
سب کچھ ہے بکتا یہاں دوستی بھی وفا بھی
دُکانیں سجائے بیٹھے ہیں اپنے پرائے سب ہی
دِن رات بیچتے ہیں یہاں زہر بھی دوا بھی
پختہ یقین تھا کہ تجھے پلٹ کر نہ دیکھیں گے
ہمارے ہی کام آ نہ سکی ہماری انا بھی
زخمی آنکھوں کے آنسو بیچ کر بھی دیکھا میں نے
میرا کاسہ نہ بھر سکی کسی مخیّر کی عطا بھی
سب خلوص مٹ چکا ہے اب دِلوں سے اپنے
دوستوں سے دوستی بھی کرتے ہیں ریا بھی

وہ زخمی آنکھوں کے ساتھ گھر پہنچا تھا۔ دِل نے خون خون رونا شروع کیا تو وہ ماں کے مہربان آنچل میں اپنا منہ چھپا کر دِل کھول کر رونے لگا۔ ممتا کی ٹھنڈک اور محبت نے اس کے اندر کی جلتی ہوئی آگ پر اپنے پیار کے پانی

کا چھڑ کاؤ کرنا شروع کر دیا تھا۔

دولت بی بی ماں تھیں وہ ارباب احمد کو اپنی گود میں لٹائے اس طرح اس کے دکھ کا مداوا کر رہی تھیں کہ وہ اپنے کم ظرف آنسوؤں کے آگے ہار مان گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی آنکھیں کھول کر ماں کے مہربان مگر اداس چہرے کی جانب دیکھتا تو تڑپ کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیتا تھا۔ وہ خود کو شمسہ کا مجرم گردان رہا تھا اور کم ظرف مراد خان کے الفاظ اس کی روح کو تڑپا رہے تھے۔ اس نے شمسہ سے زبردستی یہ فیصلہ منوایا تھا بلکہ مراد خان کی دوستی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا کر شمسہ پر اپنی محبت کا احساس مسلط کر کے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ مراد خان سے شادی کر لے۔ ''مجھے معاف کر دینا شمسہ! میں تمہارا مجرم ہوں۔'' وہ تصور ہی تصور میں شمسہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

○……❖……○

آنسوؤں اور سسکیوں کو چھپاتی ہوئی شمسہ حجلہ عروسی میں بیٹھی کنکھیوں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ مراد خان نے اسے پانے کی خاطر کیا کیا نہ پاپڑ بیلے تھے۔ وہ جوان اور خوبصورت تھی اور کالج کے اور بھی کئی لڑکے اس کی جوانی اور خوبصورتی پر فریفتہ تھے۔ لیکن وہ صرف ارباب احمد کی شخصیت کی دیوانی تھی اور دل کی گہرائیوں سے اس کو چاہتی تھی اس نے کئی بار اشاروں کنایوں میں ارباب احمد پر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ دھیمے مزاج کا نوجوان تھا وہ دوست کی عزت و آبرو کا بھرم رکھنا جانتا تھا۔

شمسہ اس کی دل سے قدر کرتی تھی محبت جب انتہا کو چھونے لگی تو ارباب احمد نے اس کو اس سے مانگا لیکن شمسہ کو انتہائی حیرت کا جھٹکا اس وقت لگا جب ارباب احمد نے اسے اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے دوست مراد خان کے لئے مانگ لیا۔ ارباب احمد اگر شمسہ سے اس کی جان بھی مانگ لیتا تو وہ کبھی بھی انکار نہ کرتی لیکن اسے مراد خان پسند نہ تھا اس لئے وہ انکار کرنے کی جرأت کر گئی اور اس کی یہ جرأت ایک سنگین غلطی بن کر اس کے سامنے آ گئی۔ ارباب احمد نے اس کے انکار کو اپنی محبت کی توہین سمجھا اور خودکشی کرنے کی بھرپور کوشش میں ناکام رہا لیکن اس کی یہ ناکام مگر پرخلوص کوشش شمسہ کو اندر سے ہلا کر رکھ گئی۔

چاروناچار شمسہ کو اس کی بات ماننا پڑی اور نتیجتاً اس نے اپنے مستقبل کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کریم خان کو بھی اس شادی پر راضی کیا اور آج مراد خان کی دلہن بنی بیٹھی اس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔

کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سن کر وہ کچھ سنبھل کر بیٹھ گئی تو دروازہ پر دستک سن کر اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ آنے والا وہی مراد خان جو کل تک اس کا کلاس فیلو تھا لیکن آج اس کا مجازی خدا بن کر اس کے پاس پہنچا تھا۔ وہ اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتی ہوئی نظریں جھکا کر بیٹھ گئی تو مراد خان اس کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا وہ مخمور اور مسحور کن آنکھوں سے شمسہ کو دیکھتا رہا۔ شمسہ اس انتظار میں تھی کہ وہ کوئی الفاظ کہے، اس کے حسن کی تعریف میں۔ اس کی خوبصورتی کے بارے میں یا پھر یہ بتائے کہ وہ کب سے اس کا دیوانہ تھا لیکن اسے یہ انتظار جان لیوا لگا تو اس نے نظریں اوپر اٹھا کر مراد خان کی طرف دیکھا جو اس کے حسن میں اس قدر محو تھا کہ کچھ بھی بول نہ پا رہا تھا۔ شمسہ کو اس طرح دیکھتا ہوا پا کر وہ ہنسا اور بولا۔

''ارباب احمد یونہی تمہارا دیوانہ نہ تھا۔'' یہ تو تعریف تھی لیکن الفاظ کا چناؤ غلط ہی نہیں بلکہ انتہائی غلط تھا۔ وہ

استفہامیہ انداز سے مراد خان کی طرف دیکھنے لگی تو وہ پھر بولا۔ ''یہ پھول میرے ہی بیڈ روم میں سجنا تھا اور آج سج گیا۔ واہ۔'' اس نے آگے بڑھ کر شمسہ کے چہرے کے پاس اپنا منہ کیا تو شراب کی تیز بدبو نے شمسہ کو مضطرب اور حیران کر دیا۔ وہ تھوڑا سا سمٹ کر بیٹھ گئی۔

مراد خان نے اپنا کوٹ اتارا اور ایک طرف پھینکتا ہوا بولا۔

''میں نے ارباب احمد کو منع کر دیا ہے کہ وہ اب کبھی بھی اس گھر میں نہیں آئے گا۔'' الفاظ گو کہ لڑکھڑا رہے تھے لیکن لہجہ بدبودار بھی تھا اور زہریلا بھی تھا۔ شمسہ کو مزید حیرت ہوئی۔ وہ اپنی شرٹ کے بٹن کھولتا ہوا پھر بولا۔ ''وہ حرامزادہ تمہارا عاشق تھا..... تمہاری خاطر جان دینے لگا تھا..... اونہہ..... جان دینے لگا تھا'' مراد خان کے منہ سے ارباب احمد کے لئے گندی گالی سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی وہ تو ارباب احمد کی محبت کو خراج پیش کرنے کے لئے مراد خان کی دلہن بنی تھی اور خراج پیش کرنا ہو تو زبان سے ہی نہیں بدن کے ہر حصے سے اس کا اظہار ظاہر ہونا چاہئے تھا۔ وہ فی الحال خاموش ہی تھی اور مراد خان اٹھ کر کمرے میں موجود ایک الماری کی جانب بڑھا اور اس میں سے ایک شراب کی بوتل اور دو گلاس میز پر رکھے اور لڑکھڑاتا ہوا شمسہ کے پاس آیا۔

''مدت سے اک آس تھی کہ تم میرے سامنے بیٹھی ہو اور جام میں تمہاری تصویر رقص کر رہی ہو اور اس جام کو میں ہونٹوں سے لگا کر اس طرح پی جاؤں کہ جیسے کوئی مرنے والا آبِ حیات پیتا ہے۔'' اس نے ہنوز حیران شمسہ کو بازو سے پکڑا اور اپنی جانب کھینچتا ہوا سینے سے لگا کر بولا۔

''آج میری ہر خواہش پوری ہوگئی۔'' وہ بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اس کے نتھنوں میں شراب کی بو اس طرح گھس رہی تھی کہ اسے متلی ہونے لگی۔

مراد خان نے اسے بیڈ سے نیچے اتارا اور تقریباً کھینچنے والے انداز میں لے کر میز کے پاس آ گیا اور خود کرسی پر بیٹھ کر شمسہ کو نیچے کارپٹ پر بٹھایا اور بولا۔

''جانتی ہو یہ کیا ہے؟'' شمسہ اس کی بات سن کر شش و پنج میں پڑ گئی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے؟'' وہ حلق کے بل دھاڑا تو شمسہ سہم کر بولی۔

''نن..... نہیں..... مجھے نہیں معلوم کہ یہ کون سا مشروب ہے۔' وہ یہ سن کر قہقہے لگانے لگا تھا ایک ساعت کو یوں لگا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے مگر وہ اپنی ہنسی ضبط کر کے بولا۔

''جس حسن کی پری کو ارباب احمد کے بدن کا خمار ستا رہا ہو اسے کسی دوسرے نشے کا علم کیسے ہوگا؟'' یہ سیدھا سیدھا الزام اور اس کی ذات پر کیچڑ بھی اچھالا گیا تھا۔

''مراد خان! آپ میری توہین کر رہے ہیں۔'' وہ الفاظ پر قابو نہ رکھ سکی لیکن لہجہ دھیما ہی تھا۔ وہ اس کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

''اس گھر کا اصول یہی ہے کہ مرد کی آواز سے اونچی آواز کسی عورت کی ہوگی تو زبان گدی سے کھینچ کر تلی پر رکھ دی جائے گی۔'' اس نے شمسہ کو بالوں سے پکڑا اور شراب کا بھبھوکا اس کے منہ پر چھوڑتا ہوا بولا۔ ''اب تمہیں اسی گھر میں رہنا ہے شمسہ بیگم اور یہیں مرنا ہے۔ اس گھر کے قاعدے اور قانون اچھی طرح سیکھ لو ایسا نہ ہو کہ نئی نویلی دلہن گونگی

ہو کر باقی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے۔''

اس نے شراب گلاسوں میں انڈیلی تو شمسہ خاموش نہ رہ سکی۔

''مجھے تم سے یہ امید نہ تھی کہ تم اتنے گھٹیا اور کمینے نکلو گے۔'' وہ کہہ کر واپس بیڈ پہ جانے لگی تو شراب کے نشے میں دھت مراد خان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔

''گھٹیا اور کمینہ میں نہیں...... وہ تمہارا عاشق ہے جس نے مجھے تمہیں خیرات میں دیا ہے اور جانتی ہو خیرات کیسے استعمال کی جاتی ہے؟'' وہ اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش میں لڑکھڑا کر دوبارہ صوفے پر گر گیا اور شرمندگی کی بجائے بولا۔

''جس طرح چاہو خیرات کو استعمال کرو...... کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔''

''کیا کرو گے مراد خان! میرا جسم ہی نوچ سکو گے نا؟...... مگر یاد رکھو کہ روح کی گہرائی سے بھی میں اس شخص کی امانت ہوں جسے میں نے دِل سے چاہا ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں نے چاہت کا انتخاب کرتے وقت صحیح آدمی کو چنا ہے۔''

''وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک گلاس پکڑتا ہوا بولا۔''

''میں تمہیں طوائف بنا کر اس بازار میں بیچوں گا جہاں چاہت محبت اور عشق کوڑیوں کے دام فروخت ہوئے ہیں۔'' شمسہ اس کا منصوبہ سن کر روح تک کانپ گئی لیکن اس وقت وہ نشے میں تھا اور اس پر الفاظ کے ذریعے حاوی ہونے کی ضرورت تھی۔ وہ ہنستی ہوئی بولی۔

''تم مجھے طوائف کیا بناؤ گے مراد خان! تم تو میرے ایک عاشق کو بھی اس کنجر خانے پر برداشت نہ کر سکے......''

شمسہ کی بات نے اس کا سارا ہی نشہ کافور کر دیا تھا۔ ''میں دعا کروں گی کہ تم میں سے پہلی اولاد مجھے بیٹی ہی ہو...... پھر دیکھنا کہ میں اسے کیسے طوائف بناتی ہوں اور یہ بھی تہیہ کرتی ہوں کہ اسے اس دنیا کی سب سے بڑی منڈی میں نیلام کروں گی۔''

''تڑاخ!'' ایک زوردار تھپڑ نئی نویلی دلہن کے نرم و نازک گالوں پر اپنی انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا تو شمسہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں لیکن وہ مسکرا کر مراد خان کی طرف دیکھنے لگی کہ اس نے اس کی دم پر پاؤں رکھ کر زور سے دبا دیا تھا۔

''بکواس مت کرو اور میری رات خراب کرنے کی کوشش مت کرو۔ یہ لو ایک گلاس اور اس طرح پی جاؤ جس طرح اپنے یار کے ساتھ کالج میں جوس پیتی تھی۔'' اس نے شراب کا گلاس شمسہ کی طرف بڑھایا تو اس نے نفرت سے ہاتھ مار کر شراب والا گلاس گرا دیا جو مراد خان کے سوٹ کو خراب کرتا ہوا نیچے کارپٹ پر گر گیا۔ پھر تو وہ وحشی ہو گیا اس نے شمسہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی تو وہ اپنے بچاؤ کے لئے نیچے لیٹ گئی وہ وحشی اور خونخوار درندے کی طرح اس کو نوچنے لگا تھا اور وہ چیختی چلاتی رہی لیکن اس کی چیخیں سننے والی محبت اور عشق اندھے گونگے بہروں کی طرح اس کی چاہت اور دلی ارمان لٹ جانے پر آنسو بہاتے رہے۔

اس کی سہاگ رات بھی عجیب رات تھی۔ اس پوری رات میں کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جو دلہن اور دلہا نے پیار

کے انداز میں کی ہو یا محبت کے لہجے میں کی ہو۔ شمسہ اپنی محبت کو خراج پیش کرنے کے لئے خاموشی سے اپنے بدن کے مالک کو برداشت کرتی رہی اور اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اسے ارباب احمد جیسا چاہنے والا ملا تھا جو اس درندے کی طرح جسم اور گوشت کی بھوک مٹانے کی بجائے روح اور دِل سے محبت کرتا تھا۔ اگلی صبح اس کے لئے تکلیف دہ تھی کیونکہ جسم اس طرح درد کر رہا تھا جیسے کہ اسے کسی نے رات بھر کسی موٹے ڈنڈے سے ملیدہ بنانے کی کوشش کی ہو۔ اس نے اپنے پاس پڑے ہوئے اپنے شرابی مجازی خدا کو دیکھا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ رونے لگی۔

''ارباب احمد! یہ کیسی قربانی تم نے مجھ سے مانگ لی ہے۔ روز گھٹ گھٹ کر مرنے سے تو اچھا ہوتا کہ اگر تم ایک ہی بار مجھ سے میری جان مانگ لیتے۔'' وہ تخیل میں ہی ارباب احمد سے مخاطب تھی۔ مراد خان دنیا و مافیہا سے بے خبر ٹیڑھے میڑھے انداز میں سویا ہوا تھا۔ وہ نفرت سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''محبت کہنا اور نبھانا بہت مشکل ہے مراد خان۔ تم نے میرے جسم پر قبضہ کر لیا ہے لیکن میری روح اسی کی امانت رہے گی...... تم ہمیشہ تڑپو گے...... میرے پیار اور میری محبت کو پانے کی خاطر ہمیشہ ترسو گے۔'' اس نے نفرت سے اس پر تھوک دیا اور بیڈ پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ اپنی اس رات کے بارے میں اپنی کسی دوست کو بھی نہ بتا سکتی تھی۔ ماں بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی جو بیٹی کے چہرے پر رات کی لکھی گئی کہانی اپنی آنکھوں سے ہی پڑھ لیا کرتی ہیں۔ نہ ہی کوئی بڑی بہن تھی جو اس کی راز دار ہوتی اس کے دکھ کا مداوا کرنے کے لئے اس کی بات شادی کے پہلے ہی دن اس کے باپ کریم خان تک پہنچاتی اور نہ ہی کوئی بھابی تھی جو نند کی تکلیف کو بھانپتے ہوئے اس کے بھائی کو تمام داستان کہہ دیتی وہ اپنی بے بسی اور تقدیر کی اس ستم ظریفی پر آنسو بہا رہی تھی کہ رشتے دینے میں تقدیر نے اس کے ساتھ کیسی ڈنڈی ماری تھی آج وہ تنہا تھی۔

شوہر، سسر، ساس اور نند کے ہوتے ہوئے بھی وہ تنہا تھی کسی کا کاندھا نہ تھا جس پر سر رکھ کر وہ دوستی یا اپنا دکھڑا سنا لیتی۔ وہ اپنی زبان سے اپنی بربادی کی داستان اپنے شریف النفس باپ سے نہ کہہ سکتی تھی کیونکہ جس طرح ناز و نخروں سے کریم خان نے اسے پالا تھا وہ اس کی پہلی رات کی داستان سن کر ہی مر جاتا اور وہ اس انمول رشتے سے بھی مرحوم ہو جاتی اور مزید تنہائی اس کا مقدر بن جاتی اس نے خاموش رہ کر ہر ظلم سہنے کا تہیہ کر لیا اور ایک عزم اور مصمم ارادے سے اپنے آنسو پونچھے اور باتھ روم میں گھس گئی۔

اس دن کے بعد شمسہ نے کوئی بھی دن سکون کا نہ دیکھا تھا سہانا بیگم اس کو اکثر کہا کرتی تھیں کہ تم خاموش اور اداس کیوں رہتی ہو ہنسا بولا کرو۔ سب کے ساتھ چہکا کرو۔ لیکن شمسہ ہلکی سی مسکان سے ان کو ٹال جاتی تھی۔ شمسہ نے ایک ملازمہ سے اس گھر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس پر نت نئے انکشاف ہو رہے تھے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ زبیدہ شادی شدہ ہے اور اس کے بیٹے کو ارباب احمد کو دے دیا گیا تھا وہ اس کے بچے کو لے کر نا معلوم کس کو دے آیا تھا۔

وہ اس گھر کی پرانی ملازمہ تھی اور سب سے اچھی حرح واقف تھی۔ ایک دن شمسہ لان میں بیٹھی چائے پی رہی

تھی کہ زبیدہ بھی ادھر آ نکلی شمسہ نے اس کو دیکھ کر نظر انداز کر کے منہ دوسری طرف کر لیا اور چائے سے لطف اندوز ہونے لگی۔ زبیدہ چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور شمسہ کی طرف دیکھ کر طنز سے مسکرائی اور بولی۔

''یاد تو آتی ہو گی؟'' شمسہ اس کا مطلب نہ سمجھتی ہوئی اس کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگی۔ زبیدہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ''مراد میرا چھوٹا بھائی ہے اور میں اس کی بڑی بہن ہوں۔ وہ مجھے آپا کہتا ہے اور تم بھی مجھے آپا کہہ سکتی ہو......''

''رشتوں کی عزت عمروں سے نہیں اخلاق اور زبان سے ہوتی ہے۔'' شمسہ بولی۔

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم نے آج تک مجھے بھی آپا نہیں کہا اور نہ ہی کبھی بھابی اور نندوں جیسی باتیں ہم دونوں کر سکی ہیں؟''

''میں نے اس دل سے کوئی بھی رشتہ قبول نہیں کیا۔'' شمسہ مختصراً بولی تو زبیدہ آپا کی ناک چڑھ گئی اس کی پیشانی پر بل پڑنے لگے۔

''تو پھر اس گھر میں ٹکی ہوئی کیوں ہو...... چلی کیوں نہیں جاتی واپس اپنے یار کے پاس۔'' زبیدہ کا لہجہ کافی تلخ اور الفاظ اخلاقیات سے گرے ہوئے تھے۔ شمسہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور بولی۔

''طلاق کے کاغذ اور تین الفاظ میرے پاؤں کی زنجیر ہیں......''

''تو پھر کہو مراد خان سے وہ تمہیں طلاق دے دے۔'' وہ رعونت سے بولی تھی۔

''میں نہیں کہوں گی۔ میں اس کو اور تم سب کو اس قدر مجبور کر دوں گی کہ تم لوگ خود مجھے طلاق دینے پر سکون محسوس کرو گے۔''

''شرم تو نہیں آتی تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے۔ طلاق کیا ہوتی ہے یہ مجھ سے پوچھو۔'' زبیدہ کا رویہ تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ ''طلاق یافتہ عورت کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا شمسہ بی بی!''

''تو پھر تمہارے ماتھے پر اپنی غلطی کی ندامت کی کوئی بھی لکیر کیوں نہیں ہے زبیدہ بی بی!'' اینٹ کا جواب پتھر سے ملا تو زبیدہ ہتھے سے ہی اکھڑ گئی وہ اول فول بکنے لگی تو شمسہ خاموشی سے بیٹھی چائے پیتی رہی۔ زبیدہ کی چیخ پکار سن کر سہانا بیگم اور اورنگزیب بھی ادھر آ نکلے۔ وہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے کیونکہ زبیدہ اکیلی ہی چیخ رہی تھی جبکہ شمسہ تو خاموشی سے چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' سہانا بیگم نے زبیدہ کے منہ پر ہاتھ رکھا اور پوچھنے لگیں۔ ''کیوں فضول میں بولتی جا رہی ہو؟'' زبیدہ شمسہ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''اس کمینی نے مجھے میرے ماضی کا طعنہ دیا ہے۔ یہ خود بھی مراد سے طلاق لینا چاہتی ہے۔'' اتنا سننا تھا کہ اورنگزیب تو کانپ کر رہ گئے جبکہ سہانا بیگم پھٹی پھٹی نگاہوں سے دو ماہ کی دلہن کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ ''کیا تم نے ایسا کہا ہے بیٹی؟'' اورنگزیب آگے بڑھ کر شمسہ کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بولے تو شمسہ احتراماً اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور نظریں جھکاتی ہوئی بولی۔

''آپ کو تو معلوم ہی انکل کہ میں بہت کم بولتی ہوں اور جب بھی بولتی ہوں سچ ہی بولتی ہوں۔'' پھر اس نے

زبیدہ کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔ ''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی...... زبیدہ آپا جھوٹ بول رہی ہیں۔'' شمسہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی وہ اندر کی جانب جاتی ہوئی ہونٹوں پر مسکان سجائے زبیدہ کے بری طرح پٹ جانے پر خوش ہو رہی تھی۔

''تمہیں شرم آنی چاہئے، پہلے ہی اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہمارے منہ پر سیاہی مل چکی ہو اور اب اپنے بھائی کا گھر بھی برباد کرنے پر تلی ہوئی ہو؟'' سہانا بیگم نے زبیدہ کو ڈانٹنا شروع کر دیا تھا۔ اورنگزیب تو تھک کر وہیں کرسی پر ہی ڈھیر ہو گئے تھے۔

''آپ کو میرا یقین نہیں ہے تو نہ سہی...... اس نے مجھ سے خود کہا ہے کہ وہ واپس ارباب احمد کے پاس جانا چاہتی ہے اور اس کے پاؤں کی زنجیریں طلاق کا کاغذ اور تین بول ہیں۔''

''کس نے کہا ہے تم سے؟'' سب چونک کر اس آواز کی جانب مڑے تو مراد خان غصے میں کھڑا تھا اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ''جلدی بتاؤ، کیا یہ شمسہ نے کہا ہے؟''

''ہاں مراد! شمسہ نے خود مجھ سے کہا ہے کہ وہ مراد خان سے طلاق لینا چاہتی ہے۔'' زبیدہ کی بات سن کر وہ الٹے پاؤں مڑا ابھی دو قدم ہی چلا تھا کہ اورنگزیب کی گونجدار آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

''رک جاؤ مراد خان! تم اس کی باتوں پر یقین کر کے بہو سے کچھ نہیں پوچھو گے۔ میں اور تمہاری ماں خود شمسہ سے بات کریں گے۔'' زبیدہ کو تو آگ لگ گئی تھی اس کے باپ نے نادانستہ طور پر اس کو جھوٹی کہہ دیا تھا۔ سہانا بیگم اور اورنگزیب خان ان دونوں کو لان میں ہی چھوڑ کر شمسہ کے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آئے تو آتے ہی زبیدہ پر برس پڑے۔

''تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی بھائی کا گھر برباد کرنے کے لئے جس جھوٹ کا سہارا لے رہی ہو۔ جانتی ہو وہ کون سے الفاظ ہیں...... جن کو سن کر عرش الٰہی بھی کانپ اٹھتا ہے اور تم خود ان لفظوں کی ڈسی ہوئی ہو۔'' سہانا بیگم نے بیٹی کی لے دے کی تو وہ روہانسی ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ جبکہ مراد خان ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اورنگزیب رعب دار آواز میں بولے۔

''ہماری بات ہوئی ہے بہو سے...... اسے کوئی تکلیف نہیں ہے اور نہ ہی اس نے ایسی کوئی بات کہی ہے۔''

''تو پھر زبیدہ آپا نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟'' مراد خان ابھی تک شک میں مبتلا تھا۔

''یہ تو ہے ہی جھوٹی...... اس نے شمسہ سے اس کی کلائی میں پہنا ہوا سونے کا کڑا چھیننے کی کوشش کی تھی اور ناکامی پر اس نے شمسہ پر یہ الزام لگا دیا اور تم...... میں تو سمجھتا تھا کہ تم بہادر ہو لیکن تم میں تو مردوں والی کوئی بھی بات نہیں ہے مراد۔''

مراد خان کو اپنی توہین کا احساس شدت سے ہو رہا تھا لیکن وہ باپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا رہا۔ اورنگزیب خان پھر بولے۔ ''سامان پیک کرو۔ میں نے بہو سے بھی کہہ دیا ہے اب ہم یہاں نہیں رہیں گے بلکہ ایبٹ آباد والے محل میں باقی زندگی گزاریں گے۔''

اورنگزیب اور سہانا بیگم اپنا فیصلہ سنا کر چلے گئے تھے اور مراد خان کے حلق سے بات نیچے نہ اتر رہی تھی۔

ایبٹ آباد والا محل کئی کنال پر محیط تھا۔ شمسہ حیرت میں گم ہو کر اس محل کو دیکھ رہی تھی۔ کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا لان اور خوبصورت بلڈنگ اور تعمیر میں خاصی دلچسپی اور ڈیزائننگ نے کاریگروں کی مہارت کو اجاگر کر دیا تھا۔

شمسہ کا کمرہ محل کی مغربی سائیڈ پر تھا جہاں سے پہاڑوں کے پیچھے غروب ہونے والا سورج شام کو عجیب سا منظر پیش کیا کرتا تھا۔ وہ قدرتی مناظر کی بے حد شوقین تھی اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا کہ وہ شادی کے بعد ارباب احمد کے ساتھ ان علاقوں کی سیر کے لئے آئے گی۔ وہ ان علاقوں میں تو آ گئی تھی لیکن اس کے ساتھ شریک سفر کی صورت میں ارباب احمد نہیں بلکہ مراد خان تھا۔

اس کے وجود کا مالک مراد خان تو تھا لیکن اس کی روح ارباب احمد کے ساتھ کی پیاسی تھی اور شمسہ کو اب بھی اپنی محبت پر اعتماد اور ذاتِ عشق پر بھروسہ تھا کہ وہ واپس ارباب احمد کی سیج پر ہی جائے گی۔ وہ جب بھی مراد خان سے بات کرتی تو اس کے لہجے اور الفاظ میں بلا کا اعتماد ہوتا تھا جو کبھی کبھی مراد خان کو بھی لڑکھڑانے پر مجبور کر دیتا تھا۔

سہانا بیگم کی طبیعت اچانک ہی بگڑ گئی تھی انہیں ہسپتال لے جایا گیا تو جو رپورٹس سامنے آئیں وہ کوئی تسلی بخش نہ تھیں بلکہ خطرناک حد تک تشویش ناک تھیں۔ ان کے جگر میں پانی پڑ گیا تھا اور وہ بقول ڈاکٹرز کے چند مہینوں کی مہمان تھیں۔ اورنگزیب اس خبر کو سن کر کافی دلبرداشتہ ہو گئے تھے ان کو سہانا بیگم کی رفاقت کا بڑا آسرا تھا۔ وہ اپنے دکھ سکھ کی ہر بات ان کے ساتھ شیئر کر کے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے تھے۔ اب جو بھی دن بچے تھے وہ سہانا بیگم کی تیمارداری میں ان دنوں کو عبادت کی طرح گزارنے لگے تھے۔

زبیدہ اور مراد خان بھی ماں کی بیماری سے کافی پریشان تھے لیکن مشیت ایزدی میں دم مارنے کی کس کو جرأت ہے۔ وہ بھی رب تعالیٰ کے فیصلے کو دلی طور پر قبول کر چکے تھے اور پھر ایک رات سہانا بیگم خاموشی سے اس دنیا کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملیں۔

شمسہ نے ان کی بہت خدمت کی تھی دن رات کی خدمت نے شمسہ کو بھی ذہنی طور پر تھکا دیا تھا لیکن وہ دلی طور پر ایک سکون محسوس کر رہی تھی کیونکہ اس کا نظریہ تھا کہ اگر اس کی ماں بھی اس حالت میں ہوتی تو وہ ان کی بھی خدمت اسی طرح کرتی۔ شاید قدرت نے اسے ایک موقع دیا تھا کہ وہ سہانا بیگم کی صورت میں اپنی ماں کی تیمارداری کر لے اور وہ اس آزمائش میں پوری اتری تھی۔

اورنگزیب خان اداسی اور غم کی تصویر بنے ہوئے لان میں کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شمسہ ان کے پاس پہنچی اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”انکل! جانے والوں کو رویا نہیں کرتے۔“ اورنگزیب خان نے اپنی تمام عمر رعب اور دبدبے کے بل بوتے پر گزاری تھی۔ شمسہ کی بات سن کر ان کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ نمناک لہجے میں گیلے الفاظ کو حوصلوں کا پیرہن اوڑھا کر بولے۔

”ساتھی کا آسرا اس لاٹھی کی مانند ہوتا ہے جو اندھے کو صحیح اور ٹھیک راستے پر گامزن کرتی ہے۔“

”اگر ساتھی اچھا ہو تو؟“ شمسہ ان کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی تو وہ آنسو پیتے ہوئے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے سر ہلا کر بولے۔

''ہاں، اگر ساتھی اچھا ہو تو زندگی پھولوں کی سیج بن جاتی ہے اور برا ساتھی تو عذاب بن کر زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔''

''آپ کا اپنے بیٹے کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' شمسہ کے منہ سے اس سوال کو سن کر اورنگزیب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے لیکن جب شمسہ نے جھکی ہوئی نظروں سے دو آنسو بہائے اور ساری داستان مختصراً الفاظ میں بیان کی تو اورنگزیب خان کا سر شرم سے جھک گیا۔ شمسہ نے سہاگ رات سے لے کر آج تک جو بھی اس کے ساتھ ہوا تھا اس نے من وعن بیان کر دیا تھا۔ اورنگزیب خان ذلت اور شرمندگی کے بار تلے دبے جا رہے تھے۔

''نادان لڑکی تم مجھے آج بتا رہی ہو؟'' وہ اپنا دکھ چھپا نہ سکے اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے تو شمسہ بھی ان کے احترام میں کھڑی ہو گئی۔ وہ پھر بولے۔

''تم نے کریم خان کو تو کچھ نہیں بتایا؟'' ایک انجانا سا خوف ان کے الفاظ میں چھپا تھا۔

''انہوں نے مجھے اس گھر کی عزت اور لاج بنا کر بھیجا ہے انکل اور میں اپنے باپ کی کہی ہوئی بات کی لاج رکھنا جانتی ہوں۔''

انہوں نے فخر سے شمسہ کی طرف دیکھا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ ''کاش کہ تم میری بیٹی ہوتی۔''

''میں آپ کی بیٹی ہوں انکل! لیکن افسوس ہے کہ اس گھر کی بہو اور ایک شوہر کی بیوی نہیں بن سکتی۔'' وہ دکھ سے بولی تو اورنگزیب نے بڑی محبت سے اس کو اپنے سینے سے لگا لیا اور یہی وہ لمحہ تھا جب زبیدہ نے اس کو دیکھ لیا اور مراد خان کو بھی دکھا دیا۔

اورنگزیب خان بولے۔ ''اللہ تعالیٰ تمہیں سدا خوش رکھے..... میری دعا ہے کہ تم وہ سب کچھ پاؤ جس کی تمہارے دل میں تمنا ہے اور یہ دعا ایک سسر نہیں ایک باپ دے رہا ہے۔'' انہوں نے شمسہ کے ماتھے پر بوسہ دیا اور آنکھوں میں آنے والی نمی کو چھپاتے ہوئے بولے۔

''اللہ سے دعا کرنا کہ اب وہ مجھے اٹھا لے۔'' وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے لیکن شمسہ کے غم کو ہلکا ہونے کے لئے جس کاندھے اور سہارے کی ضرورت تھی وہ میسر آ گیا تھا۔ اس نے بھی لوہا گرم دیکھتے ہوئے ایسی چوٹ لگائی تھی کہ اورنگزیب خان پر اس کے بیٹے مراد خان کے سارے کرتوت کھول کر رکھ دیئے تھے۔ اس محل میں اس کا ایک تو ووٹ پکا ہو گیا تھا اور ووٹ بھی جاندار تھا اور سربراہ بھی تھا۔ ان کے فیصلوں کے سامنے زبیدہ اور مراد خان کو جرأت نہ تھی کہ وہ انکار کر دیتے۔ یہ شمسہ کی بہت بڑی جیت تھی۔

وہ اپنی جیت پر شاداں وفرحاں اپنے کمرے میں پہنچی تو مراد خان کے بگڑے ہوئے تیوروں میں مزید اضافہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''کہاں سے آئی ہو؟''

''انکل کو چائے دینے گئی تھی۔''

''ملازم کہاں ہیں سبھی؟'' اس کا شک سے بھرا لہجہ شمسہ کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''ماں جی کی موت کے بعد وہ میرے ہاتھوں کی چائے پسند کرتے ہیں۔'' شمسہ نے جواب دیا تو وہ اکھڑے ہوئے بدتمیز لہجے میں بولا۔

''تمہارے ہاتھوں کی چائے پسند کرتے ہیں یا تمہارے ہاتھوں کو پسند کرنے لگے ہیں؟'' آگ کا گولہ سا شمسہ کی جانب بڑھا جو اس کے وجود کو جھلساتا ہوا گزر گیا۔ وہ نا مراد مراد خان کی طرف دُکھ سے دیکھنے لگی۔

''وہ میرے باپ کی طرح ہیں۔'' شمسہ اس گھٹیا اور نئے الزام کو سن کر کانپ گئی تھی۔

''باپ کی طرح ہیں باپ تو نہیں ہے نا؟'' مراد خان نے پھر زہر اگلا۔

''تم کمینے ہو اس بات کا مجھے علم تو تھا ہی لیکن گھٹیا اور ذلیل بھی ہو گے یہ مجھے اندازہ نہ تھا'' شمسہ نفرت سے بولی تو ایک زوردار تھپڑ نے اپنا نشان سیب جیسے گالوں پر چھوڑا۔

''خاوند مجازی خدا ہوتا ہے اور خاوند کی تذلیل خدا کو بھی ناراض کر دیتی ہے۔'' وہ غصے میں چیختا ہوا آگے بڑھا اور اس کو بالوں سے پکڑ کر بیڈ پر پھینک دیا تو وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی اور بولی۔

''مجازی خدا؟'' ان الفاظ میں جو طنز تھا اس نے مراد خان کو مزید آگ بگولہ کر دیا۔'' کبھی اس خدا کا شکر بھی ادا کیا ہے جس نے تمہیں مجازی خدا بنایا ہے؟'' مراد خان کی ذات پر سیدھا سیدھا طنز کیا گیا تھا۔'' شراب اور شباب نے تمہیں اندھا کر دیا ہے مراد خان تمہیں رشتوں کا تقدس اور احترام بھی یاد نہیں رہا۔''

وہ آگے بڑھتا ہوا ہاتھ کی انگلی کھڑا کر کے بولا۔'' خاموش ہو جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی بیوی کی موت پر رونے والا میرا باپ...... تمہاری موت پر بھی روتا روتا مر جائے۔'' شمسہ اس کی بدتمیزی اور بداخلاقی پر حیران تھی اس نے خاموش ہو جانے پر ہی عافیت سمجھی۔ مراد خان غصے سے باہر نکل گیا۔ شمسہ کو بہت دکھ اور رنج تھا کہ مراد نے اس کو اپنے باپ کے ساتھ نتھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ رونے لگی تھی۔

دروازے پر دستک سن کر اس نے دیکھا تو زبیدہ ہونٹوں پر مسکان سجائے کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ رکھے تھے اور وہ شمسہ کی حالت دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''کیسا رہا میرا وار...... بھابی!'' اس کے الفاظ بتا رہے تھے کہ اس نے کافی دن پہلے والا اپنا بدلہ لیا ہے۔ لازمی اس نے ہی مراد خان کو اکسایا اور ورغلایا ہوگا کہ وہ اورنگزیب خان کے ساتھ شمسہ کو نتھی کر کے بدنام کرے۔'' مجھے حیرت ہے کہ تم بھی عورت ہو اور بیٹی ہی ہو جو اپنے نیک اور شریف النفس باپ کی ذات پر کیچڑ اچھال رہی ہے۔'' شمسہ کی بات سن کر وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور بولی۔

''کیوں تکلیف ہوئی نا...... ہوئی نا تکلیف...... جھوٹی بات اور گھٹیا الزام اسی طرح تکلیف دیا کرتے ہیں۔''

''مجھے تکلیف اس بات کی ہوئی ہے کہ تم نے جو الزام لگایا ہے وہ مجھ پر نہیں بلکہ اپنے اس عظیم باپ پر لگایا ہے جس کی انگلی پکڑ کر تم نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا۔''

''مگر اب تو میں اپنے پاؤں پر کھڑی بھی ہوں اور اپنی مرضی سے چل بھی رہی ہوں۔'' زبیدہ طنزیہ الفاظ ادا کرتے وقت قہقہہ بھی لگا گئی تھی۔

''خدا کرے تم ان پاؤں پر کبھی بھی کھڑی نہ ہو سکو، کبھی بھی چل پھر نہ سکو کہ تم جیسی بیٹی کو عذاب الٰہی کی ایسی مار

پڑے کہ سدا چلنے پھرنے کو ترستی رہو۔'' شمسہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ مراد خان غصے سے اندر داخل ہوا۔
''کیا شور مچا رکھا ہے اور...... تم۔'' وہ شمسہ کی جانب متوجہ ہوا۔ ''تم کیا جاہل عورتوں کی طرح بددعائیں دینے لگی ہو...... امیروں اور حکمرانوں کو بددعائیں نہیں لگا کرتیں۔''
''سکون اور چین کی زندگی تم لوگ اسی باپ کی زندگی میں ہی گزار رہے ہو۔ یاد رکھنا جب انکل نے اس دنیا سے آنکھیں بند کر لیں تو سمجھو پھر تمہارا چین اور سکون بھی غارت ہو جائے گا۔'' شمسہ خاموش نہ رہ سکی تو زبیدہ اور مراد خان نے آگے بڑھ کر اس پر تشدد کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بیڈ پر اوندھی لیٹی ہوئی ان دونوں کے تشدد کا نشانہ بن رہی تھی اور اس کی چیخوں سے کمرہ گونج رہا تھا کہ یک دم دروازہ کھلا اور آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں لئے ہوئے اورنگزیب خان اندر داخل ہوئے۔ ان کا وجود غصے سے کانپ رہا تھا وہ ان کو قصائی بونے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی ڈھب سے پستول نکال کر ایک ہوائی فائر کیا تو وہ تینوں ہی لرز گئے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اورنگزیب خان کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر زبیدہ اور مراد خان کی تو جان ہی نکل گئی تھی۔
''تم کتنے گھٹیا ہو، اس بات کا مجھے اندازہ نہیں تھا لیکن ذلیل بھی ہو اور بے غیرت بھی ہو اس بات کا پتہ آج چلا ہے۔'' وہ آگے بڑھے اور بیڈ پر بے ہوش پڑی ہوئی شمسہ کو دیکھ کر دکھ سے بولے۔ ''اگر اس بچی کو کچھ ہو گیا تو یاد رکھنا تم دونوں کی لاشیں کتوں کو ڈال دوں گا...... فوراً ایمبولینس کو فون کرو اور بہو کو ہسپتال لے کر جاؤ، ابھی......'' زبیدہ اور مراد خان بھی شمسہ کی حالت دیکھ کر سکتے کی کیفیت میں تھے کہ اورنگزیب خان کی دھاڑ نے ان کو ہوش دلا دیا۔
''سنا نہیں تم نے؟'' زبیدہ اور مراد خان کو یوں لگا تھا کہ پورا کمرہ ہی ہل گیا ہو۔ وہ باہر کی جانب بھاگا اور پھر پندرہ بیس منٹ بعد شمسہ ایمبولینس میں سوار ہسپتال کی جانب جا رہی تھی۔
ڈاکٹرز نے ایمرجنسی میں چیک اَپ کیا تو مراد اور زبیدہ نے بتایا کہ سیڑھیوں سے گر گئی ہیں لیکن ڈاکٹر نے انہیں بدلے میں خوش خبری دی کہ یہ ماں بننے والی ہیں۔ ان کی کیئر کی جائے۔ شمسہ بھی ہوش میں آ چکی تھی اور اس خبر کو سن کر زبیدہ آپا تو بجھ کر رہ گئی جبکہ مراد کے ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی اور اس مسکان میں کتنا زہر چھپا ہوا تھا وہ کڑوی کسیلی مسکان شمسہ سے چھپی نہ رہ سکی۔
گھر واپسی پر انہوں نے مراد خان کو راستے میں ہی اتارا وہ ایک کام کا بہانا بنا کر اتر گیا جبکہ گھر پہنچ کر زبیدہ نے باپ کو خوش خبری دی کہ وہ دادا بن گئے ہیں۔
اورنگزیب کے لیے یہ بہت خوشی کی خبر تھی وہ اس خوشی میں دیوانے ہو رہے تھے لیکن سہانا بیگم کی غیر موجودگی نے ان کو رلا دیا۔ وہ ان کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر ان سے باتیں کرنے لگے اور جی ہلکا ہونے پر واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔
شمسہ کو بہت احتیاط کی ضرورت تھی وہ نہ تو ماں کے گھر جا سکتی تھی کیونکہ اس معاملے میں کریم خان تو بے چارہ اس کی کوئی بھی مدد یا احتیاط نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی اس گھر میں ساس موجود تھی جو اس کا اچھی طرح خیال رکھتی اور اس کو طریقے اور وقت پر اچھی خوراک کھلاتی۔ اب وہ خود ہی اس ننھے سے وجود کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے نبھانے کے لئے ایک فیصلہ کر چکی تھی کہ اب وہ احتیاط کرے گی کہ سوتن نما نند سے کسی بھی قسم کا سامنا نہ ہوا گر ہو بھی تو وہ

خاموش ہی رہے اور اس کی کسی بھی بات کا کوئی بھی جواب نہ دے۔ اسی طرح تین ماہ مزید گزر گئے اور خیریت ہی رہی۔ اورنگزیب نے شمسہ کو ایک دن اپنے کمرے میں بلوایا اور اس کو نصیحتیں کرنے لگے۔ ان کی بات چیت جاری تھی کہ زبیدہ نے باہر سے دروازے کو کنڈی لگا دی اور مراد کے آفس اس کو فون کرنے لگی۔ ''دیکھو بیٹی! میں اب بوڑھا اور کمزور ہو چکا ہوں۔'' اورنگزیب خان کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور شمسہ ان کے سامنے والی کرسی پر اپنا سر اور پیٹ اچھی طرح ڈھانپ کر نگاہیں جھکا کر بیٹھی ہوئی تھی اور اورنگزیب خان کہہ رہے تھے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں چاند سی بیٹی عطا کرے تاکہ مراد خان کا غرور سے اکڑا ہوا سر بھی نیچا ہو اور وہ تم پر ظلم کرنا بھی چھوڑ دے۔''

''آپ دعا کریں انکل! اللہ تعالیٰ مجھے نیک سیرت اور خوبصورت بیٹی عطا فرمائے تاکہ مراد خان کو اس حقیقت کا ادراک ہو کہ بیٹی کا باپ ہونا ایک بہت بڑی سعادت ہے۔''

''میں نے تمہیں جو کام کرنے کو کہا تھا وہ تو باقاعدگی سے کر رہی ہو نا؟'' اورنگزیب فکرمندی سے بولے تو شمسہ ہنسنے لگی اور بولی۔

''جی انکل! میں ہر روز قرآنِ کریم کی تلاوت ادا کر کے اس پر پھونک دیتی ہوں۔''

''تم دیکھنا یہ قرآن کریم کی بدولت بہت نیک اور اللہ کی عاشق اولاد ہو گی۔'' اورنگزیب خان مسکراتے ہوئے مطمئن دکھائی دیئے۔ ''اس بچے کے جنم کے بعد میں یہ ساری جائداد اس بچے کے نام کر دوں گا...... یہ نامراد مراد کو کچھ بھی نہیں ملے گا۔''

''نہیں انکل! آپ مراد کا حصہ اور حق ان کو ہی دیجئے میرے نصیب میں جو ہو گا وہ مجھے اور میرے بچے کو ملتا رہے گا۔'' اورنگزیب خان مسکراتے ہوئے اٹھے اور شمسہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تو انہوں نے اسے سر پر پیار دیتے ہوئے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور عین اسی وقت زبیدہ نے باہر سے دروازہ کھول دیا اور مراد خان کی چنگاری بھری آنکھیں باپ اور بیوی کو دیکھ رہی تھیں کہ شمسہ کا سر اورنگزیب کے سینے سے لگا ہوا تھا اور اس کی نظریں خوفزدہ انداز میں شوہر اور نند کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

''میں بھی کہوں کہ آپ کو ماں جی کی کمی کیوں محسوس نہیں ہوتی بابا جان!'' مراد خان کی آواز نے زہر اگلنا شروع کر دیا تو اورنگزیب اس کے اس انداز پر حیرت میں مبتلا بھی ہوئے اور پریشان بھی دکھائی دیئے۔ ''اورنگزیب خان!'' مراد خان طنز سے بولا۔ ''کتنا بڑا نام اور کام کتنا گھٹیا اور ذلیل کہ شیطان کو بھی شرم آ جائے۔''

''مراد خان!'' اورنگزیب خان نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا اور غصے میں کانپتے ہوئے بولے۔ ''تھو ہے تمہاری گندی اور گھٹیا سوچ پر۔ ایک بیٹی کے ساتھ باپ کے رشتے کو کون سا غلیظ رنگ دینے کی گھٹیا کوشش کر رہے ہو۔'' مراد خان اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''جس رنگ میں آپ کھیل رہے ہیں اسی رنگ میں کھیلنے والوں کو رنگ رلیوں کا نام دیا جاتا ہے۔ شرم آنی چاہئے آپ کو کہ آپ اپنے بیٹے کی بیوی کو کمرہ میں بلا کر کمرہ بند کر کے اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کے گالوں پر بوسے دے رہے ہیں؟'' وہ زور زور سے چنگاڑا تو اورنگزیب خان کچھ بھی بولنے سے پہلے شمسہ کی طرف دیکھنے لگے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔

''مراد خان! اس بڑھاپے کو اس طرح تو مت رولو کہ میں اپنی اس بیٹی کے سامنے زندگی کے باقی دن آنکھ اٹھا کر نہ گزار سکوں۔''

''اس کا کیا ہوگا یہ میں بعد میں دیکھوں گا لیکن آج کے بعد آپ اس کمرہ سے باہر نہیں نکلیں گے۔ بس یہ میرا فیصلہ ہے اور مراد خان کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔''

اس نے آگے بڑھ کر اورنگزیب خان کو دھکا دیا اور وہ صوفے پر گر گئے اور شمسہ کی بانہہ پکڑ کر گھسیٹنے والے انداز میں اسے کمرے سے باہر لے گیا اور زبیدہ سے بولا۔

''اس کمرے کو تالا لگا دو زبیدہ آپا! یہ کمرہ اب اس بوڑھے کی موت پر ہی کھلے گا۔'' وہ چیختے چلاتے اورنگزیب خان کو کمرے میں چھوڑ کر کنڈی لگا کر جانے لگی تو اورنگزیب خان نے زبیدہ کو پکارا اور بولے۔ ''ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے پہلے بیٹیوں کو زندہ دفن اسی لئے کر دیتے تھے کہ وہ بڑی ہو کر ماں باپ کے لئے کالک بن جاتی تھیں...... تم نے باپ کی عزت کو اس طرح نیلام کیا ہے کہ آج کاتب تقدیر بھی حیران رہ گیا ہوگا۔''

زبیدہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ میرا بیٹا مجھ سے مت چھینو اس خاندان کی عزت کی دھجیاں اس طرح بکھیروں گی کہ آنے والی نسلیں بھی حیران رہ جائیں گی۔''

''اچھا ہی ہوا کہ تمہاری ماں مرگئی ورنہ وہ آج میری بددعائیں سن کر مر جاتی۔ جا زبیدہ میں تجھے بددعا دیتا ہوں کہ تو ساری زندگی ماں نہ بن سکے۔ تو ساری زندگی اپنے اس بیٹے کی صورت کو ترستی رہے جسے تم نے ناجائز طور پر اپنی کوکھ میں پالا تھا۔ تاحیات تجھے چلنا پھرنا نصیب نہ ہو...... اور رہ گیا یہ نامراد اور بدبخت مراد خان...... تقدیر اس کو ایسا پچھتاوا لگائے کہ اس کی راتوں کی نیندیں اور دن کا سکون برباد ہو جائے۔ دن کا سکون برباد ہو جائے۔ دن کا سکون برباد ہو جائے۔'' اورنگزیب خان چنگاڑتے ہوئے بے ہوش ہو کر گر پڑے اور زبیدہ ہنستی ہوئی کمرے کو تالا لگا کر وہاں سے چلی گئی اور بڑبڑائی۔

''بددعائیں...... بددعائیں اب اثر نہیں کرتی ابا جی!'' وہ قہقہہ لگا کر بولی تو مراد خان کے کمرے سے شمسہ کے چیخنے چلانے کی آوازیں سن کر وہ اور بھی زور سے قہقہے لگانے لگی۔ اس کی کامیاب چال نے منٹوں میں ہی گھر کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

اورنگزیب کو ہوش آیا تو وہ اجنبی اور پرائی نظروں سے کمرے کو دیکھنے لگے ہر چیز ان کو کھانے کو دوڑنے لگی تھی۔ وہ کمرے میں ہر ایک چیز سے خوفزدہ ہو کر چیخیں مارنے لگتے تھے اور چلانے لگتے تھے۔ ان کا ہسٹریائی انداز اس بات کی عکاسی کرنے لگا تھا کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو چکے ہیں۔ وہ تکیے کو بازوؤں میں بھر کر سلانے لگتے۔ کبھی بے ربط الفاظ میں لوریاں سنانے لگتے اور کبھی مغلظات بکنے لگتے تھے۔ زبیدہ نے ان کے لئے ایک ملازم مقرر کر رکھا تھا جو ان کو بمشکل کھانا وغیرہ کھلا دیا کرتا تھا۔ ان کی گندگی کو صاف کرنے کے لئے انسان کو انسانیت کے درجے سے گرنا پڑتا تھا۔

مراد خان اور زبیدہ ان کو دیکھ کر قہقہے لگایا کرتے تھے۔ یہ وہی باپ تھا جس نے ان دونوں بچوں کی خاطر اتنی دولت اور جائیداد اکٹھی کی تھی لیکن آج اولاد جو اس کو صلہ دے رہی تھی وہ انسانیت اور رشتوں کی تذلیل کے لئے کافی

تھا۔

شمسہ ان کے کمرے کے سامنے آ کر کھڑی جاتی اور وہ کھڑکی سے اس کو دیکھ کر چیخنے لگتے، چلانے لگتے اور واضح الفاظ میں کہتے رہتے۔ ''بھاگ جاؤ اس محل سے بھاگ جاؤ، نکل جاؤ یہ ڈریکولہ ہیں، یہ تمہارا خون پی جائیں گے...... یہ میرا محل ہے۔ میں نواب ہوں، میری رانی میری ملکہ میرے لئے ابھی فیڈر لے کر آتی ہے...... ابھی وہ آئے گی۔تم دیکھنا میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔ ڈاکٹر بنوں گا۔'' وہ انہی بے ربط جملوں کو ادا کرتے ہوئے گر کر بے ہوش ہو جاتے تو شمسہ ان کی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر آنسو بہانے لگتی تھی۔ وہ ظالم لوگوں کے ظلم کا شکار تو تھی ہی لیکن اورنگزیب خان تو اس گھر کے سربراہ تھے۔ اُن کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک شمسہ کو ہمیشہ ہی رلاتا تھا اور اذیت پہنچاتا تھا۔ ایک دن تو اورنگزیب خان نے حد کر دی انہوں نے اپنے خدمتگار کو پکڑ لیا اور اس کی گردن دبانا شروع کر دی اس کی گھٹی گھٹی چیخیں برآمدے میں سے گزرنے والی زبیدہ نے سنی تو دروازہ کھول کر ملازم کی جان چھڑائی اور ملازم کو لے کر فوراً باہر نکل گئی لیکن دروازہ بند کرنا بھول گئی کیونکہ اس کو ملازم کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اورنگزیب خان نے چھلانگ لگا کر دروازہ عبور کیا اور ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہوئے وسیع لان میں پہنچے تو شمسہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ لیا وہ اورنگزیب خان کو اس طرح آزاد دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی ہوئی۔

اس کے ہونٹوں سے یہی دعا نکلی کہ اورنگزیب اب اس محل سے باہر نکل جائے۔ وہ آگے بڑھی اور بڑی احتیاط سے نیچے لان میں پہنچی اور اس کو دیکھ کر اورنگزیب خاموش ہو گیا اور اچھے تاثر سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ شمسہ نے اس کا بازو پکڑا اور اس کو لے کر مین گیٹ تک پہنچی اور چوکیدار کو گیٹ کھولنے کا حکم دیتے ہوئے اورنگزیب خان سے بولی۔

''یہاں سے بھاگ جائیں۔ اس محل سے نکل جاؤ۔ یہاں ڈریکولہ رہتے ہیں۔ وہ تمہارا خون پی جائیں گے۔'' اس کی باتیں سن کر اورنگزیب کے چہرے پر بے نام سا خوف اور وحشت نظر آنے لگی۔

''بھاگ جاؤ، بھاگ جاؤ۔ وہ تمہارا خون پی جائیں گے۔ نکل جاؤ۔'' شمسہ کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر اورنگزیب ڈر کے مارے ایک طرف کو چھلانگیں لگاتے ہوئے بھاگ نکلے اور چند ہی ساعتوں میں گم ہو گئے۔

شمسہ اس کامیابی پر بہت خوش تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ مراد خان کے ہاتھوں اس کی کمبختی آنے والی ہے۔ اس نے چوکیدار سے گیٹ بند کرنے کا کہا اور واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مراد خان کے چیخنے سے اندازہ ہو گیا کہ اس کو چوکیدار نے تمام حقیقت بتا دی ہے۔ وہ دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بیڈ پر لیٹی ہوئی شمسہ سے غصے میں دھاڑا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''اگر آج وہ ملازم مر جاتا تو کیا ہوتا؟'' شمسہ اطمینان سے بولی۔

''تو مر جاتا۔'' وہ غصے سے دھاڑا۔ ''وہ تمہارا کوئی سگا لگتا تھا؟''

''پھر تم سب لوگ باقی زندگی جیل میں گزارتے۔'' اطمینان اور سکون ہنوز اس کے چہرے پر قائم تھا۔ ''اور میں نہیں چاہتی تھی کہ اس محل میں پولیس آئے اور پاگل کی بجائے کسی صحتمند کو گرفتار کر کے جیل کی ہوا بھی کھلائے اور چکی

بھی پسوائے۔''

''تم ہماری ہمدرد کب سے ہوگئیں شمسہ بیگم!'' وہ عورتوں کی طرح طنزیہ انداز میں ہاتھ نچاتا ہوا بولا تو شمسہ بھی طنزیہ انداز میں مسکرائی اور کہنے لگی۔

''اس غلط فہمی کو دل میں مت پالو، میں اپنے اس بچے کی ہمدرد ہوں۔تمہاری یا اس گھر کے کسی اور فرد سے مجھے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں ہے۔''

''تو پھر کان کھول کر سن لو۔'' وہ آگے بڑھ کر اس کے بال نوچتا ہوا بولا۔''اگر بیٹی کو جنم دیا تو یاد رکھنا وہ رات اس گھر میں تمہاری آخری رات ہوگی۔'' اس نے بال چھوڑے تو شمسہ مسکراتی ہوئی بولی۔'' پھر تو میں دعا یہی کروں گی کہ اللہ تعالیٰ مجھے بیٹی ہی نوازے۔''

مراد خان کو آگ سی لگ گئی۔''تو پھر سن لو، میں اس کی صورت دیکھنے سے پہلے ہی اسے جان سے مار دوں گا۔'' شمسہ تڑپ کر بولی۔

''کیوں خوفزدہ ہو مراد خان...... جو کچھ تم کسی کی بیٹی کے ساتھ کر رہے ہو...... ویسا ہی تمہاری بیٹی کے ساتھ بھی ہوگا؟ یہی خوف ہے تمہیں؟ تو پھر بیٹا مانگنا بھی چھوڑ دو مراد خان کیونکہ تم نے جو کچھ اپنے باپ کے ساتھ کیا ہے...... وہی کچھ تمہارے ساتھ بھی تقدیر تمہارے بیٹے سے بھی کروا سکتی ہے۔''

مراد خان کے چہرے پر خوف کی ہلکی سی پرچھائی دیکھ کر شمسہ نے قہقہہ لگایا تو وہ غصے میں لال پیلا ہوتا ہوا پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔شمسہ نے اس کی دم پر پاؤں رکھ دیا تھا اب وہ اولاد کے ہونے سے خوفزدہ ہی رہے گا۔

شمسہ نے اٹھ کر وضو کیا اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا شروع کر دی اس کی دعا یہ تھی کہ رب تعالیٰ اسے نیک اور صالح بیٹی عطا کرے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی فریاد سن لی۔اس نے بمشکل قرآن کریم کو رکھا اور درد سے چلاتی ہوئی باہر نکلی تو مراد خان نے اس کی حالت دیکھ کر پہلے تو سمجھا تھا کہ وہ کوئی ناٹک کر رہی ہے مگر زبیدہ نے اس کے کان میں کہا کہ اس پر ڈلیوری کا وقت ہے تو وہ فوراً گاڑی میں ڈال کر اسے ہسپتال کی جانب بھاگ گیا۔

ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اللہ نے اسے بیٹی عطا کی ہے تو وہ زمین میں ہی گڑھ کر رہ گیا اس کی رگیں غصے سے پھولنے لگیں تو ڈاکٹر نے اسے حیرت سے دیکھا اور بولا۔

''مسٹر خان آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آپ ذرا باہر لان کا چکر لگا آئیں تب تک آپ کی مسز کو بھی ہوش آ جائے گا۔'' ڈاکٹر اسے پکڑ کر باہر کی جانب بڑھ گیا۔

شمسہ ہوش میں ہی تھی اور اس کی پلاننگ اور ڈاکٹرز کی سمجھداری نے کام دکھایا انہوں نے ایک ٹاول میں ایک آرٹی فیشل گڑیا کی ڈمی کو رکھ کر اچھی طرح لپیٹا اور شمسہ کے ساتھ لٹا دیا اور نومولود بیٹی کو اپنے ساتھ باہر لے گئے۔ شمسہ نے ان کو بتا دیا تھا کہ مراد خان بچے کو کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ڈاکٹرز نے شمسہ کی منت سماجت اور پوری کہانی سن کر اس کی دلچسپ ڈرامائی کہانی کا کردار بننے کا فیصلہ کیا اور بچی کو باہر لے گئی۔کوئی ایک گھنٹے بعد مراد خان غصے میں کانپتا ہوا ہسپتال کے کمرے میں داخل ہوا اور شمسہ کے ساتھ سوئے ہوئے ننھے وجود کو دیکھنے کی بجائے نفرت

سے منہ موڑتا ہوا بولا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ اگر بیٹی پیدا ہوئی تو اس کی صورت دیکھنے سے پہلے ہی اسے ماردوں گا.....شمسہ بیگم تم نے بیٹی کو جنم دے کر میرے غیض وغضب کو بھی للکارا ہے اور ہماری خاندانی رسم کو داغدار کیا ہے۔ ہمارے خاندان میں یہ پہلی بیٹی ہوگی جونجانے ارباب احمد اور اورنگزیب کا گندہ خون ہے۔''

''مراد خان! زبان کو لگام دو۔'' شمسہ گھناؤنے اور ذلیل الزام سے تڑپ رک بولی۔

''میں اس گناہ کی گٹھڑی کو کھلنے سے پہلے ہی جان سے ماردوں گا۔'' اس نے آگے بڑھ کر کمبل اور تاول میں لپٹی ہوئی ڈمی بے بی کو اٹھایا اور دیکھے بغیر ہی کمرے کی دیوار سے ماردیا۔شمسہ کی چیخ سن کر کمرے کا دروازہ یک دم کھلا اور ڈاکٹرز پولیس کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

مراد خان ہونق بن کر پولیس والوں کو دیکھنے لگا۔شمسہ کی چال کامیاب رہی تھی اور اس کی بچی کی زندگی بچ گئی تھی۔ڈاکٹر نے ڈمی بے بی کو اٹھا کر دیکھا اور بولا۔'' یہ بچی تو مرگئی ہے۔''

''تمہیں بیٹی کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے مراد خان!'' انسپکٹر کی آواز سن کر مراد خان جیسے ہوش میں آ گیا۔ڈاکٹر نے بچی کو شمسہ کے سینے پر لٹا دیا اور شمسہ اپنی بچی کے زندہ بچ جانے پر ڈمی بچی کو گود میں لے کر خوشی کے آنسو بہانے لگی۔

''انسپکٹر صاحب! میں اس عورت کو مزید برداشت نہیں کرسکتا......اس کی وجہ سے میں آج گرفتار ہوا ہوں۔'' وہ غصے میں دھاڑنے لگا۔''میں اس عورت کو اپنے گھر میں نہیں دیکھنا چاہتا۔شمسہ بیگم! میں مراد خان تمہیں طلاق دیتا ہوں۔طلاق طلاق دیتا ہوں۔'' پولیس والے مراد خان کو تو کمرے سے کھینچ کر لے گئے مگر شمسہ کے ہونٹوں پر پُرسکون مسکراہٹ اور چہرے پر اطمینان دیکھ کر ڈاکٹرز بھی خوش ہوگئے تھے۔

وہ سمجھ گئے تھے کہ نام بڑے اور درشن چھوٹے والی مثال مراد خان کے خاندان پر صحیح لاگو ہوتی تھی شمسہ کو اس کی بچی واپس کردی گئی۔وہ بچی کو سینے سے لگا کر چومنے چاٹنے لگی تو زبیدہ اندر داخل ہوئی وہ بچی کو دیکھ کر حیران رہ گئی اور شمسہ اس کی حیرانگی کا فائدہ اٹھاتی ہوئی بولی۔

''بے غیرت عورت! باپ کو پاگل بنا دیا اور بھائی کو جیل بھجوا دیا۔اپنی کوکھ اور گود بھی سونی کرلی۔چچ چچ چچ...... کہاں کی رہ گئی ہو زبیدہ آپا۔لاکھ لعنت ہو تمہاری چالوں پر اور تمہاری انتقام کی سوچ پر اپنے ہی خاندان سے انتقام لینے چلی تھی ذلیل کتیا!'' شمسہ کا پارہ عروج پر تھا۔وہ سانس لیتی ہوئی پھر بولی۔''دیکھو رب نے مجھے کیسا انعام دیا ہے۔بیٹی......رحمت......میرے لئے رحمت بن کر آئی ہے یہ بیٹی اللہ تعالیٰ نے مجھے انعام بخشا ہے میرے اس صبر کا جو میں نے تمہارے محل میں ظلم وستم سہنے پر کیا ہے...... مجھے مراد نے طلاق دے کر آزاد کر دیا ہے۔اب میں آزاد ہوں زبیدہ آپا آزاد......''

شمسہ قہقہے لگاتی ہوئی بولی تو زبیدہ کا خون کھولنے لگا اسے مراد خان سے اتنی جلد بازی کی توقع نہ تھی لیکن وہ شمسہ کی چال کے سامنے مات کھا گیا تھا۔شمسہ نے اسے غصہ دلایا تھا اور غصے میں ہی زندگی کا سب سے بڑا غلط فیصلہ کر گیا تھا۔

''جاؤ......اب دفع ہو جاؤ یہاں سے......دوبارہ مجھے صورت دکھائی تو تمہارا منہ نوچ لوں گی کتیا!'' شمسہ کی گھن گرج سے کمرہ گونج رہا تھا اور زبیدہ ہارے ہوئے جواری کی طرح وہاں سے نکل گئی۔ تو ایک لیڈی ڈاکٹر نے شمسہ کو آ کر بتایا کہ اس کے لئے رہائش کا بندوبست ہو گیا ہے۔ وہ اٹھی اور ہمت کر کے ڈاکٹر کی سربراہی میں چلتی ہوئی ایک گاڑی میں بیٹھ کر نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ اس سارے منظر کو زبیدہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ شمسہ سے بری طرح ہار گئے تھے۔

مراد خان نے اپنے رعب اور پیسے کے دبدبے پر پولیس کو خریدا اور تیسرے دن جیل سے رہا ہو کر گھر پہنچا تو خاموشی اور ویرانی نے اس کا استقبال کیا۔ زبیدہ آپا لان میں بیٹھی چائے سے دل بہلا رہی تھی۔ وہ مراد کو آتا دیکھ کر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس کے گلے لگ کر مگر مچھ کے آنسو بہانے لگی۔

''تمہیں شمسہ کو طلاق نہیں دینا چاہئے تھی۔'' وہ ایک کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی تو مراد بھی خاموشی کو توڑتا ہوا کہنے لگا۔ ''اس نے مجھے بہت تاؤ دلا دیا تھا اور پھر بچی کو مارنے کے بعد میں خود پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔''

''بچی مری نہیں ہے بلکہ زندہ ہے۔ اس نے تمہارے ساتھ ڈرامہ کیا ہے اور وہ اپنے ہی لکھے ہوئے سکرپٹ میں جاندار اداکاری کر کے تمہیں ولن ثابت کر گئی ہے۔''

''بچی زندہ ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''ہاں اس نے سارا ناٹک تمہیں غصہ دلانے کے لئے رچایا تھا اور تم اس کی کامیاب چال کا نشانہ بن گئے۔'' زبیدہ تاسف سے بولی تو مراد خان کو نہ جانے کیوں پہلی بار غصہ نہ آیا تھا۔ وہ کمرے میں جانے لگا تو بچوں کا شور بلند ہوا وہ کسی بوڑھے کو ''پاگل ہے پاگل ہے'' کہہ کر روڑے مار رہے تھے اور وہ بوڑھا ان کے محل کے گیٹ پر آ کر گر گیا تو وہ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور دیکھا تو اورنگزیب لہولہان ہو چکے تھے اور ان کی حالت کافی سیریس تھی۔ مراد خان نے بچوں کو گالیاں دینا شروع کر دیں تو بچے بھاگ گئے لیکن مراد خان سکتے کی حالت میں بے ہوش باپ کو دیکھ کر لرزنے لگا تھا۔ ملازم نے ایمبولینس منگوائی تو اورنگزیب خان کو ہسپتال لے جایا گیا لیکن ڈاکٹرز نے چیک کرنے کے بعد بتایا کہ پندرہ بیس منٹ پہلے ان کی موت واقع ہو چکی ہے۔ وہ کبھی ڈاکٹر اور کبھی اورنگزیب خان کی طرف دیکھنے لگتا۔ وہی اورنگزیب خان جو اس کا باپ تھا جس کی دہشت اور رعب خاندان بھر میں مشہور تھا۔ آج اس کے قدموں میں ایک لاش کی صورت میں پڑا ہوا تھا اور لاش بھی ایسی کہ جس کی اذیت ناک موت پر وہ ماتم بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ اس کا قاتل تھا۔ اپنے باپ کا قاتل تھا اس نے ہی اس کو اس حالت تک پہنچایا تھا کہ وہ پاگل ہو کر گھر سے بھاگ گیا تھا اور بچے اس کو پتھر مارتے تھے۔ مراد خان نے غور سے اورنگزیب کے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو ایک ہاتھ کی انگلیاں کھلی ہوئی تھیں جبکہ دوسرے ہاتھ میں یوں لگتا تھا کہ اورنگزیب خان نے کچھ چھپایا ہو۔ مراد خان نے ڈاکٹرز کی مدد سے بند ہاتھ کو کھولا تو مراد خان کی چیخیں نکل گئیں کیونکہ اورنگزیب خان کے ہاتھ میں تندوری روٹی کا ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ جو یوں لگتا تھا کہ وہ تندور سے چرا کر بھاگا ہو گا اور لوگ اس کے پیچھے بھاگ نکلے ہوں گے۔

مراد خان اس روٹی کے ٹکڑے کو خوف اور وحشت سے دیکھنے لگا اور پھر سر پکڑ کر زور زور سے رونا شروع کر دیا اس کے رونے کا انداز ایسا تھا کہ لوگ سمجھنے لگے اس کا ذہنی توازن کھو گیا ہے لیکن لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ اب اس کا ذہنی

توازن ٹھیک ہو گیا تھا۔ اسے ضمیر کی عدالت نے مجرم بنا کر اپنی ہی نظروں میں گرا دیا تھا اور اس کا وہ سہارا چھین لیا تھا جوان کے لئے محل اور جائیدادیں بنا گیا تھا لیکن خود ایک روٹی چوری کر کے کھاتا ہوا مارا گیا تھا۔

مراد خان کی آنکھوں کے سامنے تمام فلم چلنے لگی وہ باپ کو برا بھلا کہتا رہا تھا۔ اس کو پاکباز بیوی شمسہ کے ساتھ ناجائز تعلقات کا طعنہ دے کر پاگل بنانے والا مراد خان ہی تھا۔ وہ ضمیر کی عدالت کا قیدی بن کر باپ کو دفنانے کے بعد کمرے میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ کوئی بات نہ کرتا تھا نہ ہنستا اور نہ ہی بولتا چالتا تھا اس کی دہشت، پرسنالٹی اور رعب دبدبہ سب کچھ اس طرح خاک میں مل گیا تھا کہ وہ گردن جھکائے اپنے کیئے پر پچھتاوے کے آنسو بہاتا رہتا تھا۔ اسی طرح کئی ماہ گزر گئے تو ایک ایکسیڈنٹ میں زبیدہ آپا کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئیں اور ڈرائیور کی موت بھی واقع ہو گئی۔ اس حادثہ نے مراد خان کو اپنے خول سے باہر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ زبیدہ آپا کی طرف دیکھ دیکھ کر رونے لگتا تھا۔

اب زبیدہ آپا چلنے پھرنے کے قابل نہ رہی تھی اس نے وہیل چیئر کو اپنا ساتھی اور اپنی ٹانگیں سمجھ لیا تھا۔ اسے باپ کی بددعائیں اور شمسہ کی آہیں یاد آ رہی تھیں۔ باپ کو زندہ درگور کرنے کی......؟ کہانی کی تخلیق کار زبیدہ آپا ہی تھی اور آج مکافات عمل کا شکار بن کر وہیل چیئر پر لگ گئی تھی۔ زبیدہ سے مراد خان کی اداسی دیکھی نہ جاتی تھی اس نے شراب میں اپنا آپ غرق کر لیا تھا اور قریب ہی تھا کہ شراب اس کے اندرونی نظام کو ختم کر دیتی اور وہ اس موذی کے ہاتھوں اپنی جان گنوا بیٹھتا۔ زبیدہ چونکہ اس گھر کی اب بڑی تھی اور وہ خود تو اپنی شادی نہ کروا سکتی تھی یا پھر یوں کہہ لیں کہ اس محتاج سے کس نے شادی کرنا تھی۔ اسی لئے اس کو فکر تھی تو مراد خان کی شادی کی فکر تھی اور اس نے اپنی دوستوں سے بات بھی کر لی تھی اور کسی جگہ سے اچھا رشتہ آنے کی امید پر وہ مراد خان کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی تھی۔

''میں اب شادی نہیں کروں گا آپا!'' وہ دھیرے سے دھیمے لہجے میں بولا تھا۔ مگر زبیدہ جانتی تھی کہ اتنی بڑی زندگی اکیلے کیسے گزرے گی۔ وہ اس کو قائل کرتی ہوئی بولی۔

''میں جانتی ہوں کہ شمسہ نے تمہیں کافی دکھ اور تکالیف پہنچائی ہیں......لیکن میرے بھائی وہ تمہاری پسند تھی۔ اب صرف میرے کہنے پر میری پسند کی لڑکی سے شادی کر کے دیکھو۔ وہ تمہاری زندگی جنت بنا دے گی۔''

''مجھے جیتے جی جنت نہیں چاہئے۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ پلیز آپا میری شادی کا خیال دِل سے نکال دیں۔ میں نے شراب سے شادی کر لی ہے۔'' وہ اٹھ کر جانے لگا تو زبیدہ آپا نے اسے جذباتی طور پر بلیک میل کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے پہلے مجھے گولی مار دے پہلے مجھے موت کی میٹھی نیند سلا دو تا کہ میں تمہارا کوئی بھی دکھ اور غم نہ دیکھ سکوں۔ مجھے موت دے دو تا کہ میں تمہارا اداس اور غمزدہ چہرہ دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی نہ رہوں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگی اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے گاؤں میں عورتیں کسی فوتگی پر ماتم کرتی ہیں۔ مراد خان نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ پکڑے اور اسے روکتا ہوا بولا۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ کیوں مجھے بھی دکھ دے رہی ہیں اور خود کو بھی ستا رہی ہیں۔''

''کاش میں معذور نہ ہوئی ہوتی تو جا کر کسی کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی ختم کر لیتی۔'' زبیدہ آپا نے

ایک اور پینترہ بدلا تو مراد خان کچھ موم ہوتا ہوا بولا۔

''مگر کیوں؟ آپ اپنی زندگی ختم کیوں کرتیں؟''

''اس لئے کہ تم اپنی بربادی کے ذمہ دار مجھے ہی سمجھ رہے ہو۔ یہ سچ سن کر مراد خان ہونق بن گیا۔

''لیکن میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا آپا جی!''

''تو پھر شادی کیوں نہیں کرتے...... میرے کہنے پر اپنا گھر کیوں نہیں بساتے۔ اس گھر کی اداسی اور خاموشی مجھے کھانے کو دوڑتی ہے۔ میں دیواروں سے باتیں کر کر کے پاگل نہیں ہونا چاہتی۔ مراد تمہیں خدا کا واسطہ شادی کروا لوتا کہ اس آنگن میں ننھے منے پھول کھل جائیں۔ ان کی قلقاریوں میں اس گھر کی ویرانی دور ہو جائے۔

زبیدہ آپا کا لیکچر اور رونا کام آ گیا تھا۔ مراد خان نے شادی کرنے کے لئے حامی بھر لی تھی لیکن اب مسئلہ لڑکی پسند کرنے کا تھا۔ زبیدہ آپا خود تو جا نہ سکتی تھی اور مراد نے صاف ہی کہہ دیا تھا کہ وہ کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے کو تیار ہے۔

بالآخر زبیدہ کو اپنی سہیلی کی چھوٹی بہن صباء پسند آ گئی۔ وہ بھی اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے اور اُن کو بھی مراد کی طرح لڑکا دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی انہوں نے کروڑوں روپے کا محل اور زمینیں جائدادیں دیکھیں اور جھٹ سے ہاں کر دی اور اس طرح صباء مراد کی دلہن بن کر اس محل میں شمسہ کی جگہ آ گئی تھی اور شمسہ کے ساتھ مراد کی پہلی شادی کو خفیہ ہی رکھا گیا تھا۔ مراد خان حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو سامنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی شمسہ ہی نظر آئی لیکن وہ آج نشہ میں نہ تھا اور پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔

دروازہ زور زور سے پیٹا جا رہا تھا تو مراد خان تخیلاتی دنیا سے واپس آ گیا اس نے اپنے اردگرد بغور دیکھا تو وہ صہیب احمد کے گھر میں اپنے کمرے میں موجود تھا اور یادوں کی دنیا نے اس کو اس کے ماضی کی تمام داستان اس کی آنکھوں کے پردہ پر چلانے کے لئے دل و دماغ سے روشنی لے کر اپنا کام دکھا دیا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ہی صہیب احمد کو کھڑے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''آئی ایم سوری بیٹا! میں ساری رات سو نہیں سکا تھا اس لئے صبح آنکھ لگ گئی۔''

صہیب احمد اندر داخل ہوتا ہوا بولا۔ ''کوئی بات نہیں بابا جان آپ فریش ہو کر آ جائیں میں ابھی ناشتہ تیار کرواتا ہوں۔'' صہیب احمد نے ایک ٹاول اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

مراد خان کافی دیر وہیں کھڑے کھڑے اس گھر کو دیکھتے رہے جس میں پہلی بار شمسہ بیاہ کر آئی تھی اور اسی گھر سے انہوں نے اپنے محسن اور جاں نثار دوست ارباب احمد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔

پچھتاوے کے دو آنسو نکل کر ان کے گالوں پر بہہ گئے تو مراد خان نے باتھ روم میں جا کر آنکھوں کو ٹھنڈے پانی سے دھونا شروع کر دیا لیکن رات بھر کے رت جگے نے آنکھوں کی سرخی کو مزید نمایاں کر دیا تھا۔ انہوں نے چند منٹ بعد شاور لینا شروع کر دیا تھا کیونکہ صہیب احمد کو آفس سے دیر ہو رہی تھی اور وہ ناشتہ مراد خان کے ساتھ ہی کرتا تھا۔

O......❖......O

شمسہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کن مساعد حالات میں ایبٹ آباد سے نکل کر اپنے باپ کے گھر پہنچی تھی اس نے کریم خان کو دو سالوں میں اس پر بیتنے والے واقعات و حالات بتائے تو وہ دِل پکڑ کر بیٹھ گئے اور بیٹی کے ماتھے پر طلاق یافتہ کا لیبل لگا دیکھ کر چند دنوں تک زندہ رہے اور خالق حقیقی سے جا ملے۔ اب گھر میں شمسہ اپنی بیٹی کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔

انہی دنوں اس کا سامنا مارکیٹ میں دولت بی بی سے ہوا تو وہ دولت بی بی کو زبردستی اپنے گھر لے گئی اور تمام داستان سے آگاہ کیا تو دولت بی بی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے انہوں نے بتایا کہ ارباب احمد تو امریکہ گیا ہوا ہے وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے جیسے ہی لوٹے گا وہ اس سے شمسہ کے ساتھ شادی کی بات ضرور کرے گی۔ شمسہ کو اس بات کا تو حوصلہ ہو گیا تھا کہ اب دولت بی بی ارباب کے آنے پر یا اس کے گھر میں فون کرنے پر اس کی تمام بات ضرور کرے گی۔ لیکن دِل میں ایک کھٹکا اور خدشہ تھا کہ کیا ارباب احمد اس کے ساتھ شادی پر رضامند ہو جائے گا؟ اگر ہو بھی گیا تو کیا وہ ننھی طیبہ کا وجود برداشت کرے گا؟

ان دو سالوں میں ارباب احمد نے اس سے ایک بار بھی رابطہ کرنے کی کوشش نہ کی تھی کیونکہ ایک تو اسے مراد خان نے سختی سے منع کر دیا تھا اور دوسرے وہ اسلام آباد سے ایبٹ آباد شفٹ ہو گئے تھے اور ارباب احمد بھی یہی چاہتا ہو گا کہ اس کی وجہ سے شمسہ کی زندگی میں کوئی طوفان نہ آ جائے لیکن وہ یہ نہ جان سکا تھا کہ مراد خان نے اس کی شمسہ کو کانٹوں بھری سولی پر راتیں اور تپتے صحرا میں گزرنے والے دنوں کا تحفہ دیا تھا۔

لیکن اب شمسہ بے خوف و خطر اپنے گھر میں اپنی طیبہ کے ساتھ رہ رہی تھی اسے اس بات کا ہلکا سا ڈر تھا کہ کہیں مراد خان واپس آ کر اس سے اپنی بچی نہ چھین لے وہ جلد از جلد طیبہ کا مستقبل محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ اسے ارباب احمد کی ڈاکٹری کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار تھا اور اسے اپنی محبت پر بھی اعتماد تھا کہ ارباب احمد واپس اسی کی طرف لوٹے گا کیونکہ تسلی بخش بات یہ تھی کہ ارباب احمد نے ابھی تک شادی نہ کی تھی۔

دولت بی بی کو گئے ہوئے پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ ارباب احمد کا فون آ گیا۔ دو سال بعد ارباب احمد کی آواز سن کر شمسہ کو دلی سکون ہو گیا تھا۔ ارباب احمد نے اس کے گھر آنے کا وعدہ کیا تو وہ حیران رہ گئی۔ دو دن بعد ارباب احمد شمسہ کے گھر پہنچا تو آنسوؤں کی برسات میں شمسہ نے اس کا استقبال کیا تھا۔ ارباب احمد کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ لٹی پٹی شمسہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہی شمسہ جس کا یونیورسٹی میں کئی لڑکوں کو انتظار رہتا تھا۔ وہ گاڑی سے اترتی تو لڑکے دِل پکڑ کر رہ جاتے تھے لیکن اس نے اپنے پیار اور دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ارباب احمد کو من مندر کا دیوتا بنایا تھا اور ارباب احمد کے کہنے پر ہی وہ محبت کی خاطر اپنا مستقبل اور کیریئر قربان کر کے مراد خان کی دلہن بن کر اس کی سیج پر بیٹھ گئی تھی۔

''میں نے اپنا وعدہ نبھا دیا ہے ارباب احمد!'' اس نے ارباب احمد کے ہاتھ کو پکڑ کر بوسہ دیا تو آنکھوں نے چھم چھم برسنا شروع کر دیا تھا۔ ''دیکھ لو میں نے محبت کا سر جھکنے نہیں دیا۔''

''شمسہ...... میں تمہارا مجرم ہوں۔'' ارباب احمد کے آنسو بھی جوابی طور پر محبت کو خراج پیش کرنے کے لئے نکل آئے تھے۔ ''میں نے تمہیں جس جہنم میں جھونکا تھا یقین کرو کہ مجھے اندازہ نہ تھا کہ اس کی تپش اتنی ہو گی کہ سب کچھ

ہی جل جائے گا۔'' وہ آنسو بہاتا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔
''مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے ارباب احمد! یہ میرا نصیب تھا جو میں نے بھگتنا تھا بھگت لیا۔'' وہ کرب سے بولی۔ ارباب احمد اس کی آنکھوں سے آنسو صاف کرتا ہوا بولا۔
''شمسہ! مجھے معاف کر دو۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا اور شمسہ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوا رونے لگا تو شمسہ نے آگے بڑھ کر اس کے پکڑ لئے اور اپنا سر اس کے سینے پر رکھتی ہوئی کہنے لگی۔
''مجھے گناہگار نہ کرو ارباب احمد! تم میرے من کے مندر میں دیوتا کی جگہ پر ہو اور دیوتا کا مقام تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کی پوجا کی جاتی ہے۔''
''میری تعلیم مکمل ہوگئی ہے رزلٹ کا انتظار ہے لیکن ایک المناک حادثے کی وجہ سے مجھے واپس آنا پڑا ہے۔'' ارباب احمد بولا تو شمسہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔
''کیسا حادثہ ارباب؟''
''میرا بڑا بھائی اور بھابی ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے مجھے کام ادھورا چھوڑ کر واپس لوٹنا پڑا ہے۔'' شمسہ یہ سن کر افسوس کرنے لگی۔
''ان کا ایک تین سالہ بیٹا بھی ہے جو اب میری ذمہ داری ہے کیونکہ بھائی کی اور کوئی اولاد نہیں ہے اور بھابی کے والدین نے اس بیٹے کو لینے سے انکار کر دیا ہے۔''
''تم فکر نہ کرو ارباب احمد! اللہ سب بہتر کرے گا۔'' شمسہ نے اس کو تسلی دی اور اپنی کہانی بیان کرنے لگی تو ارباب احمد کی آنکھیں بے اختیار ہو کر برسنا شروع کر دیتی تھیں اور وہ کبھی بے چینی سے پہلو بدل کر رہ جاتا تھا۔
شمسہ نے واقعی اس کی بات اور محبت کی لاج رکھنے کے لئے اپنی زندگی کے بہترین دن اور راتیں جس دوزخ کی نذر کی تھیں وہ جذبہ قابل ستائش ہی نہ تھا بلکہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل تھا۔
''مجھ سے شادی کرو گی شمسہ!'' ارباب احمد کی آنکھیں جلنے لگیں تو وہ اس کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔
''میں نے کہا تھا نا ارباب احمد کہ میں تمہارا اسی دہلیز پر انتظار کروں گی..... میں تو آج بھی وہیں کی وہیں کھڑی تمہاری منتظر ہوں۔'' شمسہ کا جواب ہاں میں تھا۔ ارباب احمد مسکراتا ہوا بولا۔
''میں تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم اپنے دو سال بھول جاؤ گی۔''
''اور میری بیٹی؟'' شمسہ کریم لرزتے دل سے بولی تو ارباب احمد اسی جذبے سے بولا۔
''وہ ہماری بیٹی بن کر ہمارے ساتھ رہے گی اور احمد فراز ہمارا بیٹا بن کر ہمارے ساتھ رہے گا۔ بولو منظور؟'' ارباب احمد کی آواز سے پیار ہی پیار چھلکتا ہوا پا کر شمسہ کی آنکھیں پھر برسنے لگیں۔
''بھائی اور بھابی کے چالیسویں کے بعد ہم سادگی سے نکاح کر لیں گے۔'' ارباب احمد نے اسے خوشخبری سنائی تو شمسہ اس سے لپٹ گئی۔ ارباب احمد بولا۔
''ہم ایک ہی گھر میں امی کے ساتھ رہیں گے اور طیبہ اور احمد فراز کی اچھی تربیت کریں گے۔'' شمسہ کریم جو کہ چند دنوں بعد شمسہ ارباب بننے والی تھی۔ ارباب احمد کی طرف دیکھ کر تشکر آمیز انداز میں نظریں جھکا کر رہ گئی۔ اتنی دیر

میں اندر سے طیبہ کے رونے کی آواز سن کر وہ دونوں ہی چونک پڑے تو شمسہ ہنستی ہوئی اندر کی جانب بھاگ گئی اس کو طیبہ کا رونا پسند نہ تھا یہی وجہ تھی کہ وہ بائیس سال پہلے رونے والی طیبہ کی آواز سن کر تڑپ کر اٹھ کر بیٹھ گئی اور کمرے میں اردگرد دیکھنے لگی۔

اس نے دیکھا کہ ارباب احمد سو رہا تھا جبکہ وہ طیبہ کے رونے کی آواز سن کر جاگ گئی تھی۔ کئی دنوں بعد وہ سونے کی کوشش میں سوئی ہی تھی کہ ماضی کی یادوں نے گھیر لیا تھا اور آج وہ غم اور اداسی کے چنگل میں اس طرح ایک بار پھر گھر گئی تھی کہ اسے وہ دو سال پھر سے یاد آنے لگے تھے جو اس نے مراد خان کے گھر میں ظلم و ستم سہتے ہوئے گزارے تھے۔

لیکن اب وہ ارباب احمد کی بیوی تھی۔ عدیم اور ریا کی ماں تھی لیکن آفرین تھی ارباب احمد کے بھی جس نے طیبہ کو باپ بن کر پالا تھا اور اچھی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے سگے بچوں پر اسے اہمیت اور فوقیت دی تھی۔

اس نے فرشتوں جیسی معصومیت چہرے پر سجائے ہوئے ارباب احمد کی طرف دیکھا تو وہ اسے وہ فرشتہ لگا جسے اللہ تعالیٰ نے شمسہ کے لئے انسان بنا کر روئے کائنات پر بھیج دیا تھا تاکہ وہ شمسہ کے غموں کا مداوا کر سکے اور شمسہ کو اللہ تعالیٰ نے اس صبر کا انعام بھی دیا تھا جو اس نے تشدد سہہ سہہ کر بھی کبھی زبان پر شکوہ نہ لائی تھی۔

اسے ایک خیال بری طرح جھنجوڑ گیا کہ ابھی چند دن پہلے ہی اسے مراد خان شاپنگ مال میں ملا تھا اور طیبہ کو دیکھنے کی ضد کر رہا تھا اور جب وہ طیبہ کو دیکھ چکا تو اس کے چند دنوں بعد ہی طیبہ اغوا ہو گئی تھی کیا طیبہ کے اغوا میں مراد خان کا ہاتھ ہے؟ اس خیال نے شمسہ کو بری طرح ڈرا دیا تھا کیونکہ مراد خان جیسے آدمی سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔

○......❖......○

''مجھے وہ ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔'' روشنی نے منہ بسورتے ہوئے کہا تو فواز احمد ہنسنے لگا۔ ''اس کی شکل تو دیکھو کیسے لگتی ہے؟ کیا عجیب سا گیٹ اپ کیا ہوا ہے اس نے۔ پتلی سی لکیر کو داڑھی کہتا ہے اور لانگ نیکر پہن کر پھرتا رہتا ہے، سو چیپ۔'' روشنی کا غصہ عروج پر تھا۔

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ صبا آنٹی تمہاری شادی اس سے کرنا چاہتی ہیں۔'' فواز احمد سنجیدہ ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا تو وہ سنجیدگی سے بولی۔

''مر جاؤں گی مگر شادی اس سے نہیں کروں گی۔'' وہ اس وقت لان میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی پھوار نے موسم کو مزید حسین کر دیا تھا وہ لان کے درمیان میں لگی ہوئی چھتری کے نیچے لگائی گئی چار کرسیوں میں سے دو پر براجمان تھے۔

''تو پھر کس سے کرو گی شادی؟'' فواز احمد نے دھڑکتے دل سے پوچھا تو روشنی اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔

''اس سے شادی کروں گی جس کے کاندھے پر زندگی میں پہلی بار سر رکھ کر سکون سے سو گئی تھی۔'' فواز احمد مسکاتا ہوا اس کی جانب دیکھنے لگا۔ ''اس سے شادی کروں گی جس نے مجھے لفظ محبت کی پہچان بتائی ہے۔ مجھے بولنا سکھایا ہے اور محبت کرنا سکھایا ہے۔''

''اسے معلوم ہے کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟'' فواز احمد کا شرارتی انداز روشنی کو بہت اچھا لگا وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ''اگر یہاں مجھے کہیں سے دیکھے جانے کا ڈر نہ ہوتا تو تمہیں ابھی بتا دیتی کہ اسے معلوم ہے کہ نہیں۔''

''تو بتا دو نا..... ڈرتی کیوں ہو؟''

''ڈرتی نہیں ہوں، جس رشتے اور ناطے کو لے کر تم اس گھر میں آئے ہو اس رشتے کی عزت کا احترام ہے مجھے۔ میں برملا اعتراف کر چکی ہوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ساری زندگی تمہاری ہی بن کر گزارنا چاہتی ہوں۔''

فواز احمد کو یوں لگا کہ آسمان سے کوئی حور اتر کر اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی ہو۔ وہ اتنی معصوم اور پیاری لگ رہی تھی اگر لان میں اور کھلے آسمان تلے نہ ہوتے تو شاید فواز احمد اس کو چوم لیتا۔

''اگر انکل اور باقی گھر والے نہ مانے تو؟''

''میں بغاوت کروں گی، سب کے ساتھ لڑ جاؤں گی..... ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔'' وہ کافی سنجیدہ لگ رہی تھی لیکن کورٹ میرج کے نام پر فواز احمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''روشنی! میں نے زندگی میں دو عشق کئے ہیں..... ایک کتابوں سے اور دوسرا تم سے۔'' روشنی نے فخر سے اس کی جانب دیکھا اور وہ کہہ رہا تھا۔'' میرا پہلا عشق غربت کی وجہ سے ادھورا ہے۔ میں اپنی پسند کی کتابیں نہیں خرید سکتا۔ کیونکہ میری جیب اجازت نہیں دیتی اور دوسرا عشق تم ہو روشنی!'' اس بار اس نے روشنی کی آنکھوں میں جھانک کر دل کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ اس عشق کو عبادت کا درجہ ملنے تک میری غربت اور تمہارا اسٹیٹس اس کی راہ میں اتنی اونچی دیوار بنا دے گا کہ میں چاہ کر بھی اس دیوار کو پھلانگ نہیں سکوں گا۔''

''لیکن فواز!'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ فواز احمد نے ہاتھ اٹھا کر اس کو خاموش کرا دیا اور بولا۔'' میں کتابیں چوری نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے کتابوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ان کو چوری کر کے میں اس علم کا مجرم نہیں بننا چاہتا جس نے مجھے پہچان دی اور جینا سکھایا ہے۔ اور روشنی..... تم..... تم بھی مجھے اس علم کی بدولت ہی ملی ہو۔ میں تمہیں بھی تمہارے خاندان سے چھیننا یا چرانا نہیں چاہتا کیونکہ میں جس طرح کتابوں سے علم حاصل کر رہا ہوں بالکل اسی طرح اپنے پاکیزہ عشق کی بدولت تمہیں بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرے علم کو بدنام کرنے کا کوئی بھی موقع کسی کو بھی نہ مل سکے اور اگر میرا علم بدنام ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ میرا عشق بدنام ہو گیا اور میں عشق کو بدنام نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میں نے محبت کو ایمان اور عشق کو عبادت سمجھا ہے۔''

روشنی اس کے خیالات پر قربان ہو گئی اس نے کسی بھی خوف اور ڈر کی پرواہ کئے بغیر فواز احمد کو گلے لگا لیا تو وہ گھبرا کر الگ ہوا اور اپنے کمرے میں جانے کے لئے چھتری سے نکل کر بھاگ نکلا تو روشنی کے قہقہے اس کا پیچھا کرنے لگے۔

روشنی کو اپنی پسند اور چوائس پر فخر تھا۔ وہ فواز احمد کو ہر طرح سے آزما چکی تھی اسے روشنی کی دولت اور اس کے جسم کی ضرورت نہ تھی بلکہ وہ اس سے صرف عشق کرتا تھا۔ سچا اور پاکیزہ عشق بالکل ویسا ہی جیسا عشق فرشتے اللہ تعالیٰ سے

کرتے تھے۔ پاکیزہ اور صاف ستھرا عشق۔ کسی بھی غرض اور لالچ کے بغیر والا عشق جسے عاشق اپنے عمل سے عبادت تک کے درجات تک لے جاتا ہے۔ ویسا عشق جو وہ داستانوں میں پڑھتی آئی تھی۔ وہی عشق جس کو مؤرخین نے کتابوں میں لکھا تھا۔

وہ فواز احمد کو اس کی بلند اور سچی سوچ پر دِل ہی دِل میں چوم رہی تھی کہ ''ہیلو'' کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ خیالات سے نکل کر اپنے پاس کھڑے علی کو دیکھنے لگی جو اس کی خالہ کا بیٹا تھا اور لندن سے پوری فیملی کے ساتھ دو روز سے اس گھر میں براجمان تھا۔

''ہیلو!'' روشنی مختصراً بولی اور جانے لگی تو علی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ روشنی کے بدن میں چار سو چالیس وولٹ کا کرنٹ دوڑنے لگا تھا۔ وہ حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے علی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

''میرا ہاتھ چھوڑو علی!'' لیکن علی نے اور مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور اس سے آ ٹکرائی۔ وہ ہنسنے لگا جبکہ روشنی کو غصہ آنے لگا تھا۔

''یہ کیا ذلیل حرکت ہے علی تم جانتے ہو کیا کر رہے ہو؟''

''کم آن ڈارلنگ! آخر آج نہیں تو کل ہم نے ایک ہی ہونا ہے۔ تو پھر ناراض کیوں ہوتی ہو؟'' اس کا لہجہ اور الفاظ برٹش انداز اپنائے ہوئے تھے۔ روشنی نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیز بارش کی پرواہ کئے بغیر ہی لان سے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

اسے علی اور فواز احمد میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہونے لگا کیونکہ اس نے کئی کئی گھنٹے فواز احمد کے ساتھ کمرے میں اکیلے ہی گزارے تھے۔ لیکن کبھی بھی اس کا ہاتھ پکڑنا تو درکنار فواز احمد نے اس کو کبھی بھی ایسی نظروں سے نہ دیکھا تھا کہ شیطان ان پر غالب آ جاتا۔

فواز احمد اس کو عظمت کی بلندیوں پر کھڑا نظر آیا تھا اور علی انتہائی نیچے کھڑا تھا جہاں پستی ہی پستی تھی۔ قصور اس کا بھی نہ تھا کیونکہ وہ اس ماحول میں پلا بڑھا تھا جہاں رشتوں اور عزتوں کا احترام اور تقدس برقرار رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ اس کا نام کن کی نسبت سے رکھا گیا ہے تو وہ زمین میں ہی گڑھ جائے۔ لیکن صرف نام ہی رکھ لینے سے کام تو ویسے نہیں ہو جاتے اور پھر وہ جس ملک سے آیا تھا وہ کافروں کا ملک تھا جہاں اس عظیم نام کو بگاڑ دیا جاتا ہے یا بگاڑ کر پکارا جاتا ہے۔

روشنی کو اس کی گھٹیا سوچ پر شرمندگی ہونے لگی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی بھی اس کے ساتھ شادی نہیں کرے گی اور روشنی جانتی تھی کہ اس کے فیصلے کو کوئی بھی بدل نہیں سکتا۔ اگر کوئی بدل سکتا ہے تو وہ خود ہی بدل سکتی ہے لیکن آج جو علی نے حرکت کی تھی وہ اس سے خاصی متنفر ہو گئی تھی۔

اس نے علی کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ بات فواز احمد کے لئے خاصی خطرناک تھی کیونکہ علی ان کے گھر کا فرد تھا اور وہ امیر کبیر باپ کا بیٹا بھی تھا اور آج نہیں تو کل فواز احمد کی روانگی کا پروانہ مراد خان کی طرف سے جاری ہونے والا تھا۔

کیونکہ فواز احمد سمجھتا تھا کہ صہیب احمد اور مراد خان کبھی بھی نہ چاہیں گے کہ اس کی شادی روشنی سے ہو یا پھر صہیب احمد اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ اس کنگال مصنف کے ہاتھ میں کیوں دے گا۔ وہ کنگال ہی تو تھا اپنی ماں کے علاج کے لئے پیسے بھی صہیب احمد سے ہی لیتا رہا تھا اور وہ کس طرح اور کس منہ سے روشنی کا ہاتھ ان سے مانگ سکتا تھا یا اتنی بڑی جرأت ہی کر سکتا تھا۔

اس بات کو علی نے محسوس کر کے بات کو بڑھا چڑھا کر خالہ صباء بیگم کے سامنے پیش کیا تو وہ آگ بگولہ ہو گئی اور روشنی کو کھری کھری سنا دی۔ اس نے بھی محسوس کیا تھا کہ روشنی علی کی نسبت فواز احمد سے زیادہ مانوس ہے اور اکثر اوقات اسی کے گن گاتی رہتی ہے۔ صباء بیگم شاطرانہ ذہن کی مالک تھی۔ اس نے دو دن لگا کر ایک زبردست پلان بنایا اور اس پر عمل کرنے کے لئے مراد خان اور صہیب احمد کو فون کر دیا کہ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں اور وہ دونوں باپ بیٹا ان سے ملنے تک نہیں آسکے۔

مراد خان کو واقعی شرمندگی ہوئی تھی وہ صہیب احمد کے ساتھ ایبٹ آباد پہنچے اور سب مہمانوں سے فرداً فرداً ملے اور دیر سے ملنے کی معذرت بھی کی۔ پرتکلف کھانا کھایا گیا اور اس کے بعد ہلکا پھلکا ناچ گانا اور ہلا گلا ہوتا رہا۔ صباء بیگم نے مراد خان کے کان میں سرگوشی کی کہ وہ روشنی اور علی کی منگنی کا اعلان کر دیں۔ لیکن مراد خان ٹھنڈے دماغ کا کھلاڑی بن چکا تھا وہ بات کو ٹال گیا اور فیصلہ صہیب احمد سے پوچھ کر کرنے کا کہہ کر وہاں سے اٹھ گیا۔

صباء بیگم کو اپنی سبکی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے آج ہی اپنے پلان پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ رات گہری ہو چکی تھی کہ روشنی فواز احمد کو کافی کا مگ دے کر اس کے کمرے سے نکلی تھی۔ صبا بیگم نے موقع غنیمت جانا اور روشنی کے اپنے کمرے میں پہنچنے پر دبے قدموں چلتی ہوئی فواز احمد کے کمرے میں پہنچ گئی۔ روشنی کے جانے سے فواز احمد دروازے کو لاک کرنا بھول گیا تھا یا اس کا ارادہ تھا کہ وہ کافی پی کر دروازہ لاک کرے گا اور سکون کی نیند سو جائے گا۔ لیکن صباء بیگم کو دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے۔

وہ پاگلوں کی طرح اس آفت کی پرکالہ کو دیکھ رہا تھا جو نائٹی میں نیم برہنہ حالت میں اس کے کمرے میں موجود تھی۔ وہ خاصا نروس ہو گیا تھا۔ اس دن تو روشنی کے آجانے پر اس کی جان اس طرح چھوٹی تھی کہ وہ نیند میں چلتی ہوئی اس کے کمرے کے باہر آ گئی تھی لیکن آج تو ایسا کوئی چانس نہ تھا کیونکہ روشنی تو ابھی یہاں سے گئی تھی اور پھر مراد خان اور صہیب احمد بھی اس گھر میں موجود تھے۔ اور اس شاطر عورت سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ کیا کر دے یا کیا کہہ دے۔ فواز احمد نے یہی سوچا کہ عقلمندی استعمال کرتے ہوئے اس سے جان چھڑائی جائے اور وہ اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرنے کے لئے مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھنے لگا اور بولا۔

''آپ، اس وقت میرے کمرے میں؟'' وہ اندر سے ڈرا ہوا تھا۔

''بدن ٹوٹ رہا ہے جانو......'' وہ انگڑائی لیتی ہوئی بولی تو فواز احمد کی اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے ہی رہ گئیں۔ ''تم تو جانتے ہو کہ میں جوان ہوں اور مراد خان برف کے گولے کی مانند ہو چکا ہے۔''

''آپ اس وقت ہوش میں نہیں ہیں...... آپ کو آرام کی ضرورت ہے اپنے کمرے میں چلی جائیں پلیز۔''

فواز احمد خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ تو صباء بیگم اس پر گرنے والے انداز میں آگے بڑھی اور بولی۔

''میری آگ کو ٹھنڈا کر دو۔ ورنہ میں شور مچا دوں گی اور تم جانتے ہو کہ صہیب احمد بھی یہیں موجود ہے اور تم اس کے کلاس فیلو ہو۔'' فواز احمد اتنے بولڈ اور گھٹیا الفاظ اپنے ناولوں میں تحریر کرنے سے گھبراتا تھا لیکن آج اس کے ساتھ جو ہو رہا تھا وہ خود کسی کہانی کا کردار ہی لگ رہا تھا۔

''آپ ایسا کریں...... پھر کبھی سہی......'' وہ الفاظ ادا کرتا ہوا انتہائی احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ اس کا ذہن یہی تھا کہ ابھی اس سے جان چھڑوا کر آئندہ بچے رہنے کی حکمت عملی اپنائے گا۔

''وعدہ کرو کہ پھر کبھی سہی......'' وہ ترسے ہوئے انداز میں بولی تو فواز احمد کو جانب چومتی ہوئی نظر آنے لگی۔

''ہاں...... پھر کبھی سہی پلیز......اس وقت آپ یہاں سے جائیں ویسے میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' چاروناچار فواز احمد کو وہ الفاظ ادا کرنا پڑے جو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''تو پھر ٹھیک ہے...... میں آج چلی جاتی ہوئی لیکن ایک شرط پر......؟'' وہ فواز احمد کے جسم سے اپنا جسم مس کرتی ہوئی بولی تو وہ اوپری سانس اوپر ہی کرتا ہوا بولا۔

''بولیں بولیں...... مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''مجھے میرے کمرے تک تم چھوڑ کر آؤ گے۔'' یہ کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن فواز احمد جانتا تھا کہ اس سے مشکل کام بھی کوئی نہیں ہے لیکن اس وقت تو اس آفت کو نکالنا واحد مقصد تھا۔ اس نے حامی بھر لی اور صبا بیگم اس کے کمرے سے نکلی اور دائیں بائیں احتیاط سے چلتی ہوئی فواز احمد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے تک پہنچی اور دروازہ کھول کر فواز احمد کو اندر دھکا دیا اور دروازہ باہر سے لگا دیا اور اپنی نائٹی کے بازو پھاڑنے لگی ادھر فواز احمد اس صورتِ حال سے گھبرا کر دروازہ بجانے لگا اور بولنے لگا کہ اسے باہر نکالو۔

صباء بیگم نے اونچی آواز میں چلانا شروع کر دیا وہ باقاعدہ رونے لگی۔ ''بچاؤ...... بچاؤ...... بچاؤ۔ یہ میری عزت لوٹنا چاہتا ہے۔'' فواز احمد پر یہ الفاظ بجلیاں بن کر گر رہے تھے وہ دروازہ زور زور سے پیٹنے لگا۔ تو شور سن کر بھی اپنے اپنے کمروں سے نکل آئے سب سے پہلے علی آیا تھا۔ اس نے صبا بیگم کو اس حالت میں دیکھا تو ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

''میں برباد ہو گئی۔ میں لٹ گئی۔ بچاؤ۔'' صبا بیگم کی آواز پورے محل میں گونج رہی تھی۔ مراد خان صہیب احمد اور روشنی بھی آن ہی آن میں وہاں جمع ہو گئے۔ اور پھر وہ مہمان بھی جولندن سے آئے ہوئے تھے۔

فواز احمد اندر سے چیخنے چلانے لگا۔ ''دروازہ کھولو، مجھے باہر نکالو......'' وہ دروازے کو زور زور سے پیٹ رہا تھا۔ روشنی فواز احمد کی آواز سن کر اپنی ماں کی حالت کو دیکھتی ہوئی تمام بات کو سمجھنے میں دیر نہ لگا سکی۔ اس نے ساتھ والے کمرے سے بستر کی چادر لا کر صبا بیگم کے ننگے بدن پر اوڑھا دی۔ مراد خان اور صہیب احمد ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جبکہ باقی لوگ اس تماشے سے محظوظ ہو رہے تھے۔

دروازہ زور زور سے پیٹا گیا تو صہیب احمد نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تو اندر سے گھبرایا ہوا فواز احمد کمرے کے باہر اتنے لوگوں کو کھڑے دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا۔ وہ سب کی شکلوں کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں

روشنی سے ملیں تو روشنی نے نفرت سے منہ پھیر لیا جبکہ صبا بیگم اس کو دیکھ کر اونچی آواز میں رونے لگی تو صہیب احمد نے فواز احمد کو گریبان سے پکڑا اور ایک زوردار گھونسہ اس کے منہ پر مار دیا۔ وہ تکلیف سے کراہ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ رات کے ڈھائی بجے اس کو مار پڑ رہی تھی۔ اس کی بات سننے والا کوئی نہیں تھا۔

وہ کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا تو اس کو اور بھی مار پڑنے لگتی۔ وہ اس کو مارتے ہوئے لان میں لے آئے تھے اور اب تو مار کھا کھا کر وہ بے ہوش ہو کر گرا پڑا تھا۔ دور کھڑی صباء بیگم کے لبوں پر زہریلی مسکان تھی اور روشنی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب موجزن تھا جو نفرت اور غصے کی آتش نے روک رکھا تھا اور زبیدہ تمام معاملے کو مشکوک قرار دیتی ہوئی کچھ بھی فیصلہ نہ کر پا رہی تھیں اور فواز احمد کو بے ہوش اور گھاس پر گرا ہوا دیکھ کر ان کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا لیکن وہ اپنی اس بے چینی اور بے قراری کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھیں۔

ٹھنڈی گراؤنڈ پر پڑے ہوئے فواز احمد کو آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ صبا بیگم کپڑے تبدیل کر کے آ چکی تھی روشنی بت بنی محبت اور عشق کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کو فواز احمد سے اتنی نیچ اور ذلیل حرکت کی توقع نہ تھی۔ اس نے کیا کچھ سوچ رکھا تھا۔ فواز احمد نے ایک ہی گھٹیا حرکت میں سب کچھ خاک میں ملا دیا تھا۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی کہ وہ اس شخص کے کندھے پر سر رکھ کر سوتی رہی ہے۔ وہ اس سے پیار و محبت کی باتیں کرتی رہی ہے۔ وہ تو لفظوں کا کھلاڑی تھا عزتوں کا لٹیرا کیوں بن گیا۔ اس نے روشنی کی ماں پر گندی نظر رکھی تھی اور اس کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے اس کے کمرے تک پہنچ گیا تھا۔ روشنی آنسوؤں کے ساتھ رونے لگی تو علی نے اس کے کندھے کو پیار سے دبایا۔

صہیب احمد کو تو روشنی سے بھی نظریں ملاتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ وہ اکیلی اس جانور کے ساتھ کئی کئی گھنٹے ایک ہی کمرے میں بند رہی تھی۔ یہ کیسا نقاب تھا جو فواز احمد نے اپنے چہرے پر چڑھا رکھا تھا۔ اس نقاب کے اترتے ہی فواز احمد ان سب کی نظروں میں ایک حقیر کیڑے کی مانند ان کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ وہ ان سب کی نظروں میں مجرم تھا اور اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے جس تھالی میں کھایا تھا اسی میں چھید کرنے کی بھونڈی کوشش کی تھی۔

دن کا اجالا پھیلنے لگا تو مراد خان بولا۔ ''اگر یہ مر گیا تو ہمارے لئے مسئلہ بن جائے گا۔ اسے اٹھاؤ اور گاڑی میں ڈال کر ویرانے میں پھینک آؤ۔''

صہیب احمد نے باپ کی بات سے اتفاق نہ کیا اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا زبیدہ آپا بول پڑیں۔

''میرا خیال ہے کہ اس کی بات بھی سن لینی چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم کسی اور غلط فہمی کا شکار ہو کر تقدیر کے قہر کو مزید آواز دیں لیں۔''

مراد خان اس بات کو سمجھتے تھے۔ وہ زبیدہ آپا کی طرف دیکھ کر رہ گیا اور صہیب احمد سے بولے۔

''اسے ہوش آتا ہے تو پوچھو اس سے کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی؟''

صہیب احمد باپ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''بابا جان! یہ سچ کیوں بتائے گا یہ تو مجرم ہے۔''

''مجرم کتنا ہی ہوشیار اور چالاک کیوں نہ ہو...... وہ قرآن کریم پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک بار کانپتا ضرور ہے۔'' مراد خان کی بات خاصی گہری تھی۔ زبیدہ آپا بھی اس کی بات کی تائید کرتی ہوئی بولیں۔ ''ہاں اس سے قرآن کریم پر ہاتھ رکھوا کر قسم لو یا پھر یہ پوچھو کہ یہ اتنا بڑا جرم کرنے پر کیوں راضی ہوا؟''

صبا بیگم تڑپ کر بولی۔ ''اس سے قرآن پر ہاتھ کیوں رکھواتے ہو میں قسم کھاتی ہوں کہ اس نے میری عزت تار تار کرنے کی کوشش کی ہے۔''

''بس صہیب احمد اب فیصلہ ہو گیا کیونکہ صبا بیگم نے قرآن کی قسم کھا کر وہ بات بتا دی ہے جو سچ ہے۔'' مراد خان اور باقی سب نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلا دیئے کیونکہ قرآن کریم سے بڑی کائنات میں کوئی بھی کتاب نہ تھی اور قرآن کریم کو باقاعدہ طور پر اس معاملے میں شامل نہ کیا گیا تھا صرف صبا بیگم نے قرآن کریم کی قسم کھا کر بول دیا تھا کہ اس نے میری عزت تار تار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب فواز احمد پر پانی پھینکا گیا تو وہ ہوش میں آ گیا لیکن اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے بھی قاصر تھا۔

اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھا اور دوبارہ گھاس پر گر گیا۔ صہیب احمد نے ملازم کو سمجھا دیا کہ اس کا سامان ساتھ لے جاؤ اور اس کو گاڑی میں ڈال کر اس کے گھر اسلام آباد میں چھوڑ آؤ۔ روشنی کے آنسوؤں نے صہیب احمد اور مراد خان کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ جو معاملہ سمجھ رہے تھے وہ وہی معاملہ سمجھنا چاہتے تھے۔

○......❖......○

فواز احمد کو ہوش آیا تو وہ کسی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا اس کا وجود پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اسے یاد آنے لگا تھا کہ صبا بیگم نے کس طرح اس کو اپنی شاطرانہ چال کا نشانہ بنایا تھا۔ مگر س نے ایسا کیوں کیا تھا۔ شاید اس دن کے تھپڑ کا بدلہ لینے کے لئے صبا بیگم نے اس کو اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔ کتنا گھناؤنا اور گھٹیا انتقام لیا تھا اس نے فواز احمد کو صہیب احمد اور روشنی کی نظروں میں ذلالت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرا دیا تھا۔ اسے رہ رہ کر روشنی کی وہ آنکھیں یاد آنے لگی تھیں جن کو اس نے آخری بار دیکھا تھا جن میں نفرت اور تضحیک کے سوا فواز احمد کچھ بھی نہ دیکھ پایا تھا اور صہیب احمد نے اس کو ظالمانہ تشدد کا نشانہ بنا کر ادھ موا کر دیا تھا۔ وہ اس کا محسن تھا لیکن اسے دکھ اس بات کا تھا کہ اس کو اپنی صفائی میں کوئی بھی بات کہنے کا موقع نہ دیا گیا تھا۔

اسے اپنی بے بسی پر بہت دکھ ہوا اور آنسو بہہ کر گالوں پر لکیر بنا کر گریبان میں داخل ہوئے تو تکلیف کا احساس اور بھی بڑھ گیا اس نے ہاتھ سے آنسو صاف کئے تو گالوں پر لگا ہوا خون دیکھ کر سہم گیا جو اس کے ہاتھوں کو بھی لگ گیا تھا۔ اس نے بمشکل اٹھ کر دیکھا کہ گاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی اور وہ اکیلا ہی پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا تھا اور ڈرائیور گاڑی چلاتے ہوئے اس کو انجان منزل کی جانب لے جا رہا تھا۔ جتنا بڑا الزام اس پر لگا تھا وہ اپنے زندہ بچ جانے یا ان لوگوں کا اس کو زندہ چھوڑ دیئے جانے پر حیران تھا۔

''گاڑی ایک طرف روکو۔'' وہ بمشکل بولا تو ڈرائیور نے ایک مرر سے اس کی طرف دیکھا اور گاڑی سڑک کے ایک طرف کر کے روک دی۔ ''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' اس نے ڈرائیور سے پہلا سوال کیا تو وہ پیچھے کی جانب گھومتا ہوا مؤدب انداز میں بولا۔

''ہم آپ کے گھر اسلام آباد جا رہے ہیں۔''

''کس نے کہا؟'' وہ دکھ سے بولا تھا۔

''صہیب احمد نے۔'' مختصر جواب پا کر وہ بولا۔

''میں اپنا منہ دھونا چاہتا ہوں۔'' اس نے گاڑی سے باہر دیکھا اب دن نکل آیا تھا اور سورج کی کرنیں سڑک کنارے لگے درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ ڈرائیور نے پانی کی بوتل نکال کر فواز احمد کی طرف کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے اچھی طرح فواز احمد کا منہ دھلوایا اور پھر تولیے سے منہ خشک کرنے پر زخموں سے پھر خون رسنے لگا اس نے شیشے میں دیکھا تو ہونٹ سوج گئے تھے اور آنکھوں کے گرد بھی کافی زخم تھے اس کی ناک سے بھی خون بہہ چکا

تھا۔

''گاڑی کسی ٹی سٹال پر روکنا، ہم چائے پئیں گے اور میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' فواز احمد نے ڈرائیور سے کہا تو وہ بولا۔

''فواز صاحب! ہمیں اجازت تو نہیں ہے لیکن ہم انسانیت کے ناطے آپ کی خدمت کے لئے آپ کی ہر بات مانے گا۔'' گاڑی چل پڑی تو فواز احمد نے دیکھا کہ اس کا سامان گاڑی کی اگلی سیٹ پر موجود تھا۔ اس کا لیپ ٹاپ کپڑوں کا بیگ اور دیگر سامان بھی ساتھ ہی تھا۔ اس نے اپنی شرٹ کی جیب ٹٹولی تو اس میں چند سو روپے موجود تھے۔ یہ وہی روپے تھے جو اکثر اس کی جیب میں رہتے تھے اور ان روپوں کو خرچ کرنے کی نوبت کبھی بھی نہ آئی تھی۔

فواز احمد نے ایک میڈیکل ہال سے اپنی ابتدائی ٹریٹمنٹ کروائی اور پھر چائے پینے کے لئے ایک ہوٹل پر رک گئے۔ اس کے زخموں سے خون رسنا بند ہو گیا تھا۔ کبھی وہ انہی راستوں سے ہوتا ہوا روشنی کے گھر جا رہا تھا اور آج وہ واپس آیا تھا تو بدنام اور ذلیل و رسوا ہو کر لوٹا تھا اور ذلت و رسوائی کا جو داغ اس کے اجلے دامن پر لگا تھا وہ اس میں قصوروار بھی نہ تھا بلکہ ذرہ برابر بھی اس کا قصور نہ تھا۔

''تم جانتے ہو کیا ہوا تھا؟'' فواز احمد نے گرم گرم چائے کا گھونٹ بھرا تو اسے یاد آ گیا کہ روشنی اس کے لئے کافی کا مگ لے کر آئی تھی اور وہ کافی اس کو پینا نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے پوچھا تو ڈرائیور پہلی بار کسی مالک کو اپنے ساتھ اس طرح مہربان دیکھ کر خوش ہو رہا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ فواز احمد کو اس محل سے ذلیل کر کے نکالا گیا ہے لیکن وہ اتنے عرصے میں یہ بھی جان گیا تھا کہ فواز احمد روشنی بی بی کی جان بن چکا ہے اور وہ روشنی کے لئے کسی خاص پیغام کا منتظر بھی تھا اور اپنی جیب گرم کرنے کے چکر میں بھی تھا۔ وہ بھی چائے پیتا ہوا بولا۔

''ہم کو تو اتنا ہی معلوم ہے صاحب کہ وہ لوگ آپ کو مار رہے تھے اور بڑی بیگم شور مچا رہی تھیں کہ ہم کو یہ لڑکا برباد کرنے والا تھا۔''

''پھر...... روشنی نے کچھ نہیں کہا؟'' فواز احمد تجسس سے پوچھنے لگا کیونکہ اسے تو علم ہی نہ تھا کہ اس کی بے ہوشی میں کیا ہوا تھا اور روشنی نے بھی کچھ کہا تھا یا صرف نفرت سے ہی منہ موڑا تھا۔

''روشنی بی بی کچھ نہیں بولا صاحب! لیکن...... ان کا آنکھیں بہت کچھ بول رہا تھا۔'' ڈرائیور چائے ختم کر چکا تو فواز احمد نے ایک اور چائے لانے کو کہا۔

''مراد خان اور زبیدہ بی بی نے بھی کچھ کہا تھا؟''

''وہ لوگ تو آپ کو جان سے ہی مارنے والے تھے لیکن زبیدہ بی بی کے کہنے پر بات قسم پر آ گئی کہ اس لڑکے سے قرآن پر ہاتھ رکھوا لو جو بھی سچ ہو گا واضح ہو کر سامنے آ جائے گا۔''

''پھر......؟'' فواز احمد کا جوش دیدنی تھا وہ تجسس سے پوچھنے لگا۔ ''پھر کیا ہوا۔ کیا قرآن کریم لایا گیا تھا؟''

ڈرائیور نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔

''نہیں صاحب! قرآن پاک تو لانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کیونکہ بڑی بیگم صاحبہ نے کہا کہ وہ قرآن کریم کی قسم کھا کر کہتی ہیں کہ فواز احمد نے ہی اس کی عزت کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔'' فواز احمد پر یہ بات بجلی بن کر

گری تھی۔

وہ اس کے بعد خاموش ہو گیا اور کوئی بات نہ کی تھی کیونکہ صبا بیگم نے قرآن کریم کی جھوٹی قسم کھا کر خود کو سچا اور فواز احمد کو جھوٹا ثابت کر دیا تھا اور اب معاملہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پہنچ گیا تھا۔

اسلام آباد میں داخل ہونے سے پہلے فواز احمد نے گاڑی ایک بک ڈپو پر رکوائی اور خود اندر چلا گیا۔ ڈرائیور کی سمجھ سے یہ بالاتر تھا کہ وہ کتابوں کی دُکان میں کیا لینے گیا ہے۔ مگر وہ خاموش رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد فواز احمد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک گفٹ پیک تھا جو اس نے اپنی جھولی میں رکھا اور گاڑی چلانے کو کہا۔ گاڑی اس کے علاقہ میں پہنچی تو فواز احمد کی آنکھیں جگنے لگی تھیں وہ کئی ماہ بعد اپنے گھر پہنچا تھا۔ اس نے ایک سائیڈ پر گاڑی رکوائی اور نیچے اتر گیا۔ اس نے اپنا تمام سامان بھی نیچے اتارا اور ڈرائیور سے بولا۔

''یہ ایک نایاب چیز ہے۔'' اس نے گفٹ پیک ڈرائیور کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں تمہاری ماں جی کی قسم اس کو کسی نہ کسی طرح روشنی بی بی تک پہنچانا۔'' پھر اس نے اپنی جیب سے چند نوٹ نکال کر ڈرائیور کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارا انعام نہیں ہے بلکہ تم نے بھائی بن کر مجھے میری منزل پر پہنچایا ہے۔ یہ ایک بھائی کی طرف سے رکھ لو۔ بچوں کے لئے کوئی چیز خرید لینا۔'' وہ سو سو والے کئی نوٹ تھے۔

''میں امید کروں کہ تم میرا یہ کام کر دو گے؟'' فواز احمد نے گفٹ پیک کی طرف اشارہ کیا تو ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب یہ میرا کام ہے، آپ نے ہم کو بھائی بولا ہے تو اب ٹینشن نہ لو صاحب! یہ گفٹ روشنی بی بی تک پہنچ جائے گا۔ کیسے پہنچانا ہے یہ ہمارا ذمہ داری ہے۔''

فواز احمد نے اسے رخصت کیا اور اپنا سامان اٹھا کر گھر کو جانے والی گلی کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جانے اور آنے میں کتنا فرق تھا اس فرق کو فواز احمد نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ وہ رسوا ہو کر کوئے یار سے نکلا تھا۔ عشق نے ایسا امتحان لیا تھا کہ وہ اپنی ہی نظروں میں خود کو شرمندہ محسوس کرنے لگا تھا۔ حالانکہ عشق کو اس پر ناز تھا اور وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے جو گفٹ روشنی کو بھجوا چکا تھا وہ اس بات کی گارنٹی تھی کہ اس نے محبت کو ایمان اور عشق کو عبادت ہی سمجھا تھا۔

O……❖……O

''ریبا میں کیا کر سکتا ہوں تمہارے لئے؟'' صہیب احمد کی آواز بھی بجھی بجھی تھی وہ موبائل پر ریبا سے بات کر رہا تھا اس کا انداز بجھا بجھا سا اس لئے بھی تھا کہ وہ فواز احمد جیسے دوست کو احسان فراموش سمجھتا تھا اور اس نے صہیب احمد کے گھر میں جو نقب لگائی تھی صہیب احمد کو اس کا بہت قلق تھا۔

''کیا بات ہے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' ریبا اس کی آواز سے ہی سمجھ گئی تو خود بھی پریشان ہو گئی۔ ''کچھ نہیں وہ آج کل انگلینڈ سے روشنی کے سسرال والے آئے ہوئے ہیں تو مصروفیات بھی بڑھ گئی ہیں اور تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ آفس میں کام بھی کافی ہوتا ہے۔'' وہ بات کو ٹال گیا تھا۔

''طیبہ آپی کا کہیں بھی کچھ بھی پتہ نہیں چل رہا۔ گھر والوں نے تو لوگوں کے سوالوں سے تنگ آ کر اپنے اپنے

سمز نمبر تبدیل کر لئے ہیں اور شاید میں بھی کرلوں۔'' ریبا بھی کافی پریشان تھی۔

''تم پریشان نہ ہو...... اللہ سب بہتر کرے گا۔ میں اسلام آباد آ کر تمہیں کال کروں گا۔ اپنے نئے نمبر کا بتا دینا۔'' ریبا نے ''اوکے'' کہہ کر نمبر آف کیا اور پریشانی کی کیفیت میں کمرے میں گھومنے لگی۔ طیبہ کا پورے ملک میں کوئی اتہ پتہ نہ معلوم ہو رہا تھا۔

دولت بی بی اور شمسہ نے تو رو رو کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگی تھیں کہ طیبہ دنیا میں جہاں بھی ہو عزت و آبرو کے ساتھ صحیح سلامت ہی رہے۔ ان کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ عدیم بھی کافی پریشان رہنے لگا تھا کیونکہ کالج میں اس کے کلاس فیلوز طرح طرح کے سوالات کرتے تھے اور وہ ہر کسی کو مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا اور اکثر ناکام ہی رہتا تھا۔

احمد فراز نے بھی عارضی طور پر چینل پر جانا چھوڑ دیا تھا جبکہ ارباب احمد آج کئی دنوں بعد ہسپتال جانے کے لئے تیار ہوئے تھے شمسہ بیگم نے ان کے سامنے ناشتہ رکھا تو وہ بغیر ناشتہ کے ہی میز سے اٹھ گئے اور دولت بی بی سے اجازت لے کر گھر سے نکل آئے تھے۔

وہ ہسپتال پہنچے تو دو ایک مریضوں کا آپریشن کرنا تھا وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے لیکن بار بار ذہن بھٹک کر طیبہ کی جانب چلا جاتا تھا۔ انہوں نے سر کو بار بار جھٹک کر بڑی مشکل سے اپنا کام نپٹایا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر بیٹھے اور چائے کا کپ منگوا کر پینے لگے تو عین اسی وقت شمسہ دروازے سے اندر داخل ہوئی وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ ارباب احمد ان کو اس طرح ہسپتال میں دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

''خیریت تو ہے شمسہ! تم یہاں؟''

''ارباب...... مجھے مراد خان کی ساری چال لگتی ہے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' شمسہ رونے لگیں تو ارباب احمد نے آگے بڑھ کر ان کو کندھوں سے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور بولے۔

''لیکن یہ اچانک مراد خان کہاں سے آ ٹپکا تمہارے ذہن میں؟'' وہ شمسہ کی حالت اور پھر ان الفاظ سے خاصے حیران تھے۔

شمسہ کرسی پر بیٹھ گئی اور ارباب احمد کو اس دن کی وہ ملاقات بتانے لگی جو اچانک مراد خان سے ہو گئی تھی۔ ارباب احمد حیرانگی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ شمسہ رو رو کر بتا رہی تھی کہ وہ طیبہ کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ وہ اس کو ہم سے چھین ہی لے گا۔

''لیکن تم نے مجھے آج سے پہلے کیوں نہیں بتایا؟'' ارباب احمد بھی اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولے۔ ''ارباب! میں گھر میں بچوں کے سامنے مراد خان کا تذکرہ کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔'' وہ رونے لگی تو ارباب احمد تمام بات کو سمجھتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اٹھے اور شمسہ کی کرسی کے پیچھے آ کر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''شمسہ بیگم! مراد خان جیسا کمینہ شخص تم سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے اپنی ہی بیٹی کو اغوا کیوں کرے گا؟''

''ارباب! جو شخص اپنے بچپن کے دوست سے دھوکا کر سکتا ہے، جو شخص اپنی پہلی محبت کو پہلی ہی رات اپنے جبر و تشدد کا نشانہ بنا سکتا ہے، جو شخص اپنے باپ کو قیدی بنا کر پاگل ہو جانے پر مجبور کر سکتا ہے، اس کے لئے رشتے بے معنی اور ان کا احترام کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ پلیز ارباب! میرا دل کہہ رہا ہے کہ طیبہ کو اسی نے ہی اغوا کیا ہے۔'' شمسہ بیگم کی باتوں میں دلیل اور ثبوت بھی موجود تھے اور دبنگ لہجہ اس کیس میں بھی مراد خان کو ہی مجرم ثابت کر رہا تھا۔

''وہ کہاں مل سکتا ہے؟'' ارباب احمد سوچ میں گم ہوتے ہوئے بولے تو شمسہ فوراً بول پڑی۔

''وہ اسلام آباد میں پرانے گھر میں ہی مل سکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہم اس بے غیرت کے گھر جائیں؟'' ارباب احمد حیرت سے بولے تھے۔

''ارباب! ہمیں اس سے اپنی بیٹی کا پتہ معلوم کرنا ہے..... ہم اس کے گھر کوئی بھیک نہیں مانگنے جا رہے بلکہ وہ ہماری نظروں میں چور ہے۔ ہم اس سے اپنا مال وصول کرنے جا رہے ہیں۔ وہی مال جس کی پرورش اور تربیت تم نے اور میں نے راتوں کو جاگ جاگ کر کی ہے۔ وہ مال ہماری عزت ہے۔ ہماری طیبہ ہے۔'' شمسہ ایک بار پھر جذباتی ہونے لگی تو ارباب احمد بولے۔

''ٹھیک ہے ہم دونوں ہی اس کے گھر جائیں گے..... بچوں کو معلوم نہیں ہونا چاہئے اور خاص طور پر احمد فراز کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہئے اوکے؟ اب ریلیکس ہو جاؤ۔''

شمسہ کو ارباب احمد کی باتوں نے کافی حوصلہ دیا تھا وہ کچھ پُرسکون ہوئی تو ارباب احمد کے نمبر پر کال آنے لگی وہ شمسہ کے بارے میں پریشان تھا۔ ارباب احمد نے بتا دیا کہ شمسہ اس کے ساتھ ہے اور ہم کسی دوست کے ہاں جا رہے ہیں ذرا لیٹ ہو جائیں تو گھبرانا نہیں۔''

ارباب احمد اور شمسہ گاڑی میں بیٹھ کر مراد خان کے گھر کی جانب چل پڑے تھے۔ دونوں ہی خاموش اور سوگواری کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ ارباب احمد نے زندگی بھر مراد خان سے نہ ملنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن معاملہ طیبہ کا تھا انہوں نے طیبہ کو اپنے کندھوں پر کھلایا تھا۔ طیبہ نے ان کی پشت پر سواری کی تھی۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر قدم قدم چلنا سیکھی تھی وہ ارباب احمد کی اپنی اولاد نہ تھی بلکہ اس کے دشمن کی بیٹی تھی لیکن شمسہ کی کوکھ سے جنم لینے کی بنا پر ارباب احمد کا اس کے ساتھ محبت پیار اور دل کا رشتہ قائم تھا اور یہی رشتہ ارباب احمد کو رونے پر مجبور کر دیتا تھا۔

شمسہ بھی طیبہ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی اسے بھی معلوم تھا کہ ارباب احمد نے کبھی بھی مراد خان سے ملنے اور اس کی صورت نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی لیکن وہ عظیم انسان تھا۔ دوستی کی معراج کو بلند رکھنے کے لئے عمارت سے کود کر اپنی جان کی بازی لگا چکا تھا اور اب تو بات انسانیت کی سربلندی کی تھی وہ خاموشی سے اپنے دشمن کے گھر اسی لئے چلا آیا تھا کہ انسانیت کو خراج پیش کیا جا سکے۔

گاڑی مراد خان کے اس گھر کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھی جس گھر میں شمسہ دلہن بن کر پہلی بار آئی تھی وہ اس گھر میں مراد خان کی بیوی بن کر آئی تھی اور آج مراد خان سے اپنی بیٹی کا پتہ معلوم کرنے کے لئے آئی تھی۔ گیٹ کے ساتھ پلر (ستون) پر آج بھی اورنگزیب خان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

شمسہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ ارباب احمد کی طرف دیکھا اور گاڑی سے نیچے اتری تو ارباب احمد بھی نیچے اتر

آیا اور گیٹ پر لگی ہوئی بیل بجائی تو چند سیکنڈ بعد گیٹ کی ذیلی کھڑکی سے ایک ملازم کا منہ نظر آیا۔

''جی صاحب کہیے؟''

''ہمیں مراد خان سے ملنا ہے۔''

''بڑے صاحب تو ایبٹ آباد میں رہتے ہیں، یہاں تو کبھی کبھار آتے ہیں۔'' ملازم نے جواب دیا تو ارباب احمد نے شمسہ کی طرف دیکھا اور چوکیدار سے بولا۔

''کیا تمہارے پاس ان کا کوئی رابطہ نمبر ہے؟''

''جی ہے، تھوڑا ٹھہرو ہم ابھی لا کر دیتا ہے۔'' ملازم کا چہرہ کھڑکی کے پیچھے گم ہو گیا تو ارباب احمد شمسہ سے بولا۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

''ہمیں ایبٹ آباد جانا چاہئے۔'' شمسہ کے منہ سے یہ سن کر ارباب احمد کھلے منہ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''کیا تم سنجیدہ ہو شمسہ؟''

''ہاں ارباب! میں اپنی بیٹی کو ڈھونڈنے کے لئے پاتال تک بھی جانا پڑا تو جاؤں گی۔'' اس کی آواز رندھ گئی تو ارباب احمد سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اتنی دیر میں ملازم نے کھڑکی سے ایک کاغذ ارباب احمد کی طرف بڑھایا تو اس پر دو نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ ملازم بولا۔

''اوپر والا نمبر بڑے صاحب مراد خان کا ہے اور نیچے والا چھوٹے صاحب کا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کھڑکی بند کی اور اندر کی جانب گم ہو گیا۔

''چھوٹا صاحب کون ہو سکتا ہے؟'' شمسہ بولی تو ارباب احمد گاڑی کی طرف چل پڑا۔

''اس کے بیٹے کا ہو گا اور کون ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مراد کا کوئی بھی چھوٹا بھائی تو نہ تھا۔'' شمسہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی تو ارباب احمد نے گاڑی واپس گھر کی جانب بھگا دی۔

''اب کیا کرنا ہو گا؟'' شمسہ نے ارباب احمد کی طرف دیکھا جو سکرین کے پار سڑک پر نظریں جمائے ہوئے گاڑی چلانے میں مصروف تھا۔ ''اب ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھ سکتے۔''

''اگر ایبٹ آباد ہی جانا ہے تو پھر ہمیں احمد فراز کو بھی ساتھ لینا ہو گا۔ اس طرح اکیلے جانا ٹھیک نہ ہو گا۔'' ارباب احمد کی بات سن کی شمسہ کانپ کر رہ گئی جو راز انہوں نے بائیس سالوں سے چھپایا ہوا تھا وہ احمد فراز کو بتانا ہو گا اور اس کو بھی اس راز کا حصہ بنا کر کام کو آگے بڑھانا ہو گا۔

''احمد فراز کو میں اچھی طرح جانتا ہوں وہ اس راز کو ہمیشہ راز ہی رکھے گا۔'' ارباب احمد نے شمسہ کے چہرے پر چھانے والی پریشانی کی لکیروں سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ راز فاش ہو جانے کے خوف سے پریشان ہو گئی ہے۔

''لیکن اگر مراد خان اس معاملے میں بے قصور ہوا تو پھر کیا کریں گے؟'' ارباب احمد کے اس سوال میں کافی پریشانی نمایاں تھی۔

''میرا دل کہتا ہے کہ وہ بے قصور نہیں ہے..... اگر وہ بے قصور بھی ہوا تو اس کا راز بھی اس کی فیملی کے سامنے ہی فاش کر دوں گی۔ میں اس سے انتقام لینا چاہتی ہوں ارباب احمد!'' شمسہ جوش میں بول رہی تھی۔

''اپنے آپ کو سنبھالو...... ہم جذباتی بن کر سوچیں گے تو ہمارا نقصان بھی ہوسکتا ہے۔'' ارباب احمد اس کو سمجھاتے ہوئے بولے۔ اتنی دیر میں گاڑی گھر جانے والی سڑک پر مڑ گئی تھی۔

''ارباب احمد! اگر مراد خان طیبہ کے اغوا میں ملوث نہ ہوا تو پھر وہ بھی چین سے نہیں بیٹھ سکے گا۔ تم دیکھنا میرا دل کہتا ہے کہ وہ اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لاتے ہوئے طیبہ کو بازیاب کروانے میں ہماری مدد کے لئے میدان میں کود پڑے گا۔ کیونکہ میں نے طیبہ سے ملنے کے لئے اس کے چہرے پر التجا اور الفاظ میں منت کو کافی محسوس کیا ہے۔'' شمسہ کی بات میں وزن تھا اور یہ بات ارباب احمد کے حلق سے بھی نیچے اتر گئی کہ اگر مراد خان بے قصور ہوا تو وہ طیبہ کو ڈھونڈنے میں ان کی مدد ضرور کرے گا۔ اس نے ایبٹ آباد جانے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن احمد فراز کو اعتماد میں لینے کی خاص ضرورت تھی۔

احمد فراز منہ کھولے کبھی شمسہ اور کبھی ارباب احمد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ احمد فراز نے شمسہ اور ارباب کی زبانی تمام کہانی سنی تھی۔ اس نے شمسہ کا ہاتھ پکڑا اور اس کو بوسہ دیتا ہوا بولا۔

''چچی! آپ کتنی عظیم ہیں جو آپ نے چچا کی محبت کی خاطر کتنی قربانیاں دی ہیں۔ آپ کی عظمت کو سلام کرنا چاہئے۔'' احمد فراز نے شمسہ کو سلیوٹ جھاڑ دیا تو وہ روتے روتے مسکانے لگی۔

''تمہارا کیا خیال ہے ہمیں مراد خان کے گھر جانا چاہئے یا نہیں؟'' ارباب احمد نے احمد فراز سے پوچھا تو وہ سوچتا ہوا بولا۔ ''جتنا امیر آدمی آپ بتا رہے ہیں وہ اتنا ہی بااثر بھی ہوگا۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' ارباب احمد حیران تھے۔

''میرا مطلب ہے کہ ہمارا وہاں جانا ضروری تو ہے لیکن کہیں وہ ناراض ہو کر ہمیں ہی الٹا کسی نہ کسی کیس میں پھنسوا دے۔'' احمد فراز کا ڈر تھا یا پھر مراد خان کی شخصیت کا رعب اس پر چھا گیا تھا۔

''میں نے جب آخری بار اس کو دیکھا تھا تو وہ بالکل ایسا تھا جیسے کہ زخمی شیر اپنے زندگی کے دن پورے کر رہا ہو اور وہ شکار کے قابل نہ رہا ہو۔ بلکہ دوسروں کا مارا ہوا کھا کر زندگی پوری کر رہا ہو۔'' شمسہ نے دلیل دی تو وہ راضی ہوتا ہوا بولا۔

''ٹھیک ہے چچا! آپ دادی سے بھی مشورہ کر لیں۔ یہ ضروری ہے کیونکہ ان کو بھی تو علم ہو کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ یہ کوئی ایک آدھ گھنٹے کا کام نہیں ہے بلکہ پورا دن لگ جائے گا۔'' ارباب احمد کی سمجھ میں احمد فراز کی بات آ گئی تھی وہ تینوں اٹھے تو دروازے میں ریبا اور عدیم کھڑے تھے جو نہ جانے کب سے آ کر کھڑے ہو گئے تھے اور ان کی تمام باتیں بھی سن چکے تھے۔

شمسہ نے گھبرا کر ارباب احمد کی طرف دیکھا تو عدیم بول پڑا۔

''پاپا! آپ طیبہ آپی کے لئے جہاں بھی جانا چاہیں جائیں ہم دعا کریں گے۔'' ارباب احمد کو اس کی بات نے رلا دیا تھا کہ وہ طیبہ کو اپنی سگی بہن ہی سمجھ رہے تھے۔ ''اور مما! آپ نے کتنی تکلیفیں سہی ہیں اور اف تک نہ کی۔ ہمیں آپ پر فخر ہے مما یو آر گریٹ۔'' ریبا اور عدیم روتے ہوئے شمسہ کے گلے لگ گئے تو ایک بار پھر آنسوؤں کی برسات جاری ہو گئی۔

دولت بی بی نے پوری بات سنی اور آنسوؤں کی جھڑی میں جانے کی اجازت دے دی۔

''مجھے مرنے سے پہلے صرف ایک بار طیبہ سے ملوا دو ارباب! صرف ایک بار۔'' انہوں نے ارباب احمد کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تو وہ بھی تڑپ گئے۔ ارباب احمد نے ان کے ہاتھوں کو دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا تھا اور ان ہاتھوں کو چومتے ہوئے آنکھوں سے لگا رہے تھے۔

''آپ دعا کریں۔ بس طیبہ کی زندگی اور عزت و آبرو کو آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے ماں جی!''

''میں اللہ کو راضی کرلوں گی۔ میں کہا کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ سے فضل و کرم مانگا کرو لیکن وہ ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ میں اللہ کے گھر کو دیکھنے کی خاطر ہر امتحان کے لئے تیار ہوں.....'' دولت بی بی روتے ہوئے بتا رہی تھیں۔ ''اے اللہ! وہ نادان ہے اس کے بول معاف فرما دے.....میرے اللہ! میری بچی کو اپنی پناہ میں رکھنا۔'' دولت بی بی روتی ہوئی اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

اگلی صبح ہی نماز فجر کے بعد روانگی ہوگئی تھی۔ احمد فراز گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ارباب احمد اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ جبکہ شمسہ بیگم پچھلی سیٹ پر درود شریف کا ورد کر رہی تھیں۔

''کتنی دیر بعد آپ لوگ وہاں جا رہے ہیں؟'' احمد فراز نے پوچھا تو ارباب احمد ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ ''میں نے تو اس کو اس دن کے بعد سے دیکھا بھی نہیں ہے جب سے اس کی شادی ہوئی تھی۔''

''بائیس تیئیس سال تو گزر گئے ہیں احمد فراز!'' شمسہ دھیرے سے بولی تھیں۔

''چچی! کیا ان کی بہن زبیدہ زندہ ہے یا مرگئی ہے؟'' احمد فراز اپنے علم اور معلومات کے لئے مراد خان سے متعلق سوالات کر رہا تھا۔

''مجھے تو علم نہیں ہے کہ وہ مرگئی ہے یا زندہ ہے لیکن اتنی بے غیرت تھی کہ اس نے اپنے باپ کو ہی ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔''

''انکل! اس کا جو بیٹا تھا وہ آپ نے کس کو دیا تھا۔ آپ کو یاد ہے کہ وہ زندہ ہے یا مرگیا ہے؟'' یہ بہت اہم سوال تھا۔ ارباب احمد سامنے دیکھتے ہوئے بولے۔

''وہ زندہ ہے۔ مجھ سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔''

''کیا؟'' شمسہ حیرت سے بولی تو ارباب احمد پھر بولے۔

''ہاں وہ زندہ ہے اور اچھی بھلی زندگی گزار رہا ہے اور آج کل تو وہ اس ملک کا نامور مصنف بنا ہوا ہے۔'' ارباب احمد کی بات سن کر احمد فراز چونکا اور ان کی طرف دیکھ کر پھر سڑک پر نظریں مرکوز کرتا ہوا بولا۔ ''اس ملک کا نامور مصنف؟''

''ہاں یار، وہ ناول وغیرہ لکھتا ہے۔'' ارباب احمد نے سرسری انداز میں کہا تو احمد فراز بولا۔

''آپ فواز احمد کی بات تو نہیں کر رہے؟''

''تم جانتے ہو اسے؟'' ارباب احمد حیران تھے۔

''انکل! وہ تو میرا کلاس فیلو ہے۔ میں فواز اور صہیب احمد تینوں ہی اچھے دوست اور کلاس فیلوز ہیں۔''

''اچھا؟'' ارباب احمد ایک ادا سے بولے۔ ''وہی فواز احمد زبیدہ آپا کا بیٹا ہے۔''

''ارباب آپ نے مجھ سے کبھی یہ بات نہیں کی۔'' شمسہ بیگم بولیں تو ارباب احمد مسکراتے ہوئے بولے۔

''آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں تھا۔ یہ تو احمد فراز نے بات کی ہے تو بات سے بات چل نکلی ہے۔''

''انکل! اس کی پرورش کس نے کی تھی۔ کیا اس کو معلوم ہے کہ وہ زبیدہ کا بیٹا ہے اور ایک امیر کبیر خاندان کا چشم و چراغ ہے؟'' احمد فراز کے اندر کا اینکر جاگ گیا تھا۔ اسے یہ دلچسپ سٹوری معلوم ہو رہی تھی اور وہ ایک لمبی سوچ رکھتے ہوئے اپنے ہی کسی منصوبے پر عمل کرنے کے لئے کہانی بنا رہا تھا۔

''اسے یہ تو معلوم ہے کہ جس عورت نے اسے پالا ہے وہ اس کی سگی ماں نہیں ہے۔ اس کا تمام خرچہ میں ہی اٹھاتا رہا ہوں۔ اس کی سکول و کالج کی فیسیں اور تمام لوازمات میں نے پورے کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے اور میں نے ہی اسے بتا دیا تھا کہ وہ اس عورت کا سگا بیٹا نہیں ہے۔ لیکن اس نے ہمیشہ اس عورت کی عزت اور خدمت کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ عورت فوت ہوگئی ہے اور فواز احمد کو یہ علم نہیں ہے کہ اس کی اصل ماں کہاں ہے اور وہ کس کا بیٹا ہے؟''

ارباب احمد نے طویل کہانی مختصر الفاظ میں بیان کر کے فواز احمد کی شخصیت سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ شمسہ اور احمد فراز حیرت سے اس کہانی کو سن رہے تھے۔ احمد فراز کی نظروں میں ارباب احمد کی عزت و توقیر اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ پہلے انہوں نے طیبہ کو ہنس کر گلے لگایا اور بیٹی مان کر اس کی ذمہ داری لی۔ پھر اس نے احمد فراز کو بیٹا بنایا تو ہر طرح سے اس کو معاشرے کا کامیاب شہری بنایا۔ اور پھر فواز احمد کی ذمہ داری یہ جانتے ہوئے بھی نبھائی کہ یہ اس مراد خان کا بھانجا ہے جس نے اسے ذلیل کر کے اپنے گھر سے نکالا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ فواز احمد اس زبیدہ کا بچہ ہے جس نے شمسہ کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ دو سال زبیدہ اور مراد خان کے ظلم و ستم سہنے کے بعد مراد خان نے شمسہ کو طلاق دے کر فارغ کر دیا تھا تو ارباب احمد فواز احمد کی کفالت سے ہاتھ کھینچ بھی سکتے تھے لیکن وہ عظیم شخص تھے انہوں نے مراد خان کی دشمنی کا بدلہ اس بچے سے لینے کی بجائے اس کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی اور اپنے وسائل بھی اس پر قربان کرتے ہوئے آج اُسے اس منزل پر پہنچا دیا تھا کہ ملک میں اس کا ایک نام تھا اور ملک کے بہترین مصنفین کی فہرست میں اس کا نام شامل تھا۔

یہ ارباب احمد کی عظمت اور انسانیت کی بلندی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ احمد فراز کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں وہ ارباب احمد کی طرف دیکھنے لگا جو سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کئے ہوئے خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ فواز احمد کی داستان کے ساتھ ان کے بھی کافی رشتے جڑے ہوئے تھے جو ایک امیر زادے نے شک کی بنا پر چند لفظوں سے ہی توڑ ڈالے تھے اور ارباب احمد کو ان لفظوں کی کڑواہٹ آج ایک بار پھر محسوس ہو رہی ہوگی۔

○......❖......○

گھر میں عارضی لائٹنگ نے رات کو بھی دن کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ صبح روشنی کا نکاح تھا۔ علی اور اس کے تمام رشتہ دار بھی موجود تھے اور مراد خان نے بھی اپنے دوست اور احباب کو شرکت کی دعوت دے ڈالی تھی۔ علی کافی خوش تھا جبکہ روشنی اس نکاح سے ناخوش تھی کیونکہ اس نے فواز احمد کے ساتھ زندگی گزارنے کے سنہری خواب دیکھے تھے۔

صباء بیگم کی شاطرانہ چال کامیاب رہی۔ علی اور صبا بیگم نے فواز احمد کو اپنے رستے سے اس طرح ہٹا دیا تھا کہ وہ کبھی اس گھر میں آیا ہی نہ تھا لیکن روشنی کی زندگی میں فواز احمد اس طرح موجود تھا کہ ابھی تک گیا ہی نہ تھا۔

وہ اسی چھتری کے نیچے بیٹھی ہوئی اداسی اور سوگواری کا پیرہن اوڑھے ہوئے بیتے دنوں کو یاد کر رہی تھی اس کو وہ پہلی ملاقات ہی تڑپا رہی تھی جب وہ فواز احمد کے کندھے پر سر رکھے بے خیالی میں ہی سو گئی تھی۔ فواز احمد بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ تو الفاظ کا کھلاڑی تھا۔ اس نے روشنی کی عزت کو نقب لگانے کی کوشش کی تھی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ روشنی پر ہاتھ صاف کرنے کا اسے موقع ہی نہ ملا ہو اور صبا بیگم کو اس نے اپنے جال میں پھنسا کر گھناؤنے کھیل کا آغاز کرنے کا سوچا ہو۔ اس کا مقصد ایسا ہی ہو کہ وہ صبا بیگم کے ذریعے روشنی کو بھی ورغلا لے گا۔

لیکن روشنی کی سوچ اسی بات پر آ کر ختم ہو جاتی تھی کہ وہ کئی کئی گھنٹے اکیلی اس کے ساتھ اس کے کمرے میں رہتی تھی فواز احمد نے چھونا تو دور کی بات اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ تو پھر صباء بیگم میں ایسی کیا بات تھی کہ وہ اپنی اعلیٰ سوچ اور اعلیٰ منصب سے اتنا گر گیا کہ اس نے صبا بیگم کی عزت ہی پامال کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس کو گئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ روشنی سوگواری میں یہ دن گزار چکی تھی راتوں کی نیند اس سے روٹھ گئی تھیں سکون اور چین چھن گیا تھا۔ آنکھوں نے رو رو کر آنسوؤں کے ختم ہونے کا ریڈ سگنل جاری کر دیا تھا۔

"کیوں اداس ہو روشنی؟" وہ اس آواز کو سن کر چونکی تو صہیب احمد کو اپنے پاس کھڑے پایا۔ وہ نہ جانے کب سے اس کے پاس کھڑا اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں بھائی!" وہ دوسری طرف منہ کرتی ہوئی بولی تو وہ گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔

"میں نے محسوس کیا ہے کہ جب سے فواز احمد اس گھر سے گیا ہے تم اداس اور غمزدہ رہتی ہو۔"

"اداسی اور غم میرے دوست ہیں اور میں اپنے دوستوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی بھائی!" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی تو صہیب احمد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہاتھ کو دیکھتا ہوا بولا۔

"جو چیز ان لکیروں میں نہ لکھی ہو تو سمجھو وہ تمہارے مقدر میں نہیں تھی اس کا سوگ اور افسوس منانا تقدیر کے فیصلوں کی نفی کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔"

"اور جن کے ہاتھ ہی نہیں ہوتے بھائی ان کی تقدیر کن لکیروں کے گرد گھومتی ہے؟" بڑا شاندار اور مدلل جواب تھا۔ وہ فواز احمد کی شاگرد تھی اور صہیب احمد اس ملک کے بہترین سرکولیشن والے نیوز پیپر کا چیف ایڈیٹر تھا۔ بہن بھائی کا پیار مثالی بھی تھا اور بے لوث بھی تھا۔ یہ صہیب احمد ہی تھا جو اس کی سفارش بن گیا تھا کہ فواز احمد اس کو پڑھانے آیا کرے گا اور آج پورے خاندان میں وہی مجرم بھی بنا ہوا تھا۔

"کم ظرف کی نشانی یہی ہوتی ہے کہ وہ جس تھالی میں کھائے اسی میں چھید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔" وہ بولا تو روشنی کرسی پر بیٹھ گئی اور بھائی کی طرف اداس نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"ظرف اور کم ظرفی کی مثالیں تو بہت ہیں لیکن میں اس چاند کو دیکھ رہی ہوں جو اپنے ہالے میں اس قدر خوش نظر آ رہا ہے کہ گویا کبھی چاندنی اس سے بے رخی برتتے ہوئے بے وفائی نہیں کرے گی۔" صہیب احمد نہ سمجھتے ہوئے بول پڑا۔

''میں جانتا ہوں کہ فواز احمد ایک اچھا مصنف ہے اور اس نے تمہیں اچھی ٹریننگ بھی دے دی ہے لیکن میں چاند والی مثال نہیں سمجھ سکا۔''

وہ طنز سے مسکرائی اور بولی۔ ''سردیوں کی سرد اور تنہا راتوں میں جب اماوس اپنے عروج پر ہوتا ہے تو پھر وہی اس چاند کا ساتھی اور دوست بن کر رات گزارتا ہے۔ تب چاندنی اس کا ساتھ چھوڑ چکی ہوتی ہے۔'' صہیب احمد ہولے سے مسکرایا اور بولا۔

''تم اس کو گناہگار نہیں سمجھتی ہو۔ اس نے ہماری ماں پر گندی نگاہ ڈالنے کی جرأت کی ہے۔''

''مجھ سے بہتر تو آپ اُسے جانتے ہیں بھائی! آپ نے تو اس کے ساتھ بہت سا وقت گزارا ہے۔ وہ آپ کو بیگانہ اور مجھے اپنا کیوں لگنے لگا ہے؟''

''اس کا جرم ایسا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی بھی رشتہ جوڑنا ہمیں بدنام کر سکتا ہے۔'' وہ جانے لگا تو اس بار روشنی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں نے اس کے ساتھ بہت سا وقت بند کمرے میں اکیلے ہی گزارا ہے۔ اس شخص نے مجھے چھونا تو درکنار کبھی اس زاویے سے بھی نہ دیکھا تھا کہ میں اس کی نظروں کو غلط کہہ سکتی۔''

صہیب احمد اس کی طرف دیکھنے لگا اور ہاتھ چھڑاتا ہوا بولا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ مما جھوٹ بول رہی ہیں؟'' اس کی آواز میں تیزی اور لہجے میں تندی تھی۔

''وہ چور ہے، اس نے اس گھر میں نقب لگائی تھی اور واردات سے پہلے ہی پکڑا گیا۔''

''وہ کیسا چور تھا جس نے میرے کہنے پر بھی گھر سے بھاگ کر شادی کرنے کی مخالفت کی تھی۔'' اس بات نے صہیب احمد کو ہلا دیا تھا۔ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ روشنی اس کی محبت میں اس قدر آگے بڑھ گئی تھی کہ وہ گھر سے بھاگ کر فواز احمد سے شادی کرنا چاہتی تھی۔

''صبح تمہارا نکاح ہے۔ اب تم علی کی امانت ہو...... وہ تین ماہ بعد تمہیں انگلینڈ بلوا لے گا پھر تم سدا کے لئے وہیں رہو گی۔''

''صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں تمہارے پاس تین ماہ تک ہوں اور پھر تم سب کے لئے مر جاؤں گی۔''

''روشنی!'' صہیب احمد نے تڑپ کر اس کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا لیکن اپنے ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ اس نے نم آنکھوں سے روشنی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''میں نے تمہیں بہن نہیں بیٹی کی طرح چاہا ہے۔ تم میری دوست بھی ہو، بہن بھی اور بیٹی بھی ہو...... لیکن ان تمام رشتوں کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع میں تمہیں نہیں دوں گا۔''

''میں علی سے نکاح نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''اگر یہی بات بابا جان سن لیں تو تمہیں جان سے مار دیں گے۔''

''یہی تو میں چاہتی ہوں۔''

''تم ہمارے پیار کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو روشنی!''

''پیار کا اصل امتحان تو اب شروع ہوا ہے۔ دوستی اور بھائی کے پیار میں کتنا خلوص اور سچائی ہے اس کا پتہ تو کل

چلے گا۔" وہ دکھ سے بولی تھی۔ "کہ تم اپنی بیٹی، بہن اور دوست کو اس طرح کسی ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کردو گے جس کو وہ چاہتی نہ ہو۔ پسند ہی نہ کرتی ہو؟"

"میں مجبور ہوں روشنی!" وہ بے بس دکھائی دیا تھا۔

"تو پھر یہ دعویٰ کرنا بھی چھوڑ دو بھائی کہ تم میرے بہترین دوست ہو۔" وہ یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھی، صہیب احمد وہیں کھڑا تھا۔

روشنی کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ روشنی فواز احمد کو بے گناہ سمجھ رہی ہے اور تمام حالات و واقعات فواز احمد کو مجرم ثابت کررہے تھے کیونکہ صبا بیگم اس کی ماں تھی اور صبا بیگم کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ فواز احمد پر اتنا گھٹیا الزام لگائے اور پھر فواز احمد صبا بیگم کے کمرے میں بند تھا۔ انہوں نے اس کی وحشت اور درندگی سے بچنے کے لئے بھاگ کر اپنی عزت بچائی تھی۔ صبا بیگم کی چالاکی اور ہوشیاری ہی کام آ گئی تھی ورنہ فواز احمد جیسے شخص نے تو روشنی پر اپنے الفاظ کا ایسا جادو ڈالا تھا کہ وہ اسی کے گن گا رہی تھی۔ اس کو یہ بھی علم نہ تھا کہ فواز احمد لفظوں کا جادوگر ہے۔

یہ صہیب احمد کی اپنی سوچ تھی جو فواز احمد کے بارے میں وہ سوچ رہا تھا۔ سچائی کیا تھی اس کا فیصلہ کرنے کے لئے کوئی بھی ایسی کسوٹی نہ تھی جو جھوٹ اور سچ کو پرکھ سکتی۔ کیونکہ صبا بیگم قرآن کریم کی قسم کھا کر خود کو سچ ثابت کر چکی تھی اور یہی بات صہیب احمد روشنی کو سمجھانا چاہتا تھا لیکن سمجھا نہ پا رہا تھا۔

روشنی آج تین دن بعد اس کمرے میں آئی تھی جس میں فواز احمد رہتا رہا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی اس کی خوشبو روشنی کے نتھنوں سے ٹکرائی وہ اردگرد دیکھنے لگی اسے یوں لگا کہ فواز احمد اس کمرے میں ہی موجود ہے وہ ابھی کسی کونے سے برآمد ہوگا اور ہنستا ہوا اسے دیکھ کر خوش ہو جائے گا لیکن آج تو روشنی اداس تھی اس کی آنکھیں رورو کر سوجی ہوئی تھیں۔ چہرہ اترا ہوا تھا اور گلابی رنگت کی جگہ زردی اور سوگواری چھا گئی تھی وہ اس کرسی پر بیٹھ گئی جس پر فواز احمد بیٹھ کر اسے پڑھایا کرتا تھا۔

پھر وہ اس کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی جہاں کھڑے ہو کر فواز احمد چائے یا کافی پیا کرتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کافی کا مگ ابھی تک ویسے ہی بھرا ہوا تھا۔ یہ وہی مگ تھا جو آخری بار روشنی فواز احمد کو دے کر گئی تھی۔ اس مگ کو فواز احمد کے ہاتھ لگے ہوئے تھے، وہ اس مگ کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"وہ چور تھا۔ اس نے میری عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی۔" صبا بیگم کی آواز نے اسے چونکا دیا تو وہ مگ کو دیکھتی ہوئی مڑی اور ماں کی طرف دیکھ کر نظریں جھکاتی ہوئی بولی۔

"اگر وہ چور تھا تو پھر اُس کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع کیوں نہیں دیا گیا؟" وہ آہستگی سے بولی۔

"یہ اس گھر کی عدالت کا قانون ہے...... وہ مجرم تھا بس۔" صبا بیگم تنک کر بولی تو روشنی مسکرائی اور کہا۔

"یعنی خود ہی مدعی خود ہی گواہ۔"

"میں سمجھ گئی تھی کہ تم اس دو ٹکے کے قلمکار میں دلچسپی لینے لگی ہو..... وہ مجھے بھی اچھا لگتا تھا۔" ان الفاظ نے روشنی پر بجلی گرائی وہ چونک اٹھی لیکن صبا بیگم کے ہونٹوں پر الفاظ کی بجائے طنزیہ اور زہریلی مسکان تھی۔ "وہ مجھے اتنا اچھا لگتا تھا کہ میں تمہارے لئے مراد خان سے اس کی سفارش ضرور کرتی..... لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں بھی اسے

بہت اچھی لگتی ہوں۔''

ایسی باتیں جوان بیٹی سے کرتے ہوئے ماں کو ویسے ہی شرم محسوس ہونے لگتی ہے لیکن وہ صبا بیگم تھی اس کو شرم نام کی کوئی بھی چیز چھو کر نہ گزری تھی۔

''وہ آپ کے کمرے تک پہنچا کیسے؟ میں تو اسے کافی دے کر گئی تھی اور آپ اپنے کمرے میں تھیں۔'' روشنی کا انداز مشکوک تھا۔ اس نے صبا بیگم کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ بھی ہتھے سے اکھڑی ہوئی بولی۔

''وہ تیسری بار میرے کمرے میں آیا تھا بیٹی!'' لفظ بیٹی کو اس نے چبا کر ادا کیا تو روشنی اس نئے انکشاف سے مزید حیران رہ گئی۔ ''دو بار تو میں نے سمجھا کہ وہ نیند میں چلنے کا عادی ہے۔ میں نے اسے دن کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ اپنی حرکات پر شرمسار بھی تھا لیکن اس دن اس نے اپنی ہوس پوری کرنے کی ضد میں مجھ پر تشدد شروع کر دیا اور میرے کپڑے پھاڑنے لگا تو میں اس کو جل دے کر اپنے کمرے سے نکل بھاگی اور باہر آ کر دروازہ باہر سے بند کر دیا...... اگر میں بچ کر نہ نکلتی تو آج کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔'' صبا بیگم نے تمام من گھڑت کہانی روشنی کو سنا کر اس کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش میں اس کو فواز احمد کے خلاف کیا تھا۔

''علی تمہیں ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرے گا۔'' وہ واپس جانے لگی تو روشنی تلخی سے بولی۔

''کوشش؟''

صبا بیگم پر اس کی چیخ اور رونے کا کوئی اثر نہ ہوا اور باہر نکل گئی۔ روشنی بیڈ پر گر کر رونے لگی۔ کوئی بھی اس کی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ کوئی بھی اس کو سمجھ نہ رہا تھا۔ صہیب احمد اور صبا بیگم نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ علی سے نکاح کر لے بس یہی اس کا مقدر ہے۔

اب مراد خان ہی رہ جاتے تھے وہ ان سے ایسی بات نہ کر سکتی تھی کیونکہ مراد خان کی شخصیت کافی رعب اور دبدبہ رکھتی تھی۔ لیکن انہوں نے روشنی کو بڑی محبت اور لاڈ سے پالا تھا۔ کبھی بھی روشنی کی کوئی بھی بات نہ ٹالی تھی انہوں نے روشنی کی ہر خواہش پوری کرنے کی حتی الوسیع کوشش کی تھی۔ یہ بھی روشنی کی ضد اور خواہش تھی کہ وہ فواز احمد سے ناول لکھنا سیکھنا چاہتی تھی۔ مراد خان نے کچھ پس و پیش کے بعد اس کو اجازت دے دی تھی کہ وہ فواز احمد کو گھر بلا سکتی تھی۔

فواز احمد اس کے گھر کیا آیا تھا اس کے دل کے نہاں خانوں میں گھر کر گیا تھا۔ وہ اس کی زندگی بن گیا تھا لیکن اب وہ اس کے چلے جانے کے بعد مُردوں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔

وہ فواز احمد کو بے گناہ مان رہی تھی لیکن تمام افراد فواز احمد کے خلاف تھے اور تمام گواہیاں اور ثبوت اس کو مجرم اور گناہگار قرار دے رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ فواز احمد علم اور ادب تخلیق کرنے والا ادیب ہے۔ وہ کسی کی عزت سے کھیلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن ایسا ہو گیا تھا کہ اس نے صبا بیگم کی عزت سے کھیلنے کا جو پروگرام بنایا تھا اس پر عمل درآمد سے پہلے ہی پکڑا گیا تھا۔

یہ خیال آتے ہی روشنی نے نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ فواز احمد کے تخیل اور نام سے ہی نفرت کرنے لگی تو دل سے اک ہوک سی اٹھی جو اس کی بات کو نہ مانتی ہوئی آنکھوں کے راستے پانی بن کر بہتی ہوئی اس کو بہت کچھ سمجھانے

کی کوشش کر گئی تھی لیکن عقل پر پردہ پڑ گیا تھا اور وہ صبا بیگم کی دلیلیں اور صہیب احمد کی قرآنِ کریم والی بات سن کر فواز احمد کو مجرم تصور کر چکی تھی۔

اس نے علی سے نکاح کرنے کا اصولی فیصلہ کر لیا تھا وہ غصے اور نفرت سے اس کمرے سے نکلی اور دروازے کو اتنے زور سے بند کیا کہ کہیں فواز احمد کی صدا اس کا پیچھا کرتی ہوئی اس کو پھر رک جانے پر مجبور نہ کر دے۔

○......❖......○

گھر میں مہمانوں کی آمد آمد تھی ارباب احمد اتنے بڑے محل کو دیکھ کر حیران تھے جبکہ یہی حالت احمد فراز کی بھی تھی ان کی نسبت شمسہ پر سکون تھی۔ ارباب احمد کو احساس ہوا کہ وہ مراد خان کی دوستی کے قابل ہی نہ تھا کیونکہ وہ کچھ بھی تھا مراد خان کے سٹیٹس کے آگے بہت چھوٹا آدمی تھا۔ چوکیدار نے ان کو گیٹ پر خوش آمدید کہا تو وہ حیرت سے بولے۔

''یہ اتنا اہتمام کس لئے ہے بھئی!'' چوکیدار نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتا ہوا بولا۔

''ہمیں معلوم ہے صاحب آپ ہم سے مذاق کرتا ہے...... آپ روشنی بی بی کے نکاح میں آئے ہیں۔''

ارباب احمد اس کی بات سن کر ہنس پڑا اور وہ تینوں آگے بڑھ گئے۔ شمسہ نے لان میں قدم رکھے تو اسے وہ لمحات یاد آنے لگے جو اس نے اس گھر میں گزارے تھے۔ وہ رک گئی تو ارباب احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں حوصلہ دیا اور بولے۔

''ہم طیبہ کے لئے آئے ہیں۔''

''یہ روشنی کون ہے جس کا نکاح ہے؟'' احمد فراز نے شمسہ سے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

''میں نہیں جانتی یہ کون ہے۔''

لان میں کرسیاں بچھائی گئی تھیں اتنی دیر میں ایک پرانی ملازمہ نے شمسہ کو دیکھ لیا تو وہ تیزی سے اُن کی طرف آئی اور شمسہ کو پہچانتی ہوئی بولی۔

''بی بی جی آپ؟...... اس گھر میں؟'' وہ کچھ خوفزدہ بھی لگ رہی تھی۔ شمسہ بھی اسے پہچان چکی تھی۔ وہ ہونٹوں پر دکھ بھری مسکان سجاتی ہوئی بولی۔

''کیسی ہو ریحانہ؟''

''سب اچھا ہے بی بی! آپ نے مجھے پہچان لیا؟''

''ہاں ریحانہ اس محل کی ہر اینٹ اور ہر ذرہ اگر مجھے پہچانتا ہے تو میں اس کے مکینوں کو کیسے بھول سکتی ہوں۔''

شمسہ نے انتظامات دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

''وہ جی...... مراد خان کی بیٹی روشنی بی بی کا نکاح ہے جی ان کی خالہ کے بیٹے علی سے...... وہ انگلینڈ سے آیا ہوا ہے۔'' ریحانہ نے تفصیلاً بتایا تو ارباب احمد نے کہا۔

''ہمیں مراد خان سے ملنا ہے وہ کہاں ہو گا؟''

''صاحب جی...... وہ تو اندر ہال میں ہیں۔ مہمانوں کے ساتھ ہیں۔ آئیے...... آئیے میں آپ کو لئے چلتی

ہوں۔'' رحانہ آگے آگے چلنے لگی تو کچھ ہی قدم وہ چلے ہوں گے کہ سامنے سے صہیب احمد کو آتا دیکھ کر وہ تینوں ہی حیران رہ گئے اور یہی کیفیت صہیب احمد کی تھی۔ وہ بھی حیرت سے ان تینوں کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران تھا۔ اس نے تو کسی بھی دوست کو انوائٹ نہ کیا تھا لیکن ارباب احمد اور شمسہ کی حالت عجیب ہو رہی تھی وہ صہیب احمد کو اس حوالے سے جانتے تھے کہ وہ احمد فراز کا دوست ہے اور ریبا میں بھی دلچسپی رکھتا ہے لیکن یہاں تو ان کو معاملہ ہی الٹا لگ رہا تھا۔ اتنی دیر میں صہیب احمد ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔

''السلام علیکم انکل، آنٹی......اور فراز......تم لوگ یہاں؟'' اس نے ارباب اور احمد فراز سے ہاتھ ملایا تھا۔

''کیسے ہو صہیب بیٹا؟'' شمسہ نے پوچھا تو وہ مسکراتا ہوا بولا۔

''اچھا ہوں لیکن آپ لوگوں نے تو مجھے سرپرائز دیا ہے۔ اس طرح اچانک میرے اس گھر میں آ کر۔''

''تمہارا گھر؟'' ارباب احمد اور احمد فراز یک زبان ہو کر بولے تو وہ حیران رہ گیا۔

''ہاں، بھئی میرا گھر......میرے بابا جان مراد خان کا گھر۔'' شمسہ پر بجلی کی کئی وولٹ کی تاریں گر کر اسے جھلسا گئی تھیں......ارباب احمد منہ کھولے کبھی شمسہ اور کبھی صہیب احمد کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہوا؟ حیران تو مجھے ہونا چاہئے اور آپ لوگ حیرت سے کھڑے ہو؟ فراز کیسے ہو یار؟'' صہیب احمد کا انداز اور رویہ ان کے ساتھ ویسا ہی بے تکلفانہ اور باتمیز انداز لئے ہوئے تھا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ابھی چند منٹ بعد مراد خان کا بیٹا ہونا اس کے لئے کتنا بڑا جرم بن جائے گا۔

''مراد کہاں ہے۔ مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' ارباب احمد نے بات کو طول دینے کی بجائے مختصراً کہا کیونکہ ان کو رات ہونے سے پہلے پہلے واپس بھی جانا تھا۔

''بابا جان اندر ہیں۔'' وہ ان کے آگے چلنے لگا اور پھر مڑ کر پوچھا۔ ''انکل آپ بابا کو جانتے ہیں۔''

''اتنا جانتا ہوں کہ......اتنا تم بھی نہیں جانتے ہو گے؟'' ارباب احمد کا نہ سمجھ میں آنے والا انداز اور جواب سن کر صہیب احمد خاموش ہو گیا۔ وہ ان کو لے کر ہال میں داخل ہوا تو مراد خان کی تو سٹی گم ہو گئی وہ شمسہ اور ارباب کو دیکھ کر پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو گیا تھا جبکہ وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی زبیدہ آپا بھی بائیس سال بعد شمسہ کو اچانک اس طرح دیکھ کر حیرت سے گنگ رہ گئی تھیں۔

ارباب احمد اور شمسہ احمد فراز کے ساتھ ہال میں کیا پہنچے تھے کہ سبھی مہمان ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے کیونکہ وہ لوگ صہیب احمد کے ساتھ ہال میں پہنچے تھے اور ان کے اندر آتے ہی جو حالت مراد خان کی ہو رہی تھی وہ سب کے سامنے تھی۔

صبا بیگم اور روشنی کی نظروں میں بھی تعجب اور حیرت نمایاں تھی اور زبیدہ آپا کو ارباب احمد کو دیکھ کر اپنا بیٹا یاد آ گیا تھا۔ وہ نم آنکھوں سے ارباب احمد کی طرف ملتجانہ انداز میں دیکھنے لگیں۔

''بابا جان! یہ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں لیکن میں پہلے ان کا تعارف کروا دوں کیونکہ میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' صہیب احمد نے تعارف کروانا شروع کیا تھا۔

''ارباب احمد اس ملک کے نامور اور ذہین نیورو سرجن ہیں۔ یہ ان کی مسز شمسہ ارباب اور یہ میرا کلاس فیلو احمد

فراز جو کہ ارباب انکل کا بھتیجا ہے۔ آپ لوگ اسے کئی بار ٹی وی سکرینوں پر دیکھ چکے ہوں گے۔''
مراد خان کے ذہن میں نہ جانے کیا چل رہا تھا لیکن وہ چہرے پر ہنسی کی کیفیت سجاتا ہوا بولا۔
''آؤ آؤ ارباب احمد...... آج کیسے راستہ بھول پڑے۔'' وہ پھر صہیب احمد سے مخاطب ہوئے۔'' یہ ارباب احمد ہے میرا کلاس فیلو اور بچپن کا دوست!'' دوست کہتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔
''ارے واہ بابا جان! آپ تو کافی چھپے رستم نکلے۔'' احمد فراز صہیب احمد کی طرف دیکھنے لگا جو مراد خان سے کافی بے تکلف لگ رہا تھا۔
''میری بیٹی کہاں ہے مراد خان؟'' شمسہ نے بم پھوڑا جو ہال میں بیٹھے ہوئے ہر شخص کے سر پر پھٹا تھا لیکن مراد خان اور زبیدہ آپا کے سینوں کے اندر دل پر پھٹا تھا۔ مراد خان منہ کھولے شمسہ کی طرف دیکھنے لگے۔
''بیٹی...... میں سمجھا نہیں...... ارباب احمد! بیٹھو تو سہی یار...... بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' شمسہ کا دھماکے دار سوال اور مراد خان جیسے دبنگ آدمی کا اس طرح بھیگی بلی بن کر مفاہمت والا انداز اپنانا صہیب احمد اور روشنی کے ساتھ ساتھ صبا بیگم کو بھی کھٹکنے لگا تھا۔
''میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا مراد! مجھے اتنا بتا دو کہ میری بیٹی طیبہ کو اغوا کر کے تم نے کہاں چھپایا ہوا ہے؟''
ارباب احمد کا رویہ خاصا تلخ تھا۔ اس کو مراد خان نے توہین کر کے کئی سال پہلے گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ اس رویے اور سلوک کو تو شاید بھول چکا تھا لیکن جو کچھ مراد نے شمسہ کے ساتھ کیا تھا وہ اس کو آج بھی یاد تھا اور خون کے آنسو رلاتا تھا۔
''بیٹی...... طیبہ...... اغوا؟ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو ارباب! میں ایسا کیوں کروں گا یار...... میں بھی بیٹی کا باپ ہوں۔'' مراد خان نے غمزدہ انداز میں روشنی کی طرف اشارہ کیا جو دلہن بنی بیٹھی تھی اور اس کی اداس آنکھیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہو رہا ہے۔ یہ بات شمسہ سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔
''وہی بیٹی جس کی پیدائش پر تم نے اسے اٹھا کر ہسپتال کی دیوار کے ساتھ پٹخ کر قتل کرنے کی ناکام اور بھونڈی کوشش کی تھی۔'' شمسہ بیگم کی آواز میں موجود درد سب نے محسوس کیا تھا۔ صہیب احمد حیرت سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو کسی فلم کی طرح چلنے والے منظر میں آ کر رنگ میں بھنگ ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی لیکن یہاں تو معاملہ سراسر ہی الٹا اور ہی تھا۔ ابھی اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لئے صہیب احمد نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا اور پھر مراد خان کی طرف متوجہ ہو گیا جو مہمانوں کی وجہ سے کوئی بھی بات کا جواب دینے سے ہچکچا رہے تھے۔ صہیب احمد کو ارباب احمد اور شمسہ کا اس طرح مراد خان کو ڈی گریڈ کرنا کچھ اچھا نہ لگا تھا لیکن بات بڑوں کے درمیان ہو رہی تھی تو اس کا خاموش رہنا ہی مناسب تھا۔
''تم لوگ کسی غلط فہمی کا شکار لگتے ہو۔ بھلا تمہاری بیٹی سے میرا کیا تعلق؟'' مراد خان کا لہجہ مسکینی سے بھرپور تھا۔ ارباب احمد آگے بڑھا تو احمد فراز نے بھی اس کا ساتھ دیا وہ بھی قدم سے قدم ملا کر اور کندھے سے کندھا جوڑ کر ارباب احمد کے ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔
''میرا خیال ہے کہ یہ مناسب وقت اور مناسب جگہ نہیں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی الگ کمرے میں

بیٹھ کر بات کر لیں۔'' مراد خان کا انداز بتا رہا تھا کہ اس نے بھی اپنی پہلی شادی کو بچوں اور بیوی سے ابھی تک راز ہی رکھا تھا۔ وہ اسی لئے چاہتا تھا کہ بات عام نہ ہو اور معاملہ بھی نپٹ جائے لیکن شمسہ کو اصرار تھا کہ آج سے بائیس تیئس سال قبل مراد خان نے اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے اس کی ایک نہ سنی تھی اور طاقت کے نشے میں اندھا ہو کر اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے۔ اس لئے ہر بات کھلے میدان میں ہی ہو گی اور سب کے سامنے ہی ہو گی۔

''مراد خان اپنی شکست تسلیم کرنے والے انداز میں بولا۔

''بیٹھو ارباب احمد! ہم یہیں بات کر لیتے ہیں۔'' وہ تینوں خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے ان کو دوسرے مہمانوں کی طرح تواضع کے لئے کولڈ ڈرنک اور کافی پیش کی گئی لیکن انہوں نے کوئی بھی چیز کھانے پینے سے انکار کر دیا تھا۔

''میرا یقین کرو کہ مجھے نہیں معلوم کہ تمہاری بیٹی کو کس نے اغوا کیا ہے۔ مجھے چند دن پہلے صہیب احمد نے سرسری انداز میں بتایا تھا کہ اس کے دوست کی بہن کو اغوا کر لیا گیا ہے۔'' مراد احمد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ طیبہ کو اغوا کیا گیا ہے جو تمہاری بڑی بیٹی ہے تو یقین کرو میں خود تمہارے پاس چل کر آتا۔''

''مراد خان! تم جتنے گھٹیا اور کمینے انسان ہو اس کا مجھے اندازہ ہے۔'' ارباب احمد کا لہجہ اور الفاظ کافی سخت اور تلخ تھے سب ہی حیرت سے مراد خان اور ارباب احمد کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ سب کو ہی پتہ تھا کہ مراد خان کا غصہ کتنا تیز اور سخت ہے لیکن کوئی بھی نہ بولا تھا صرف صہیب احمد آگے بڑھا اور ارباب احمد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''انکل! آپ کو کوئی حق نہیں کہ آپ ہمارے ہی گھر میں کھڑے ہو کر ہمارے بابا جان کی انسلٹ کریں۔ پلیز کنٹرول یور سیلف۔'' انداز گو کہ مؤدبانہ ہی تھا لیکن لہجہ دھمکی آمیز ہونے پر ارباب احمد بھی تلملا کر بولے۔

''تو پھر تم بھی وہ تاریخی الفاظ دہرا کر ہمیں اس گھر سے نکل جانے کا حکم دے دو جو آج سے کئی سال قبل تمہارے باپ نے دیا تھا۔'' صہیب احمد مراد خان کی طرف دیکھنے لگا تو انہوں نے اشارہ کیا کہ صہیب احمد اس معاملے میں نہ پڑے اور ان کو بات کرنے دے۔ وہ خاموشی سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔

''بتاؤ مراد خان...... ان بچوں کو بتاؤ کہ ہم کون ہیں اور کس بچی کی بات کر رہے ہیں۔'' شمسہ بولی تھی تو زبیدہ آپا وہیل چیئر کو لڑھکاتی ہوئی آگے آئیں اور بولیں۔

''ارباب احمد! میرا بیٹا کہاں ہے؟''

''آپ کون ہیں، میں آپ کو نہیں جانتا۔'' ارباب احمد کا روکھا لہجہ اور انداز بتا رہا تھا کہ وہ زبیدہ آپا سے بات بھی نہیں کرنا چاہتے لیکن احمد فراز نے چونک کر دیکھا تھا کہ یہی عورت فواز احمد کی ماں ہے۔

''مجھے پہچاننے کی کوشش کرو ارباب احمد! تم نے میری کوکھ اجاڑ کر مجھے انتظار اور کرب کی جس سولی پر آج تک لٹکائے رکھا ہے میں اب برداشت نہیں کر سکتی۔'' زبیدہ آپا رونے لگی تھیں۔

''اس بات کا جواب تو آپ کو خود ہی ڈھونڈ لینا چاہئے تھا زبیدہ آپا!'' شمسہ بولی تھیں۔ ان کی بات سن کر زبیدہ آپا کا ندامت سے سر جھک گیا تھا اور وہ آنسوؤں کے موتی برساتی ہوئی اثبات میں سر ہلا کر بولیں۔ ''میں کچھ بھی نہیں بھولی شمسہ! میں تمہاری مجرم ہوں......'' انہوں نے شمسہ کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو تماشائیوں کے لئے

تماشہ اور بھی دلچسپ ہونے لگا۔ ''مجھے معاف کر دو شمسہ! میں نے تم پر بہت ظلم ڈھائے ہیں مجھے معاف کر دو...... تمہیں تمہارے بچوں کا واسطہ مجھے میرے بیٹے سے ملوا دو۔'' وہ ہاتھ جوڑتی ہوئی ارباب احمد اور شمسہ کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

''جب تک میری بیٹی مجھے واپس نہیں مل جاتی تب تک میں نہیں بتاؤں گا کہ تمہارا بیٹا کون ہے اور کہاں ہے۔''

ارباب احمد نے بھی اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ ''ہاں یہ حوصلہ رکھو کہ وہ زندہ ہے اور اس معاشرے کا باوقار شہری بن کر زندگی گزار رہا ہے۔'' ارباب احمد کی زبانی بیٹے کی زندگی کا سن کر زبیدہ آپا نے پُرسکون انداز میں آنکھیں بند کر لیں ان کا انداز ایسا تھا کہ وہ رب تعالیٰ کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

''میں تمہارے ساتھ مل کر طیبہ کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں ارباب احمد!'' مراد خان پھر بولے۔ ''پلیز میرا اعتبار کرو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ......''

اس کی بات ارباب احمد نے راستے میں ہی کاٹ دی تھی۔ ''یقین اور اعتبار تم کئی سال پہلے ہی کھو چکے ہو مراد خان جب تم نے شک کا خنجر دوست کی پیٹھ میں گھونپا تھا...... ماں کو اس طرح ذلیل کیا کہ وہ بے چاری عزت و آبرو کا بھرم قائم نہ رکھنے پر موذی مرض کا شکار ہو گئی۔'' ارباب احمد نے مراد خان کے راز فاش کرنا شروع کیے تو وہ ندامت اور شرمندگی سے آنکھیں جھکائے سر کو جھکائے اس طرح بیٹھا تھا جیسے کسی مجرم کو اس کی فرد جرم پڑھ کر سنائی جا رہی ہو اور اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لئے بھی کچھ نہ ہو۔

''وہ وقت بھی تمہارے اعتبار اور اعتماد کا تھا جب تمہارا بوڑھا باپ تمہیں اپنے بڑھاپے کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا رہا کہ وہ بے قصور ہے وہ بے گناہ ہے۔ اس کی بہو اس کی بیٹی جیسی ہے۔ وہ اپنی بہو کی عزت بیٹی سے بھی زیادہ کرتا ہے۔'' شمسہ کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھومنے لگا تھا جب زبیدہ نے اس کو اور اورنگزیب کو ایک کمرے میں بند کر کے ان دونوں سسر اور بہو کو ذلیل الزام لگا کر بدنام کیا تھا۔

''یاد ہے مراد خان! وہ لمحات وہ وقت وہ گھڑیاں تمہیں اچھی طرح یاد ہوں گی جب تم اپنی بیوی کو اپنے ہی سگے باپ کے ساتھ بدنام کر کے اس پر تشدد کرتے ہوئے اسے ہسپتال لے گئے تھے۔''

ارباب احمد نے کہا تو صہیب احمد اور روشنی کی حالت دیدنی تھی جبکہ صبا بیگم کو یہ سن کر تعجب ہو رہا تھا۔

''پلیز ارباب احمد! مجھے اور ذلیل نہ کرو میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں تمہیں خدا کا واسطہ۔'' کڑیل جوان مراد خان ارباب احمد کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔

''مراد خان! میں نے بھی تمہارے سامنے ہاتھ جوڑے تھے کہ میں بے قصور ہوں، بے گناہ ہوں۔'' شمسہ بولیں تو سب حیرت کے جھٹکے لینے پر مجبور ہو گئے۔ وہ سب کی جانب مخاطب ہو کر بولنے لگیں۔ ''میرا نام شمسہ ہے میں مراد خان کی پہلی بیوی تھی۔'' اس نے ایٹم بم ہی گرا دیا تھا۔ پھر اس نے مختصراً تمام داستان سنانا شروع کر دی تو روشنی اور صہیب احمد شرمندگی سے سر جھکائے بیٹھے رہے زبیدہ آپا کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ شمسہ خاموش ہو جاتی تو ارباب احمد بولنے لگتے تھے۔ انہوں نے تمام داستان سنا دی تو مہمانوں کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

''زبیدہ آپا! مجھے بہت افسوس ہوا ہے تمہیں اس کرسی پر بیٹھے دیکھ کر لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ انکل کی بد دعائیں تمہیں لگ گئیں اور تمہیں آج اس بات کا احساس کچوکے لگا رہا ہے کہ تم نے کتنا بڑا گناہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا نا کہ تاحیات اپنے بیٹے کی شکل وصورت کو ترسو گی..... تو یاد رکھو زبیدہ آپا! جب تک میری بیٹی صحیح سلامت گھر نہیں آجاتی تب تک تمہارا بیٹا تو کیا تم یہ بھی نہیں سن سکو گی کہ اس کا نام کیا ہے۔ شمسہ ارباب کی گھن گرج نے سارے ہال پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ مراد خان کی طرف مڑی اور بولیں۔

''مجھے برباد کرنے کے بعد تم نے اپنے بیٹے کو مہرہ بنا کر میری بیٹی ریبا سے عشق رچانے کا جو ڈرامہ چلانا چاہا تھا افسوس ہے مراد خان کہ اس کا سکرپٹ انتہائی جاندار ہونے کے باوجود بھی کمزور فلیش بیک کی وجہ سے مار کھا گیا...... اگر میری بیٹی کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی کی تو یاد رکھنا تمہاری آنکھیں نوچ لوں گی۔'' آخری فقرہ انہوں نے صہیب احمد سے کہا تھا جس کو اپنی محبت جاتی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔

ارباب احمد نے اشارہ کیا تو شمسہ اور احمد فراز اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ جانے لگے تو روشنی کی آواز نے ان کو رکنے پر مجبور کر دیا۔

''آنٹی! آپ بابا جان کو معاف کر دیں۔'' روشنی کا انداز ایسا تھا کہ مراد خان خود پر قابو نہ رکھ سکے اور رونے لگے۔ شمسہ نے روشنی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولیں۔

''مراد خان! مجھے افسوس ہے کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ تم آج پھر ایک غلط فیصلہ کرنے جا رہے ہو پہلے تو اپنی نادانی اور طاقت کے گھمنڈ میں اپنے تئیں ایک بیٹی کو قتل کر ہی چکے ہو لیکن آج ایک اور بیٹی کو زندہ درگور کرنے کی تیاری کر رہے ہو۔'' شمسہ سانس درست کرتی ہوئی پھر بولیں۔

''اس کی آنکھیں پڑھو مراد خان! کیوں تمہیں دکھائی نہیں دیتا کہ یہ تمہارے اس فیصلے سے خوش نہیں ہے۔'' ارباب احمد نے روشنی کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا اور دعا دی۔

''اللہ تعالیٰ تمہاری ہر آس پوری کرے..... یہ ہم بڑوں کا معاملہ ہے بیٹا! تم بچے اس سے دور ہی رہو۔'' ارباب احمد اور شمسہ احمد فراز کے ساتھ وہاں سے نکلے تو شام ہونے لگی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ رات کسی ہوٹل میں ہی رک جاتے ہیں لیکن فراز نے انہیں سمجھایا کہ پیچھے دادی اور عدیم ریبا بھی پریشان ہوں گے میں محتاط ڈرائیو کر کے گھر ہی پہنچنا چاہتا ہوں۔''

ان دونوں نے بھی اس کی بات کی تائید کی اور گاڑی سرسبز علاقوں میں گھری ہوئی سڑک پر دوڑنے لگی۔ ''میرا خیال ہے انکل کہ مراد خان اس معاملے میں بے قصور ہے۔'' احمد فراز نے بات شروع کی تو ارباب احمد نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور بولے۔

''اچھا ہو گیا کہ صہیب احمد بھی سامنے آ گیا۔ اگر ہم ریبا کا رشتہ اس سے کر دیتے تو میں ساری زندگی اپنے آپ کو کبھی بھی معاف نہ کر پاتا۔'' ارباب احمد کی بات سن کر شمسہ بھی بولیں۔

''اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ اب اگر مراد خان سمجھدار اور غیرت مند ہو گا تو روشنی کی شادی اپنی بیوی کے کہنے پر نہیں کرے گا۔'' دونوں ہی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سامنے سڑک پر دیکھنے لگے تھے۔ شمسہ طیبہ کی

عزت و آبرو کے لئے دعائیں مانگنے لگی تھیں اور گاڑی گھر کی جانب بھاگی جارہی تھی۔

○...... ❖ ...○

دنیا کی سب سے بڑی انسانوں کی منڈی لگ گئی تھی یہی وجہ تھی کہ آج اس جگہ اور بازار کی رونقیں انتہائی عروج پر تھیں۔ سپیڈو جیسے کارندوں کی تو موجیں لگی ہوئی تھیں کیونکہ امپورٹڈ مال کی بدولت اس کی جیب بھرنے والی تھی۔ اس نے انیل شرما کو بھی فون کردیا تھا وہ بھی اس منڈی میں ایک جگہ پر کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ بیس بائیس سال کی نوخیز دوشیزائیں اندر سے لاکر ان کی بولی لگائی جارہی تھی۔ انیل شرما کو اس کام سے کوفت ہونے لگتی تو وہ بور ہونے لگتا لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ وہاں سے جانا چاہتا تھا لیکن دل اس کو وہیں ٹھہرنے پر مجبور کررہا تھا۔

ایسا کئی بار ہوا تھا وہ کئی بار ارادہ کر چکا تھا کہ اس بولی کے بعد وہ یہاں سے چلا جائے گا لیکن ہر بار ہی دل کی جیت ہوتی تھی اس نے وہاں سے جانے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ خوبصورت اور جوان لڑکیوں کے چہروں سے خوف اور وحشت ٹپک رہی تھی۔ وہ سہمی ہوئی ہرنیوں کی طرح اپنے اردگرد مردنما خونخوار بھیڑیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جس کو جو بھی مال پسند آتا تھا وہ بولی لگاتا اور بولی اس پر ختم ہوتی تو مال اس کے حوالے کرنے سے پہلے اس سے پے منٹ لے لی جاتی تھی جس کے پاس پیسے کم ہوتے تھے تو پھر سپیڈو جیسے دلالوں کی ضمانت کام آتی تھی اور وہ اپنا بھی خوب مال پانی بنالیتے تھے۔

''کیوں جناب! ابھی تک سوکھے ہی کھڑے ہیں یا کوئی ہاتھ مارا ہے؟'' سپیڈو نے اس کو اتنے زیادہ رش میں بھی ڈھونڈ لیا تھا آخر وہ جانتا تھا کہ انیل شرما بہت بڑی اور کھری پارٹی ہے۔ اگر انیل شرما کو کوئی حسینہ بھاگئی تو سمجھو پھر سپیڈو کی تو چاندی ہوگئی تھی۔

''مجھے ایک بات بتاؤ سپیڈو جی!'' انیل شرملا نے اس سے پوچھا۔

''ہزار باتیں پوچھا جناب! مگر ابھی کیا ہے کہ دھندے کا ٹائم کھوٹا ہوگا۔ اپن کا تو یہی روزگار ہے۔ پھر پتہ نہیں کب بولی ہوتی ہے۔ برا نہ ماننا'' سپیڈو خالص کاروباری لہجے میں بولا تو انیل شرما مسکرانے لگا مگر جب اس کی نگاہ سٹیج کی جانب اٹھی تو مسکراہٹ گم ہوگئی۔ آنکھیں چندھیا گئیں دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ سانسیں رک رک کر چلنے لگیں۔ چہرے کا رنگ سرخ ہونے لگا۔ جسم میں خون کی جگہ پارہ دوڑنے لگا۔ ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئی تھیں پاؤں بے جان ہوکر اس کے سر کے بالوں کو کھڑا ہونے میں مدد دینے لگے تھے۔

''دگیت؟'' انیل شرما کے منہ سے نکلا تو سپیڈو کی نظریں فوراً سٹیج کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ بھی پہلی ہی نظر میں اس لڑکی کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا کہ کائنات میں اتنا حسن بھی ہے۔ وہ انیل شرما کی جانب دیکھتا ہوا پوچھنے لگا۔

''پسند ہے تو بات کروں؟''

''اس کی بولی نہیں ہوگی جو بھی چاہے مل جائے گا۔ کہہ دو جاکر بابو سے، ابھی جاؤ ابھی کے ابھی۔''

انیل شرما کی دھاڑ سن کر سپیڈو کی سپیڈ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ آن کی آن میں سٹیج پر پہنچا تھا اس نے بابو کے کان میں کچھ سرگوشی کی تو بابو کی نظریں انیل شرما سے چار ہوئیں تو اس نے اشارہ کردیا کہ جو بھی تم چاہو گے تمہیں مل جائے گا۔ مگر بابو کمینہ اور گھٹیا آدمی تھا اس نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر آگے کی جانب کھینچا تو وہ سہمی ہوئی نظروں سے

اپنے خریداروں کو دیکھنے لگی۔ اس کے سر پر سیاہ سکارف ابھی بھی موجود تھا۔ ''ایک لاکھ......'' بولی شروع ہوگئی تو مول بڑھنے لگا۔ انیل شرما کی بے چینی اور بے قراری قابل دید تھی اس کی نظریں سٹیج پر تھیں اور وہ مجمع کو چیرتا ہوا سٹیج پر پہنچ گیا۔ اسے روکنے کی کوشش کی گئی لیکن سپیڈو نے کہا کہ آنے دو ہمارا ہی بندہ ہے۔ وہ سٹیج پر پہنچا تو گیت کی خوشبو سے اس کی سانسیں مہکنے لگیں۔ وہ قریب سے گیت کو دیکھ رہا تھا اور ہونق بن کر کھڑا تھا۔

''واہ جی واہ...... دس لاکھ۔'' بولی دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔

''بابو! تمہیں سنا نہیں کہ بولی بند کرواور اپنا منہ کھولو کتنا پیسہ چاہئے۔ اس لڑکی کی بولی نہیں ہوگی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پر اس کا مول چکانے والا کوئی نہیں ہے۔'' انیل شرما نے چیخ چیخ کر کہا تو مجمع پر خاموشی طاری ہوگئی۔ سبھی انیل شرما کی جانب دیکھنے لگے تھے۔ وہ چیخ کر بولا۔

''یہ لڑکی میں خریدوں گا۔ کسی میں بھی دم ہے تو اپنی اوقات سے بڑھ کر ایک ہی بار بولے ورنہ قسم کھاتا ہوں کہ آج کے بعد یہاں منڈی نہیں لگا کرے گی۔'' پھر وہ بابو کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔

''بابو اس لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دو اور بول کیا چاہئے تمہیں۔'' بابو کو انیل شرما تھوڑا سا کھسکا ہوا لگا تھا لیکن سپیڈو اس کے کان میں ''پارٹی تگڑی ہے'' کی سرگوشی کر چکا تھا۔

''پچاس لاکھ۔'' مجمع میں سے ایک بولا تو سبھی اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے کیونکہ آج تک کوئی بھی ''دانہ'' اتنا مہنگا نہ بکا تھا۔ سب اس کو پاگل کہنے لگے بلکہ غصہ کرنے لگے کہ وہ منڈی کا بھاؤ خراب کرنے آیا ہے۔ انیل شرما نے اس کی طرف دیکھا اور غصے سے بولا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے...... اب اگر زبان کھولی تو کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دوں گا۔'' وہ گیت کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''سالہ پچاس لاکھ کا بچہ...... دو کوڑی جیب میں ڈال کر آ گیا ہے اور چلا ہے میرا عشق خریدنے۔'' گیت نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا تو انیل شرما بابو سے بولا۔

''تمہیں ایک کروڑ مل جائے گا۔ سپیڈو کو مرے ساتھ بھیج دو۔'' اس نے گیت کا ہاتھ پکڑا تو من کے مندر میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں لیکن بابو کو اتنی بڑی رقم کی توقع نہ تھی اور سپیڈو بھی ہل کر رہ گیا تھا وہ تو تین چار لاکھ تک کی ضمانت دے سکتا تھا۔

''اپنے آدمی ساتھ لے لو اور میری گاڑی تک آ جاؤ۔ پے منٹ گاڑی میں موجود ہے۔'' انیل شرما نے ان کو تذبذب میں دیکھا تو گیت کا ہاتھ پکڑ کر احتیاط سے سٹیج سے نیچے اتر آیا۔ بابو کے اشارے پر اس کے آدمی انیل شرما کے پیچھے ہولئے۔ اس نے قیمتی گاڑی کا دروازہ کھولا اور گیت سے مخاطب ہوا۔

''آپ اندر تشریف رکھیں۔'' گیت اس کی طرف دیکھ کر گومگو کا شکار تھی۔ وہ پھر بولا۔ ''کیا یہ گاڑی اس سٹیج سے بہتر نہیں ہے؟'' گیت کو جیسے ہوش آ گیا تھا وہ ٹھنڈی آہ بھرتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی تو انیل شرما دوسرے دروازے کی طرف آیا اور سیٹ کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈیاں نکالنے لگا۔ گڈیاں گننے کے بعد اس نے بابو کے بندوں کو دیں اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی کے دروازے بند کر کے شیشے چڑھا دیئے اور گیت کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کی نظروں میں محبت نہ تھی بلکہ عشق کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن تھا۔ گیت اس کی طرف حیرانگی سے دیکھ رہی تھی اس نے گیت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ کو دانتوں سے کاٹ کر یقین کیا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا بلکہ حقیقت میں ہی گیت اس کے پہلو میں بیٹھی ہے۔

''سب کہتے تھے کہ تم نہیں آؤ گی۔'' وہ گیت سے بولا تو وہ گونگوں بہروں کی طرح اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے گرد رو رو کر سیاہ ہلکے پڑ چکے تھے۔ اب آنسو ختم ہو گئے تھے تو اس نے اپنے آپ کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔

''میرا عشق جیت گیا ہے گیت! تم آ گئی ہو۔ میرے عشق کی سچائی کی گواہی بھگوان بھی دے گا۔ میں نے تمہیں بڑی محبتوں سے تراشا ہے۔ تمہیں راتوں کو اٹھ کر سجدے کئے ہیں۔ تمہاری پوجا کرنے کے لئے اپنے بھگوانوں کو ناراض کیا ہے۔ یہ دنیا والے کہتے تھے کہ میں پاگل ہوں۔ جس کو بھی زندگی میں ایک بار بھی نہ دیکھا ہو وہ کیسے تمہارے خیالوں پر حکومت کرنے لگی ہے؟ میں نے بہت سی باتیں سنی ہیں میں نے بہت سے طعنے سہے ہیں۔ ہر لفظ میری سمت پتھر بن کر آتا تھا لیکن تمہارے عشق میں پھول بن کر مجھ سے ٹکراتا تھا۔ اب تم آ گئی ہو میں سب کو بتاؤں گا کہ میری گیت مجھے مل گئی ہے۔ میری منزل مجھے مل گئی ہے۔ میرا بھگوان مجھے مل گیا ہے۔ میری عبادتوں کو صلہ مل گیا ہے۔ میں تمہیں پوجوں گا۔ تیری پوجا کروں گا۔ تمہیں بھگوان بنا کر تمہارا داس بن کر تمہارے چرنوں کی دھول بن کر تمام زندگی گزار دوں گا۔ میں تمہیں اب سجدے کروں گا۔ سجدے کروں گا۔ دیکھتا ہوں کہ کون مجھے کافر کہتا ہے۔''

مانا کہ خاک نشیں ہوں مگر اتنا یقین ہے مجھے
ردائے عشق اوڑھ لوں تو یہ گھر بہشتوں جیسا ہے
کافر نہ کہہ سکو گے مجھے سجدہ صنم کو کرنے پر
میری چاہت پیغمبروں جیسی ہے، میرا عشق فرشتوں جیسا ہے

O......❖......O

امیت چوہان کی فیملی گیت کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کہ وہ کوئی عجوبہ ہو کیونکہ انہوں نے انیل شرما کے کمرہ میں بنے ہوئے مجسموں کو دیکھا تھا ان مجسموں اور گیت میں رتی برابر بھی فرق نہ تھا۔ انیل شرما تو کہتا تھا کہ اس نے کبھی بھی گیت کو نہیں دیکھا ہے لیکن آج گیت کو دیکھ کر خود انیل شرما کی بھی یہی حالت تھی جو آج امیت چوہان، رادھا، پری اور سمن کی ہو رہی تھی۔

پری تو باقاعدہ طور پر گیت کو چھو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ اس کو یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ انیل شرما جس لڑکی کو اپنے ساتھ گھر لایا ہے وہ گیت ہے۔ مجسموں کو یہ نام بھی انیل شرما کا ہی دیا ہوا تھا اور اس لڑکی کا ابھی نام پتہ پوچھنا باقی تھا وہ گھبرائی ہوئی اور سہمی ہوئی نظروں سے ہر ایک کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنے بڑے محل کو بھی دیکھ رہی تھی جس میں جابجا طاقوں میں پتھروں کی مورتیاں سجائی گئی تھیں اور ایک طرف لان کے کونے میں ایک چھوٹا سا مندر بھی بنا ہوا تھا جس میں ایک دیا روشن تھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' رادھا اور امیت چوہان آگے بڑھتے ہوئے اس کے پاس آئے اور رادھا بولی۔

''نام.....'' وہ دھیرے سے بولی اور نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ ذہن پر زور دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ رادھا پھر پیار سے بولی۔

''تمہارا نام، جیسے میں رادھا ہوں، یہ امیت جی ہیں، وہ پری اور وہ سمن ہے۔'' رادھا نے سب کی طرف باری باری اشارہ کرتے ہوئے ان کے نام بتائے شاید یہ تعارف کروانے کا ایک طریقہ تھا اور اس کا نام بھی پوچھنا ضروری تھا۔

''نام..... نام.....'' وہ ذہن پر زور دینے لگی تو دماغ کے نہاں خانوں نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جب سے اغوا ہوئی تھی اس نے ظلم وستم ہی دیکھے اور سہے تھے اب اس جگہ آ کر اس کو کچھ سکون محسوس ہوا تھا تو اس نے ذہن پر زور دیا اور روتی ہوئی بولی۔ ''طیبہ!'' اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں نے برسات جاری کر دی۔

رادھا نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور بولی۔ ''تم فکر نہ کرو تمہیں یہاں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ تم کہاں سے آئی ہو؟ اور انیل کو کیسے جانتی ہو، کب سے جانتی ہو؟'' رادھا کے تین چار سوالات یک دم ہی پوچھنے پر وہ کچھ پریشان ہو گئی اور انیل شرما کی طرف دیکھنے لگی تو امیت چوہان بول پڑے۔

''رادھا دیوی آپ بھی کمال کرتی ہو..... وہ بچی پہلے ہی گھبرائی ہوئی ہے اور آپ ہیں کہ سوال پر سوال کیے جا رہی ہیں۔'' وہ سمن اور پری سے مخاطب ہوئے۔ ''بیٹا اس کو لے جاؤ اور نہلا دھلا کر اچھا سا لباس پہناؤ۔ یہ بے چاری ہماری مہمان ہے۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔'' طیبہ آنسو بہاتی ہوئی ان دونوں کے ساتھ چلی گئی تو انیل شرما امیت چوہان سے مخاطب ہوا۔

''یہ ہے میرا عشق اور عشق کی سچائی۔''

''کہاں سے لائے ہو اسے؟'' امیت چوہان جہاندیدہ آدمی تھے ان کا لہجہ مشکوک اور الفاظ مدلل تھے۔

''انسانوں کی منڈی سے خرید کر لایا ہوں۔'' امیت چوہان کا قہقہہ بلند ہوا اور وہ بولے۔

''انسانوں کی منڈیوں میں اگر عشق بکنے کے لئے آنے لگے تو سمجھو اس دھرتی پر قہر آ گیا۔''

''عشق اور محبت انسان کی میراث ہے۔ بکنا بھی عشق کی ایک ایسی دلیل ہے کہ خریدار ایک انی لے کر بھی خریداروں میں اپنا نام شامل کروانے پر فخر محسوس کرنے لگتا ہے۔''

''ایسی کوئی بھی بات اور دلیل ہندو دھرم میں موجود نہیں ہے۔'' امیت چوہان حیران تھے کہ انیل شرما عشق کے کون سے حوالے دے رہا ہے۔

''بات دھرم کی نہیں ہو رہی پتا جی! عشق دین دھرم سے بھی اوپری درجے کا نام ہے اس میں زیر زبر اور شد مد کی گنجائش نہیں ہوتی اور شک تو عشق کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح گھن لکڑی کو اندر ہی اندر سے کھا جاتا ہے۔'' انیل شرما کو عشق کا پروفیسر کہا جاتا تو غلط نہ ہوتا۔

''میں تم سے پھر کبھی بات کروں گا۔ بہر حال اس لڑکی کے نام سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں سے تعلق رکھتی ہے... جن کی بھی ہے فوراً ان کے حوالے کرو.....ایسا نہ ہو کہ اس لڑکی کی وجہ سے کوئی دنگا فساد شروع ہو جائے۔'' امیت چوہان یہ کہہ کر وہاں سے رادھا دیوی کو اپنے ساتھ لے گئے۔

انیل شرما نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو جانی پہچانی خوشبو نے اس کا سواگت کیا وہ مسحورکن انداز میں آنکھیں بند کر کے سانس اندر کی جانب کھینچنے لگا تھا۔

وہ چلتا ہوا گیت کے مجسموں کے پاس آیا اور اپنی تخلیق کو حیرانگی سے دیکھنے لگا۔ قدرت نے اسے جس فن سے نوازا تھا آج اس کا صلہ اسے طیبہ کی شکل میں مل گیا تھا۔ اس نے ان مجسموں کی پوجا کی تھی۔ ان کو بھگوان کا درجہ دیا تھا۔ پورے گھر والوں سے لڑائی جھگڑا کر کے ان مجسموں کو دن رات کی محنت سے تراشا تھا۔ وہ غور سے ان سب کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ اگر کسی بھی مجسمے میں ہلکا سا بھی فرق نظر آ گیا تو عشق بدنام ہو جائے گا۔

گیت کیا سوچے گی کہ اس کے عشق کا دعویدار اس کی شکل بھی ٹھیک طرح سے نہ تراش سکا ہے۔ وہ تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آج تقدیر اس پر مہربان ہو گئی تھی اسے گیت اس طرح مل گئی تھی کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن دکھ اور افسوس اس بات کا تھا کہ وہ جسم فروشوں اور ہیرا منڈی کے دلالوں کے ہاتھ کیسے لگ گئی۔ وہ تو کسی پڑھے لکھے سلجھے ہوئے باشعور گھرانے کی سمجھدار لڑکی تھی۔

پھر خود ہی انیل شرما کو اپنی بات کا جواب مل گیا تھا کیونکہ کالجوں اور یونیورسٹیز سے اغوا کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ اس لڑکی کے پس منظر میں کیا ہے۔ اور ان کی واردات کے بعد اس کے گھر والوں پر کیا کیا قیامتیں گزریں گی۔ وہ کیسے کرب اور ذلت کی زندگی میں باقی دن گزاریں گے۔ وہ لوگوں اور رشتہ داروں کو کیا جواب دیں گے۔ ان سب باتوں اور خیالوں سے مبرا ہو کر وہ اپنے کاروبار کی ترقی اور عروج کے لئے نگینے تلاش کرتے تھے۔ جوان خوبصورت اور مال بڑھانے والے فیگرز ان کی ڈیمانڈ ہوا کرتے تھے اور مال پہچاننے والے اپنا ایمان بیچ کر بھی اس ڈیمانڈ کو پورا کرنے کی کوشش میں ان بچیوں کے والدین کے جذبات سے کھیل جاتے تھے۔ طیبہ بھی اسی طرح ان کے ہاتھ لگ گئی ہو گی۔ یہ بھی کسی کالج یا یونیورسٹی سے اغوا ہوئی ہو گی اور انسانوں کی منڈی میں بکتی بکتی اس تک پہنچ گئی تھی۔ اس کھیل میں انسانیت بری طرح ذلیل و رسوا ہونے پر چیخ چیخ کر روتی ہو گی۔ لیکن ''سوداگروں'' کی سماعتیں بہری ہونے کی وجہ سے یہ کام انتہائی عروج پر پہنچتا جا رہا تھا اور انیل شرما کے ملک میں تو یہ دھندہ تجارت کا درجہ پا کر باقاعدہ حکومت اور تنظیموں کی سربراہی میں پنپ رہا تھا اور مال ''اوپر'' تک بھی پہنچتا تھا۔

انیل شرما کانپ کر رہ گیا وہ خود ہی اپنی سوچ کے مطابق اس کام کی تفصیل جانتا تھا اگر سپیڈو جیسے کسی آدمی کے ساتھ وہ دو چار گھنٹے گزار لیتا تو ایسی ایسی کہانیاں سامنے آتیں کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور وہ سر تا پا لرز کر رہ جاتا۔

اس نے سمن اور پری کو دیکھا تھا جو طیبہ کو لے کر آئی تھیں تو وہ خود مجسمے میں تبدیل ہوتا ہوا اس کو دیکھنے میں اتنا محو ہوا کہ یوں لگتا تھا کہ بارہ مجسموں میں تیرہواں مجسمہ انیل شرما کا ہے۔ طیبہ اس کے تخیل سے بھی حسین تھی۔ وہ دودھ میں نہائی ہوئی ایسی دوشیزہ دکھائی دے رہی تھی جس کو تقدیر نے تنہائی اور فرصت میں بڑی دلچسپی سے بنایا ہو گا۔

وہ مجسموں کو دیکھ کر آگے بڑی اور حیرت سے گنگ ہو کر باری باری سب کی طرف دیکھنے لگی۔ پری کا چہرہ ستا ہوا تھا جبکہ سمن کو اپنے بھائی پر ناز اور فخر محسوس ہو رہا تھا۔

طیبہ ہر ایک مجسمے کے پاس جاتی اور غور سے دیکھنے لگتی۔ تمام کے تمام مجسمے ہو بہو ایک ہی شکل کے تھے اور وہ

حیرت کی بات یہ تھی کہ شکل بھی طیبہ کی ہی تھی۔ حالانکہ طیبہ آج سے پہلے کبھی بھی انیل شرما سے نہ ملی تھی اور نہ ہی کبھی انیل شرما اس سے ملا تھا۔ وہ اگر سنگتراش تھا تو پھر اس نے طیبہ کا مجسمہ بنا دیکھے ہی کیسے تراش لیا تھا؟ طیبہ نے حیرانگی سے اپنا ہاتھ ایک مجسمے کے چہرے پر رکھا تو اسے احساس ہوا کہ تراشنے والے نے کتنی محنت اور محبت سے اس کو تراشا ہے۔ اسے اپنا خالق و مصور یاد آ گیا جس نے اس کو بنانے میں کوئی کمی نہ رکھی تھی وہ ایک زندہ اور جیتی جاگتی انسان تھی اور اس کا خالق کل کائنات کا مصور تھا اور اسی مصور نے انیل شرما کو یہ ہنر بخشا تھا کہ وہ طیبہ سے اگر عشق کرتا ہے تو پھر اپنے عشق کی سچائی کو دنیا میں عیاں کر کے دکھائے اور انیل شرما نے خالق کائنات کی اس نعمت سے فائدہ اٹھایا تھا اور کیا خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ بس ان مجسموں میں انیل شرما جان نہیں ڈال سکتا تھا ورنہ یہ باتیں بھی بالکل طیبہ کی طرح ہی کرتے۔ ایسا فن اور کمال رب واحد نے صرف اپنے پاس ہی رکھا ہے۔ وہ بے جان جسموں میں جان ڈال کر ان کو انسان بنا دیتا ہے اور جیتے جاگتے انسانوں کو اجل کا پیغام دے کر بے جان وجود میں تبدیل کر دیتا ہے یہی اس کی مہارت اور کاری گری ہے اور کوئی بھی اس کا ہمسر اور شریک نہیں ہے۔

''جسم پانی سے پاکیزہ ہوتا ہے اور دل سچائی سے پاک صاف ہوتا ہے۔'' انیل شرما نے طیبہ کی حیرت دیکھی تو اس کے پاس آ کر کہنے لگا۔ ''میں نے جو پوجا اور عشق کیا ہے سچے دل سے کیا ہے اور آج اس کا صلہ دیکھ لو کہ میرا بھگوان چل کر میرے پاس آ گیا ہے۔''

''میں انسان ہوں۔'' طیبہ بولی تو پری آگے بڑھی اور مسکراتی ہوئی کہنے لگی۔

''یہی بات تو پورا گھرانہ انیل کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہے کہ انسان کی پوجا انسان کو کافر بنا دیتی ہے۔'' وہ اس انداز سے بولی تھی کہ طیبہ کو اس کا انداز اچھا نہ لگا تھا۔ ''تم لوگ باتیں کرو ہم تمہارے لئے کھانا بھجواتی ہیں۔'' پری نے سمن کو ساتھ لیا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

انیل شرما نے طیبہ کو اپنے سامنے کرسی پر بٹھا لیا اور حیران و پریشان طیبہ کو مزید حیران کرنے کے لئے اس نے سجدہ کرنا شروع کر دیا۔ طیبہ ہکی بکی رہ گئی اور گھبرا کر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور انیل شرما کو اس طرح سجدہ ریز ہوا دیکھ کر اس کی سانسیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ انیل شرما کو کیسے سمجھائے کہ وہ کتنا بڑا گناہ کر رہا ہے۔ وہ طیبہ ہے گیت نہیں ہے۔ وہ زندہ انسان ہے مجسمہ یا بت نہیں ہے۔ وہ انسان ہے بھگوان نہیں ہے۔ وہ مہمان ہے مہان نہیں ہے۔ وہ انسانوں کی منڈیوں میں دلالوں کے ہاتھوں بکتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے۔

وہ اپنی ہی نظروں سے اتنا گر چکی ہے کہ نظریں اٹھا کر جینے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔ انسانوں نے اسے کسی بھیڑ بکری کی طرح جگہ جگہ بیچا ہے۔ اسے ناچنا نہیں آتا تھا۔ اس کا مول کوئی بھی ادا نہ کرتا تھا۔ دو کوڑی بھی اس کا مول نہ لگ رہا تھا دلالوں نے اسے کنٹینر میں بند کر کے سرحدی لٹیروں کی نگرانی میں سرحد پار کرا دی اور وہ دوسرے ملک انڈیا آ گئی تھی۔ اسے کنٹینر میں ہی ایک لڑکی نے بتا دیا تھا کہ اب وہ انڈیا پہنچنے والی ہیں۔

وہ انیل شرما کے گھر اور ماحول کو دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ انڈیا کا ایک متمول گھرانہ ہے۔ ان لوگوں میں نفاست اور سادگی کو دیکھ کر طیبہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گھر میں بھگوان کی پوجا ہوتی ہے لیکن وہ تو مسلمان ہے وہ تو اللہ کی عبادت کرتی ہے۔ تو پھر یہ انسان انیل شرما ہندو ہو کر بھی سجدہ کر رہا ہے تو کس کو کر رہا ہے۔ یہ لوگ تو پتھر کے بھگوان

بنا کر ان کی پوجا کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ سجدہ کس کو کر رہا ہے کہیں یہ طیبہ کو سامنے بٹھا کر اس کو تو سجدہ نہیں کر رہا تھا۔طیبہ یہ خیال آتے ہی تڑپ کر رہ گئی اس کی روح تک کانپنے لگی۔ وہ آنسوؤں کے ساتھ رونے لگی۔ وہ کمرے کی چھت کی طرف یوں دیکھ رہی تھی کہ گویا اللہ کو دیکھ کر اس کی تقسیم اور کاریگری پر حیران ہو رہی ہو۔

اس نے کندھے سے پکڑ کر انیل کو ہلایا اور بولی۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' وہ سجدہ سے اٹھا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور رونے کی وجہ سے یوں لگ رہا تھا کہ خون بہا رہی ہوں۔ وہ طیبہ کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا گیا اور طیبہ بھی اس سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ کر سکی تھی۔

''میں نے اپنے بھگوان کو سجدہ کیا ہے۔'' انیل شرما بولا تو طیبہ حیرت سے سامنے دیکھنے لگی کہ سامنے تو سپاٹ دیوار تھی جس جگہ انیل شرما نے سجدہ کیا تھا بس اس سے چند قدم آگے پر ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر انیل نے طیبہ کو بٹھایا تھا اور سجدہ ریز ہو گیا تھا۔

''لیکن یہاں تو بھگوان کی کوئی مورت نہیں ہے۔ پھر آپ کس کو سجدہ کر رہے ہیں؟'' وہ حیرت سے بولی تھی۔

''میں پہلے ان مجسموں کو سجدہ کیا کرتا تھا گیت۔'' اس نے طیبہ کو اپنے ہی دیئے ہوئے نام سے پکارا۔ ''مگر اب میرا ان مجسموں کو سجدہ کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا کیونکہ تم زندہ سلامت میرے سامنے کھڑی ہو تو میں ان پتھروں کو سجدہ کر کے گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔''

اس کی عجیب اور نرالی منطق پر طیبہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ اتنی اہم تھی کہ کوئی اس کو بھگوان بنا کر اس کی پوجا کر رہا تھا اور اس کو اتنا چاہتا تھا کہ اسے دیکھے بنا ہی اس کے ایک جیسے بارہ مجسمے بنا ڈالے تھے اور ان کی زیر زبر میں رتی برابر بھی فرق نہ تھا لیکن وہ رب واحد کی ماننے والی تھی مسلمان تھی اور اسے اس بات پر فخر تھا۔ وہ انیل شرما کو سمجھانے کے لئے الفاظ ڈھونڈنے لگی تھی لیکن وہ اسے کیوں سمجھائے وہ تو خود سمجھدار ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ بھگوان اور انسان میں فرق ہوتا ہے۔

پری اور سمن ایک ملازم کے ساتھ کھانا لے کر اندر داخل ہوئیں تو لذیذ کھانوں کی خوشبو نے طیبہ کی بھوک چمکا دی تھی۔ اس نے کئی دنوں سے پیٹ بھر کر اچھا کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ ندیدوں کی طرح کھانے کی بھری ہوئی ٹرے کی جانب دیکھ رہی تھی لیکن اخلاقیات کا تقاقہ یہی تھا کہ صبر سے کام لیا جائے اور وہ صبر کرنے پر مجبور تھی۔

ملازم کھانا میز پر رکھ کر چلا گیا تھا۔ ''انیل! انکل کہہ رہے ہیں کہ تم کھانا ان کے ساتھ کھالو کیونکہ یہ مہمان کے لئے منگوایا گیا ہے۔'' پری نے انیل شرما کو مخاطب کر کے کہا تو وہ ہنستا ہوا اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

طیبہ نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا گوشت کو بہترین طریقے اور نئے انداز سے پکایا گیا تھا۔ اس نے تقریباً تین ماہ بعد گوشت کھایا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کے لمحات کو یاد کرنے لگی۔

اس سے پہلے وہ جس طوائف کے پاس پندرہ دن رہی تھی اس نے طیبہ پر ظلم وستم کی انتہا کر دی تھی وہ اسے ناچنا سکھاتی تھی لیکن طیبہ نے کبھی بھی ایک بھی پاؤں نہ اٹھایا تھا۔ طوائف کو معلوم ہو گیا کہ یہ ناچ نہیں سکتی اس نے اچھے مول میں اس کو آگے فروخت کر دیا تھا۔ اسی طرح بکتی ہوئی وہ شہر در شہر گھومتی ہوئی آج انڈیا پہنچی تھی اور اس کی دعا تھی

کہ وہ یہاں سے آگے کہیں نہ جا سکے کیونکہ یہ ایک گھر تھا اور یہ کوٹھوں سے کہیں بہتر تھا۔

اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا کہنے کو تو یہ ایک کمرہ ہی تھا لیکن پورا گھر اس میں سمایا ہوا تھا یوں لگتا تھا کہ انیل شرما کو ضرورت کی ہر چیز اس کمرے میں ہی مہیا کی جاتی تھی یا وہ خود ہی اس کمرے میں قید رہتا تھا۔ ہر چیز طریقے اور نفاست سے اپنی جگہ پر رکھی گئی تھی جیسے کہ بنی ہی اس جگہ کے لئے ہو۔ یہ کام خود انیل شرما کا ہی لگتا تھا کیونکہ وہ خود ایسا فنکار تھا جو ذرا سی بھی ٹھوکر لگا کر اوزار اور پتھر کی مدد سے ایک شاہکار تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

طیبہ اس کے عشق سے بہت متاثر ہوئی تھی وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کائنات کے اس حلیے میں بھی کوئی ایک ایسا ہے جو اس کو دیکھے بنا ہی اس کا عاشق ہے اور اس کو تخیل ہی تخیل میں اس قدر حسین انداز میں تراش چکا ہے کہ چھونے پر ہی معلوم ہوتا ہے کہ پتھر پر کاریگری کی گئی ہے۔ ورنہ دور سے یوں لگتا تھا کہ طیبہ ہی سر پر سیاہ حجاب اوڑھے کھڑی ہے اور اس نے اپنی سانسیں روک رکھی ہیں۔ وہ انیل شرما کی محبت اور عشق کی انتہا جان کر آبدیدہ ہو گئی تھی۔

ایک اس کا کزن تھا جو اس کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ اس کی جدائی میں رو رو کر ہلکان ہو گیا ہو گا۔ اسے جب طیبہ مارکیٹ میں نہ ملی ہو گی تو وہ پاگل ہو گیا ہو گا وہ دیوانوں کی طرح اسے ڈھونڈنے نکلا ہو گا۔ وہ مارکیٹوں اور شاپنگ پلازوں میں اس کو تلاش کر رہا ہو گا۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر جب تھکا ہو گا تو گھر والوں کے پاس تھکا ہارا اس امید پر پہنچا ہو گا کہ طیبہ نے اس کے ساتھ سنگین مذاق کیا ہے اور وہ خود ہی گھر پہنچ گئی ہو گی۔ وہ اسے ڈانٹ رہا ہو گا۔ وہ چاہتا ہو گا کہ کسی نہ کسی طرح طیبہ اس کے سامنے آ جائے تاکہ وہ اس پر اپنی تھکن اور مذاق کا غصہ نکال سکے۔ وہ امی اور ابو کے بعد ربیا عدیم اور دادی کے کمرے میں بھی طیبہ کو ڈھونڈنے گیا ہو گا۔ اس کو پورے گھر میں نہ پا کر کالج اور پھر اس کی دوست کے گھر فون کئے ہوں گے لیکن مایوسی کے سوا کچھ بھی نہ پا کر وہ رو دیا ہو گا۔ وہ رو رو کر طیبہ کو یاد کرنے لگا ہو گا۔ طیبہ نے چشم تصور میں دیکھا کہ امی ابو اور گھر کے سبھی لوگ پریشان ہیں اور رات گہری ہونے پر عزت پر آنے والی آنچ اور سفید پوشی پر لگنے والے بدنامی کے دھبے کو چھپانے کے لئے رات کے ٹھہر جانے کے منتظر ہوں گے۔ دادی تسبیح لے کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہوں گی۔ عدیم آپی کو نہ پا کر پریشان ہو گا۔ ارباب احمد اور شمسہ کھانے پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

لیکن سب کچھ ختم ہو کر رہ گیا جب وہ گھر پہنچنے کی بجائے ایک طوائف کے پاس کوٹھے پر پہنچ گئی۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ عزتوں پر کالک مل گئی۔ سفید پوشی کے بھرم ختم ہو گئے۔ رات گزر گئی۔ جوان بیٹی گھر سے رات بھر باہر کہاں رہی ہے۔ طرح طرح کے سوالات طرح طرح کی باتیں ہر منہ ہر زبان کے زہر بھرے الفاظ اور شریف النفس ارباب احمد ان کے جواب کیسے دے پائے ہوں گے۔

جو مہمان گھر میں شادی پر شرکت کے لئے آئے ہوں گے ان کو کیا جواب دیا ہو گا۔ ان کو کیا بتایا ہو گا۔ کسی نے تو صاف صاف ہی کہہ دیا ہو گا کہ لڑکی گھر سے بھاگ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ احمد فراز سے شادی ہی نہ کرنا چاہتی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو احمد فراز پسند ہی نہ ہو۔ نہیں نہیں..... وہ تو احمد فراز کی جان تھی اور احمد فراز بھی اس کی جان اور پسند تھا۔

کیا آج بھی احمد فراز اس کو اسی طرح چاہتا ہوگا؟
کیا آج بھی احمد فراز اس کو اپنانے کے لئے بے تاب و بے چین ہوگا؟
کیا اتنی دیر بعد وہ اگر گھر بھی پہنچ جاتی ہے تو کیا گھر والے اور وہ معاشرہ اس کو قبول کرے گا؟ نہیں...... کرے گا یقیناً نہیں کرے گا۔

وہ سجدے میں گر گئی اور زار و زار رونے لگی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور آنسوؤں کے نذرانے پیش کر رہی تھی۔
''میرے مولا! میرے پاک پروردگار میرے اللہ! تیری شان بہت نرالی ہے۔ میں حقیر اور گناہگار ہوں تیری رمزیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میرے مالک و معبود میں نے تو تیرے گھر کو دیکھنے کی جستجو کی تھی میں نے تو بیت اللہ کو آنکھوں سے بوسے دینے کی جرأت مندانہ خواہش کی تھی۔ میرے اللہ میرے بول میرے گناہ میرے عیب میری خطائیں اور سب تقصیریں تیری نظر میں ہیں۔ میرے اللہ! میرے ہر بڑے بول کی مجھے معافی دے دے۔ مجھے معاف کر دے مالک میں نے جانے انجانے میں بڑی بڑی باتیں کی ہیں۔ میں تیرا گھر دیکھنے کے لئے ہر امتحان ہر آزمائش سے گزرنے کے لئے تیار تھی۔ یہ میری بھول تھی کہ میں تیرے ڈالے ہوئے امتحان سے باعزت سرخرو ہو جاؤں گی۔ میرے مالک جس طرح آج تک میری عزت و آبرو کی حفاظت فرمائی ہے میرے اللہ اسی طرح کوئی ایسا سبب بھی پیدا فرما دے کہ میں باحفاظت تیرے فضل و کرم کے سہارے پر سفر کرتی ہوئی اپنے گھر میں واپس چلی جاؤں۔ مجھ پر رحم فرما میرے مولا میں بہت کمزور اور ہلکی ہوں۔ تیری کسی بھی آزمائش کے قابل نہیں ہوں۔ مجھ پر رحم فرما کہ کوئی سبب اور وسیلہ ایسا پیدا فرما دے میں اپنوں میں واپس چلی جاؤں۔ اپنے گھر سے عشق کا اتنا بڑا تاوان مجھ سے نہ لے مالک! میں ناتواں اور نادان ہوں۔ تیرے تاوان کو ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ مجھ میں سکت نہیں ہے۔ مجھے میری آرزوؤں کی تکمیل میں نہ تھکا میرے مالک!'' آنسوؤں نے کارپٹ پر جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ طیبہ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ قبلہ کس طرف ہے اور وہ کس طرف منہ کر کے دعا مانگے اور سجدہ کس طرف کرے۔ بس اس کو اتنا یقین تھا کہ سچے دل سے مانگی جانے والی دعائیں وہ ضرور سنتا ہے۔ وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اس کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا وہ سجدہ کی حالت میں ہی غش کھا کر بے ہوش ہو گئی تھی اور آڑے ٹیڑھے انداز میں کارپٹ پر گر گئی تھی۔

اس کا چہرہ آنسوؤں کے پانی نے دھو دیا تھا۔ وہ اور بھی نکھری ہوئی لگنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر گلابی رنگت کی واپسی شروع ہو گئی تھی۔ اس کے سر پر کالا حجاب بھی موجود تھا۔ جو اس نے سمن سے کہہ کر خصوصی طور پر فوری طور پر بازار سے منگوایا تھا۔ امیت چوہان نے حکم دیا تھا کہ وہ طیبہ کی ہر خواہش پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ کیونکہ وہ مہمان تھی۔ لیکن انیل شرما کی جان تھی۔ انیل شرما کا عشق تھا اور انیل شرما کی پوجا تھی۔ وہ اپنی پوجا اور عشق کے لئے ہر امتحان سے گزرا تھا۔ اس نے خاندان اور بھگوان سے بھی ٹکر لینے کی جرأت کر لی تھی۔

سبھی اس کے عشق کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن آج وہ طیبہ کو اپنے عشقیہ نام گیت کی صورت میں اپنے گھر میں اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر لیٹا ہوا محویت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز والہانہ تھا اور وہ محبت کی نظروں سے نظروں ہی نظروں میں طیبہ کو پوج رہا تھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو انیل شرما!'' پری کی آواز سن کر وہ چونکا اور پیچھے مڑ کر ناگواری سے بولا۔

''میری پوجا میں خلل ڈال کر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو پری؟''

''یہ چند دنوں کی چاندنی ہے انیل!''

''چاندنی تو راتوں کی ہوتی ہے پری! یہ میری عبادتوں کی چاندنی ہے۔''

''چند راتوں بعد تم جب پھر اماوس کے قہر کا شکار ہو گے تو میں ہی تمہارے کام آؤں گی۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو لیکن میں گیت سے عشق کرتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''محبت اور عشق میں فرق بھی تم نے خود ہی بنایا ہے۔'' پری بولی تو وہ پری کو بازو سے پکڑ کر کمرے کے ایک کونے میں لے گیا اور بولا۔

''عشق محو استراحت ہے میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی گفتگو سے اس کو ڈسٹرب کرو۔''

''تو پھر مان لو انیل کہ ڈھلتی چاندنی اور بڑھتی عمر کا خوف انسان کو اندھیروں کا عادی بنا دیتا ہے۔'' پری کی دلیل ٹھوس ضرور تھی لیکن وہ انیل شرما تھا جس نے مدتوں گیت کا انتظار کیا تھا۔ وہ اس کے حسن کی تپش سے اپنے عشق کو جھلسا جھلسا کر کندن بنانا چاہتا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے پری کہ تم محبت کیوں ہو اور وہ عشق کیوں ہے؟''

''تم ہی بتا دو!'' پری ہمہ تن گوش تھی۔

''یہ عشق اس طرح ہے کہ یہ پہلے سے ہی وہ چاند ہے جس کو کسی کی چاندنی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خود ہی اتنا پیارا ہے کہ اس کو مجھ جیسے کسی بھی دعویدار کے پیار کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ پہلے سے ہی اتنا حسین ہے کہ مجھ جیسے عاصی اور گناہگار کی پوجا اس کے حسن میں مزید اضافہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ جانتی ہو کیوں؟''

وہ پری کی طرف دیکھتا ہوا پھر بولا۔

''اس کو بھگوان نے اتنا مکمل بنایا ہے کہ اس میں کوئی بھی کمی نہیں رکھی۔ تم اماوس کی راتوں کا خوف ناک ذکر کر کے مجھے ڈرانا چاہتی ہو نا؟ میں کبھی بھی اماوس سے خوفزدہ نہیں ہوا ہوں کہ وہ گیت کے آنے سے پہلے میری دوست رہی ہیں۔ تاریک اور سیاہ راتوں کو میں نے عشق کی ردا اوڑھ کر چاندنی کا لطف اٹھایا ہے۔ میں اس کائنات بنانے والے کے سامنے کتنی ہی بار حاضر ہونے کی کوشش میں منہ کے بل گرا ہوں۔ شاید میرے عشق میں سچائی نہ تھی۔

شاید وہ تڑپ نہ تھی جو عاشق کے جذبوں میں ہوتی ہے۔ شاید وہ آگ نہ تھی جو پتھروں کو بھی جھلسا کر موم کی طرح پگھلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پری! تم کیا جانو، میں یونہی کندن نہیں بن گیا۔ میں نے اپنے دل کو سورج کی آگ میں اس طرح جلایا ہے کہ وہ خود ہی شرمندہ ہو کر غروب ہونے پر مجبور ہو جاتا تھا اور پھر اگلے دن مزید جھلسنے کے لئے میں اس کے طلوع ہونے سے قبل ہی اس کا منتظر ہوتا تھا تو وہ میری ہٹ دھرمی اور سخت جان ہونے پر آگ بگولہ ہو جاتا تھا اور مجھے جھلسانے کے لئے کاتب تقدیر سے مزید وقت کی مہلت بھی مانگتا ہو گا مگر میں نے اپنے جذبوں اور حوصلے سے جھلسا دینے والے سورج کو شکست دی ہے اور یہ اماوس کی راتیں تو میرے جیسے عاشق کا پانی

بھرتی ہیں۔''

وہ سانس لینے کے لئے رکا تو پری اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کانپ کر رہ گئی۔ کیونکہ آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ ان آنکھوں نے چاند و سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عشق کا لبادہ اوڑھا ہے لیکن میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں انیل!'' وہ روہانسی ہوگئی تو وہ زیرِلب مسکراتا ہوا بولا۔

''ابھی اس محبت کو عشق بننے دو پری۔ تم خود دیکھو گی کہ محبت تمہاری غلامی کرنے پر فخر محسوس کرے گی۔''

''اب تمہارا گیت...... میرا مطلب ہے کہ اس لڑکی کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟'' پری اپنے دل کا چور نکالتی ہوئی بولی تو وہ مسکراتا ہوا اس کی طرف اور پھر گیت کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اور گیت ایک ہونا چاہتے ہیں یا پھر میں نے تو کوئی بھی ایسا ارادہ نہیں کیا کہ میں گیت سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔'' پری کو یہاں تک تو سکون مل گیا تھا۔ وہ انیل کی طرف متوجہ تھی جو کہہ رہا تھا۔ ''تم نہیں جانتی پری کہ گیت میرے لئے کیا ہے؟''

''کیا ہے؟'' وہ اس کو مزید کھنگالنا چاہتی تھی۔

''اگر جان کہوں گا تو تمہیں اعتراض ہوگا کیونکہ میں اب تک اسی آس پر زندہ تھا کہ ایک نہ ایک دن گیت میرے عشق کو حقیقت اور بے جان تصور کو جان بخشنے کے لئے ضرور آئے گی۔ تم دیکھ لو میرا عشق جاندار ہو گیا ہے اور حقیقت تمہارے سامنے ہے۔''

''لیکن یہ تو پرائی ہے آج نہیں تو کل چلی جائے گی پھر کیا کرو گے؟''

''ایک نہ ایک دن تو اجل نے آنا ہی ہے۔ چتا کی آگ جس دن مقدر میں ہے مرنا اسی دن ہے۔ اب جس دن جان جائے گی اسی دن انیل شرما بھی چتا پر لیٹا ہوا تمہیں ملے گا۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھرتا ہوا بولا۔

''تو پھر میرا کیا ہوگا انیل۔'' وہ دکھ اور کرب نما لہجہ میں بولی اور اپنی بانہیں انیل کے گلے میں ڈال کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''مجھ سے محبت کرتی ہو؟''

''اپنی جان سے بھی زیادہ۔'' انیل کے سوال پر پری شوخی سے بولی۔

''تو جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندگی کیسے جی سکو گی؟'' وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور پری اس کی بات کی گہرائی کو سمجھتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ بیڈ کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور گہری نیند پُرسکون انداز میں سوئی ہوئی طیبہ کے چہرے کا دیدار کرنے لگا۔ وہ محبت اور پرخلوص نگاہوں سے اس کو دیکھتا ہوا بیڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اسے اس کی منزل مل گئی تھی۔ وہ مسلمان تھی تو کیا ہوا...... عشق تو دین دھرم کی رسموں کو نہیں مانتا ہے۔

O......❖......O

مراد خان سر کو جھکائے لان میں بیٹھا ہوا تھا چائے کا کپ اس کے سامنے پڑا پڑا ٹھنڈا ہو گیا تھا اور وہ آنکھوں میں آنسو بسائے ہوئے کبھی درختوں اور کبھی محل کی پرشکوہ عمارت کو دیکھنے لگتے تھے۔ صہیب احمد مراد کی اس حالت پر

کافی پریشان تھا۔اسے زیادہ پریشانی تو اس بات کی بھی بن گئی تھی کہ ریبا اس کے بارے میں کیا سوچے گی۔اس کا اور ریبا کا رشتہ ہونا تو دور کی بات اب ان دونوں کی بات ہونا بھی ناممکن بن گیا تھا۔

وہ مراد خان کے پاس آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''بابا جان! ماضی تلخ اور کڑواہٹ بھری یادوں کا نام ہی ہے۔'' مراد خان نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا تو صہیب احمد ان کے سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔''آپ نے مجھ سے اتنا بڑا سچ چھپایا بابا جان!'' مراد خان اس کی طرف دیکھ کر شرمندگی سے سر جھکانے لگا تو آنسو گر کر اس کی جھولی میں اپنا نشان چھوڑ کر قمیص میں جذب ہو گئے۔ صہیب احمد نے ان کا ہاتھ پکڑا اور پھر بولا۔

''کچھ تو بولیئے نا بابا جان!''

''میں کتنا بدبخت ہوں بیٹا کہ میری بیٹی اغوا ہوئی ہے اور الزام بھی مجھ پر ہی آیا ہے۔''

''آپ نے شمسہ آنٹی اور ارباب انکل کے سامنے اپنا اعتبار جو کھو دیا ہے۔'' صہیب دھیرے سے بولا۔

''میں اسی دن سے پچھتاوے اور ندامت کی زندگی گزار رہا ہوں لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ اور جرأت نہ ہو سکی کہ میں ارباب احمد کو اپنا یقین دلا دوں اور شمسہ کو یہ بتا سکوں کہ میں اسی دن سے ان دیکھی آتش کی تپش محسوس کر رہا ہوں جس دن سے شمسہ طیبہ کے ساتھ اس گھر سے گئی ہے۔''

مراد خان کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ برسنے لگے تو صہیب احمد کرسی سے نیچے اتر کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''آپ کو معلوم ہے بابا! کہ آنسو کمزور لوگ بہایا کرتے ہیں۔''

مراد خان اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

''نہیں...... آنسو بہادر لوگ ہی بہاتے ہیں۔ندامت اور اپنے اعمال کی شرمندگی پر۔''

''تو پھر آپ کمزور تو نہ ہوئے نا؟'' وہ باپ کی بات سے بات نکال کر ان کو دلاسہ دے رہا تھا۔''آپ تو ماضی پر ندامت اور شرمندگی سے آنسو بہا کر بہادر بن گئے ہیں اور بہادر لوگ ایسے اداس اور غمزدہ تھوڑی بیٹھا کرتے ہیں؟''

مراد خان زیر لب تکلیف دہ مسکراہٹ سے مسکائے اور بولے۔

''میں بچہ نہیں ہوں صہیب احمد! تمہارا باپ ہوں۔تمہاری باتیں اچھی ہیں کیونکہ ابھی تم نے دنیا کو دیکھا اور پرکھا نہیں ہے۔خدا نہ کرے کہ تمہارے ساتھ یا میری لاڈلی روشنی کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ ہو جو تم کو تلخ تجربات سے آگاہی کا سبق دے جائے۔اللہ کبھی نہ کرے۔''

''بابا جان! آپ نے اچھا فیصلہ کیا ہے جو روشنی اور علی کے نکاح سے انکار کر دیا ہے۔'' صہیب احمد نے کہا تو مراد خان آزردہ ہو کر بولے۔

''شمسہ اور ارباب احمد بہت عظیم لوگ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کو عین موقع پر صرف اور صرف میری آنکھیں ہی کھلوانے کے لئے بھیجا تھا۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہنے لگے۔''میں روشنی کی آنکھوں میں وہ آنسو دیکھ چکا

ہوں جو فواز احمد کے اس گھر سے جانے پر بضد تھے۔''

''آپ پھر بھی مما کے کہنے پر اس کی شادی علی سے کر رہے تھے؟''صہیب احمد کی حیرت بجا تھی لیکن وہ فواز احمد کی ذات میں کیڑے نکالتا ہوا بولا۔''اگر وہ بے غیرتی نہ کرتا تو شاید میں روشنی کے لئے آپ کو فواز احمد کی سفارش کر دیتا۔''

''صہیب احمد!'' مراد خان اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔''فواز احمد کو کب سے جانتے ہو تم؟''

''کئی سالوں سے بابا جان وہ میرے ساتھ پڑھا ہے۔وہ کافی محنتی اور لائق ہے۔''صہیب احمد کا جواب سن کر مراد خان مسکرانے کی کوشش میں بولے۔اتنے سالوں میں اس نے تمہارے ساتھ کتنے جھوٹ بولے اور تم کو کتنے دھوکے دیئے، کچھ یاد ہے تمہیں؟''صہیب احمد حیرانگی سے مراد خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا بابا جان!''

''جوان اور بھوکے پیاسے گھوڑے کے سامنے اگر تم دو ڈھیر لگا دو جن میں سے ایک گھاس کا ہو جو تازہ اور سرسبز و شاداب مہک رکھتی ہو.....اور دوسرا ڈھیر ایسی گھاس کا ہو جس کی باس اور بو دور دور تک جاتی ہو اور اس پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے اس کو تازہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے تو میرے بچے یہ بتاؤ کہ جوان اور بھوکا پیاسا گھوڑا کس ڈھیر پر منہ مارے گا؟''

مراد خان اپنی بات مکمل کر کے ہونہار اور سمجھدار بیٹے کی طرف دیکھ رہے تھے جس کی پیشانی پر بل پڑنا شروع ہو گئے تھے اور وہ ایک آہ بھرتا ہوا بولا۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ فواز احمد کو ٹریپ کیا گیا ہے؟''صہیب احمد کا فقرہ بتا رہا تھا کہ وہ مراد خان کی تمام بات سمجھ گیا ہے۔

''صرف علی کے لئے راہ ہموار کرنے کی کوشش میں ہو سکتا ہے کہ یہ صبا بیگم کی کوئی گھٹیا اور گھناؤنی چال ہو؟'' مراد خان نے دل کی بات زبان سے ادا کی تو صہیب احمد کو شدید جھٹکا لگا وہ دو قدم پیچھے ہو کر مراد خان کی طرف دیکھنے لگا اور حلق تھوک سے اتار کر گلے کو تر کرتا ہوا بولا۔

''آپ کہنا چاہتے ہیں کہ مما نے اپنی عزت برباد ہونے کا ناٹک کیا تھا؟''اس کی آواز میں درشتی محسوس کرتے ہوئے مراد خان بولے۔

''ناٹک نہیں کہہ رہا صرف ایک چال کہنا چاہتا ہوں، ہو سکتا ہے کہ میں غلط بھی ہوں؟''

''تو پھر اس بات کا فیصلہ کیسے ہو گا کہ فواز احمد جھوٹا تھا یا سچا تھا؟''صہیب احمد بولا تو مراد خان اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

''صہیب احمد فواز احمد کوئی گمنام نوجوان نہیں ہے۔وہ اس ملک کا نامور مصنف ہے تم نہیں تو اس کے پبلشرز ضرور جانتے ہوں گے کہ وہ کس جگہ رہتا ہے۔اس کا پتہ کر کے اسے اپنے اسلام آباد والے گھر میں بلواؤ اور پھر مجھے بتا دینا......میرے پاس ایک کسوٹی ہے جو سیکنڈوں میں فیصلہ کر دے گی کہ فواز احمد جھوٹا ہے یا صبا بیگم نے اس پر

بہتان لگا کر علی کے لئے روشنی کو سولی چڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

مراد خان آگے بڑھنے لگے تو حیران و پریشان صہیب احمد آگے بڑھتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور بولا۔

''بابا جان! آپ مما سے بدگمان نہ ہوں...... وہ اتنا بڑا بہتان اپنی ذات پر لگا کر ہم سب کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتیں۔''

''علی وغیرہ کب جا رہے ہیں یہاں سے؟'' مراد خان نے اس کی بات سن کر الٹا اس سے سوال کیا تو وہ بولا۔

''کل شام کو ان کی فلائٹ ہے اور وہ یہاں سے دوپہر کو نکل جائیں گے۔''

''آنکھیں کھلی رکھنا، ہارا ہوا جواری گلے پڑ سکتا ہے۔'' مراد خان تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اندر کی جانب بڑھ گئے تو صہیب احمد وہیں کھڑا رہ گیا۔

وہ مراد خان کی کسی بھی بات کو چیلنج کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ ان کی عمر اور تجربہ اتنا تھا جتنی ان اس کی عمر بھی نہ تھی اسی لئے صہیب احمد کو باپ کی باتیں سچ لگنے لگیں تو وہ صبا بیگم کے بارے میں سوچنے لگا کہ اگر وہ جھوٹی نکلی تو وہ کس منہ سے فواز احمد کا سامنا کرے گا۔

وہ پڑھا لکھا اور باشعور جوان تھا۔ بڑی محنت اور تحقیق کے بعد اخبار شائع کرتا تھا۔ اس کی محنت اور تحقیق ہی اس کو ترقی کے زینے طے کرنے میں مدد کر رہی تھی اور یہ تو اس کے گھر کا معاملہ تھا اس کو اس بات کی تحقیق بھی کرنا چاہئے کہ سچا کون ہے فواز احمد یا صبا بیگم؟ لیکن وہ خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا کہ صبا بیگم صرف علی کی خاطر اپنی ذات پر گھٹیا الزام لگوا کر ساری زندگی اس گھر والوں اور اپنی بہن کے سسرالیوں کی نظروں میں گرنا نہیں چاہتی ہوں گی۔ تو پھر معاملہ بھی کوئی اور ہوگا اور اس کی تحقیق کرنا اب صہیب احمد کی اوّلین ذمہ داری بن گئی تھی۔

○......❖......○

دروازے پر ہلکی ہلکی دستک سن کر روشنی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ حیرت سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی اور پھر اسے اپنا وہم سمجھ کر لیٹنے لگی تو پھر دستک سن کر وہ اٹھی اور خمار آلود تھکی ہوئی آنکھوں سے دروازے کی جانب بڑھی اور دروازہ کھول کر دیکھا تو دروازے پر علی کھڑا تھا۔ وہ پہلے تو خوفزدہ ہو گئی ،ور دروازہ بند کرنے لگی تو علی دکھ سے بولا اٹھا۔

''پلیز روشنی! دروازہ بند مت کرنا......'' روشنی کی آنکھیں حیرت سے اس کی جانب اٹھیں جب وہ بدلے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولا تھا۔ ''میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں روشنی۔''

''روشنی کی حیرت مزید دوچند ہوگئی جب اس نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''لیکن مجھ سے کس بات کی معافی اور تم کیوں معافی مانگنا چاہتے ہو؟''

''پلیز...... میں تم سے اس بات کی معافی مانگنا چاہتا ہوں کہ میری لندن میں پہلے ہی شادی ہو چکی ہے۔'' اس دھماکے نے روشنی کو بے احتیاط اور ڈھیلا کر دیا تھا وہ منہ کھولے علی کی طرف دیکھنے لگی تو اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے علی نے اندر داخل ہو کر حیران پریشان روشنی کو زور سے دھکا دیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا اور قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔

''میں تم جیسی تتلیوں کا شکاری ہوں مائی ڈیئر کزن!'' روشنی کی تو سانسیں اوپر کی اوپر ہی رہ گئیں وہ اس درندے کو دیکھنے لگی تھی جو اس کے پنجرے میں گھس آیا تھا اب اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا اور اپنی جان وعزت بچانا بھی ضروری تھا اور عقلمندی استعمال کرنے کی ضرورت تھی۔

''تم نے مجھے بہت تڑپایا ہے روشنی!'' وہ جس انداز میں بولا تھا روشنی کو اندازہ ہو گیا کہ اس نے شراب پی رکھی ہے اور شرابی کو عقلمندی سے ہی قابو کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے ذہن کو دوڑانے لگی۔ علی اس وقت نشہ میں تھا اور چیخنا چلانا فضول تھا کیونکہ کمرے کی کھڑکیوں پر دبیز پردے بھی تھے اور المونیم کی فریم میں شیشہ بھی کافی موٹائی والا تھا اور کمرے کا اکلوتا دروازہ بھی بند تھا اور دروازے پر علی کھڑا تھا۔

''میں صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔ جب صبا آنٹی نے تمہاری فوٹو بھیجی تو یقین کرو میں تو اسی لمحہ تم پر مرمٹا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں...... کم آن جانِ من، کم آن۔ کسی کو بھی علم نہیں ہے کہ میں تمہارے کمرے میں ہوں۔''

وہ نشے کی زیادتی اور حسن کے انکار کی وجہ سے سچ بیان کر رہا تھا۔ روشنی نے لوہا گرم ہوتا دیکھا تو بولی۔ ''اگر نہ آؤں تو کیا کرو گے جانو؟'' وہ روشنی کے منہ سے لفظ جانو سن کر قہقہہ لگا کہ ہنسا اور بولا۔

''اچھا...... تو آگ ہے برابر لگی ہوئی...... گڈ ویری گڈ!'' علی نے نفسیاتی داؤ آزما کر اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس پر فتح پالی تھی لیکن اب روشنی اس کو اسی کی بچھائی ہوئی بساط پر مات دینے کے لئے ذہنی طور پر تیار تھی اور ہوشیار بھی تھی۔

''تم بھی تو بہت کمینے ہو۔ اتنے دنوں کے آئے ہوئے ہو اور مجھے لفٹ تک نہیں کرائی۔ میں نہیں تم سے بولتی۔'' روشنی کی تھر تھر کانپتی ٹانگیں اس کی زبان اور اچھی اداکاری کا ساتھ دینے لگی تھیں۔ وہ آگے بڑھا اور بیڈ پر سیدھا لیٹتا ہوا بولا۔

''کم آن ڈارلنگ! اگر تم بھی جوانی کی آگ بجھانا چاہتی ہو تو پھر مراد انکل سے کہو نا کہ نکاح ہونے دیں۔'' روشنی کچھ حوصلہ پا کر اس کے پاس آئی اور بیڈ پر سہمی ہوئی بیٹھنے لگی تو اس نے شکاری کی طرح اس کو دبوچ لیا اور بولا۔

''اب باتیں کم کرو نا، رات گزر گئی تو تمام عمر ترستی ہی رہو گی، کم آن۔'' وہ روشنی کو کھینچ کر اپنے اوپر گراتا ہوا بولا تو روشنی کو یہ تصدیق ہو گئی کہ وہ بہت زیادہ پئے ہوئے ہے۔ وہ اس کی شرٹ کے بٹن کھول کر اپنے بالوں کو بھی کھولتی ہوئی اس کی بانہوں سے نکل گئی تو وہ ہنستا ہوا اٹھا اور بولا۔

''اچھا، یہ بات ہے تو پکڑ لیتا ہوں تم کو بہت سی تتلیوں کو پکڑ کر میں نے ان کو مسلا ہے۔'' روشنی اس کو کمرے میں بھگانے لگی وہ کبھی بیڈ پر چڑھ جاتی اور کبھی بیڈ کو پھلانگ کر کمرے کے دوسرے کونے میں بھاگ جاتی۔ وہ اس چھوا چھوئی میں ہانپنے لگا تو بولا۔

''ایسا مت کرو جان! کیوں خود کو بھی تڑپا رہی ہو اور مجھے بھی، آ جاؤ...... ایک ہو جاتے ہیں یار!'' روشنی بھی اس دوڑ دھوپ میں ہانپنے لگی تھی لیکن اب اگر وہ اس کے ہاتھ آ جاتی تو پھر وہ یقیناً مسلی جاتی اور وہ جس طرح وحشی ہو چکا تھا وہ یقیناً روشنی کو کلی ہی کر دیتا۔

''تو پھر شرٹ اتارو!'' روشنی کا اتنا کہنا تھا کہ وہ فوراً تیار ہو گیا اس نے شرٹ کھینچ کر اتاری اور بولا۔

''آ جاؤ نا!''

''ایسے نہیں...... تم نے شراب پی رکھی ہے...... چلو...... منہ دھو کر آؤ...... اتنی دیر میں میں بھی......'' وہ اپنے قمیص پر گریبان میں ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی تو وہ پینٹ اتارتا ہوا رک گیا اور قہقہہ لگا کر بولا۔

''پاکی گرل ہو، صفائی ستھرائی پسند کرتی ہو نا۔'' وہ باتھ روم میں داخل ہوا تو روشنی نے موقع پا کر باتھ روم کا دروازہ بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔

اس نے اپنی ذہانت اور ہوشیاری سے اپنی عزت بچالی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگی تھی۔ اسے علی کی کمینگی پر رونا آ رہا تھا جو اسے مفت کا مال سمجھ کر اس پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو جیسے علی کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ وہ بھی دروازہ زور زور سے پیٹنے لگا تھا۔

روشنی نے اپنے بال بکھیرے اور قمیص کو گریبان سے پھاڑا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی اس نے

دروازے کو باہر سے کنڈی لگانے کی کوشش نہ کی تھی اور اس نے گریبان بھی اس لئے چاک کیا تھا کہ اس کی ماں صبا بیگم کبھی بھی اس کی صاف حالت کو دیکھ کر اپنے بھانجے کو قصوروار نہیں مانے گی۔ روشنی نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ وہ اونچی اونچی آواز میں رونے لگی اور ساتھ ہی مراد خان کو بھی پکارنے لگی۔

''بابا جان!...... مجھے بچاؤ بابا جان! صہیب بھائی!...... بچاؤ...... بچاؤ بھائی بابا جان!'' اس کی دلدوز چیخیں پورے محل کے مکینوں کو منٹوں میں نہیں سیکنڈوں میں گہری نیند سے بیدار کر چکی تھیں۔ روشنی کو اس بات کی فکر نہ تھی کہ باتھ روم کو کنڈی کھل جائے گی۔ کیونکہ اچھے میٹریل کا کام اچھا ہی ہوتا ہے۔ چند ہی منٹ میں گھر کے تمام مکین روشنی کے پاس کھڑے تھے۔ مراد خان نے روشنی کی حالت دیکھی تو دم بخود رہ گئے۔ صبا بیگم نے اندر سے بیڈ کی چادر لا کر اس پر دینا چاہی تو بیڈ پر علی کی شرٹ پڑی ہوئی دیکھ کر اس کو بات سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی۔

''کہاں مر گئی ہو تم!'' مراد خان کی گونجدار آواز نے جیسے صبا بیگم کے جسم میں کرنٹ دوڑا دیا تھا۔ وہ چادر لے کر باہر نکلی اور روشنی کا نیم برہنہ بدن اس سے ڈھانپ دیا تو مراد خان نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور بولے۔''

''کیا ہوا بیٹی! ڈر گئی ہو...... مجھے بتاؤ؟''

روشنی کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ گھر کے تمام افراد مع مہمانوں کے اس کی حالت کو دیکھ کر حیران تھے۔ روشنی نے روتے ہوئے اندر کمرے کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔

''وہ...... وہ اندر ہے...... وہ مجھے جان سے مارنے کی بات کرتا ہے۔ وہ میری عزت سے کھیلنا چاہتا ہے۔''

''کون...... کون اندر ہے؟'' صہیب احمد فوراً کمرے میں داخل ہوا۔ ''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' وہ پردوں کو اٹھا اٹھا کر روشنی کی طرف دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

''وہ...... علی...... علی...... باتھ روم میں بند ہے بابا! اس نے مجھے جان سے مارنے......'' وہ اونچی آواز میں رونے لگی تو سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اتنی دیر میں علی نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ صہیب احمد نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو سامنے کھڑے علی کا سارا نشہ کافور ہو گیا تھا۔

وہ اسی سازش کا حصہ بن گیا تھا جو اس نے صبا بیگم کے ساتھ مل کر فواز احمد کے خلاف بنائی تھی لیکن اس چال میں شکست دھوکے اور جھوٹ کی ہوئی تھی۔ فواز احمد سچا تھا اور علی اس لمحہ چور تھا اور بدنیت بھی تھا اس نے شراب بھی پی رکھی تھی۔ اس کی شرٹ بیڈ پر پڑی ہوئی تھی اور اس نے باتھ روم میں تو پینٹ بھی اتار لی تھی۔

مراد خان نے کھا جانے والی نظروں سے اس کو دیکھا اور پھر صبا بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''لازمی نہیں کہ غیرت اور عزت امیر لوگوں کی ہی میراث ہو۔'' اتنی دیر میں زبیدہ آپا کو بھی ملازم لے آیا تھا۔ وہ بھی تمام معاملہ سن کر صبا بیگم پر تھوتھو کرنے لگی تھیں۔

''ابھی کے ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ تم سب کو ایک ایک کر کے کتے کی موت مار دوں گا۔ دفع ہو جاؤ اور اس بے غیرت کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاؤ۔'' مراد خان کا اشارہ صبا بیگم کی طرف تھا۔

صہیب احمد علی کو پکڑ کر مراد خان کے پاس سے گزرا تو ان کا ہاتھ اٹھ گیا اور ایک زوردار تھپڑ نے اس کے گالوں پر اپنا نشان چھوڑا۔

''یہ تھپڑ اس لئے مارا ہے کہ تمہارا سارا نشہ اتر جائے تا کہ جب اس محل سے باہر جاؤ تو معلوم ہو کہ تم مراد خان کے گھر سے آئے ہو......'' انہوں نے سینے سے لپٹی سہمی اور خوفزدہ روشنی کی طرف دیکھا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے سب مہمانوں سے مخاطب ہوئے۔

''میری بیٹی کے آنسو خشک ہونے سے پہلے پہلے اپنا سامان سمیٹ کر نکل جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو جتنے آنسو میری بیٹی کے گرتے جائیں گے تمہاری لاشوں کے اتنے ہی ٹکڑے بڑھتے جائیں گے۔'' وہ صہیب احمد کی طرف مڑے اور بولے۔''ڈرائیوروں سے کہو کہ ان کو گاڑیوں میں لاد کر ائیر پورٹ چھوڑ کر آئیں اور تب تک واپس نہ آئیں جب تک ان بے غیرتوں کے وجود سے میرا ملک پاک نہ ہو جائے۔''

مراد خان روشنی کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ صہیب احمد نے ڈرائیوروں کو ہدایات کر دی تھیں اور وہ بھی مراد خان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں مراد خان روشنی کو تسلی اور دلاسہ دے رہے تھے۔ صہیب احمد بھی اندر داخل ہوا تو مراد خان بولے۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ہارا ہوا جواری گلے کی ہڈی بننے کی کوشش ضرور کرے گا۔''

''میں نے ان سب کو بھجوانے کا بندوبست کر لیا ہے لیکن بابا جان مما کو روک لیا ہے۔'' صہیب احمد نے کہا تو مراد خان کے چہرے کا رنگ یک دم سرخ ہو گیا وہ غصے سے اٹھے اور کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ صہیب احمد بول پڑا۔

''بابا جان ریلیکس ہو جائیں اور ٹھنڈے مزاج سے سوچیں کہ علی کی اس حرکت نے فواز احمد کو بے گناہ ثابت کرنے کا راستہ ہموار کیا ہے۔''

''کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ میرا خون کھول رہا ہے۔ میری پھول جیسی بچی کو اس بے غیرت نے میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت کیسے کی؟'' روشنی ابھی تک آہیں بھر رہی تھی۔

''بابا جان! ہم فواز احمد کو ڈھونڈ کر لائیں گے اور مما کے سامنے کھڑا کر کے تمام بات سنیں گے اگر مما یہاں سے ان کے ساتھ چلی گئیں تو پھر فواز احمد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چور ہی ٹھہرے گا۔''

''وہ ابھی بھی چور ہے لیکن یہ دلیل اور گواہی اب کمزور ہو کر اس کو بے گناہ ثابت کر رہے ہیں۔''

''بابا جان آپ نے کہا تھا کہ آپ کے پاس ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر آپ سچ اور جھوٹ کو پرکھ کر یہ فیصلہ بخوبی کر سکتے ہیں کہ کون مجرم ہے۔ وہ کسوٹی کیا ہے بابا جان!''

مراد خان روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولے۔

''میں نے زبیدہ آپا کے کہنے پر ماضی میں بہت سی غلطیاں اور غلط فیصلے کئے ہیں۔ جن پر میں آج بھی پچھتا رہا ہوں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ اس دن شمسہ کی آنکھوں میں سچائی اور پاکیزگی کی روشنی چمک رہی تھی۔ وہ اس وقت بھی سچی تھی جب زبیدہ آپا نے بابا جان کے ساتھ اس کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ اس دن جس سچائی سے بولی تھی کہ روشنی کے ساتھ علی کا نکاح کر کے ہم روشنی کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ میں نے اس کی آنکھوں کی سچائی اور پرکھ کو آزمانے کے لئے کائنات کی اعلیٰ ترین کتاب قرآن کریم سے مدد لے کر نکاح کو منسوخ کر دیا تھا اور دیکھ لو کہ قرآن کریم نے بھی شمسہ کی پاکیزگی کی گواہی اس طرح دی کہ ثابت ہو گیا علی میری روشنی کے قابل ہی نہ تھا۔'' مراد

خان کی باتیں بہت گہری تھیں پھر بھی صہیب احمد سمجھتا ہوا بولا۔

''لیکن مما تو قرآن کی قسم کھا چکی ہیں۔''

''اگر یہی قسم فواز احمد قرآن کریم ہاتھ میں لے کر کھائے اور کہے کہ وہ بے گناہ تھا تو میرے بچے اس دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے فواز احمد کے سوا جو میری روشنی کو خوش رکھ سکے۔''

روشنی نے مراد خان کی طرف دیکھا تو وہ پھر بولے۔

''میں اپنی غلطی اور ہٹ دھرمی سے طیبہ کو کھو چکا ہوں...... اب میں پھر غلطی کر کے اپنی دوسری بیٹی روشنی کو نہیں کھونا چاہتا۔''

''لیکن بابا جان! ہم فواز احمد کو یہاں کیسے لائیں گے حالانکہ ابھی تک وہ مجرم ہی ہے۔'' صہیب احمد بولا تو مراد خان کہنے لگے۔

''میں اس کے گھر جاؤں گا اسے لینے کے لئے۔'' صہیب احمد اور مراد دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جبکہ روشنی باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تم فکر نہ کرو۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ فواز احمد تمہیں پیار کرتا ہے؟'' مراد خان نے روشنی سے پوچھا تو وہ خوشگوار حیرت کے ساتھ باپ کی طرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تو مراد خان دوبارہ بولے۔

''اور تم بھی؟'' مختصر سے سوال کا جواب اثبات میں سر ہلانے کے سوا روشنی زبان سے نہ دے سکی۔

''تو پھر دعا کرو کہ فواز احمد بے گناہ ہو۔'' مراد خان نے روشنی سے کہا اور اس کو کمرے سے باہر لے آئے تو گاڑیاں جا چکی تھیں۔ مہمان جا چکے تھے لیکن روشنی ابھی تک سہمی ہوئی بیڈ کی چادر میں لپٹی ہوئی تھیں'' تم جاؤ اور جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو۔ وہ بے غیرت جا چکے ہیں۔'' مراد خان نے روشنی سے کہا اور صہیب احمد کو اشارہ کیا کہ وہ اس کو اس کے کمرے تک چھوڑ آئے۔

فجر کی اذان ہو رہی تھیں گھر کے سبھی مکین جاگ رہے تھے۔ مراد خان نے وضو کر کے نماز ادا کی روشنی نے بھی اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اس کا شکر ادا کیا اور آنسوؤں کے نذرانے بہا بہا کر فواز احمد کی بے گناہی کی دعائیں کیں۔ وہ جائے نماز پر سجدہ ریز ہو کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کرتی ہوئی اس وحدہ لاشریک سے التجائیں اور دعائیں مانگنے لگی۔

مراد خان نے قرآن کریم کو آنکھوں سے بوسہ دیا اور کھول کر اپنے سامنے رکھ لیا اور اللہ تعالیٰ سے یوں درخواست کرنے لگا۔

''میرے پاک پروردگار! کل کائنات تیری رحمت اور فضل و کرم کی محتاج ہے۔ میرے اللہ! میں بھی تیرا حقیر اور پر تقصیر بندہ تیری پاک بارگاہ میں تجھ سے ہاتھ جوڑ کر اس مقدس کتاب کا واسطہ دے کر تجھ سے اپنے چھوٹے بڑے گناہوں پر معافی مانگتا ہوں۔ میرے مالک! میری بیٹی طیبہ کی آبرو کی حفاظت فرمانا۔ میں ساری زندگی اس بچی کے لئے کچھ نہیں کر سکا...... اب بھی میں بے بس اور لاچار ہوں۔ میرے اللہ میں اس بیٹی کے لئے تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ میری بیٹی کو اپنی حفظ و امان میں پناہ نصیب فرمانا۔ میرے اللہ! جس طرح تو نے میری بیٹی روشنی کی آبرو محفوظ

فرمائی ہے اسی طرح طیبہ پر بھی اپنا فضل و کرم فرماتے ہوئے اسے بحفاظت واپس اپنے گھر اس کے والدین کے پاس پہنچا دے۔''

مراد خان کی سسکیاں اور آنسو قرآن کریم کے مقدس اوراق کو تر کرنے لگے تھے۔

''میرے اللہ! میں بے بس ہوں اس مقدس قرآنِ کریم کے صدقے تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے روشنی کے متعلق بہتر فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرما اور جو بھی سچائی ہے اپنے فضل و کرم کا صدقہ اس کتاب کا وسیلہ ہم سب کے سامنے لے آ میرے مالک! ہم کو دکھا دے کہ سچ کیا ہے؟''

مراد خان کی آہیں اور التجائیں عرش بریں کے مالک تک پہنچ گئی تھیں کہ ادھر روشنی کو یاد آ گیا کہ جو ڈرائیور فواز احمد کو چھوڑنے گیا تھا اس نے واپسی پر روشنی کو سب سے چوری ایک گفٹ پیک دیا تھا۔ وہ روشنی کے پاس محفوظ تھا۔ اس نے جائے نماز سے اٹھ کر الماری سے وہ گفٹ پیک نکالا جس پر چمکدار کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ روشنی نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ کاغذ کھولنا شروع کر دیا تو آنکھوں سے بہنے والے آنسو بھی تھم گئے کہ دیکھیں بھلا اس میں کیا ہے۔ دھڑکنیں خاموش اور سانسیں باوضو تھیں کہ کاغذ کے اندر سے ایک چھوٹا قرآنِ کریم نکلا جو کہ خوبصورت طباعت اور بہترین جلد کی وجہ سے دل میں اترتا گیا۔ روشنی کو سمجھ نہ آ سکی کہ فواز احمد نے یہ قرآن کریم اسے کیوں بھیجا ہے۔ اس نے قرآن کریم کو ہونٹوں سے چومتے ہوئے آنکھوں سے لگایا تو پہلے ہی صفحہ پر ایک کاغذ کا ٹکڑا مل گیا جس پر جلدی جلدی میں کچھ تحریر کیا گیا تھا اور وہ ہینڈ رائٹنگ فواز احمد کی تھی جس سے روشنی بخوبی آشنا تھی۔

''پیاری روشنی! میرے پاس یہی ایک طریقہ ہے کہ میں اپنی پاکیزگی اور بے گناہی ثابت کر سکوں۔ میں اس کتاب کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آنٹی صبا کے معاملے میں بے گناہ اور بے قصور ہوں وہ گناہ پر اکسانے کے لئے کئی بار میرے کمرے میں آ چکی تھیں اور آج بھی ان کا یہی ارادہ تھا لیکن میں ان کی چال کا شکار بنتا ہوا ان کے کمرے تک پہنچا ہی تھا کہ ان کی چالاکی کام دکھا گئی۔ گناہ اور اپنی خواہشات کی ناکامی پر انہوں نے مجھ سے انتقام لینے کے لئے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ میرے لئے بھی شرمندگی اور ندامت کا باعث ہے کیونکہ وہ تمہاری اور صہیب کی ماں ہیں تو میں نے بھی آج تک انہیں اپنی ماں ہی سمجھا ہے۔ مجھے اس قرآن کریم کی قسم ہے اور میں اللہ کو حاضر ناظر جان کر اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ اگر میں نے ان کی طرف کبھی غلط نگاہ سے دیکھا بھی ہو تو خدا تعالیٰ مجھے اندھا کر دے۔ میں نے کہا تھا نا کہ میرا عشق ادھورا رہ جائے گا...... دیکھ لو رہ گیا نا؟ فقط فواز احمد''

روشنی خط کو بار بار چوم رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فواز احمد کو ہر گناہ سے باعزت بری کر دیا تھا۔ وہ اٹھی اور خط کو قرآن کریم میں رکھا اور صہیب احمد کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا دروازہ کھلنے پر اس نے کہا کہ جلدی سے بابا جان کے کمرے میں پہنچو۔ وہ حیران و پریشان صہیب احمد کو چھوڑ کر مراد خان کے کمرے کی طرف گئی تو ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر دروازہ کھلا ہی ملا تھا۔

مراد خان جائے نماز پر قرآنِ کریم ہاتھوں میں لئے آنکھوں سے برسات جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان کو روشنی کے آنے کی خبر نہ ہو سکی تھی۔ اتنی دیر میں صہیب احمد بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ استفہامیہ انداز میں روشنی کی طرف دیکھتا ہوا اشارے سے پوچھنے لگا تو روشنی کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکان اور چہرے پر بکھری ہوئی فتح کی روشنی نے روشنی کو تر و

تازہ پھول کی مانند کر دیا تھا۔

''بابا جان!'' روشنی دوزانو بیٹھ گئی تو مراد خان نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تو روشنی نے ان کی روئی ہوئی سرخ خون آلود آنکھیں دیکھ کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

''بابا جان! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے نا کہ وہ سچ اور جھوٹ کا نتارہ کر دے؟'' روشنی ان کی طرف دیکھتی ہوئی بولی تو مراد خان حیرت سے اس کی طرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے۔ ''تو بابا جان! اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا سن لی ہے۔'' روشنی نے بتایا کہ جب ڈرائیور فواز احمد کو چھوڑ کر آیا تھا تو اس نے راستے میں کتابوں کی دُکان پر رک کر ایک گفٹ پیک کروایا اور وہ گفٹ روشنی تک پہنچانے کی قسم لی تھی۔ ڈرائیور نے وہ گفٹ روشنی تک پہنچایا تو اس نے بھی فواز احمد کو مجرم گردانتے ہوئے اس گفٹ پیک کو کھولے اور دیکھے بغیر ہی اپنی الماری میں رکھ لیا تھا۔ آج رات علی کی طرف سے اس کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کے بعد روشنی کو وہ گفٹ یاد آیا تو اس نے کھول کر دیکھا تو وہ گفٹ یہ تھا۔

روشنی نے وہ چھوٹا قرآن کریم مراد خان کی طرف بڑھا دیا تو وہ حیرت سے قرآن کریم کو دیکھنے لگا اور صہیب احمد بھی دوزانو بیٹھ گیا تو قرآن کریم کو کھول کر دیکھا تو اندر ایک تہہ کیا ہوا پرچہ بھی تھا۔ مراد خان نے وہ پرچہ حیرت سے کھولا اور سرسری نظر ڈالتے ہوئے صہیب احمد کی طرف بڑھا دیا اور بولے۔ ''تم پڑھو اور مجھے بھی سناؤ۔''

صہیب احمد اس ڈرامائی اور فلمی صورت حال کو حیرت زدہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے وہ پرچہ پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ جوں جوں پڑھتا جاتا تھا اس کی آنکھیں نم ہوئی جاتی تھیں اور مراد خان کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔

صہیب احمد نے خط پڑھنا ختم کیا تو اس کی آنکھیں بری طرح نم تھیں اس کو یہی بات کھائے جا رہی تھی کہ اس کی ماں کو فواز احمد نے بھی اپنی ماں ہی سمجھا تھا جبکہ صبا بیگم نے اس کو اپنے جذبات کی تسکین کے لئے کئی بار اپنے اور گھٹیا طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔

مراد خان اور صہیب احمد کے ساتھ ساتھ فواز احمد ان کو عظمت کی بلندیوں پر نظر آنے لگا تھا۔ قرآن کریم کو ہاتھوں میں پکڑ کر اس کی قسم کھانا کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہوتی۔ صبا بیگم نے قرآن کریم کی جھوٹی قسم کھا کر فواز احمد پر اپنے گناہ تھوپنے کی کوشش کی تھی۔

مراد خان نے روشنی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور بولے۔

''میں فواز احمد کو ڈھونڈوں گا۔ میں اسے عزت واحترام سے اس گھر میں لاؤں گا۔ میں اس کے پیر پکڑ کر معافی مانگوں گا۔'' مراد خان نے روشنی کی پیشانی پر بوسہ دیا تو تینوں کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ مراد خان آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

''بے شک میرا پروردگار بڑی عظمت اور بزرگی والا ہے۔ اس نے چند گھنٹوں میں ہی مجھے میری اوقات دکھا دی۔ میرا اپنا ہی برتن جھوٹا اور کھوٹا ہے...... دیکھو کہ فواز احمد کی سچائی رب نے ثابت کرنے کے لئے میرے گھر میں اپنی مقدس اور پاک کتاب کو اس طرح بھیجا کہ خود خدا بھی فواز احمد کی سچائی کا گواہ بن گیا ہے۔''

مراد خان نے صہیب احمد سے کہنا شروع کیا۔ ''تم پتہ چلاؤ کہ فواز احمد کی ماں کون ہے۔ اس کا باپ کیا کام کرتا ہے۔ ہم اس کے ماں باپ کے پاس جا کر ان سے معافی مانگیں گے۔ تم لوگ دیکھو کہ فواز احمد کی گواہی قرآن کریم نے کس شاندار انداز میں دی ہے۔''

''بابا جان! جہاں تک میں جانتا ہوں اس کے والدین اس دنیا میں نہیں ہیں وہ تنہا ہے اور ناول وغیرہ لکھ کر ہی اپنا گزارہ کرتا ہے۔'' صہیب احمد نے بتایا۔

''میری بیٹی اس کے گھر میں خوش تو رہے گی نا؟'' مراد خان نے روشنی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر نظریں جھکاتی ہوئی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

''ہم ایسا کرتے ہیں کہ سبھی لوگ اسلام آباد والے گھر میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔'' صہیب احمد نے تجویز دینا شروع کی۔ ''ہم وہاں جا کر فواز احمد کو ڈھونڈ کر اس کو منا بھی لیں گے اور...'' وہ جان بوجھ کر ہی خاموش ہوا تو مراد خان تھوڑا سا جھکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولے۔

''اور...... اور کیا بھئی؟'' ان کا موڈ کافی بہتر ہو گیا تھا۔

''اور بابا جان...... طیبہ آپی کو بھی مل کر ڈھونڈنے کی پوری کوشش کریں گے۔'' مراد خان کو یک دم اداسی کا جھٹکا لگا تو وہ قرآن کریم کو بوسہ دیتے ہوئے بولے۔

''تم دیکھنا ان شاء اللہ میرا رب مجھے اس کڑی آزمائش میں بھی باعزت سرخرو کرے گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے ہم لوگ کل ہی اسلام آباد شفٹ ہو جاتے ہیں۔'' صہیب احمد نے کہا تو روشنی اس کو چھیڑتے ہوئے بولی۔

''اور بابا جان میں بھابی کو بھی دیکھ لوں گی۔''

صہیب احمد نے اس کی چٹیا پکڑ کر پیار سے کھینچی تو مراد خان بولے۔

''دعا کرو کہ طیبہ باعزت اور خیر و خیریت سے ارباب اور شمسہ کے پاس پہنچ جائے...... صہیب احمد کے لئے یہی ایک راستہ ہے کہ وہ اس گھر کا داماد بن سکتا ہے۔''

''میرے جذبوں میں سچائی ہے بابا جان! آپ دیکھنا کہ میں طیبہ آپی کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور ریبا ضرور میری ہو گی۔''

''یہ ریبا کون ہے بھائی؟'' روشنی نے پھر چھیڑا تو مراد خان تصدیق کرنے کے لئے صہیب احمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ شمسہ کی چھوٹی بیٹی ہے اور تمہارے بھائی کی پسند ہے، کیوں بھئی؟''

''صہیب احمد نے شرما کر سر جھکا لیا تو ایک ملازم چیخنے چلانے والے انداز میں کمرے میں داخل ہوا۔

''صاحب جی...... صاحب جی...... وہ بی بی...... بیگم صاحبہ...... میرا مطلب ہے بیگم صاحبہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔''

وہ تینوں کی پریشانی کے عالم میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''کون بیگم صاحبہ! کس کی بات کر رہے ہو؟'' صہیب احمد غصہ سے بولا۔ ''تو ملازم سہمے ہوئے انداز میں کہنے

لگا۔

''وہ جی بڑی بیگم صاحبہ نے اپنے کمرے سے مسلسل میرے کوارٹر کی بیل بجانا شروع کی تو میں پریشانی سے بھاگا ہوا ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ بے ہوش تھیں اور ان کا چہرہ...... آپ خود چلیں جی۔'' ملازم یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔صہیب احمد بھاگتا ہوا وہاں سے نکل کر صبا بیگم کے کمرے کی جانب چلا گیا۔

مراد خان نے قرآن کریم کو آنکھوں سے لگا کر طاق میں رکھا تو روشنی بھی کمرے سے نکل چکی تھی۔ وہ بھی چلتے ہوئے وہاں پہنچے تو صبا بیگم کی حالت دیکھ کر حیران اور پریشان رہ گئے۔صبا بیگم کو روشنی اور صہیب احمد نے بیڈ پر لٹا دیا تھا لیکن اس کا چہرہ ٹیڑھا ہو گیا تھا۔اس کے ہونٹ اپنی جگہ سے ایک طرف کو کھسک گئے۔یوں لگتا تھا کہ اندر سے جبڑے اپنی جگہ چھوڑ گئے ہیں۔اس کا ایک ہاتھ بھی ٹیڑھا ہو گیا تھا۔

مراد خان اور صہیب احمد خوفزدہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے جبکہ روشنی آنسو بہا رہی تھی۔''ڈاکٹر کو فون کرو صہیب احمد!''

''بابا جان! ہمیں ہسپتال چلنا چاہیے۔''صہیب احمد نے کہا اور تھوڑی ہی دیر بعد ایمبولینس صبا بیگم کو لے کر ہسپتال کی طرف اپنے دلدوز ہوٹر بجاتی ہوئی سڑکوں پر رواں دواں ہو گئی تھی۔

دن کا اجالا پھیل گیا تھا، رات بھر علی نے جو اپنی مذموم حرکت سے اس گھر کا چین تباہ کیا تھا اس کا سلسلہ ابھی تک بھی جاری تھا۔بس ایک خوشی کی خبر یہی تھی کہ فواز احمد بے گناہ اور معصوم تھا جبکہ قرآنِ کریم کا فیصلہ صبا بیگم پر بھی تو لاگو ہونا تھا اس فیصلے کو سننے کے لئے گھر میں روشنی اور زبیدہ آپا بے چین تھیں۔

''کوئی تین گھنٹوں کے جان لیوا انتظار کے بعد صہیب احمد کی کال نے روشنی کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔روشنی نے کال ریسیو کی تو صہیب احمد کی آنسوؤں بھری آواز اس کے کانوں میں زہر گھولنے لگی۔

''روشنی! مما کو فالج کا اٹیک ہو گیا ہے اور ساتھ ہی ہارٹ اٹیک بھی ہے۔''اس کے بعد صہیب احمد خاموش ہوا تو روشنی بولی۔''بھائی پلیز جلدی بتائیں نا ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟''

''اب ان کو کوئی بھی بیماری تنگ نہیں کر سکے گی۔ہم مما کو لے کر گھر آرہے ہیں۔'' کال ختم ہو گئی لیکن روشنی سمجھ گئی کہ الفاظ کو ہیر پھیر کر کے صہیب احمد نے صبا بیگم کی موت کی خبر سنائی ہے۔

O......✤......O

ہوا یوں تھا کہ جیسے ہی صبا بیگم کو لے کر ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹرز نے ایمرجنسی میں کافی اچھی دیکھ بھال کے بعد انہیں بتایا کہ ان کو فالج کا حملہ ہوا ہے جو منہ کے جبڑے کو متاثر کرتا ہوا بائیں بازو اور ہاتھ کو بھی کافی متاثر کر گیا ہے۔

صہیب احمد اور مراد خان کافی پریشان دکھائی دے رہے تھے۔وہ صبا بیگم کے پاس ان کے سرہانے کھڑے تھے۔

صہیب احمد نے صبا بیگم کو مہمانوں کے ساتھ نہ جانے دیا تھا اس کا خیال تھا کہ مراد خان اس وقت کافی غصے اور اشتعال میں تھے پھر وہ خود ہی معاملہ نپٹا لے گا لیکن ابھی ایک رات بھی نہ گزری تھی کہ صبا بیگم قدرتی آفت کا شکار ہو گئی تھی۔اس کے بدن میں حرکت ہوئی تو مراد خان متوجہ ہو گئے وہ منہ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن الفاظ اس کی زبان کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔مراد خان نے اپنا کان اس کے منہ کے پاس کیا تو صہیب احمد بھی غور سے صبا بیگم کی بات

سننے کی کوشش کرنے لگا جو کہہ رہی تھی۔

"مم...... مم...... مجھے...... معاف...... کر...... دو......" اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر بائیں ہاتھ پر رکھنے کی کوشش کی تو صہیب احمد سمجھ گیا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا چاہتی ہے مراد خان بھی سمجھتا ہوا بولا۔ "میں نے تمہاری ہر غلطی کو درگزر کرتے ہوئے تمہیں معاف کرنے کا کئی بار سوچا ہے لیکن اس بار صبا بیگم! معاملہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

وہ رونے لگی۔ ندامت اور پچھتاوے کے آنسوؤں کا رنگ بھی وہی ہوتا ہے جو خوشی کے آنسوؤں کا ہوتا ہے لیکن انداز اور وقت ظاہر کرتا ہے کہ آنسوؤں کو کس رنگ کا سمجھا جائے۔ یہی بات سمجھتے ہوئے تو صہیب احمد بولا۔

"بابا جان! آپ مما کو معاف کر دیں، انہیں اپنی غلطی کا احساس ہے۔"

"صہیب احمد!" مراد خان دکھ سے بولے۔ "میں شرابی تھا لیکن میں نے کبھی بھی زنا کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کبھی ایسا سوچا لیکن جب سے یہ عورت میرے گھر میں آئی میں نے شراب پینا بھی چھوڑ دیا کہ شاید یہ اپنی بری سوسائٹی اور گندے ماحول کو تبدیل کر لے۔ میں آنکھیں بند کر کے اس کی ہر حرکت پر نظر رکھتا تھا۔ اس کا کلبوں میں جانا، عریاں لباس پہننا اور شراب پی کر نوجوانوں کے ساتھ ناچنا اور فحش حرکات کرنا...... میں نے صرف تم دونوں کی خاطر برداشت کیا......" مراد خان کی آنکھیں پہلے ہی کافی رو چکی تھیں لیکن پھر بھی ساون کی طرح برسنے لگیں۔

"اس عورت کو قسم دے کر پوچھو کہ میں نے کبھی بھی اس کے کسی بھی من پسند کام میں دخل نہیں دیا لیکن اس نے فواز احمد کے ساتھ جو بھی کیا...... کیا تم نہیں سمجھتے کہ یہ اسی کا صبر اور قرآن کریم کی وہ قسم کا نتیجہ ہے جو اس نے جھوٹی کھائی ہے۔" انہوں نے صبا بیگم کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر تکلف بڑھتی جا رہی تھی وہ اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کرتی ہوئی پھر بولی۔

"معاف...... معافی...... دے دو...... اللہ...... معافی......" اس کی حالت پر صہیب احمد کو ترس آنے لگا تھا وہ بھی ماں کو اس تکلیف میں دیکھ کر روتا ہوا بولا۔

"بابا جان! پلیز...... آپ مما کو معاف کر دیں...... پلیز بابا جان! اللہ تعالیٰ نے بھی معافی کو پسند کیا ہے۔"

"میں نے اس کو معاف کیا صہیب احمد معاف کیا۔" مراد خان نے روتے ہوئے کہا تو صبا بیگم کے چہرے پر کچھ سکون نمودار ہو گیا لیکن پھر یک دم اس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہونے لگی۔

صہیب احمد اس کی حالت کو دیکھتا ہوا باہر کی جانب بھاگا وہ ڈاکٹر کو لینے گیا تھا لیکن صبا بیگم نے مراد خان کی طرف دیکھتے ہوئے آخری ہچکی لی اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ مراد خان کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر ان کے گالوں پر بہہ گئے۔ صہیب احمد ڈاکٹر کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو مراد خان صبا بیگم کی آنکھیں اپنے ہاتھوں سے بند کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اسٹیتھوسکوپ لگایا اور مایوسی کے عالم میں نفی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ "آئی ایم سوری، شی از ایکسپائر۔"

صہیب احمد گنگ کھڑا تھا۔ مراد خان نے آگے بڑھ کر اس کو سینے سے لگایا تو دونوں کی آنکھیں چھلکنے لگیں تھوڑی دیر بعد ہی اس نے گھر میں روشنی کو اطلاع دے دی کہ صبا بیگم کی موت واقع ہو گئی ہے۔ میت گھر پہنچنے پر روشنی کی آہ و

بکا سے گھر لرزنے لگا تھا۔ زبیدہ آپا بھی نم دیدہ آنکھوں سے صبا بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے روشنی کو دلاسہ اور حوصلے کی تلقین کر رہی تھیں۔

مراد خان اور صہیب احمد نے اپنے اپنے جاننے والوں کو موبائل پر اطلاع دینا شروع کر دی تھیں اور جو مہمان لندن کے لئے روانہ ہوئے تھے وہ ابھی ائیر پورٹ پر ہی تھے۔ علی کے علاوہ سب لوگ واپس پہنچ گئے تو صبا بیگم کو شام کے وقت دفنا دیا گیا۔

گھر میں اداسی کی گہری ردا اوڑھ کر غم نے بسیرا کر لیا تھا۔ روشنی کو شاید خوشی راس نہ آئی تھی۔ اگر فواز احمد بے گناہ قرار پایا تھا تو قدرت نے اس کا سب سے بڑا رشتہ چھین لیا تھا۔ صبا بیگم کو اس طرح مجرم قرار دے کر تقدیر نے زندگی سے بری کر دیا تھا کہ اب وہ اپنی بیٹی کے سامنے شرمندہ ہو کر زندگی نہ گزار سکتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ صادر فرماتے ہوئے بتا دیا تھا کہ میری سچی کتاب جھوٹی قسمیں کھانے کے لئے نہیں ہے۔ صرف عمل کرنے کے لئے ہے اور ہر مرض کی شفا پانے کے لئے ہے کیونکہ یہ قرآن حکیم ہے کوئی عام کتاب نہیں ہے۔

○......❖......○

ارباب احمد نے تصور خان کی بات توجہ سے سنی اور موبائل آف کر دیا تو احمد فراز نے پوچھا۔

''کیا کہہ رہا تھا انکل؟''

''وہ انڈیا جا رہا ہے طیبہ کو ڈھونڈنے کے لئے۔'' ان کی بات سن کر شمسہ بیگم بھی حیران رہ گئیں۔

''انڈیا؟'' احمد فراز حیرانگی سے بولا تو ارباب احمد آہ بھرتے ہوئے کہنے لگے۔

''انڈیا میں انسانوں کی سب سے بڑی منڈی لگتی ہے۔'' ان کا دکھ ان کی آنکھوں میں چھلکنے لگا تو وہ آنسو پیتے ہوئے بولے۔ ''وہاں کے دلال نے بتایا ہے کہ ایسے حلئے اور صورت والی لڑکی کو دیکھا گیا ہے۔''

''یہ میری زبان کے بول ہیں جو میرے آگے آئے ہیں۔'' شمسہ بیگم کی سسکیاں ابھرنے لگی تھیں وہ بولیں۔ ''میں نے مراد خان کو غصے میں کہا تھا کہ میں تمہاری بیٹی کو دنیا کی سب سے بڑی منڈی میں فروخت کرنے کے لئے اس کی بولی لگواؤں گی۔'' شمسہ بیگم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں آنسوؤں کی رم جھم میں یہ بات بتائی تو احمد فراز ان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا لیکن دولت بی بی بول پڑیں۔

''سارے دن میں ایک گھڑی ایسی بھی ہوتی ہے جس میں ہر ''چندری بات'' پوری ہو جاتی ہے۔'' دولت بی بی کی بات سن کر وہ لوگ اور بھی پریشان ہو گئے تھے۔ ''خدا تعالیٰ سے اپنے ہر بول اور غلطی کی دل سے معافی مانگو...... اللہ کرے میری بچی صحیح سلامت ہو۔'' ان کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ ملازم نے آ کر بتایا کہ کچھ مہمان ان سے ملنا چاہتے ہیں اور ارباب احمد نے اس سے کہا کہ ان کو ڈرائنگ روم میں بٹاؤ ہم ابھی آتے ہیں۔ ملازم کے جانے کے بعد ارباب احمد بولے۔

''اماں آپ جائیں اور دیکھیں کہ کون ہے۔'' وہ دولت بی بی سے مخاطب ہوئے۔ ''اگر کوئی رشتہ دار ہو تو اسے ٹرخا دیں۔ میں کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ اس وقت جس کمرے میں بیٹھے تھے وہ ڈرائنگ روم سے ملحقہ

تھا۔ اس سے پہلے کہ دولت بی بی کمرے سے باہر جاتیں تو اندر داخل ہونے والے مراد خان کو دیکھ کر وہ سب ہکے بکے رہ گئے۔ وہ بلا دستک دیئے ان کے گھر آیا تھا اور اس کمرے تک پہنچا تھا۔

''تم؟'' ارباب احمد اس کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔ ''تم یہاں؟ کیسے جرأت کی تم نے یہاں تک آنے کی؟'' لیکن وہ اور شمسہ سمیت سب حیران رہ گئے جب مراد خان کچھ نہ بولا تو آنکھیں بولنے لگیں۔ رم جھم برسات نے پیہم بارش کی شکل اختیار کی تو روشنی اور صہیب احمد بھی مراد خان کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔ شمسہ بیگم کی حیرانگی اور بھی بڑھ گئی۔ جب انہوں نے وہیل چیئر پر زبیدہ آپا کو بھی اندر آتے دیکھا۔ ''میں یار مار ہوں ارباب احمد!'' مراد خان نے کہنا شروع کیا تو ان کی آواز پھٹنے لگی حلق میں ایک گولہ سا آ رک پھنس گیا تھا۔ ''میں وہ مجرم ہوں جسے معافی کا لفظ ادا کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔'' وہ آگے بڑھ کر دوزانو ہو کر ارباب احمد اور شمسہ کے قدموں میں گر گیا تو ارباب اور شمسہ بیگم تڑپ کر اٹھے اور ارباب احمد بولا۔ ''مراد خان! یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

''ارباب احمد!'' مراد خان ہاتھ جوڑتے ہوئے بولے۔ ''میں نے دوستی کو دغا دیا میں نے محبت کو جھوٹا سمجھا میں نے طاقت اور دولت کے بل بوتے پر تمہیں اپنا دشمن سمجھ لیا اور گھر سے نکال دیا۔'' مراد خان نے اب باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے دولت بی بی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور بولے۔

''ماں جی! آپ ارباب احمد سے کہئے کہ مجھے معاف کر دے۔'' وہ زار و زار رونے لگے تھے۔ دولت بی بی جہاندیدہ عورت تھیں وہ جان گئیں کہ مراد خان کوئی بہت بڑی چوٹ کھا کر واپس لوٹا ہے اور اس کی آنکھوں میں سچائی اور ندامت کے پانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے مراد خان کو اپنے قدموں سے اٹھایا تو وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہو کہنے لگے۔

''ماں جی! اگر آج میری ماں زندہ ہوتی تو یقیناً میری حرکتوں پر مجھے جوتیاں مارتی...... میں نے بہت ہی غلط کام کئے ہیں۔ میں نے وفا کی دیوی شمسہ پر جتنے بھی ظلم کئے ہیں وہ سب تقدیر باری باری مجھے لوٹا رہی ہے لیکن ماں جی میں تقدیر کے وہ تاوان ادا نہیں کر سکتا جو وہ مجھ سے لینا چاہتی ہے۔''

مراد خان کی آنکھوں نے سب کو رلا دیا تھا۔ دولت بی بی نرم دل خاتون تھیں اور ان کے رونے کو دیکھ کر اور آہ و بکا سن کر ریا اور عدیم بھی آ گئے تھے۔ ریا صہیب احمد کو دیکھ کر حیران تھی جبکہ شمسہ بیگم اور ارباب احمد پریشان تھے۔

''ارباب احمد!'' دولت بی بی ارباب احمد سے مخاطب ہوئیں تو وہ نظریں جھکائے ماں کے حکم کی تعمیل میں ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولے۔ ''جی!'' ان کی مختصر ''جی'' اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ بھی اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔

''اگر کوئی گھر میں چل کر معافی مانگنے آتا ہے تو وہ اپنا آپ گنوا کر آتا ہے۔'' ارباب احمد ان کی بات سمجھتے ہوئے بولے۔ ''لیکن ماں جی! میری طیبہ؟'' ان کی بھرائی ہوئی آواز نے شمسہ کو اور رلا دیا تھا۔

''مجھے اپنے ان بچوں کی قسم ہے ارباب احمد!'' مراد خان نے فوراً روشنی اور صہیب احمد کے سروں پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں طیبہ کے اغوا میں کسی طرح بھی شریک نہیں ہوں۔ خدا کی قسم...... میرے بس میں ہو یا مجھے علم ہو تو اپنی کل جائیداد کا تاوان ادا کر کے بھی طیبہ کو لے آؤں۔ ارباب احمد! میرا یقین کرو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

ارباب احمد نے شمسہ بیگم کی طرف دیکھا جن کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ روشنی آگے بڑھتی ہوئی بولی۔ ''انکل آنٹی! اگر آپ کو بابا جان پر اعتبار نہیں ہے تو پھر آپ مجھے گروی رکھ لیں۔ طیبہ آپی کے گھر پہنچنے تک میں آپ کی غلامی کروں گی۔'' اس کی بات نے ان سب کو رلا دیا تھا۔ شمسہ نے حیرت انگیز طور پر روشنی کو اپنے سینے کے ساتھ لگا کر بھینچ لیا تھا۔ آنسوؤں کی جھڑی میں دلوں کو کشادہ کر لیا گیا تھا۔ مراد خان کو ارباب احمد نے سینے سے لگایا تو دونوں دوست ہی دِل کھول کر روئے تھے۔

''مراد خان ہاتھ جوڑتے ہوئے شمسہ کی جانب بڑھے اور بولے۔

''شمسہ! تم واقعی عظیم ہو اور میں ہی تمہاری قدر نہیں کر سکا لیکن تمہاری سچی محبت کی جیت میں میرا بہت بڑا ہاتھ ہے اور آج انہی ہاتھوں کو جوڑ کر تم سے اپنے تمام گناہوں کی معافی مانگتا ہوں۔'' مراد خان نے شمسہ کی جانب اپنے ہاتھ بڑھائے تو وہ نظریں جھکا کر رہ گئیں۔ ''مجھے طیبہ کا صدقہ ہی معاف کر دو۔'' شمسہ تڑپ کر بولی۔ ''مجھے مزید شرمندہ نہ کریں۔ میں نے اپنی بیٹی کے صدقے سب کو معاف کیا۔ سب کو معاف کیا۔'' ان کا اشارہ زبیدہ بی بی کی طرف بھی تھا۔

''انکل! ہم مل کر طیبہ آپی کو ڈھونڈیں گے۔'' صہیب احمد نے کہا تو احمد فراز نے اس کو گلے لگا لیا۔ ریبا کی آنکھیں بھی خوشی سے جلنے لگی تھیں۔

زبیدہ بی بی نے دولت بی بی سے معافی مانگی تو انہوں نے کھلے دل سے کہا کہ آپ تو میری بہن ہو اور بہنیں ایسا نہیں کیا کرتیں۔

اداسی اور غم کے کہر نے آہستہ آہستہ چھٹنا شروع کر دیا تھا۔ سب لوگ ڈرائنگ روم میں اکٹھے ہوئے تو ارباب احمد نے ملازم کو کھانا لگانے کا کہا تو مراد خان نے صبا بیگم کی المناک موت کا تذکرہ چھیڑ دیا لیکن وہ فواز احمد والی تمام باتیں حذف کر گئے تھے۔

شمسہ بیگم اور ارباب احمد کے ساتھ ساتھ سب نے ہی صبا بیگم کی موت پر افسوس کا اظہار کیا تو مراد خان نے کھلے دل سے تسلیم کیا کہ یہ تقدیر کی طرف سے ایسا تھپیڑا تھا جس نے مراد خان کے منہ کو ایک ہی جھٹکے میں اتنا سرخ کر دیا تھا کہ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر پرانے دوست کی دوستی میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

ریبا اور روشنی کی تو تھوڑے ہی وقت میں اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ ارباب احمد عدیم کو بتانے لگے کہ ہم کس طرح بچپن سے ایک ہی سکول میں پڑھتے پڑھتے کالج اور پھر یونیورسٹی تک گئے تھے۔ مراد خان نالائق سٹوڈنٹ تھا اسی لئے ڈاکٹر نہ بن سکا تھا۔

ہلکے سے قہقہے کی بدولت گھر میں وقتی طور پر خوشیاں لوٹ آئی تھیں۔ اب طیبہ کو ڈھونڈنے کے لئے صہیب احمد اور احمد فراز کو اپنی پیشہ ورانہ صحافتی ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونا تھا اور وہ مراد خان اور ارباب کے بازو بن کر یہ کام کرنے کے لئے پرجوش اور پرامید بھی تھے۔

O......❖......O

پری نے حیرانگی سے طیبہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''ٹھیک ہے میں تمہیں موبائل فون دوں گی اور تم اپنے گھر

والوں کو اپنی یہاں موجودگی کی اطلاع کرو گی۔"
طیبہ نے اثبات میں سر ہلا دیا تو پری کے چہرے پر پھیلنے والی روشنی طیبہ سے چھپی نہ رہ سکی۔ پری باہر نکل گئی تو طیبہ سوچنے لگی کہ وہ سب سے پہلے عدیم کو کال کرے گی اور اسے بتائے گی کہ وہ کہاں ہے اور پھر اس کے ردعمل سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ طیبہ کو قصوروار سمجھتے ہیں یا بے گناہ سمجھتے ہوئے اس کو تلاش کر رہے ہیں۔ وہ فون والی بات انیل شرما سے نہ کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس نے پورے ایک کروڑ روپے دے کر اس کو خریدا تھا اور وہ بھلا کیسے چاہے گا کہ طیبہ یہاں سے واپس اپنے وطن یا اپنے گھر چلی جائے۔ اسی لئے اس نے پری کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تو پری فوراً مان گئی کیونکہ وہ بھی چاہتی تھی کہ طیبہ جتنی جلدی ہو سکے اس گھر سے چلی جائے اور انیل شرما اسی کا ہو کر رہ جائے۔

طیبہ نے جس طرح انیل کو اس کے عشق میں فنا دیکھا تھا اسے خود پر شرمندگی ہونے لگی تھی اور انیل کی ان حرکات پر غصہ بھی آنے لگا تھا کہ وہ انسان ہو کر انسان کی پوجا کرتا ہے۔ وہ انیل کو سدھار سکتی تھی لیکن اس کو اپنے گھر جانے کی جلدی اور لگن تھی اس نے اللہ تعالیٰ سے رو رو کر اپنے بڑے بولوں اور گناہوں کی معافی مانگی تھی۔ اسے یہ سکون تھا کہ وہ آج تک جتنی بھی گندگی میں رہی تھی اس کے اجلے دامن پر کوئی بھی ایسا داغ نہ تھا جو اس کے آنسوؤں سے نہ دھل سکتا ہو اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کی وحدانیت اور رحمٰن و رحیم ہونے کے واسطے اور اس کے پیارے محبوبؐ کے وسیلے دے دے کر اپنی معافی کی عرضی بارگاہ الٰہی میں پیش کر دی تھی۔ اب اس کا ذہن کافی حد تک پُرسکون اور ضمیر مطمئن تھا اسے قوی امید تھی کہ بہت جلد ہی وہ اپنے گھر والوں تک یا اس کے گھر والے اس تک پہنچ جائیں گے یہ عقیدہ اور اعتماد ہی مسلمان کی عبادت کی پہلی شرط ہے۔
انیل شرما اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں پھل فروٹ کے لفافے پکڑے ہوئے تھے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس نے گیت (طیبہ) کو دیکھا تو عقیدت سے پھل فروٹ والے شاپر ایک جگہ پر رکھتا ہوا بولا۔
"تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"
"ہے ایک تکلیف؟" طیبہ کی سچ بیانی پر وہ تڑپ اٹھا اور بولا۔
"کسی نے کچھ کہا ہے؟ مجھے بتاؤ میں اس کمرے میں اس کا داخلہ بند کر دوں گا۔"
"مجھے تم نے تکلیف دی ہے انیل!" طیبہ نے اس کی طرف دیکھا تو وہ کرب زدہ انداز میں طیبہ کی طرف دیکھ کر نگاہیں جھکاتا ہوا بولا۔ "میں نے؟"
"ہاں تم نے مجھے بہت تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے۔" طیبہ اسے سدھارنے کی ڈگر پر لا رہی تھی۔
"اگر میں نے تمہیں تکلف دی ہے تو پھر مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" وہ فوراً دروازے کی جانب لپکا تو طیبہ کو جیسے ہوش آ گیا وہ یک دم بولی۔
"رک جاؤ تمہیں میری قسم!" انیل شرما کے قدم تو جیسے زمین نے جکڑ لئے تھے لیکن طیبہ کی حاضر دماغی کام کر گئی تھی کیونکہ وہ چند ہی دنوں میں جان گئی تھی کہ انیل اس کے معاملے میں کتنا بڑا جذباتی ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔
"کہاں جا رہے تھے تم؟" طیبہ اس کے پاس پہنچی تو اس کی نگاہیں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اسی انداز میں بولا۔

''خود کو ختم کرنے۔''

''کیوں؟'' طیبہ حیرت سے بولی۔ ''اتنا بڑا قدم اٹھانے کا اس نے کیوں سوچ لیا تھا۔''

''میں نے برسوں جسے دل کے مندر میں بھگوان بنا کر پوجا ہو اور وہی بھگوان میری وجہ سے کسی بھی تکلیف میں مبتلا ہو تو پھر مجھے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' اس نے اس بار نظریں اٹھا کر طیبہ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔

''آپ رو کیوں رہی ہو؟'' اس نے جرأت اور ہمت کر کے اپنی انگلی کی پور سے طیبہ کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''بس یہی تکلیف ہے مجھے کہ تم جتنا مجھے چاہتے ہو اگر اللہ کی محبت میں ڈوب کر اسے چاہتے تو آج تم انیل شرما نہ ہوتے ایک ''ولی'' ہوتے۔''

''اللہ کی محبت؟'' وہ حیرت سے بولا تو لوہا گرم ہوتے ہوئے دیکھ کر طیبہ نے ایک بھرپور چوٹ لگائی۔ ''ہاں، اللہ تعالیٰ کی محبت...... مجھے یقین ہے کہ تمہارے اندر کہیں نہ کہیں ایسا عاشق چھپا بیٹھا ہے جو اللہ سے محبت کرتا ہے لیکن چور ہے...... اللہ سے ڈرتا بھی ہے۔ باہر نکل کر سامنے بھی نہیں آتا۔'' وہ خوفزدہ نظروں سے طیبہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

''لیکن میں اللہ سے محبت کیوں کروں گا؟''

''کیونکہ اللہ بھی تم سے محبت کرتا ہے۔'' ایک اور زوردار چوٹ گرم لوہے پر پڑی تو وہ اپنی ہیئت بدلنے لگا۔

''اللہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے؟'' وہ اور سہم گیا۔

''ہاں، اللہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔'' طیبہ اس کو ڈگر پر لانے میں کامیاب ہو رہی تھی۔

''لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے؟'' اس کی دلیل وزنی تھی۔ ''وہ تو مجھے کبھی بھی نظر نہیں آیا۔ میں نے تو اسے کبھی بھی نہیں دیکھا۔ وہ کون ہے، کہاں رہتا ہے؟''

انیل شرما کے چہرے سے خوف اور لہجے سے اعتماد چھلکتا دیکھ کر طیبہ بولی۔

''جو نظر نہیں آتا وہی تو اللہ ہے۔ عبادت کے لائق، واحد تنہا، لاشریک، ارض و سما کا مالک، وہ تمہیں ہر وقت دیکھتا ہے اس کی محبت کا ثبوت یہ ہے کہ وہ تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ تمہارے دل میں اس کا بسیرا ہے۔''

وہ حلق کو تھوک سے تر کرتا ہوا بولا۔ ''میں کیسے مان جاؤں کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔'' طیبہ کو واضح محسوس ہوا کہ انیل شرما پر خوف خدا طاری ہو رہا ہے۔ ''اس کی محبت کا کوئی بھی ثبوت دے دو...... میں مان جاؤں گا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

وہ اسے ہاتھ سے پکڑتی ہوئی کرسی پر بٹھا کر بولی۔ ''تم نے ایک لڑکی کو زندگی بھر دیکھا بھی نہیں اور نہ ہی کبھی اس کی تصویر دیکھی اور نہ ہی کبھی اس لڑکی نے تمہیں دیکھا لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کی محبت دیکھو کہ اس نے تمہارے خلوص اور جذبے کو دیکھتے ہوئے ان مجسموں کو زندگی میں بدل کر مجھے تمہارے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔''

وہ طیبہ کی دلیل پر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کچھ کچھ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اپنے دل کا چور باہر نکالتا ہوا بولا۔

''پتھر تو دوسرے لوگ بھی تراشتے ہیں۔ وہ بھی پتھروں کی پوجا کرتے ہیں۔ کیا اللہ ان سے بھی محبت کرتا ہے؟''

طیبہ پڑھی لکھی اور باشعور تھی اور ساتھ مسلمان ہونے کے ناطے اسے اسلامی طور پر کافی معلومات بھی تھیں اور پھر دولت بی بی جیسی مذہبی عورت نے اس کی تربیت کی تھی اور شمسہ جیسی صابر و شاکر عورت نے اس کی پرورش کی تھی قرآن کریم نے اس کے علم میں اضافہ کیا تھا اور اس کے سجدوں نے اسے اللہ تعالیٰ کے عشق کے قریب کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آج عشق کا تاوان ادا کرتی کرتی طوائفوں کے بازاروں میں ہوتی ہوئی انسانوں کی منڈی میں پہنچی تھی اور وہ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خامی کی وجہ سے بچ گئی تھی اور وہ خامی تھی کہ اسے ناچنا نہیں آتا تھا اور جسم فروش عورتیں اس کو جسم فروشی پر مجبور نہ کر سکی تھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خاص کرم نوازی اور عشق کی پاکیزگی نے اس کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھا تھا اور اس کی عزت کی سلامتی کے لئے جو دعائیں اس کے گھر والے مانگ رہے تھے وہ اس کو درندوں کے چنگل اور عزتوں کے لٹیروں کے چنگل سے بچا کر لے آئی تھیں اور اب اس پر انیل شرما کو اللہ کی وحدانیت سے متعارف کروانے کا جو سنہری موقع ملا تھا وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو اس ڈگر پر لانا چاہتی تھی کہ انسان اگر انسان کی پرستش شروع کر دے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ وہ غیر مسلم تو تھا ہی لیکن اس کو پیار اور محبت سے سمجھا کر کافر ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔

''وہ جن پتھروں کو تراشتے ہیں انہی کی عبادت کرتے ہیں لیکن ان پر اللہ مہربان کیوں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کئی پتھروں کو اپنا معبود سمجھتے ہیں۔ وہ پتھروں کو پوجنے میں بھی وحدانیت کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن تم نے جس ایک مجسمے کو تراشا ہے اسی کو چاہا ہے بس اللہ تعالیٰ کو تمہاری یہ چاہت پسند آ گئی ہے اور وہ تم سے محبت کرتا ہے۔''

''اور اگر میں بھی اللہ سے محبت کروں تو کیسے کروں۔ وہ تو مجھے نظر ہی نہیں آتا۔'' وہ بھولپن سے بہت ہی گہری بات کر گیا تھا یا پھر وہ بھی طیبہ کو آزما رہا تھا اس کا فیصلہ ابھی نہ ہوا تھا۔

''اگر تم غور کرو تو وہ تمہیں کائنات کے ہر ذرے میں محسوس ہو گا۔ دن کے بعد سیاہ رات اور سیاہ رات کی خوفناک تاریکی کے بعد سورج کو طلوع کرنا اور دن کا اجالا اس طرح پھیلانا کہ انسان کی ایجاد بھی اتنی روشنی نہیں کر سکتی جتنی سورج کروڑوں میل دور سے کرتا ہے۔ پھر چاند کا بڑھنا اور گھٹنا اور پھر ایک وقت پر پورا ہو جانا پھر گھٹتے گھٹتے اس طرح ہو جانا کہ یوں لگنے لگتا ہے جیسے کھجور کی پرانی شاخ ہو اور پھر تم زمین پر جو بیج بوتے ہو چند ماہ بعد اپنی مرضی کا جو اناج حاصل کرتے ہو وہ سب اسی کا مرہون منت ہے۔ ہوا، پانی، گیس اس کے حکم کی محتاج ہیں۔ اس کی نعمتوں کا اگر شمار کرنا چاہو تو تم تھک جاؤ۔ تمام درختوں کے قلم اور سمندروں کی سیاہی بھی بن جائے تو رب تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتی لیکن وہ ہر چیز پر قادر اور ہر شے کا حاکم ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہلتا۔ وہ اتنا طاقتور ہے کہ ''کن'' کہے تو پوری کائنات وجود میں آ جاتی ہے۔ ہم سب روزِ قیامت اسی کے حضور دوبارہ حاضر ہوں گے۔ وہ ہم سب کا حساب کرے گا۔''

طیبہ نے مسلمان ہونے کے ناطے اس کو بہت سی معلومات بہم پہنچانے کی کوشش میں اس کی آنکھیں کھول دی تھیں اور اس کا دل اور دماغ روشن ہو چکا تھا۔ وہ حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو کر طیبہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس

کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے اور آنکھیں سرخ ہونے لگیں تھیں۔

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے میرے سوا کوئی معبود بنایا تو اس کی مثال مکڑی کے اس گھر کی طرح ہے جو کہ نہایت ہی کمزور ہوتا ہے۔''لوہا مکمل طور پر گرم ہو چکا تھا اور طیبہ نے زوردار ضرب لگا کر اس کی مکمل ہی ہیئت بدلنے کی کوشش کی تھی اور وہ کامیاب بھی ہو گئی تھی کیونکہ دور سے اس کے کانوں میں اذان کی آواز پڑنے لگی تھی۔

''اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔'' موذن کی اذان کا یہ ترجمہ طیبہ ساتھ ساتھ ہی اس کو سنانے لگی تو اس کا بدن ہولے ہولے کانپنے لگا تھا اور اذان پوری ہونے پر اس کی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو چکا تھا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا تو طیبہ کو تشویش ہوئی اور پھر وہ بے ہوش ہو کر کرسی سے گر گیا تو طیبہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ بھاگتی ہوئی دروازے تک پہنچی اور دروازہ کھول کر کھلے صحن میں پہنچ کر اس نے پری اور سمن کو آوازیں دے کر پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آوازیں سن کر امیت چوہان اور رادھا سب سے پہلے اپنے کمروں سے باہر نکلے اور امیت جوہان طیبہ کو اس طرح پریشان دیکھ کر بھاگم بھاگ اس کے پاس پہنچے اور پوچھنے لگے۔

''کیا بات ہے، تم کیوں چلا رہی ہو اور کافی پریشان بھی دکھائی دیتی ہو؟'' تین چار سوال اکٹھے ہی کئے گئے تو طیبہ نے ان کا ایک ہی جواب دینے کے لئے انیل کے کمرے کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔

''انیل کو کچھ ہو گیا ہے۔'' اتنا سننا ہی تھا کہ رادھا اور امیت چوہان بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تو انیل کارپٹ پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھیں امیت چوہان نے چیخ چیخ کر ایمبولینس منگوانے کا کہا تو پندرہ بیس منٹ بعد انیل ہسپتال کے بستر پر پڑا ہوا تھا اور ڈاکٹرز اس پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کوئی بھی خاص بیماری نہ آ رہی تھی وہ مایوس ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک فیصلے پر پہنچے کہ اس مریض کو ایمرجنسی میں رکھ کر اس کے لواحقین کو صرف دلاسے ہی دیئے جائیں تب تک اس کی سانسیں پوری ہو جائیں گی اور پھر ایکسپائر ہونے پراسے ہسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا لیکن وہ چند منٹوں بعد حیران رہ گئے جب انیل نے آنکھیں کھول دیں اور خود کو ہسپتال میں پا کر وہ حیران رہ گیا۔ ڈاکٹرز نے اس کا اس طرح ہوش میں آ جانا ایک معجزہ قرار دیتے ہوئے امیت چوہان کو مبارک باد دی اور یہ بھی حیرت ظاہر کی کہ انیل کو کوئی بھی بیماری نہیں ہے لیکن موت اس کے آس پاس منڈلا کر چلی گئی ہے۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد انیل کو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا لیکن اس کے ہونٹوں کی ہنسی ختم ہو چکی تھی اور وہ خاموش ہو گیا تھا۔ گھر والے یہی سمجھے کہ وہ ہسپتال کی وجہ سے گھبرایا ہوا ہے لیکن طیبہ جان گئی تھی کہ لوہا اپنی ہیئت بدل کر کسی اور ہی نئے سانچے میں ڈھل چکا ہے۔

انیل کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا اور پری اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھیں وہ اس کے لئے سوپ اور پھل وغیرہ کاٹ کر لائی تھی اور اس کو کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ انیل نے تھوڑا بہت کھایا اور پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا تو پری اور طیبہ ایک طرف ہو کر بیٹھ گئیں تو پری نے پوچھنا شروع کر دیا کہ اس کو کیا ہوا تھا۔

طیبہ نے مختصراً بتایا کہ کرسی پر بیٹھے ہی گر گیا تھا۔ پری کو بھی یہ منطق سمجھ نہ آئی تھی۔ وہ دکھ اور کرب سے انیل کی

طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر چونکتی ہوئی بولی۔ ''میں نے فون کا بندوبست کرلیا ہے تم کو ابھی لا کر دیتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر باہر گئی تو طیبہ کو یوں لگا کہ انیل کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ وہ اس کے پاس پہنچی تو اس کے متحرک ہونٹ بنا آواز کے کچھ کہنے کی کوشش کررہے تھے۔ طیبہ اس کے ہونٹوں کے پاس جھک گئی اور اپنے کان اس کے ہونٹوں سے لگا دیئے۔ اگر کوئی اس کو اس طرح دیکھ لیتا تو یقیناً ایک غلط کردار کی لڑکی سمجھ کر اسے گھر سے نکال دیتا یا پھر اسی بازار کی زینت بننے پر مجبور کردیا جاتا۔

''اَشْھَدُ اَنَّ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' انیل کے متحرک ہونٹوں سے ہلکی سی آواز ابھری تو وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اسے اپنی سماعتوں پر اعتبار نہ ہورہا تھا۔ طیبہ نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا اُسے ڈر تھا کہ امیت چوہان یا کوئی اور انیل کے منہ سے یہ کلمہ سن کر طیبہ کو اس کو ذمہ دار نہ ٹھہرا دے۔ وہ چاہتی تھی کہ انیل خود اپنی زبان سے اقرار کرے لیکن اس وقت جب وہ ہوش میں ہو اور اسے پوری طرح علم ہو کہ یہ محض ایک کلمہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم سمجھنا ہی زندگی گزارنے اور آخرت سنوارنے کے لئے کافی ہے۔

پری موبائل لے کر آ گئی تھی اس نے طیبہ کو موبائل دیا اور بولی۔

''باہر صحن میں جا کر کال کرلو کیونکہ یہاں انیل بھی سو رہا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا تو وہ مجھ پر ناراض ہو گا۔'' طیبہ انیل کی طرف دیکھتی ہوئی موبائل لے کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اُسے بہت خوشی بھی تھی اور دل انجانے خوف سے گھبرا بھی رہا تھا کہ نہ جانے گھر والے اس کو دوبارہ قبول بھی کریں گے یا دھتکارتے ہوئے اس کی آواز سننا بھی گوارہ نہ کریں گے۔ اس نے سب سے پہلے احمد فراز کے نمبر کو ڈائل کیا چند سیکنڈ بعد ہی اس کو مایوسی ہوئی۔ پھر اس نے ارباب احمد اور پھر شمسہ بیگم کے بھی نمبر ڈائل کئے تو سب نمبرز ہی آف مل رہے تھے۔ وہ سخت مایوسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی موبائل پکڑے رونے لگی۔

''مجھے اور سزا نہ دے میرے مالک...... مانا کہ میں گناہگار ہوں لیکن میرے اللہ! تو تو بہت غفور و رحیم ہے، مجھے معاف فرما دے میرے اللہ! مجھے معاف فرما دے۔'' وہ ایک دیوار کی ٹیک لے کر رونے لگی تھی۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے پھر نمبر ڈائل کرنا شروع کئے لیکن نتیجہ بے سود ہی نکلا۔ اس نے گھر کا لینڈ لائن نمبر ڈائل کیا تو وہ بھی ڈیڈ ہی ملا تھا۔ عدیم کے نمبر پر ٹرائی کیا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ بیل جانے لگی تھی۔

کافی دیر تک بیل جا جا کر ٹون آف ہو گئی۔ وہ بار بار ٹرائی کرنے لگی تھی کوئی آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔ ''ہیلو!'' وہ اس آواز کو کیسے بھول سکتی تھی۔ یہ اس کے بابل ارباب احمد کی آواز تھی۔ اس کی آنکھوں نے برسنا شروع کر دیا تھا۔ ''ہیلو!'' دوسری طرف سے پھر کہا گیا تو وہ آنسوؤں کی بھیگی آواز میں بولی۔ ''ابو!'' اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ارباب احمد کے ہاتھ سے موبائل نیچے گر گیا ہے کیونکہ اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ موبائل کی بیٹری نکل گئی ہے یا نیچے گرنے سے موبائل ٹوٹ گیا ہے۔

وہ بار بار رابطہ کرنے لگی لیکن ناکام ہی رہی تو پھر رونے لگی۔ وہ روتی ہوئی واپس کمرے میں آئی تو انیل جاگ رہا تھا۔ وہ طیبہ کو دیکھ کر بیڈ سے نیچے اتر آیا۔ پری اس کے ساتھ تھی۔ وہ انیل کو حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ چلتا ہوا گیت کے مجسموں کے پاس پہنچا اور ان کو بڑی محویت سے دیکھنے لگا۔ وہ ایک مجسمے پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔

''کیا تو اس میں بھی ہے؟'' پری کو اس کا یہ فقرہ سمجھ نہ آیا تھا۔ وہ حیرت زدہ تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ انیل کی ذہنی رو بہک گئی ہے۔

''انیل! تمہیں آرام کی ضرورت ہے، پلیز تم لیٹ جاؤ'' طیبہ کی روئی ہوئی آنکھیں دیکھ کر پری کو یہ حوصلہ ہو گیا کہ طیبہ کی بات اس کے گھر والوں سے ہوگئی ہے۔ ''طیبہ تم ہی اسے سمجھاؤ'' میری تو یہ کوئی بات بھی نہیں مانتا۔''

طیبہ نے موبائل پری کو پکڑایا اور انیل کے پاس جا کر بولی۔

''میرے ساتھ آؤ'' وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا ہوا اشارہ کرنے پر بیڈ پر بیٹھ گیا اور طیبہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''میری چاہت پیغمبروں جیسی ہے، میرا عشق فرشتوں جیسا ہے۔''

پری کو اس نے یہ شعر کئی بار سنایا تھا لیکن طیبہ کو اس شعر کا یہ فقرہ سمجھ نہ آیا تھا کیونکہ شعر پورا بھی نہ تھا اور بے موقع بھی تھا۔

انیل نے آنکھیں بند کر لیں اور پری سے بولا۔ ''پری! پلیز مجھے سونے دو'' پری سمجھ گئی کہ وہ طیبہ سے کوئی ذاتی بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ کربناک مسکان ہونٹوں پر سجاتی ہوئی بولی۔

''انیل! اتنا یاد رکھنا کہ کوئی تمہیں اس طرح بھی چاہتا ہے کہ اس کا عشق فرشتوں کو بھی مات دے جائے۔'' طیبہ اس کے فقرے کو سن کر کبھی جاتی ہوئی پری کو دیکھنے لگی اور کبھی بیڈ پر مسکان ہونٹوں پر سجائے انیل کی طرف دیکھنے لگی۔

''پاگل ہے..... فرشتوں سے بھی پاکیزہ اور زیادہ عشق بھلا کون کر سکتا ہے؟'' وہ پری کے جانے کے بعد طیبہ سے بولا۔ ''کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کو بھی مجبور کر دے کہ اللہ اس سے بھی عشق کرنے لگے؟'' اس سوال نے طیبہ کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہونق بنی انیل کی طرف دیکھتی رہی۔

''عشق مجبوریوں کا نام نہیں ہے، عشق تو بک جانے کا نام ہے۔ عشق تو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ہوتا ہے۔ عشق تو بہت مشکل راہوں پر چلنے کا نام ہے۔ عشق کی راہ پر چلنے والے بڑے بڑے شاہ خاکروبوں میں مل گئے۔ عشق نے سید سر بازار نچوا دیئے۔ عشق نے جلتی ہوئی آگ میں چھلانگیں لگائی ہیں۔''

طیبہ اسے بتا رہی تھی اور ہر فقرہ ہر بات اس کے دل پر اس طرح لگ رہی تھی کہ گویا کوئی بڑے سے دستی لوہے کے ہتھوڑے سے بڑے سے چاندی کے تھال پر ایک زوردار ضرب لگاتا ہو تو آواز کم اور چوٹ زیادہ محسوس ہوتی ہو اور ساتھ ساتھ چاندی کا تھال درد کی زیادتی سے دوہرا بھی ہوتا جا رہا ہو۔ یہی کیفیت اس لمحہ انیل کی ہو رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر سے ان دیکھی اور بے آواز ضربوں کو محسوس کرتا ہوا میٹھے میٹھے درد کی کیفیت سے گزرنے لگا تھا۔

''عشق نے کان چھدوا دیئے، عشق نے ننگے پاؤں ریت پر چلنے کے لئے اف تک نہ کی۔ عشق نے کتوں کے پیر چومنے پر مجبور کر دیا۔ عشق نے گرم اور جھلستے پتھروں پر لیٹنا منظور کیا۔ عشق نے حسب نسب اور اونچ نیچ بھی نہ دیکھی۔ کربلا کی تپتی ریت پر خیمے لگوا دیئے۔ عشق نے پیاسے ہی قربان ہونے کو ترجیح دے کر اپنا علم بلند رکھا۔ عشق نے بازو کٹوا دیئے۔ عشق نے کائنات کے عظیم گھرانے سے امتحان لینا چاہا تو اس کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی نے

نیزے پر چڑھ کر اس طرح قرآن سنایا کہ خود عشق بھی عشق پر حیران رہ گیا اور تم دیکھ رہے ہو کہ یہ کائنات کیوں معرض وجود میں آئی ہے؟ یہ سب عشق کی کارستانی ہے۔ سہ حرف عشق کی حشر سامانی ہے کہ کائنات کا خالق بھی عشق سے محفوظ نہ رہ سکا اور اپنے محبوب کے لئے اس کائنات کو بنا کر سب سے پہلے اور سب سے بڑے عاشق ہونے کا ثبوت بھی دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا پہلا عاشق ہے اس دنیا اور انسانیت کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس نے اپنے محبوبؐ کی خاطر ایسا کلمہ بنایا جس میں اس کے محبوبؐ کا نام لئے بغیر کوئی بھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ایسی اذان بنادی کہ اگر کوئی بھی اس کے محبوبؐ کے نام کو محبت سے ادا کرے گا تو اذان بھی کانوں میں سحر گھول دے گی اور ایسی بندگی فرض کر دی کہ اگر کوئی سجدہ کرے گا تو وحدہ لاشریک کی پاک ذات کو کرے گا لیکن صرف سجدہ کرنے پر ہی وہ فرض بندگی قبول نہیں کرے گا اگر اس کے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود نہیں پڑھو گے تو کوئی بھی فرض بندگی قبول اسے قبول نہیں ہے۔ عشق کی انتہا تو دیکھو کہ وہ اللہ جو کُن کہے تو کائنات ہی کیا کئی جہان اور کروڑوں مخلوقات معرض وجود میں آجاتی ہیں۔ وہ خود اپنے محبوبؐ کا اتنا بڑا عاشق ہے کہ قرآنِ کریم میں فرماتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور میرے فرشتے میرے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وسلام بھیجتے ہیں اور اے ایمان والو! تم بھی میرے محبوبؐ پر درود وسلام بھیجو۔ یہ ہے عشق کی ابتدا اور یہی عشق کی انتہا بھی ہے۔''

طیبہ خاموش ہوگئی تو انیل شرما کی گھگی بندھ گئی تھی۔ وہ حیرت سے طیبہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا اور طیبہ اس کی بگڑتی ہوئی حالت پر پریشان ہونے لگی تھی۔

○.....❖.....○

ارباب احمد نے زبیدہ آپا کی التجاؤں اور دولت بی بی کے کہنے پر فواز احمد کو اپنے گھر بلا کر زبیدہ آپا سے ملوانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ زبیدہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ مراد خان، روشنی اور صہیب احمد بھی اس کردار سے ملنے کیلئے بے چین تھے جو ایک دن بھی اپنی ماں کا دودھ نہ پی سکا تھا لیکن اس کی اہمیت اس پوری داستان میں مرکزی کردار کی تھی اور وہ اس داستان کا آغاز بھی تھا۔

فواز احمد کو بڑی مشکل سے ارباب احمد نے سمجھایا تھا اور بات اس کی سمجھ میں بھی آ گئی تھی۔ روشنی اور مراد خان کے گھر سے وہ جس طرح رسوا ہو کر نکلا تھا وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو اور میلے کپڑے دیکھ کر بھی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ یہی فواز احمد ہے جس کی تحریریں پڑھ پڑھ کر لڑکیاں اس پر دل ہار جاتی ہیں۔ یہ وہ فواز احمد تھا جس نے کسی بھی کتاب پر اور فیس بک اکاؤنٹ پر اپنی فوٹو نہ لگائی تھی۔

روشنی کی جدائی اور رسوائی نے اس کو ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ ارباب احمد کا مشکور اور احسان مند تھا کہ ارباب احمد نے بچپن سے اس کی تعلیم کا بوجھ اٹھا کر اسے آج یہاں تک پہنچایا تھا کہ وہ الفاظ کا کھلاڑی بن کر مصنّفین کی فہرست میں شامل ہو گیا تھا۔

فواز احمد کو ارباب احمد کی ملازمہ نے پالا تھا اور اس عظیم عورت نے فواز احمد کی خاطر شادی بھی نہ کی تھی اور فواز احمد نے بھی ساری زندگی ان کی خدمت میں ہی گزاری تھی۔ ان کی اطاعت اور تابعداری میں ہی گزارے ہوئے وقت نے فواز احمد کو حساس اور باشعور بنا دیا تھا۔ وہ میٹرک میں تھا کہ اس عورت نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اس کی سگی

ماں نہیں ہے اور فواز احمد اس کا بیٹا نہیں ہے۔ اور ارباب احمد ہی اس کے محسن ہیں۔ تمام داستان سننے کے بعد وہ ارباب احمد سے ملا تھا۔ ارباب احمد نے اسے بتایا تھا کہ وہ اعلیٰ اور امیر کبیر خاندان کا چشم و چراغ ہے لیکن وہ لوگ تمہیں قبول کرنے پر راضی نہیں ہیں لیکن تمہاری ماں تمہیں دیکھنے اور حاصل کرنے کے لئے تڑپتی ہوگی وہ بھی مجبور ہے وہ تمہیں اپنا نہیں سکتی۔ بس فواز احمد نے صبر کر کے زندگی کے دن گزارنے کے لئے کتابوں اور قلم سے رشتہ جوڑ لیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو جو علم عطا کیا تھا فواز احمد اس علم سے جی بھر کر فائدہ اٹھاتا ہوا آج ملک کا بہترین مصنف تھا اور اس کی کئی شاہکار کتب آج مارکیٹ میں موجود تھیں اور وہ اس بات پر فخر محسوس کرتا تھا کہ وہ الفاظ سے کھیلتا ہے تو الفاظ بھی اس کے ذہن اور قلم کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے ہیں۔

فواز احمد جیسے ہی ارباب احمد کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو سبھی لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ مراد خان اور زبیدہ آپا نے ارباب احمد کی طرف کچھ اس انداز میں دیکھا کہ ارباب احمد نے ان کے ساتھ کوئی سنگین مذاق کیا ہے یہی کیفیت فواز احمد کی بھی تھی۔

وہ سلام کر کے اپنی جگہ پر گنگ کھڑا ارباب احمد کی طرف ہی دیکھے جا رہا تھا جو مراد خان کی فیملی کے تاثرات اور رویے کو دیکھ کر خود بھی حیران تھے۔ روشنی اور صہیب احمد کے لئے یہ جھٹکا ہی کافی تھا کہ فواز احمد ان کی بوا زبیدہ کا بیٹا ہے۔ روشنی فواز احمد کی کمزور حالت دیکھ کر تڑپ گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ فواز احمد کی آنکھوں کے گرد رونے کی وجہ سے حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ آنسو بہانے لگی تو ارباب احمد آگے بڑھتے ہوئے فواز احمد کا ہاتھ پکڑ کر زبیدہ آپا کے پاس لائے اور بولے۔

''زبیدہ یہ ہے تمہارا وہ بیٹا جسے تمہارے باپ نے میری گود میں ڈال دیا تھا'' زبیدہ آپا کو اپنی معذوری پر بہت دکھ ہوا وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔ ''فواز احمد یہ تمہاری ماں ہیں سگی ماں جنہوں نے تمہیں جنم دیا ہے۔'' فواز احمد کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔

دونوں ماں بیٹا کتنی دیر تک ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت تلے رہ چکے تھے لیکن اجنبیوں کی طرح تھے ان کے درمیان کوئی شناسائی نہ تھی اور زبیدہ آپا بھی اس کو پہچان نہ پائی تھیں۔

فواز احمد نے زبیدہ آپا کے سامنے دوزانو ہو کر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں اور زبیدہ آپا نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تو برسات پیہم ہوگئی۔

صہیب احمد اور مراد خان کی حیرت کو دیکھتے ہوئے ارباب احمد نے بتانا شروع کر دیا تھا کہ وہ کس طرح فواز احمد کو لے کر اپنی ملازمہ کے پاس چھوڑ کر آئے تھے اور اس نے ہی اس کی تربیت کی ہے۔

''میں شرمندہ ہوں فواز!'' صہیب احمد نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے کہا تو فواز احمد اعلیٰ ظرفی سے بولا۔ ''پہلے شرمندہ تھے کہ اب ہو رہے ہو؟'' صہیب احمد نے ایک ہلکا سا گھونسہ اس کے سینے پر مارا اور بولا۔ ''مجھے معاف کر دو یار! مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم میرے دوست اور کلاس فیلو ہی نہیں ہو میرے فسٹ کزن بھی ہو۔'' فواز احمد نے روتی آنکھوں مراد خان کی طرف دیکھا تو وہ ہاتھ جوڑنے لگے تو فواز احمد تڑپ کر بولا۔ ''ماموں جی! مجھے اور ذلیل نہ کریں۔'' دونوں ہی ایک دوسرے کے گلے لگے تو روشنی کی آنکھیں برسنے لگیں۔ مجھے معاف کر دینا یار! میں

تمہاری آنکھوں میں سچائی نہ پڑھ سکا تھا۔'' مراد خان نے کہا تو فواز احمد مسکرانے لگا۔ مراد خان نے روشنی کا ہاتھ پکڑا اور فواز احمد کو تھماتے ہوئے بولے۔

''یہ تمہاری امانت میرے پاس تھی اس میں خیانت ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس گناہ پر معاف فرمائے۔'' فواز احمد کو روشنی اور روشنی کو فواز احمد کا اس طرح مل جانا یہ معجزہ ہی تھا اور یہ معجزہ قرآنِ کریم کی بدولت ہی رونما ہوا تھا۔

شمسہ اور ارباب کی پوری فیملی حیران رہ گئی جب مراد خان نے بتایا کہ فواز احمد تو روشنی کو پڑھانے کے لئے کئی ماہ ان کے گھر رہ چکا ہے اور ایک غلط فہمی کی بنا پر اسے وہاں سے نکال دیا گیا تھا جس پر مراد خان اور صہیب احمد خاصے شرمندہ ہیں اور ایک بار پھر فواز احمد سے معافی مانگتے ہیں۔

اس دوران روشنی اور فواز احمد کی منگنی طے کر دی گئی۔ ریبا اور صہیب احمد کا معاملہ بھی طے ہو گیا تھا لیکن سب معاملات طیبہ کے گھر آنے تک رک گئے تھے۔

عدیم کا فون بار بار بجنے لگا تو ارباب احمد نے اس کی توجہ موبائل کی طرف دلائی تو اس نے موبائل ہی ارباب احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ دوسرے ملک سے کال لگتی ہے۔ ارباب احمد حیرت سے بولے۔ ''دوسرے ملک سے ہے؟'' ان کا پہلا خیال یہی تھا کہ تصور خان نے کال کی ہو گی۔

انہوں نے ریسیو کرتے ہوئے۔ ''ہیلو'' کہا تو دوسری طرف سے خاموشی تھی۔ سب حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''ہیلو'' کہنے پر دوسری طرف سے طیبہ کی آواز ابھری۔ ''ابو!'' ارباب احمد کے ہاتھوں سے موبائل گر کر پرزے پرزے ہو گیا تو آنکھوں کی برسات نے شمسہ کو بے چین کر دیا وہ فوراً ارباب احمد کے پاس آئیں اور پوچھنے لگیں۔

''ارباب! بتاؤ کس کا فون تھا، کیا ہوا ہے؟ مجھے مزید پریشان نہ کریں ارباب پلیز بتائیں نا!''

''ارباب بولتے کیوں نہیں بیٹا! کس کا فون تھا'' دولت بی بی بھی بے چینی سے بولیں تو ارباب احمد سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''طیبہ تھی، میری بیٹی طیبہ۔'' گھر میں موجود تمام افراد پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی وہ بجلی اس گھر کو خاکستر کرنے کی بجائے امید کی روشنی بن کر گری تھی۔ عدیم اور احمد فراز نے جلدی سے سم نکال کر دوسرے موبائل میں ڈالی اور واپسی اسی نمبر پر کال کر دی۔ چونکہ احمد فراز صحافی تھا اور موبائل اور انٹرنیشنل نمبر رکھنا اس کے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

کئی ٹونز ہونے کے بعد کسی پری نامی نے کال ریسیو کی۔

''میں پری بول رہی ہوں۔'' مترنم آواز سن کر احمد فراز بولا۔

''دیکھیں میڈم ابھی ابھی ہمیں اس نمبر سے ایک لڑکی کی کال آئی تھی اس کا نام طیبہ ہے۔ پلیز کیا آپ ان سے میری بات کروا سکتی ہیں؟'' احمد فراز کا لہجہ تیز اور الفاظ پر جوش ہو گئے تھے۔

''جی وہ ہمارے گھر میں ہے آپ کون؟''

''میں ان کا کزن احمد فراز بات کر رہا ہوں آپ لوگ کہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کا نمبر بتا رہا ہے کہ

آپ انڈیا میں رہتے ہیں۔" احمد فراز کی ذہانت باتیں کرنے لگی تھی۔

"جی ہم انڈیا میں رہتے ہیں۔" پری نے شہر کا نام بتایا تو احمد فراز فوراً بولا۔

"پلیز ہمیں اپنا مکمل ایڈریس لکھوائیں ہم طیبہ کو لینے آ جائیں گے۔ پلیز میڈم!" ارباب احمد نے فراز کی بات سن کر فوراً پاس پڑے ہوئے میز پر سے کاپی اور پنسل اٹھائی اور پری ایڈریس بتانے لگی تو احمد فراز دہرانے لگا تو ارباب احمد لکھنے لگے۔

"طیبہ کیسی ہے؟ آپ لوگ کون ہیں، وہ آپ کے پاس کیسے پہنچی؟" احمد فراز نے کئی سوال کر دیئے تو پری بولی۔ "آپ کی کزن بالکل ٹھیک ہے، وہ ہم تک کیسے پہنچی یہ ایک لمبی داستان ہے۔ خیر آپ لوگ کب آ رہے ہیں اس کو لینے کے لئے؟" پری کی خواہش تھی کہ ہونٹوں سے بات نکلے اور طیبہ فوراً یہاں سے چلی جائے۔

"ہم لوگ پہلی فلائٹ سے ہی آ رہے ہیں۔ آپ پلیز طیبہ کو انفارم کر دیں پلیز ہم لوگ آ رہے ہیں۔" احمد فراز نے رابطہ منقطع کر دیا تو شمسہ بیگم روتی ہوئی آنکھوں سے بولیں۔

"آپ کو یقین ہے کہ وہ طیبہ کی آواز تھی؟" ارباب احمد روتے ہوئے بولے۔

"تمہیں یاد ہے شمسہ بیگم! اس نے اس گھر میں آ کر بولنا سیکھا تھا اور میں نے اس کی قلقاریاں اپنی سماعتوں میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ میں اس کی آواز نہیں پہچانوں گا تو کون پہچانے گا۔"

ارباب احمد کی اس بات پر مراد خان کا سر شرم و ندامت سے جھک گیا تھا۔ ارباب احمد اس کو آج ایک بار پھر عظمت کی بلندیوں پر نظر آ رہا تھا اور وہ بہت نیچے کھڑا خود کو حقیر محسوس کر رہا تھا۔

احمد فراز نے ارباب احمد اور اپنی سیٹیں پہلی ہی پرواز میں بک کروا دی تھیں۔ ان کے لئے ویزہ پرابلم نہ تھی کیونکہ انٹرنیشنل صحافی اور انٹرنیشنل ڈاکٹر ہونے کی بنا پر وہ آسانی سے دنیا میں کہیں بھی آ جا سکتے تھے۔

شمسہ اور ارباب احمد کو مراد خان اور زبیدہ آپا نے مبارک باد دی کہ ان کی طیبہ کا بھی پتہ چل گیا ہے۔

"یہ وہ نیکی ہے جو تم نے میرے ساتھ کی ہے ارباب احمد! اللہ نے تمہیں کیسا خوب انعام دیا ہے۔" زبیدہ آپا نے فواز احمد کی نسبت ارباب سے بات کہی تو وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"اللہ تعالیٰ تو کسی کا قرض نہیں رکھتا وہ بڑا بے نیاز ہے۔"

"جلدی جائیں نا میری بیٹی کو لے کر آئیں۔" شمسہ بیگم بولیں تو دولت بی بی نے ان کا کندھا دبایا اور کہا۔

"اب کچھ دیر اور صبر کر لو شمسہ طیبہ ان شاء اللہ گھر پہنچ جائے گی اور وہ بحفاظت اور باعزت طریقے سے اپنے گھر آئے گی۔"

ان کی بات پر سبھی سر ہلا کر رہ گئے تھے۔ ارباب احمد اور احمد فراز تیار ہو کر گھر سے ائیرپورٹ روانہ ہو رہے تھے اور ان کو سی آف کرنے کے لئے صہیب احمد اور مراد خان کے ساتھ فواز احمد بھی تھا۔

O.....❖.....O

پری نے طیبہ کو بتا دیا تھا کہ اس کی احمد فراز سے بات ہوئی ہے جو کہ خود کو تمہارا کزن بتا رہا تھا۔ طیبہ کو یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ احمد فراز اس کو خود لینے کے لئے آ رہا ہے۔ وہ بے یقینی کی کیفیت میں پری کی طرف دیکھتی رہی تو پری نے اسے یقین دلایا کہ احمد فراز نامی کسی لڑکے نے اس سے کافی تفصیلی بات کی ہے اور مکمل ایڈریس بھی لیا ہے۔ طیبہ کے چہرے پر رونق چھا گئی۔

پری کافی مطمئن تھی اور طیبہ جان گئی تھی کہ وہ انیل سے محبت کرتی ہے لیکن ایک یہ بھی بہت بڑی سچائی تھی کہ انیل طیبہ سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا تھا بلکہ عشق کرتا تھا اور عشق کی انتہائی حدوں کو چھوتا ہوا وہ اس کی پوجا کرنے لگ گیا تھا۔ اس نے اوروں کی طرح کئی معبود نہ بنائے ہوئے تھے۔ وہ کسی بھی بھگوان کے سامنے اپنا سر نہ جھکاتا تھا صرف اور صرف گیت کے مجسمے کو ہی اپنا بھگوان مان کر دل سے اس کی پوجا کرتا تھا۔ اس نے ہر قسم کا دکھ طعنہ اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کیا تھا لیکن آج تک گیت کے علاوہ کسی اور پتھر کے بت کو سجدہ نہ کیا تھا۔ یہ اس کے عشق کی سچائی تھی، اور وہ محبت و عشق میں بھی توحید کا قائل تھا۔

لیکن اب اس نے عشق کے بارے میں اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو کچھ بھی سنا تھا اس کو سن کر وہ بہت خوفزدہ رہنے لگا تھا۔ اس کا بدن اس وقت تھر تھر کانپنے لگتا جب وہ اذان کی آواز سنتا تھا۔

طیبہ اس کی اس کیفیت کو کوئی بھی نام نہ دے سکتی تھی کیونکہ وہ غیر مسلم تھا۔ اس کے اجداد نے ہمیشہ بتوں کو پوجا تھا۔ بھگوان تراش کر ان کی پوجا کی تھی اور یہی کچھ انیل بھی کر رہا تھا لیکن ایک ہی پتھر کو اپنا معبود بنا کر اسی کی پوجا کرتا تھا لیکن اب اذان سن کر اس کی کیفیت کا ایسا ہو جاتا کہ وہ تھر تھر کانپتا تھا۔ لرزنے لگتا تھا اور آنکھیں بند کر کے خاموشی سے اذان سننے لگتا تھا۔ وہ جب آنکھیں کھولتا تھا تو اس کی سرخ آنکھیں یوں دکھائی دیتی تھیں کہ وہ خون رو چکا ہے۔

امیت چوہان تو اس سے نظریں ملانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ اس نے ایک انوکھا فیصلہ کیا اور اپنے دوستوں کو فون کالز کے ذریعے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی اور شام کا وقت دے دیا۔ پھر اس نے انڈیا کے تمام میڈیا کو بھی اطلاع کر دی کہ وہ ایک اہم اعلان کرنے والا ہے۔

گھر میں مہمانوں کے لئے ٹینٹ لگنے شروع ہو گئے تھے۔ وسیع تر لان میں کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ امیت چوہان اس سے کئی بار پوچھ چکا تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے لیکن اس نے ہر بار ہی ہنس کر دھیرے سے ٹال دیا اور یہی کہتا رہا کہ آپ کو کوئی رنج نہیں ہوگا۔

شام ہوتے ہی میڈیا کے لوگ اور اس کے دوستوں نے اس کے گھر میں یلغار کر دی تھی۔ تمام مہمانوں کی مشروبات سے تواضع کی گئی تھی، سبھی حیرانگی سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے لیکن کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ اتنا مجمع جمع کرنے کا انیل کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

پری، ہمن اور رادھا اس کی حرکات سے واقف تھیں لیکن آج تو اس نے کمال ہی کر دیا تھا۔ وہ کمرے میں تھا اور اس کے پاس صرف طیبہ تھی۔

''یہ کیا کر رہے ہو انیل!''

''گیت......نہیں نہیں مس طیبہ!'' اس کے منہ سے پہلی بار طیبہ نے اپنا نام سنا تو مزید حیران رہ گئی۔

''میں نے تمام عمر بتوں کو پوجا، اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے مجسمے کو سجدے کرتا رہا اور دعویٰ کرتا رہا کہ میں اس پتھر کی مورتی سے عشق کرتا ہوں۔'' وہ کہنے لگا اور چلتا ہوا گیت کے مجسموں کے پاس چلا گیا اور پھر بولا۔
''میرا دعویٰ کتنا سچا تھا یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ اوپر والے نے تمہاری خواہش کو تاوان میں بدلنے کے لئے تمہیں یہاں تک بھیجا اور تم میرے سامنے آ گئیں۔ میں سمجھا کہ میرا عشق سچا تھا اور بھگوان نے تمہیں مجھ سے ملوا دیا ہے لیکن میں غلط تھا طیبہ!'' وہ افسوس کرتا ہوا بولا۔ ''تم یہاں سے میرے لئے نہیں بلکہ اپنی اس خواہش کا تاوان ادا کرنے کے لئے آئی تھیں بلکہ لائی گئی تھیں جو تم نے اللہ کے گھر کو دیکھنے کے لئے کی تھی اور کہا تھا کہ تم ہر آزمائش اور ہر امتحان اور ہر تاوان کے لئے تیار ہو بس ایک بار وہ پاک اللہ تمہیں اس کا اپنا گھر دکھا دے......تو مس طیبہ! عشق تو تمہارا سچا ہوا نا!'' وہ معرفت کی باتیں کر رہا تھا اور طیبہ گنگ بنی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی وہ پھر بولنے لگا۔
''اللہ تعالیٰ کو تمہارا عشق بہ نسبت مرے زیادہ عزیز ہے اس نے تمہیں سرخرو کرنے کے لئے جس راستے کا انتخاب کیا ہے تم یقیناً اس پر ثابت قدم رہی ہو اور صبر و شکر کر کے اس کی رضا کو ہی مانا اور جانا ہے۔ وہ تمہیں مجھ تک اس لئے ملوانے کے لئے یہاں تک لایا کہ تم مجھے ان پتھروں کے عشق سے نجات دلا سلو۔ میں اپنے اس عشق کے دعوے پر شرمندہ ہوں کہ آج تک پتھر کو سجدہ کر کے پاکیزہ عشق کا دعویٰ کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ بڑا رحمٰن و رحیم ہے وہ مجھے ان خطاؤں پر معاف فرمائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں جو کچھ کرنے یا کہنے جا رہا ہوں اس سے ہمارے خاندان میں ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا لیکن افسوس کہ اس طوفان کو دیکھنے کے لئے میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''
طیبہ مزید حیران رہ گئی۔
''طیبہ! مجھے وضو کرنا سکھاؤ، پلیز ابھی۔'' وہ واش بیسن پر گیا تو طیبہ نے اسے وضو کرنا سکھایا اور وضو کرنے کے بعد وہ بولا۔
''اللہ بڑا بے نیاز ہے، وہ وحدہ لاشریک ہے، کوئی بھی اس کا ہمسر اور ثانی نہیں ہے۔ اس کو کسی نے پیدا نہیں فرمایا ہے اور نہ ہی وہ کسی کا باپ ہے، وہ تو خالق ہے اور مالک ہے۔ گواہ رہنا طیبہ کہ میں نے اپنا دھرم آج چھوڑ دیا ہے۔ میں مروں گا تو عاشق ہی مروں گا لیکن ایک عورت یا پتھر کے مجسمے کا عاشق بن کر نہیں مرنا چاہتا تھا۔ میں تو اس اللہ کا عاشق بن کر مرنا چاہوں گا جو خود اس کائنات کا پہلا عاشق ہے۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا طیبہ بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے نکلی تو میڈیا والے کیمرے لے کر اس کے آگے پیچھے چلنے لگے۔ وہ سٹیج پر پہنچا تو اس کی آنکھوں سے برسات جاری ہو گئی۔
سب لوگ حیرانگی سے اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا تو سورج اپنا سفر طے کرتا ہوا مغرب کی گود میں اپنا منہ چھپانے کے لئے غروب ہونے کو تھا وہ انجانی خوشی سے سرشار ہو کر بولنے لگا۔
''میرے پاس وقت بہت کم ہے، میں ہندوستان کا بہترین سنگتراش ہوں لیکن آج تک ایک ہی پتھر کو

تراش کر ایک ہی صورت کے کئی مجسمے بنائے ہیں۔ میں ان پتھروں سے کھیلتا تھا اور وہ مجسموں کی صورت میں ڈھل کر میرے ارمانوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔''

امیت چوہان، رادھا اور سمن ایک جگہ کھڑے اس کی باتیں سن رہے تھے جبکہ طیبہ اپنے کمرے کے باہر ہی کھڑی اس کو دیکھ بھی رہی تھی اور سن بھی رہی تھی اور پری اس کے سامنے کھڑی تھی اور ایک انجانے خوف سے وہ بے چینی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔

''اس کھیل ہی کھیل میں مجھے مجسموں سے عشق ہو گیا اور میں برملا اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی کسی بھگوان کو سجدہ نہیں کیا صرف اپنے ہی ہاتھوں سے تراشے ہوئے مجسمے کو بھگوان مانا اور اسی کو سجدے کئے لیکن ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ سجدہ تو پتھر کے خداؤں کو واجب ہی نہیں ہے۔''

آخری فقرے پر قیامت برپا ہو گئی۔ ایک شور مچ گیا۔ امیت چوہان کی شکل دیکھنے والی تھی۔ وہ رادھا کی طرف دیکھ کر غصے میں تلملا رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ابھی کے ابھی انیل شرما کو گولیوں سے چھلنی کر دیتا لیکن پورا لان میڈیا کے نمائندوں سے بھرا ہوا تھا۔ امیت چوہان کا خون کھول کر رہ گیا۔

''تم سب لوگ گواہ رہنا کہ میں نے آج تک جو بھی گناہ کئے ہیں، پتھر کے مجسمے کو پوجنے کا جو گناہ مجھ سے سرزد ہوا ہے جسے میں نے پاکیزہ عشق کا نام دے رکھا تھا، میں اس گناہ پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں اور یہ اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اپنا دھرم چھوڑ دیا ہے اور میں مسلمان ہی مرنا چاہتا ہوں۔ خدا رسولؐ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے دفنایا جائے مجھے دفنایا جائے۔''

مغرب کی اذان شروع ہو گئی تو وہ خاموش ہو گیا۔ اذان ہونے لگی وہ خاموشی سے احترام میں اذان سننے لگا۔ طیبہ کو یہ امید نہ تھی کہ وہ اتنا بڑا عاشق ہو گا۔ اس نے پوری اذان سنی اور اذان کے آخری الفاظ سننے کے بعد دِل پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

''اَشھدُ اَنّ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' اس نے فلک شگاف نعرہ لگایا اور کٹے ہوئے شہتیر کی مانند گر پڑا سب بھاگتے ہوئے سٹیج پر پہنچے تو اس کی سانسیں چل رہی تھیں، وہ دھیرے سے بولا۔

کافر نہ کہہ سکو گے مجھے سجدہ عشق کو کرنے سے
میری چاہت پیغمبروں جیسی ہے، میرا عشق فرشتوں جیسا ہے

پھر اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ رادھا کی چیخوں نے سب کو ہی دہلا دیا تھا اور طیبہ کی تو آنکھیں اس طرح برس رہی تھیں کہ جیسے اس کا کوئی بہت ہی خاص عزیز اس سے بچھڑ گیا ہو۔

وہ اتنا عظیم عاشق تھا کہ صرف چند ہی دنوں میں ایسا اللہ کے عشق میں فنا ہوا کہ خود کو فنا فی اللہ کر لیا۔ اس نے بہت سے راز طیبہ کو بھی نہ بتائے تھے اس نے یہ بھی نہ بتایا تھا کہ اسے اپنی موت کی اطلاع کر دی گئی تھی اس نے اللہ اور اس کے رسول کے لئے اپنی جان دینے پر آمین کہا اور خوشی خوشی اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

طیبہ نے دیکھ لیا کہ ارباب احمد اور احمد فراز اسی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ بھاگتی ہوئی ارباب احمد کے سینے

سے لگ گئی تو ساون بھادوں کی طرح برسنے والی آنکھیں دریاؤں اور جھیل کے پانیوں کو بھی مات دینے لگی تھیں۔
اس نے احمد فراز کی آنکھوں میں پیار محبت کے ساتھ ساتھ جس اعتبار کو دیکھا تھا وہی اعتبار طیبہ کی پاکیزگی اور عشق کا گواہ تھا اور اس کی گواہی کو دنیا کی کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ طیبہ کی سماعتوں میں انیل شرما کے الفاظ گونج رہے تھے۔

مانا کہ خاک نشین ہوں مگر اتنا یقین ہے مجھے
ردائے عشق اوڑھ لوں تو مرا گھر بہشتوں جیسا ہے
کافر نہ کہہ سکو گے مجھے سجدہ صنم کو کرنے سے
میری چاہت پیغمبروں جیسی ہے، میرا عشق فرشتوں جیسا ہے

○......❖......○

وہ غلافِ کعبہ سے لپٹ کر گریہ وزاری کر رہی تھی اور احمد فراز دور سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بیت اللہ کی ہیبت سے اس طرح لرزاں تھی کہ گویا خداوند کریم کے بالکل سامنے حاضر ہو گئی ہو۔ وہ قبلہ کو بوسے دیتے ہوئے اپنی آنکھوں سے تشکر کے نذرانے پیش کر رہی تھی۔ اس گھر کو دیکھنے کی خاطر اس نے بہت کچھ کھویا تھا۔ دل و جان کو لرزا دینے والا تاوان ادا کیا تھا۔ اس گھر کو دیکھنے کے لئے وہ اتنی بے چین اور بے قرار رہتی تھی کہ بیت اللہ کے ذکر پر ہی اس کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں اور وجود بید مجنوں کی طرح تھر تھر کانپنے لگتا تھا۔

آج وہ غلافِ کعبہ کو ہونٹوں اور آنکھوں سے بوسے دیتے ہوئے ہر وہ لمحہ یاد کر رہی تھی جن کربناک لمحات سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچی تھی۔ وہ خالقِ کائنات سے دل کی باتیں زبان سے ادا کرنے سے قاصر تھی بس ہر بات آنسوؤں کی زبان سے کر رہی تھی۔

اسے وہ مناظر بھی یاد آنے لگے تھے جب وہ انڈیا سے گھر پہنچی تھی تو شمسہ کتنی ہی دیر تک اس کو دیکھ کر سکتے کی کیفیت میں مبتلا رہی تھی۔ گھر کے ہر فرد نے اس کو اس طرح چوما تھا کہ وہ واقعی حج کر کے آئی ہو۔ اس نے گھر والوں کی نظروں میں اپنے لئے جو اعتماد اور بھروسہ دیکھا تھا اس نے طیبہ کو کافی حوصلہ بخشا تھا اور سب سے بڑھ کر احمد فراز نے اسے حجلہ عروسی میں قرآنِ کریم کا تحفہ دیتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی بھی طیبہ کو مجرم یا گناہگار نہ سمجھا تھا اور نہ ہی زندگی میں کبھی میری طرف سے اس خیال کو دِل میں لانا کہ وہ طیبہ کو گناہگار سمجھتا ہے۔

احمد فراز یقیناً باشعور تو تھا ہی لیکن وہ بڑے دل اور کھلے ذہن کا مالک بھی تھا۔ طیبہ کو مراد خان اور شمسہ کی داستان بتائی گئی تو وہ مراد خان سے ملتے ہوئے خوب روئی تھی اور مراد خان تو اس کے قدموں میں ہی گر گیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں کو بوسے دے رہا تھا اور آنکھوں سے لگا لگا کر آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتا تھا لیکن دِل کے زخموں نے خون بن کر آنکھوں سے رِسنا شروع کیا تو سب ہی رو پڑے تھے۔

مراد خان کا ہچکیاں لے لے کر رونا اور کبھی طیبہ کے سر اور ماتھے پر باپ کی شفقت بھری مہریں ثبت کرنا بھی طیبہ کے دل و دماغ کو جھنجھوڑنے لگا تھا۔ اس نے مراد خان کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے آنکھوں پر لگائے اور بولی۔

''بابا!'' میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں بیٹی تھی.....؟

اُس کے اس ایک فقرے نے کڑیل مراد خان کو لرزا کر رکھ دیا۔ وہ لرزتے کانپتے ہونٹوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا تو وہ پھر بولی۔ ''مجھ سے اتنی نفرت تھی تو مجھے پیدا ہوتے ہی مار دیتے بابا......!''

مراد خان کے منہ سے کوئی بھی بات نہ نکل رہی تھی۔ مراد خان اور باقی سب کی کہانی کو فراز نے طیبہ کو راستے میں ہی بتا دی تھی۔ اس کو پوری داستان سن کر شمسہ کردار اور پاکیزگی کے اعتبار سے بہت اونچے مرتبے پر فائز نظر آئی تھی۔

گھر کے باقی سب لوگوں نے بھی طیبہ کے دل کا غبار ہلکا ہونے پر اس کو راضی کر لیا تھا کہ وہ مراد خان کی غلطیوں کو معاف کر دے۔

طیبہ کی نشان دہی پر یونیورسٹی کی انتظامیہ اور پرنسپل کو حراست میں لے لیا گیا تھا جنہوں نے بہت سی لڑکیوں کے اغوا کا اعتراف کر لیا تھا۔

ریا اور صہیب احمد کی شادی، اور احمد فراز کے ساتھ طیبہ، جبکہ فواز احمد کو روشنی کے ساتھ بیاہا گیا تھا اور آج سبھی خاندان عمرہ کی سعادت کے لئے حجازِ مقدس میں موجود تھا۔

طیبہ اپنے دِل کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی تو طواف کرنے والے زائرین میں اس کی نظروں نے دیکھا کہ انیل شرما بھی شامل ہے۔ وہ چونک کر رہ گئی۔ انیل شرما نے اس کی طرف دیکھ کر ہلکی سی مسکان ہونٹوں پر سجائی اور دوبارہ مجمع میں گم ہو گیا۔ وہ بے چین ہو کر آگے بڑھی تو احمد فراز کا ہاتھ کندھے پر محسوس کرتی ہوئی رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی جس کی آنکھوں میں پیار ہی پیار تھا اور وہ دونوں بیت اللہ کے سائے میں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔

○......ختم شد......○

شہرہ آفاق مصنف محمد فیاض ماہی کے قلم سے ایک اور یادگار شاہکار نہ بھولنے والی تحریر، بہترین اسلوب سے مزین ناول

ماں کی عظمت کو عقیدت اور تقدس کے بعد عبادت جیسا درجہ دینے والے ایک بیٹے کی ایسی کہانی...... جس میں تقدیر نے اس کو ایک بار ایسے موڑ پر کھڑا کر دیا جب وہ اللہ کی عبادت میں انتہائی مشغول تھا، لیکن ماں کو اس کی ضرورت تھی۔ اس وقت اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب سچ ہونے جا رہا تھا۔ اللہ کے گھر سے اس کو حاضری کا بلاوا آ گیا تھا۔ لیکن قدرت کی طرف سے سائنس کی ترقی نے اس پر یہ عقدہ کھولا کہ اس کی ماں صرف ایک ماہ کی مہمان ہے۔ وہ اس سچ کو سن کر لرز کر رہ گیا۔ اب ایک طرف اس کی خواہش اور اللہ کی عبادت تھی تو دوسری طرف ماں کی ممتا تھی۔ ایک طرف رحمٰن و رحیم اللہ کی عبادت تھی تو دوسری طرف اللہ کا دوسرا روپ شفیق اور مہربان آنچل اوڑھے ماں تھی۔ اس نے ماں کی ممتا اور اللہ کی عبادت کے عشق کو انوکھے انداز میں سُرخرو کر کے تقدیر کو بھی ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا......

قیمت 500 روپے

لفظ لفظ سچائی، حرف حرف عشق، عبادت گزار فقرے اور دل کی گہرائیوں سے
عظمت اور عشق کو آنسوؤں کا تاوان ادا کر کے تحریر کیا جانے والا ناول

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

20۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار لاہور ✆7247414

محمد فیاض ماہی کے قلم سے ایک نیا ناول

عین۔ شین۔ قاف

قیمت 400 روپے

- عشق ومحبت کے اس سوداگر کی کہانی۔ جس نے عشق نہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی......
مگر اس کی ضد اور انا عشق کے پہلے حرف ''عین'' کی اسیر بن گئی۔
- شرابی اور آوارہ مزاج احمد سبحانی جب عاشق بنا تو ''عین'' نے اس کو روح کی گہرائی تڑپا دینے والا تاوان دینے پر مجبور کر دیا۔ شیطان ملعون کے کاری دار ''عین'' کی سرخروئی کی راہ میں دیوار تھے۔
- اس عاشق کا قصہ جس کا دعویٰ تھا کہ اس کا عشق ''شین'' سے شک نہیں بلکہ ''شین'' سے شہادت پر مبنی ہے۔ وہ خاندان سے بغاوت کر کے شہر محمد ﷺ کا مسافر بنا تو طوفان نے اس کا راستہ روک لیا۔
- کیا اس نے عشق کی سربلندی کے لیے جان کی بازی لگا کر عشق کا دوسرا حرف ''شین'' سرخرو کر دیا؟
- سادات گھرانے کی وکالت عشق کے خلاف دلیل بن گئی جبکہ مدعیہ ایک طوائف تھی۔
- گندگی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی طوائف نے ''قاف'' کو اپنا پیرہن بنا لیا۔
- وہ عشق کے قاف کی ایسی اسیر بنی کہ دنیاوی عذابوں نے اس کی زندگی اجیرن بنا دی۔
اُس نے ''قاف'' کو کس طرح خراج پیش کیا؟
- محبت وعقیدت میں ڈوبے ہوئے الفاظ عشق کی رعنائیوں سے لبریز سطریں عبادت گزار فقرے، بہترین اسلوب عشق الٰہی اور محبوبِ الٰہی کے عشق میں جانوں کے نذرانے تحفتاً پیش کرنے والوں کی کہانی۔

مصنف کے دیگر بہترین ناول

اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس سے عشق تو ہر مسلمان کی گھٹی میں شامل ہوتا ہے لیکن یہ ایسے عاشق کی کہانی ہے جسے یہ تجسس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا گھر کیسا ہے؟ وہ کس گھر میں رہتا ہے؟ وہ اپنے گھر جن کو مدعو کرتا ہے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں؟ اور اللہ کے گھر کو دیکھنے کے لئے کسی بھی امتحان سے گزرنے کی التجائیں اور دعائیں اس تحریر کا خاصہ ہیں اور اس بار عاشقِ خدا کسی مرد کی ذات نہیں بلکہ ایک طالبہ علم ہے جس پر اللہ کے گھر کا ذکر سنتے ہی رقت اور کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ کے گھر تک پہنچی یا نہیں یہ تو ایک تجسس ہے۔ اگر وہ پہنچی بھی ہے تو کن امتحانوں سے گزر کر وہاں تک پہنچی ہے اور عشقِ خدا نے اس کی ذات سے کیا کیا تاوان وصول کیا ہے یہ بھی راز ہے اور جیسے جیسے آپ اس ناول کے اوراق کو محبتوں سے لپیٹتے جائیں گے وہ راز آپ پر آشکار ہوتے جائیں گے۔

اس کہانی کے تمام کرداروں نے میرے جذبات کے ساتھ خوب کھیلا ہے اور میں ان کے وار سے بچنے کے لئے اپنی کم علمی کا سہارا لے کر الفاظ سے ان کی تشنگی بجھانے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ فیصلہ ایک بار پھر آپ کے علم اور تجربہ کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے میرے ناتواں اور حقیر قلم نے اس طرح سننا ہے کہ تنقید اور محبتیں اس طرح نچھاور ہوں کہ میں سیکھتا بھی رہوں اور میرا قلم چلتا بھی رہے۔

آپ کی محبتوں کا منتظر و بے قرار رہوں گا۔ کیونکہ آپ کے اعلیٰ ذوق کے مطابق لکھنے کے لئے آپ کی پُرخلوص آراء میرے روکھے پھیکے اور خشک قلم کے لیے روشنائی کا کام کرتی ہیں۔

محمد فیاض ماہی
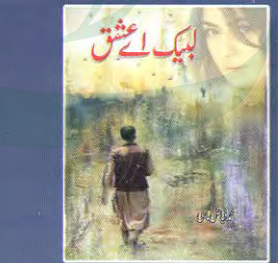
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37247414
Facebook : alimianpublications@yahoo.com